کلیاتِ پریم چند

1

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

کلیاتِ پریم چند

1

اسرارِ معابد، ہم خرما و ہم ثواب، جلوۂ ایثار، بیوہ

مرتبہ

مدن گوپال

معاون

ڈاکٹر رحیل صدیقی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل (حکومتِ ہند)

ویسٹ بلاک ا، آر۔ کے۔ پورم نئی دہلی

Kulliyat -e- Premchand- 1

Edited by:

Madan Gopal

سنہ اشاعت : جولائی، ستمبر 2000 شک 1922

پہلا اڈیشن : 1100

قیمت : پیپر بیک =/128

ہارڈ باؤنڈ =/170

سلسلہ مطبوعات : 855

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 1- آر کے پورم نئی دہلی 110066

طابع: ویپ انٹرپرائزز گرین پارک، نئی دہلی 110016

پیش لفظ

اردو زبان و ادب میں پریم چند کو خاص مقبولیت حاصل ہے۔ عرصۂ دراز سے ان کی تصانیف مختلف سطحوں کے تعلیمی نصابوں میں شامل رہی ہیں۔ ایک عرصے سے ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ پریم چند کی تمام تصانیف کے مستند اڈیشن یکجا صورت میں منظرعام پر آئیں۔ بالآخر قومی اردو کونسل نے پریم چند کی تمام تحریروں کو ''کلیاتِ پریم چند'' کے عنوان سے مختلف جلدوں میں ایک مکمل سِٹ کی صورت میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ کلیات 22 جلدوں پر مشتمل ہوگا جس میں پریم چند کے ناول، افسانے، ڈرامے، خطوط، تراجم، مضامین اور اداریے بہ اعتبارِ اصناف یکجا کیے جائیں گے۔جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

ناول : جلد 1 سے 8 تک ، افسانے : جلد 9 سے جلد 14 تک، ڈرامے :
جلد15 و جلد 16 ، خطوط : جلد17، متفرقات : جلد 18 سے جلد 20 تک،
تراجم : جلد 21 و جلد 22 تک

''کلیاتِ پریم چند'' میں متون کے استناد کا خاص خیال رکھا جا رہا ہے۔ مواد کی فراہمی کے لیے مختلف شہروں کے کتب خانوں سے استفادہ کیا گیا ہے اور پریم چند سے متعلق شخصیتوں سے بھی ذاتی طور پر ملاقات کرکے مدد لی گئی ہے۔ اس سلسلے میں پریم چند کے پسرزادے پروفیسر آلوک رائے نے بہت سی مفید معلومات بہم پہنچائیں۔

''کلیاتِ پریم چند'' کی ترتیب میں یہ التزام رکھا گیا ہے کہ ہر صنف کی تحریریں زمانی ترتیب کے ساتھ شاملِ اشاعت ہوں اور ہر تحریر کے آخر میں اول سنِ اشاعت، جس میں شائع ہوئی ہو، اس رسالہ کا نام اور مقامِ اشاعت بھی درج ہو۔ اس سے مطالعہ پریم چند کے نئے امکانات پیدا ہوں گے۔ ہماری کوشش ہے کہ ''کلیاتِ پریم چند'' میں شامل تمام تحریروں کا مستند متن قارئین تک پہنچے۔

''کلیاتِ پریم چند'' کی شکل میں یہ منصوبہ نقشِ اولیں ہے ہماری پوری کوشش کے باوجود جہاں تہاں کوئی کوتاہی راہ پاسکتی ہے۔ مستقبل میں پریم چند کی نودریافت تحریروں کا

خیر مقدم کیا جائے گا اور نئی اشاعت میں ان کا لحاظ رکھا جائے گا۔ کلیات سے متعلق قارئین کے مفید مشوروں کا بھی خیر مقدم کیا جائے گا۔

اردو کے اہم اور بنیادی کلاسیکی ادبی سرمایے کو شائع کرنے کا منصوبہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی ترجیحات میں شامل ہے۔ ان ادبی متون کو انتخاب کرنے اور انھیں شائع کرنے کا فیصلہ قومی کونسل کی ادبی پینل کی کمیٹی کے ذریعے لیا گیا ہے۔ اس کمیٹی کے چیئرمین پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی اور ارکان پروفیسر شمیم حنفی، جناب محمد یوسف ٹینگ، جناب بلراج پوری، پروفیسر نیّر مسعود، جناب احمد سعید ملیح آبادی اور کونسل کے نائب چیئرمین جناب راج بہادر گوڑ کے ہم ممنون ہیں کہ انھوں نے اس پروجکٹ سے متعلق تمام بنیادی امور پر غور کرکے اس منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے میں ہماری معاونت فرمائی۔ ''کلیاتِ پریم چند'' کے مرتب مدن گوپال اور ریسرچ اسسٹنٹ ڈاکٹر رحیل صدیقی بھی ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے پریم چند کی تحریروں کو یکجا کرنے اور انھیں ترتیب دینے میں بنیادی رول ادا کیا۔

ہمیں امید ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی دیگر مطبوعات کی طرح ''کلیاتِ پریم چند'' کی بھی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند،
نئی دہلی

فہرست

(پریم چند نے بستر مرگ پر اپنی تصانیف کی ایک فہرست تیار کی تھی اس میں بیوہ سے لے کر گئودان تک کا ذکر ہے جو ہنس کے لیٹر پیڈ پر لکھا گیا تھا۔) (مرتب)

دیباچہ

'کلیات پریم چند' کی پہلی جلد میں چار ناول پیش کیے جا رہے ہیں۔ اسرارِ معابد، ہم خرما و ہم ثواب، جلوۂ ایثار اور بیوہ ۔ اول الذکر تین ناول ان کے قلمی نام نواب رائے (اصل نام تھا دھنپت رائے) کے نام سے شائع ہوئے اور آخر الذکر ناول "بیوہ" پریم چند کے نام سے شائع ہوا۔ ان چاروں ناولوں کے بارے میں کچھ ضروری باتیں عرض ہیں۔

پریم چند نے اپنے مضامین اور خطوط میں اس امر کا اظہار کیا کہ ان کی ادبی زندگی کا آغاز 1900 میں ہوا۔ پہلا ناول 1902 میں نکلا اور دوسرا ناول 1904 میں۔ کچھ محققین نے اس امر پر سوالیہ نشان لگایا ہے کہ ان کی ادبی زندگی 1900 سے شروع ہوتی ہے۔ مجھے ان لوگوں سے اختلاف رائے اس لیے ہے کہ اپنے ایک مضمون میں پریم چند نے لکھا تھا کہ جب وہ تیرہ سال کے تھے تو انھوں نے رشتے کے ایک ماموں اور ایک عورت کے معاشقے کو لے کر ایک مزاحیہ ڈراما لکھا تھا اور جب 1899 میں میٹرک پاس کیا اور ایک اسکول میں نوکری مل گئی تو انھوں نے اپنی ادبی زندگی کی شروعات کی۔ ادب کے ساتھ ساتھ انھیں صحافت سے بھی دلچسپی تھی۔

پریم چند کا پہلا ناول 'اسرارِ معابد' ہے۔ اِسے انھوں نے 1901 تا 1904 کے بیچ لکھنا شروع کیا۔ یہ ناول بنارس کے ہفتہ وار اخبار 'آوازِ خلق' میں شائع ہوا اور مصنف کا نام منشی دھنپت رائے صاحب عرف نواب رائے الہ آبادی تھا۔ 'اسرارِ معابد' کا ذکر نہ تو پریم چند نے کیا اور نہ ہی ان کے کسی دوست نے اپنی تحریروں میں اس ناول کا ذکر کیا۔ جب میں 43-1942 میں پریم چند پر انگریزی میں کتاب لکھ رہا تھا، تب حسام الدین غوری کا 'پریم چندسوگ' پڑھا۔ یہ غوری صاحب کا خراجِ عقیدت تھا جو انھوں نے پریم چند کے انتقال کے بعد لکھا تھا۔ اور یہ بنارس کے 'آوازِ خلق' میں شائع ہوا تھا۔ حسام الدین غوری کا پریم چند سے تعلق مکاتیب کے ذریعے ہوا تھا۔ شاید بمبئی میں ملاقات ہوئی ہو۔ میں نے44-1943

میں شائع ہوئی اپنی کتاب 'پریم چند' میں 'اسرارِ محبت' کا حوالہ دیا۔ اندرناتھ مدان نے بھی میری کتاب میں دی گئی تفصیلات کو اپنی کتاب میں جگہ دی۔ میں 1948 میں پھر بنارس گیا۔ محترمہ شیو رانی دیوی اور پریم چند کے سوتیلے بھائی مہتاب رائے سے 'آوازِ خلق' کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ انھیں بھی 'آوازِ خلق' کے بارے میں کوئی جانکاری نہیں تھی۔ میں نے 'آوازِ خلق' کے دفتر کو ڈھونڈ نکالا۔ میں وہاں گیا اور پرانی فائل بھی دیکھی مگر مجھے 'اسرارِ محبت' نہیں ملا۔ گیارہ سال بعد امرت رائے میرے غریب خانہ پر تشریف لائے 'اسرارِ محبت' کا ذکر آیا۔ امرت رائے نے کہا کہ بنارس سے 'آوازِ خلق' نام کا کوئی اخبار نہیں شائع ہوا۔ میں نے بتایا کہ میں اس دفتر میں گیا تھا۔ میرے پاس 'آوازِ خلق' کے دو تین شمارے بھی ہیں۔ ایک کاپی انھیں دی۔ پھر امرت رائے وہاں گئے، اس ناول کو تلاش کرلیا۔ عنوان 'اسرارِ محبت' نہیں بلکہ 'اسرارِ معابد' تھا۔ ایک شمارہ 1/9/1904 کا دستیاب نہیں ہوا اور ناول بھی نامکمل تھا۔ ناول کا آخری قسط یکم فروری 1905 میں شائع ہوا تھا۔ اس ناول کو امرت رائے نے منگلا چرن میں 'دیو استھان رہسیہ' کے نام سے شائع کیا۔ عبارت جیوں کا تیوں دی ہے۔ صرف عربی اور فارسی کے کچھ مشکل الفاظ کو ہندی الفاظ میں بدل دیے گئے ہیں۔ تقریباً سو سال پُرانے اس اخبار کی حالت اب دِگرگوں ہوچکی ہے۔ اس لیے منگلا چرن سے ہی کچھ الفاظ بدل کر پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کے لیے میں آنجہانی امرت رائے کا مشکور ہوں۔

جب 1903 میں 'اسرارِ معابد' آوازِ خلق میں شائع ہورہا تھا پریم چند دو اور ناول لکھ رہے تھے۔ ایک تو بنارس کے ہندی ہال پریس سے شائع کرایا اور دوسرا 1904 میں منشی دیا نرائن نگم کو بھیجا کہ وہ ناشر ڈھونڈکر اس کی اشاعت میں مدد کریں۔ یہ ناول لکھنؤ کے نول کشور پریس سے شائع ہوا۔

پریم چند کا دوسرا ناول 'کشنا' ہے یا 'ہم خُرما و ہم ثواب'۔ یہ بحث و مباحثے کا موضوع بن گیا ہے۔ 'ہم خرما و ہم ثواب' کے دو' تین اڈیشن شائع ہوئے مگر کسی پر سنہ اشاعت نہیں دیا گیا۔ 'کشنا' کی ایک کاپی بھی دستیاب نہیں ہوسکی اس لیے صحیح سنہ اشاعت کا پتا نہیں۔ کچھ محققین نے ان دونوں ناولوں کی اشاعت کے بارے میں ناولوں کے اشتہار یا ریویو کا سہارا لیا۔ 'ہم خرما و ہم ثواب' کا ریویو زمانہ کے اکتوبر نومبر 1906 کے شمارے میں شائع ہوا اور

اشتہار دسمبر 1906 میں۔ 'گشنا' کا اشتہار نومبر 1907 میں اور ریویو دسمبر 1907 میں شائع ہوا۔ محققین نے ریویو اور اشتہار کی بنا پر سنہ اشاعت معین کرنے کی کوشش کی ہے کہ 'ہم خرما و ہم ثواب' دوسرا اور 'گشنا' تیسرا ناول تھا۔

میرا خیال ہے کہ 'گشنا' دوسرا ناول تھا اور 'ہم خرما و ہم ثواب' تیسرا ناول۔ کیونکہ 'ہم خرما و ہم ثواب' کے ٹائیٹل کور پر مصنف کے نام کے ساتھ لکھا تھا، منشی نواب رائے صاحب مصنف 'گشنا' وغیرہ۔ وغیرہ کا اشارہ 'اسرارِ معابد' کی طرف ہوسکتا ہے بہر حال 'گشنا' پہلے شائع ہوچکا تھا۔ زمانہ کانپور میں شائع شدہ 'گشنا' کا ریویو ذیل میں دیا جارہا ہے۔

''یہ بھی ایک ناول ہے اور ہمارے سوشل رفارم سے تعلق رکھتا ہے۔ زمانہ کے مشہور مضمون نگار منشی نواب رائے صاحب بنارسی اس کے مصنف ہیں جو فنِ ناول نویسی پر عمدہ عبور رکھتے ہیں انھوں نے عورات میں زیور کے فضول شوق کی اچھی چھتاڑ کی ہے۔ گویا یہ ایک ایسی عورت کی لائف ہے جسے زیورات کا شوق نہیں بلکہ جنون تھا۔ اس جنون کی تصویر دکھانے میں لائق مصنف نے بہت کچھ زورِ قلم صرف کیا ہے۔ تاہم افراط و تفریط کی وجہ سے یہ خبط اصلی نہیں بلکہ مصنوعی معلوم ہوتا ہے۔ ساتھ شادی بیاہ کے بعض رسوم کا بھی خاکہ اُڑایا گیا ہے۔ خصوصاً ایک رقم معینہ کا قرار داد اور اس کا سختی سے وصول کرنا۔ بے شک ایک نامعقول رسم ہے لیکن خوش قسمتی سے مہذّب اربابِ قوم روز بہ روز اس کے خلاف ہوتے جاتے ہیں اور مہذّب شہریوں اور تعلیم یافتہ حلقوں میں اس کا رواج اُٹھتا جاتا ہے۔ اس کے نمونے پر دیہات کے باشندے بھی اپنی اصلاح کرسکتے ہیں جو نہایت ضروری ہے۔ البتہ شادیوں کے موقعے پر خوشی و مسرت کا اظہار لازمی ہے ورنہ شادی و غمی کے تقریبوں میں امتیاز محال ہوجائے گا اور قوم سے زندہ دلی کا مادّہ بتدریج زائل ہوجائے گا۔ جو تہذیب کا جزوِ اعظم ہے۔ کتاب میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ منشی صاحب کی فصیح تحریروں سے بہت کم ملتی ہے۔ غالباً یہ زبان اس لیے استعمال کی گئی ہے کہ جس فرقہ کی اصلاح مقصود ہے اس کے لیے دلچسپ ہو۔ ہمیں مصنف کی بالغ نظری سے جس امر کا سخت تعجب ہے وہ اصولِ فن سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی انھوں نے 'گشنا' کو لالہ دھنک دھاری لال سے پہلے ہی سین میں ملایا ہے۔ جو سوشل ریفارمروں میں نہایت

معزز و ممتاز ہیں لیکن انھوں نے اپنی ڈیوٹی کے خلاف غریب کشنا کے جنون کا کوئی معقول علاج نہیں کیا۔ اس لیے ہیرو نے اپنے رتبے اور شان کو قائم رکھنے میں ناکامی اُٹھائی۔ فن کی نزاکت یہ چاہتی تھی کہ لالہ دھنک دھاری لال کی کوشش سے کشنا کا جنون فرو ہوجاتا۔ اور وہ اپنے طبقہ کے لیے ایک محبوبہ بنتی۔ بہ حالتِ موجودہ یہ ایک ایسا ناول ہے جس میں کوئی ہیرو یا ہیروئین نہیں ہے اور اسے ایک ناول کہنا محال ہے۔ دراصل یہ ناول ہے بھی نہیں بلکہ مذموم مذاق نسوانی کا خاکہ اُڑایا گیا ہے جسے انگریزی میں کیریکچر (Caricature) کہتے ہیں اور اس لحاظ سے یہ تصنیف ضرور قدر کی مستحق ہے۔"

صفحات: 142

قیمت: ۸/ آنہ مینیجر زمانہ سے طلب فرمایئے۔

زمانہ اکتوبر و نومبر 1907 صفحہ 285

کتابوں کے ریویو کے بارے میں عرض کرنا چاہوں گا کہ ہر کتاب کا ریویو شائع نہیں کیا جاتا۔ کئی بار ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوشش کرنے پر بھی ریویو نہیں نکلتا۔ کچھ کتابیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو مہینوں اخبار کے دفتر میں پڑی رہتی ہیں۔ اگر مصنف مشہور ہے تو ریویو جلد نکال دیا جاتا ہے۔ نئے مصنف یا غیر معروف ناشر کی کتابوں کو نظرانداز کردیا جاتا ہے۔ ریویو یا اشتہار کی اشاعت کے بنا پر سنہ اشاعت کا تعین کرنا ہمیشہ ٹھیک نہیں ہوتا۔ اس لیے میرا قیاس ہے کہ 'کشنا' پہلے شائع ہوا اور 'ہم خرما و ہم ثواب' بعد میں۔

'منگلا چرن' میں اسرارِ معابد اور ہم خرما و ہم ثواب کے ساتھ ہندی ترجمہ 'پریما' بھی شائع کیا گیا ہے۔ اس مجموعے میں 'پریما' اس لیے نہیں دیا گیا کیوں کہ یہ 'ہم خرما و ہم ثواب' کا صرف ترجمہ ہے۔ 'روٹھی رانی' کو ناول مان کر 'منگلا چرن' میں شائع کیا گیا ہے۔ 'روٹھی رانی' ناول نہیں ہے۔ یہ زمانہ میں قسط وار شائع ہوا تھا۔ زمانہ میں کبھی کوئی ناول قسط وار شائع نہیں ہوا۔ روٹھی رانی پر صاف لکھا ہے ایک قصہ۔ یہ قصہ جودھپور کے ایک کائیستھ منشی دیبی پرساد کی ہندی کتاب کا اردو ترجمہ ہے اس کے اختتام پر صاف لکھا ہے ماخوذ از ترجمہ ہندی۔ 'کلیاتِ پریم چند' میں 'روٹھی رانی' کو افسانوں کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے۔

ہندی کے محققین نے 'کشنا' کا کہیں ذکر نہیں کیا حالانکہ انڈیا آفس کے Index میں اس کا ذکر ہے گو کتاب وہاں بھی دستیاب نہیں ہے۔ اور یوپی کے سرکاری گزٹ میں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔ 'کشنا' کے بارے میں میں نے اپنی کتاب جو 1944 میں شائع ہوئی تھی، لکھا ہے کہ 'کشنا' کی تھیم کو لے کر پریم چند نے 'غبن' لکھا۔ پریم چند کے ایک طالب علم جناردن پرساد جھا نے اپنی کتاب 'پریم چند کی اپنیاس کلا' میں لکھا ہے کہ 'کشنا' کی تھیم کو لے کر پریم چند نے 'غبن' لکھا۔ انھوں نے اپنی کتاب کی پہلی کاپی پریم چند کو پیش کی تھی۔ میرے پاس اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ اگر پریم چند کو کچھ اختلاف ہوتا تو دوسرے ایڈیشن میں اس کی ترمیم کی جاتی۔ اس لیے میں نے اس امر کو قبول کیا۔ پھر 'کشنا' کا ریویو بھی زمانے میں نکلا تھا۔ (میں نے اسے اپنی کتاب قلم کا مزدور اور ادبی سوانح میں پیش کیا ہے)۔

'کشنا' اور 'ہم خرما و ہم ثواب' کے بارے میں پریم چند نے امتیاز علی تاج کو 1921 میں لکھا تھا کہ یہ ابتدائی تصانیف تھیں اور ان میں خامیاں بھی ہیں۔ جب یہ خط لکھا گیا اس وقت ان کا ناول 'جلوۂ ایثار' (مئی 1912) شائع ہوچکا تھا۔ مگر انھوں نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ یہ ناول بھی نواب رائے کے نام سے شائع ہوا۔ اس نام سے شائع ہونے والا یہ آخری ناول ہے۔ اسے اس جلد میں شائع کیا جارہا ہے۔ اس کے بعد پریم چند نے 'ہم خرما و ہم ثواب' (ہندی میں عنوان تھا پریما) کو لے کر 'پرتگیا' لکھا۔ جس کا اردو ترجمہ 'بیوہ' کے نام سے 1932 میں شائع ہوا۔ پریم چند نے سیتا مئو کے مہاراج کمار رگھو سنگھ کو ۷رمئی 1932 میں لکھا کہ جب 'پریما' (ہم خرما و ہم ثواب) لکھا گیا تھا تو اس وقت جوانی کی عمر تھی۔ ریفارم کی لہر زوروں پر تھی۔ ہندو بیوہ کی دوسری شادی کروا کر میں نے ہندو عورت کو آدرش سے گرا دیا۔ دونوں ناول (پریما اور پرتگیا) کی ابتدا اور اختتام الگ الگ ہیں مگر کردار کے نام ایک ہی ہیں۔ بیوہ کی اشاعت ہم خرما و ہم ثواب کی اشاعت کے بیس برس بعد ہوئی مگر تھیم وہی ہے اور زیادہ تر باتیں اسی ناول سے ماخوذ ہیں۔ خود پریم چند نے وفات کے کچھ ہی دن قبل اپنی تصانیف کی ایک فہرست تیار کی تھی جس میں گئودان تک کے ناولوں کا نام درج ہے۔ اس فہرست میں سنہ 1906 (سوالیہ نشان ہے) پرتگیا جو بیوہ کے نام سے اردو میں نکلی، ظاہر ہے اس کا مطلب 'پریما' سے تھا۔ جسے نیا نام دیا گیا 'پرتگیا'۔ پریما ہو یا پرتگیا ہو ہم خرما و ہم ثواب

ہو یا بیوہ ہو۔ تھوڑی بہت ترمیم کے بعد کتاب ایک ہی ہے۔ اسی لیے بیوہ کو یہاں شامل کیا جارہا ہے۔

عام طور پر ادیب تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوستانی ادب (خصوصاً اردو اور ہندی ادب) پر پریم چند کے بڑے احسانات ہیں۔ جہاں آزادی کے بعد ہندی میں پریم چند کی تخلیقات لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوئیں۔ افسوس کا مقام ہے کہ اردو میں ان کی طرف کم توجہ دی گئی ہے۔ خوشی کا مقام ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے لٹریچر پینل نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ پریم چند کی تمام تخلیقات کو اردو زبان میں لایا جائے۔ کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ نے بحیثیت کنونیر اس فیصلے کا خیر مقدم کیا اور اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی ذمہ داری راقم الحروف کے کندھوں پر رکھی، جن کا میں ممنون ہوں۔ ڈاکٹر رحیل صدیقی جنھوں نے اس پروجکٹ میں بحیثیت ریسرچ اسٹنٹ کے فرائض انجام دیے انھوں نے ہر نہج اور موڑ پر حسبِ منشائے من میری معاونت کی۔ ان کی بابت یہ کہنا مبالغہ ہو ہوگا کہ ان کے کام کے تئیں خودسپردگی اور میری ہدایتوں کی پُرتپاک انجام دہی اگر میرے شاملِ حال نہ ہوتی تو شاید یہ کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچتا۔

مدن گوپال

اسرارِ معابد

باب پہلا

محفلِ عیش و طرب و اربابِ نشاط کا جمگھٹ

"رنگیلے بلم کاہے کرو چترائی ۔ رنگیلے بلم کاہے کرو چترائی۔ رنگیلے بلم ...."
رنگیلے بلم کاہے کرو چتروائی
رنگیلے بلم کاہے کرو چتروائی ۔ رنگیلے بلم۔

رات کا وقت۔ ابھی اسی کالی بلا کی پہلی منزل ہے۔ دور سے میٹھے سُروں کی آواز سنائی پڑتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ کوکیل انداز حسینہ خوب دل توڑکر گارہی ہے، ناظرین کو بھاؤ بتاکر لبھا رہی ہے تعریفوں کی بوچھار ہورہی ہے۔صدقوں کی بھرمار ہورہی ہے واہ واہ کی صدا بلند ہے۔ ہر شخص کا دل خرسند ہے۔ محفل کے لوگ سنگیت کی شراب سے مخمور ہیں۔ جلسے کے صاحبان انگوری شراب سے چور ہیں۔ محفل کا چراغ دل کی تڑپ کے مارے بے قرار ہے، پروانہ اس پرجان سے نثار ہے۔ تمام نیچر مدہوش ہے، دیوار بھی ہمہ تن گوش ہے۔

سامعین: آپ کا شاید یہ سوال ہوگا کہ ایسی دل لبھانے والی صدا کہاں بلند ہے؟ کس خوش نصیب کے نصیب جاگے ہیں؟ کس بدنصیب کے رنج و دُکھ دور بھاگے ہیں؟ اے، یہ آپ چونکے کیوں؟ پہلے پوری بات سن لیجیے، پھر سر اور گردن ہلائیے گا۔ اعتراض نکالیے گا۔ یہ آواز شری مہادیو لنِکشور ناتھ کے مندر سے آرہی ہے۔

یہ خوب صورت مندر سرجو ندی کے کنارے ہے۔ اسی کے آس پاس کی ہریالی ایسی جاں‌فزا اور ایسی روح افزا ہے کہ امریکہ اور سوئزرلینڈ کے دل کش مناظر بھی اس کے آگے پانی بھرتے ہیں، اس کے ناموں کو سُن کر کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔ ایک طرف ندی لہریں مار رہی ہے، رات کے وقت سفر کرنے والی کشتیاں بادبان کھولے چلی آرہی ہیں۔ اور ان کے تختوں پر دھیمے دھیمے ٹمٹاتے ہوئے چراغ امید کی طرح دھندلے نظر آتے ہیں۔ دریا کی لہریں بڑے جوش و خروش سے اُٹھتی ہیں اور کناروں سے ٹکر کھاکر رُک جاتی ہیں بالکل اسی طرح جیسے کوئی غصہ ور اور جھلائی ہوئی فوج کسی مضبوط اور پائیدار قلعے پر حملہ کررہی ہو مگر اس کا تو بال بھی بانکا نہ کرسکے، خود ہی اپنا سا منہ لے کر رہ جائے۔ دوسری طرف کچھ ہرے بھرے پیڑ اپنی اونچی شاخوں کو ہوا میں اُٹھائے مستی سے جھوم رہے ہیں اسی بات کا کھلا ثبوت دے رہے ہیں کہ گو زمانے کی لہروں نے اَنگنت ہیکڑوں کو جڑ سے کھودکر پھینک دیا اور ہزاروں مشہور لوگوں کا نام صفحۂ ہستی سے مٹا دیا مگر ان تھوڑے سے نام والوں کا کچھ بھی نہ بگڑسکا جن کا نام آج تک دوپہر کے سورج کی طرح چمک رہا ہے اور ابد تک یوں ہی چمکتا رہے گا۔ پاس پڑوس کے گاؤں بالکل اندھیرے ہورہے ہیں۔
اس مندر میں داخل ہوتے ہی ایک بڑا پھاٹک ملتا ہے جس پر دربانوں کی مؤرتی اس صفائی سے کھینچی گئی ہے کہ پہلی نظر میں انسان ضرور دھوکا کھا جائے۔ پھاٹک سے آگے بڑھ کر ایک لمبا چوڑا صحن ہے جس پر ہری ہری گھاس خوب سہانی معلوم ہوتی ہے۔ اس صحن کے سامنے مہادیو جی کا عالیشان مندر ہے اور اس کے اِدھراُدھر نفیس عمارتیں بنی ہوئی ہیں جن میں سے کوئی تو گوشالہ ہے، کوئی دھرم شالہ، کوئی مٹھ اور کوئی مہنت جی کی قیام گاہ۔ مہنت جی کی بیٹھک کا کمرا طرح طرح کی خوب صورت چیزوں سے سجا ہوا ہے۔ فرش پر سنگ مرمر کے خوب صورت تختے جڑے ہوئے ہیں۔ دیواروں کی نقاشی اس عمارت کی تمام خوبیوں کو بڑھاتی ہے ایک ایک گُل بوٹا دیکھ کر عقل دنگ ہوجاتی ہے۔ جو سجاوٹ اور نفاست یہاں دیکھنے میں آتی ہے، شاید شریفوں اور امیروں کے پُرتکلف کمروں میں مشکل سے نظر پڑے گی۔ ہر قسم کی قیمتی چیزیں، طرح طرح کے سجاوٹ کے سامان یہاں پر مزین ہورہے ہیں اور ان کا مناسب موقعوں پر سجایا جانا مکان مالک کی حسین اور آرائشی دلچسپیوں کا ثبوت دیتا ہے۔

اس وقت شری مان بابا ترلوکی ناتھ ماتھے پر لال چندن کا ٹیکا لگائے، پیلے ریشم کی بھڑکیلی مرزئی ڈالے بیٹھے ہیں۔ گلے میں انمول موتیوں کی ایک خوب صورت مالا پڑی ہوئی ہے۔ سر پر ایک جڑاؤ ٹوپی عجیب شان سے رکھی ہوئی ہے۔ ان کے خونی دانتوں نے بیچارے پان کے بیڑوں کا خون اتنا زیادہ کیا ہے کہ خون کی لالی قاتلوں کے گلے کا ہار ہوکر بار بار ان کی طرف انگلی اُٹھا رہی ہے اور چونکہ یہ جلّادی دانت خون کرنے کے عادی ہوگئے ہیں، انھیں بنا کسی بے گناہ کے خون سے ہاتھ رنگے چین نہیں اس وقت وہ بڑے انہماک سے اپنے کام میں لگے ہیں۔ یہ جو آپ مہنت جی کے ماتھے پر لال نشان دیکھ رہے ہیں، یہ چندن کے نشان نہیں، بلکہ اس بات کو ثابت کررہے ہیں کہ حضرت نے انصاف اور دھرم کا خون کر ڈالا ہے۔ آپ جو ان کے گلے میں موہن مالا دیکھ رہے ہیں، یہ اصل میں لوبھ کا پھندا ہے جو آپ کو خوب کَس کر جکڑے ہوئے ہے۔ سر پر ترچھی رکھی ہوئی ٹوپی آپ کی عقل کے ترچھے پن کو ظاہر کررہی ہے۔ آپ کے جسم پر رنگ برنگی مرزئی نہیں ہے بلکہ ضعیف الاعتقاد لوگوں کو سبز باغ دکھانے کا آلہ ہے جو آپ کے دل کے اندھیرے اور سیاہی کے اوپر پردے کی طرح پڑا ہوا ہے یا بدھوؤں کو لال دروازہ دکھانے کا اوزار ہے جو اندر کی سیاہی کو سنیاس اور ویراگ کے پردے میں چھپا رہا ہے، یا دھوکے کی ٹٹی ہے جو بھکتوں کو جال میں پھسانے کے لیے پھیلائی گئی ہے۔ ترلوکی ناتھ یہ امیروں جیسا ٹھاٹ باٹ بنائے، گاؤ تکیہ لگائے بڑی آن بان سے جلوہ گر ہورہے ہیں ان کے دائیں طرف ایک اور عظیم ہستی تشریف فرما ہیں۔ یہ حضرت عمر میں مہنت سے کچھ بڑے ہوں گے، قد بھی ان سے کچھ اونچا ہوگا۔ ان دونوں صاحبوں کے علاوہ اور لوگ بھی موجود ہیں، مگر کوئی ایسا نہیں جس کے چہرے سے پاکیزگی نہ جھلکتی ہو، جس نے باباپن کا تمغا نہ حاصل کیا ہو۔ ان لوگوں کے جسم سے صاف ظاہر ہے کہ یہ پرلے سرے کے پیٹو ہیں۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ ان کا پیٹ ناند سے کم نہیں۔ گال اتنے پھولے ہوئے ہیں کہ لگتا ہے ہڑ نے کاٹ کھایا ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ منہ میں پان ٹھنسا ہوا ہے۔ محفل والوں کا حال تو ہم تفصیل کے ساتھ بتلا چکے اب محفل کی جان اور محفل کی رونق کا بھی کچھ ذکر سُن لیجیے۔ ترلوکی ناتھ کے سامنے ایک پھول جیسے مکھڑے والی، بڑے بڑے رشیوں کا تپ بھنگ کرنے والی، سب کو تباہ کرنے والی کم سن چھوکری بڑے ناز و انداز سے بیٹھی ہوئی ہے۔ یہ پری

ان سب تعریفوں کی حق دار ہے جو شعراء کی جمالیاتی جس نے صدیوں پسینہ بہانے اور جان لگانے کے بعد پیدا کی ہیں۔ اس کے گہنے، کپڑوں کا کیا پوچھنا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آسمان سے کوئی اَپسرا اس کے بھیس میں اُتر آئی ہے۔ اس پری کے ساتھ سازندے سیاروں کے حلقے کی طرح جمع ہیں۔ طبلے پر تھاپ پڑ رہی ہیں۔ چوڑی بج رہی ہے۔ کمرے کا دروازہ اپنچی کی آنکھ کی طرح بند ہے۔

سوامی جی۔ (ترلوک ناتھ کے اصلی دوست) اوہو۔ ہو کیا گلا پایا ہے!

چھوکری ۔(مسکراکر) تسلیم یہ آپ کی قدر افزائی ہے۔

ترلوکی۔ واہ واہ کیا خوب! ایشور جانتا ہے، وہ مزا آرہا ہے جیسے کوئی اپسرا گارہی ہو۔

چھوکری۔ (آنکھیں مٹکا کر)۔

موہے آچھت سوتن گھر ڈارے

ارے ہاں موہے آچھت سوتن گھر ڈارے

بھلا ای ہے کون بھلائی

رنگیلے بلم کاہے کرو چترائی۔ کاہے کرو ......

ترلوکی۔ ہائے ظالم قتل کرڈالا! کیوں سوامی جی کیسا رنگ گٹھا؟

سوامی۔ بھائی ہم سے اس وقت کچھ نہ پوچھو، کس ابھاگے کے ہوش و حواس ٹھکانے ہیں!

ترلوکی۔اجی یہ گیت ہی ایسا ہے کہ پتھر ہو تو وہ بھی پگھل جائے، ہماری تمھاری کیا بات ہے؟

سوامی۔ استاد، میرا تو دم نکلا چاہتا ہے۔ بُری گت ہورہی ہے۔

ترلوکی۔ (چھوکری کی طرف مخاطب ہوکر) کہو بی جان ہمارے سوامی جی کا تو اب دم ٹوٹا چاہتا ہے۔

چھوکری۔ (ایک خاص انداز سے مسکراکر) بھلا میرا وار بھی کبھی خالی جاتا ہے۔

ترلوکی۔ اچھا اچھا اس وقت گھاؤ پر نمک چھڑک لو! زندہ ہیں تو ہم بھی دیکھ لیں گے۔

چھوکری۔ ذرا منہ تو دیکھوں؟ بس اسی پر سمجھ لینے کا دعوا ہے؟ یہ کہہ کر اس روپ متی نے پھر سُر بھرا۔

ساس نند موہے برہی ماریں

ارے ساس نند موہے برہی ماریں

بھلا کا پیّیں موکے جلائی

رنگیلے بلم کاہے کرو چترائی

ترلوکی۔ واہ واہ کیا بات ہے۔

چھوکری۔ (رومال سے چہرے کا پسینہ پونچھ کر)۔ کہیے بابا جی آج کیا کنجوسی پر کمر باندھی ہے؟ کیا کچھ پرساد وغیرہ نہ پلوائیے گا؟

ترلوکی۔ ہائے جان صاحب، تمھارے لیے تو جان تک حاضر ہے۔

یہ کہہ کر بابا جی اُٹھے ایک الماری کا تالا کھولا جس میں ہر طرح کی شرابوں کی بہت سی بوتلیں بڑے قرینے سے چُنی رکھی تھیں۔ کئی بوتلیں نکالیں، نمکین، چٹپٹی چیزوں کا بھی انتظام کیا گیا۔

سوامی۔ شراب پینے کا مزا تو جبھی ملتا ہے جب کوئی مہندی رچا ہاتھ گلاس بھر کر دے اور یار لوگ آنکھ موند کر سب کا سب ایک ہی دم چٹ کر جائیں۔ کیوں جان صاحب؟ ذرا ادھر دیکھو ہماری خاطر سے اتنا ہی کرو۔

چھوکری۔ (انگوٹھا دکھاکر) میری بلا جاتی ہے! اللہ کی شان، میں ڈھالوں اور پیں! ایسی خاطرداری کو دور ہی سے سلام ہے۔

ترلوکی۔ ہم لوگوں کا دل نہ توڑا کرو جان صاحب! ہم لوگ چوٹ کھائے ہوئے ہیں!

غرض کہ بڑے ناز و نخرے کے بعد اس کم سِن نے شراب انڈیلی اور یار لوگ دنیا اور آخرت کو بھول کر گلاس پر گلاس چڑھانے لگے۔

ترلوکی۔ بھائی ایشور جانتا ہے، ایسی خوشی حاصل ہوئی کہ جیسے سورگ کا دوار کھُل گیا!

چھوکری۔ جی ہاں ضرور، بہشت کا دروازہ آپ جیسے پیکڑوں کے واسطے ہی تو کھُلے گا!

سوامی جی۔ جان صاحب ہم کو سورگ، نرک لے کر چاٹنا تھوڑے ہی ہے تم جس دن ہماری بغل گرم کرتی ہو اس دن ہم سمجھتے ہیں کہ سورگ کا دروازہ کھُل گیا۔

چھوکری۔ اب آپ بہت بڑھ چلے ہیں۔ وہ ہی مثل ہوئی کہ منہ لگائی ڈومنی ناچے تال بیتال! میں طرح دیتی جاتی ہوں اور آپ بولی کسے جاتے ہیں۔ واللہ اب تمھاری شامت آیا ہی چاہتی ہے۔

سوامی۔ اس وقت میرا دماغ ساتویں آسمان پر ہے۔

ترلوکی۔ اور میرا دماغ رساتل میں ہے۔

سوامی۔ میرا دماغ ساتویں آسمان پر اس وجہ سے ہے کہ آج بی جان نے مجھ پر کرم کیا اور مجھ کو چومنے کی اجازت دے دی۔

ترلوکی۔ اور میرا دماغ رساتل میں اس وجہ سے ہے کہ آج بی جان نے انکار کرکے دل توڑ دیا۔

چھوکری۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم لوگوں کی کھوپڑی کھجلا رہی ہے لاؤ تو ذرا سہلا دوں۔

ترلوکی۔ کھوپڑی سہلاؤ، چپتیں جماؤ، مگر آج دن نہ ٹلے۔ مراد ضرور پوری کرو۔

ابھی بے چارے کے منہ سے پوری بات بھی نہ نکلنے پائی تھی کہ اس شوخ لڑکی نے اُٹھ کر تڑاخے کی ٹیپ جڑی کہ تمام کمرا گونج اُٹھا اور وہ جڑاؤ ٹوپی ایک طرف کو گر پڑی۔

چھوکری۔ اور لوگے بچّہ اور لوگے! چلے تھے مجھ سے ٹھٹھولی کرنے! (قہقہہ لگاتی ہے)۔

ترلوکی۔ میری جان، اگر تم قتل بھی کر ڈالو تو اُف نہ کریں۔ یہ کھوپڑیاں ایسے کتنے پٹاخے کھایا کرتی ہیں مگر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا۔ کچھ کانچ کی تو بنی نہیں ہیں کہ ٹوٹ جائیں گی، ہاں شاید تمھارے نازک ہاتھ کو کچھ ٹھیس لگی ہو۔

راوی۔ کیا کہنے ہیں، جس ہاتھ کی ٹوپی سے تمام کمرا گونج اٹھے، اسے نازک کہنا آپ ہی کا حصّہ ہے!

غرض کہ بڑی دیر تک آپس میں نوک جھونک ہوتی رہی۔ آخرکار شراب نے سب کے ہوش و حواس کو مار بھگایا اور ان بے وقوف پینے والوں کو خوب تگنی کا ناچ نچایا۔ جب سرور ذرا زیادہ ہوا تو سوامی جی نے اس حسینہ کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنی گود میں کھینچا۔ ترلوک ناتھ بھی چپکے سے بڑھ آئے۔ کم سن چھوکری نے "چھوڑ دے چھوڑ دے ترے پیاں پڑوں" "چھوڑ دے چھوڑ دے ترے پیاں پڑوں، چھوڑ دے" کہہ کر سوامی جی کو نازک نازک ہاتھوں سے چپتیانا شروع کیا۔

راوی۔ اب تو آپ کو ہاتھ کی نزاکت کا حال ضرور ہی معلوم ہوگیا ہوگا۔

سوامی جی بے شمار چپتیں کھاتے کھاتے چپرگٹو بن گئے لیکن اسی خیال سے کہ کہیں میرا کھسیاناپن ظاہر نہ ہوجائے اور یہ لوگ آڑے ہاتھوں نہ لینے لگیں،

بے چارے خاموش ہوکر سب کچھ سہتے جاتے تھے۔ چھوکری (ایک اور جماکر)۔
دیکھو، چھوڑ دو نہیں تو ٹھیک نہیں ہوگا۔ (دھیرے سے) کیوں جامے سے باہر ہوئے
جاتے ہو؟ جلدی کے مارے مرے جاتے ہو! پہلے ان سماجیوں کو تو دور کرو۔ اس
طرح ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمائی جاتی۔

ترلوکی۔ (سماجیوں سے) تم لوگ بڑے بدتمیز ہو جی، اڑے بیٹھے ہو، کیا گردنیا کھاؤ گے؟

بوڑھا سماجی۔ بسم اللہ حضور، خوشی سے شوق فرمائیں، بندہ آڑے نہ آئے گا۔ مگر غلام کو خبر
ہوتی کہ میرے سبب سے حضور کے عیش میں رکاوٹ ہو رہی ہے تو میں کبھی کا چلا
گیا ہوتا۔ حضور ہی کے قدموں کی برکت سے بڑے بڑے رئیسوں کے درباروں
اور محفلوں میں حاضر ہوتا ہوں اور جو جوہر خداوند کریم نے اس ناچیز کو عطا فرمایا
ہے اسی سے حضور کی طبیعت بہلاتا ہوں۔ حضور بندہ پرور اتنی عمر غلام کی بڑے
بڑے امیروں اور شریفوں کے قدموں تلے بسر ہوئی ہے، مگر جو امیرانہ انداز اور
شریفانہ طرز و طریقہ حضور کے دربار میں دکھائی پڑتا ہے شاید اور کسی کو میسر بھی
نہ ہو۔ اور ہو کیوں کر، آپ پوتڑوں کے رئیس ہیں حضور ......

ترلوکی۔ سوامی، ذرا اس مردود کے ایک چنکٹ رسید تو کرنا۔ بے ہودہ فضول بک بک کرکے
مغز چاٹ گیا۔ کسی طرح جاتا ہی نہیں۔ نکال باہر کرو مردود کو۔

سماجی۔ ذرا حضور ملاحظہ ہوں اس غلام درم ناخریدہ کی چند نصیحتیں غور سے ......

ترلوکی۔ چپ رہ الّو کا پٹھا، آیا ہے وہاں سے بقرات بن کے! وہی گنوارو مثل ہے کہ
''بھونڈوں بھاؤ نہ جانے اپنے تین پسر سے کام''۔ کیا زندگی بھر بھاڑ جھونکتے رہے یا
گھاس کاٹتے رہے۔ بال سفید ہوگئے مگر موقع محل کی تمیز نہ آئی۔

سماجی۔ حضور کی یہ سخت باتیں ناچیز کو بہت میٹھی معلوم ہوتی ہیں۔ آخرکار تو حضور کے
نمک پر پلا ہوا غلام ٹھہرا۔ اگر اس ناچیز سے کوئی ایسی بات ہوگئی ہو جو آپ کی
طبیعت کے خلاف ہو تو ہاتھ جوڑکر منت کرتا ہوں کہ اسے آپ اپنے دل سے نکال
ڈالیے۔

ترلوکی۔ (جھلاکر) بھئی، اس بے ایمان کی جھکجھک نے تو مغز پریشان کردیا۔ نہ معلوم کہاں کی
باتیں پیٹ میں بھری ہیں۔ ارے میاں شیخ جی، آپ اس وقت ہیں کہاں، یہ کوئی نیا

دربار تھوڑے ہی ہے جو آپ اس قدر بحث و مباحثہ کر رہے ہیں۔ ہوش میں آیئے۔

سماجی۔ حضور بندے کی ایک گزارش سُننے کی تکلیف کیجیے۔ ایک دفعہ اس ناچیز کو نواب صاحب بہادر کی محفلِ عرش منزل میں حاضر ہونے کا موقع ملا۔ نواب صاحب بڑے ہی دریا دل، خوش مذاق اور ہنس مکھ طبیعت کے تھے جیسے ہی ناچیز نے محفل میں قدم رکھا، انھوں نے فرمایا۔ اخاہ، قبلہ ادھر تشریف لایئے۔ واللہ آنکھیں آپ کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اس ناچیز نے فوراً کہا۔ حضور قبلہ بھی کہیں نظروں سے اوجھل ہوتا ہے۔ جب دیکھیے نظروں کے سامنے بس جناب، محفل کے تمام لوگ ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ گئے، وہ وہ فرمائشی قہقہے پڑے کہ کمرہ ہل گیا۔ حضور غور فرمائیں کہ خادم سے ایک حضرت نے پوچھا کہ کیوں صاحب یہ جو ہنستے وقت لوگ زور سے قہقہہ مارا کرتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ فدوی نے چھوٹتے ہی کہا۔ ہنسیے قبلہ، آدمیوں کے دل میں ہر وقت کسی نہ کسی قسم کا ملال رہتا ہے اور چونکہ خوشی و رنج فطرتاً ایک دوسرے کے اُلٹے ہیں اس لیے جب خوشی کا دور ہوتا ہے تو وہ پہلے آتی ہے، ڈانٹ بتلاتی ہے تاکہ رنج فوراً ڈر کر بھاگ جائے۔ اس لطیفے پر لوگ یہاں تک ہنسے کہ پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔

ابھی میاں صاحب کا تقریر کا سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا اور قریب تھا کہ وہ کوئی نیا شگوفہ کھلائیں مگر سوامی جی نے دھکّے دے کر نکال باہر کیا۔ شیخ جی نکال باہر کیے گئے تو ان کے ساتھیوں نے بھی راستہ لیا۔ ایرے غیرے جتنے تھے سب کو دھتکار بتائی گئی اور اب اس محفل میں سوامی، مہنت اور کم سِن چھوکری کے علاوہ کوئی نہیں رہا۔ اس طرح جب تنہائی میسر آگئی تو آپس میں محبت اور لگاوٹ کی گپ چپ باتیں ہونے لگیں۔

ترلوکی۔ جانی، اب آج تو وعدہ پورا کرو۔ آجاؤ کلیجے میں بٹھا لوں۔

سوامی۔ جانی، ہاتھ جوڑتا ہوں، آج خوشی سے ایک چُمّا دے دو۔

ترلوکی۔ دیکھیں پہلے کس خوش نصیب کی قسمت جاگتی ہے۔

چھوکری۔ اجی الگ ہٹ کر بیٹھو، چلے ہو ٹھنڈی گرمیاں جتانے۔ نہ معلوم اس مردود کو اتنی

بات بنانا کس نے سکھا دیا۔

ترلوکی۔ میری جان، ہم تو تمھارے عاشق ہیں، ہم بات بنانا کیا جانیں۔

ترلوکی۔ میری جان، قسمیہ کہتا ہوں کہ نہ معلوم کتنے دنوں سے تمھاری پیاری صورت پر فدا ہوں مگر تمھارا دل ایسا سخت ہے کہ ابھی تک نہ پسیجا۔ ہم تو تمھارے اوپر جان دیں اور تم ہم سے یوں بھاگی بھاگی پھرو! کیوں، یہی انصاف ہے؟

سوامی۔ استاد، ایشور نے ان حسینوں کی مٹی میں بے چارے ٹوٹے ہوئے دل کے مردوں کو جلانے کا کچھ مادہ اکٹھا کر رکھا ہے۔ چاہے کوئی غرض ہو یا نہ ہو مگر ان کو اس کام میں ایسا مزا آتا ہے کہ جب دیکھو اسی ٹوہ میں رہتے ہیں۔ ہم تو ان کے بے داموں غلام بننے کو تیار ہیں اور ان کی بھی ضد ہے کہ ہم اپنی بات بنائیں گے۔

چھوکری۔ (حسرت بھرے لہجے میں)۔ اجی، یہ سب خالی پیلی باتیں ہیں۔ اس زبانی فلسفے سے کام نہیں چلتا۔ میں ایسی ننھی بھی نہیں ہوں کہ اپنے فائدے کی بات نہ سمجھوں۔ گو ابھی پندرھویں سال میں ہوں مگر تم لوگوں کی بے وفائیاں خوب دیکھ چکی۔ تم لوگوں کی تو یہی حالت ہے کہ منہ پڑی خالہ نانی اور پیٹھ پیچھے دشمن جانی۔ منہ میں اور دل میں اور۔ منہ سے تو وہ وہ باتیں کروگے کہ زمین اور آسمان سے قلابے ملا دوگے اور دل میں چھری چھپائے رہوگے۔ تم لوگوں کے ہتھکنڈے خدا کی پناہ، خدا بچائے ان سے۔

ترلوکی۔ (جوش میں گود میں کھینچ کر)۔ میری جان، قسمیہ کہتا ہوں کہ میں تمھاری صورت پر مرتا ہوں۔ میں وہ مرد نہیں ہوں کہ دغا فریب کروں، ایک بے چاری عورت کو دھوکا دوں۔ تم آزما لو، ہر آزمائش میں ہم کو کھرا پاؤ گی۔

چھوکری۔ اجی ایسی ہی اونچی اونچی باتیں تو سبھی کرتے ہیں مگر قلعی تو بعد کو کھل جاتی ہے نا؟ پہلے تو ایسی ایسی من بھائی باتیں کروگے کہ جیسے کچھ تین پانچ چھکا پنجا نہیں جانتے مگر بعد کو وہ وہ چالیں چلوگے کہ توبہ ہی بھلی۔ تم لوگوں کی میٹھی باتوں پر لٹو ہونا من کی مٹھائی کھانا ہے۔

سوامی۔ میری جان، ہم ایسے الفاظ کہاں سے لائیں جو ہماری سچی باتوں کو تمھارے دل پر جمادیں۔ جنیؤ کی قسم کھاکر کہتا ہوں کہ ہم لوگوں کی بات میں رتی بھر بھی نمک

مرچ نہیں ہے (کچھ سوچ کر) میری ایک بات مانو تو کہوں مگر تم کاہے کو ماننے لگیں!

چھوکری۔ کیا کہتے ہو، کہو، ماننے کے قابل ہو گی تو کیوں نہ مانوں گی۔

سوامی۔ ہمارے یہاں اس وقت سب طرح کے آرام کا سامان موجود ہے۔ علاقہ، نوکر چاکر، ہاتھی گھوڑے سبھی کچھ ہیں۔ تمھارے واسطے ایک خوب صورت مکان الگ کردیا جائے گا۔ ہر طرح کا ضروری سامان بھی اکٹھا کردیا جائے گا۔ دو ایک لونڈیاں بھی نوکر رکھ دی جائیں گی جو ہر طرح کا آرام دیں گی۔ ہم لوگ خود ہی تمھارے نوکروں جیسے رہیں گے۔ تمھاری خاطرداری میں کوئی بات اُٹھا نہ رکھی جائے گی۔ خوب غور سے سوچو۔

یہ کہہ کر سوامی جی نے چاہا کہ لپک کر اس کے لال لال ہونٹوں کو چوم لوں، مگر اس نے منہ ہٹا لیا۔

چھوکری۔ بھئی، تمھارا اعتبار نہیں۔ آج تو میں یہاں آکر رہنا سہنا شروع کروں، کل کو کوئی مصیبت آپڑے اور میں یہاں سے الگ ہونے پر مجبور کی جاؤں تو ناحق مفت کی شرمندگی ہو۔ رشتے برادری کی عورتوں کو طعنہ مارنے کا موقع ہاتھ آجائے کہ بھری ہوئی نعمت کو لات مار کر وہاں گئی تھی، آخرکار ذلیل ہوکر نکال دی گئی۔

ترلوکی۔ اب تمھارے اس شک و شبہ کا کیا علاج ہے؟

چھوکری۔ بھائی سنو، دودھ کا جلا چھاج کو بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ میں ایک دفعہ یہ پاپڑ بیل چکی ہوں۔ تب سے میں نے کان پکڑے کہ اب بنا سوچے سمجھے ہرگز ہرگز ایسے پیچیدہ معاملوں میں جان نہ پھساؤں گی۔ ابھی کچھ ہی روز بیتے ہیں، میری ایک منہ بولی بہن ہوتی ہے اس سے اور ایک تعلقہ دار سے کچھ سانٹ گانٹھ ہوگئی۔ بابو صاحب نے ایسی ایسی چکنی چپڑی باتیں کیں کہ وہ بے چاری کمسنی کی ماری پھول اُٹھی اور بوریا بدھنا لے کر ان کے یہاں جا دھمکی۔ کچھ دنوں تک تو ایسا نقشہ جما رہا کہ کیا بتلاؤں۔ ہم لوگ سمجھنے لگے تھے کہ بے چاری کی زندگی اب بنا جھنجھٹ کے کٹ جائے گی۔ مگر تھوڑے دنوں میں تمام امیدیں ہوا ہو گئیں۔ پہلے تو دو تین بار پیٹ گرایا گیا، آخرکار بابو نے اُسے نکال دیا۔ بے چاری کی وہ مثل ہوئی۔ نہ خدا

ہی ملا نہ وصالِ صنم، نہ ادھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے۔ وہاں سے نکلنے کے بعد اس نے کیسی کیسی پریشانیاں اور مصیبتیں جھیلیں ہیں کہ ان کو یاد کرکے میرے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ کون کون سا دُکھ نہیں بھوگی بے چاری، جیل خانے وہ گئی، گھر اس کا قرق ہوا، زہر بھی بے چاری کو دیا گیا، مگر زندگی مضبوط تھی بچ گئی اور سب پر طرہ یہ کہ یہ سب بابو صاحب ہی کی بدولت ہوا۔

سوامی۔ سب مرد ایک ہی کینڈے کے تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔ وہ بے وفا تھا، بے وفائی کرگیا ہم کو تو ایسے آدمیوں کی صورت سے ہی نفرت ہے۔

چھوکری۔ اس کا تو خود ہی امتحان ہوجائے گا۔

ترلوکی۔ میری جان، اب اس بات کا فیصلہ سوچ کر کل کر لینا۔ اس وقت مزا کرکرا ہورہا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے گلاس پر گلاس چڑھانا شروع کردیا۔ اس کے ساتھیوں نے بھی اس کا اتباع کیا۔ تھوڑے ہی دیر میں وہ سب نشے میں چور ہوگئے۔

(چھوکری ترلوکی ناتھ کے کان میں کچھ کہہ کر مسکراتی ہے)

سوامی۔ کیوں یار جی، دن دہاڑے میری نظروں میں خاک ڈالی جاتی ہے! اکیلے ہی اکیلے مزا لوگے!

ترلوکی۔ تم کیوں جلتے ہو؟ کیا اس میں بھی کچھ ساجھا ہے تمھارا۔

یہ کہہ کر مہنت جی نے اس پری کو گود میں بٹھا لیا اور تابڑ توڑ کئی بوسے لیے۔

سوامی۔ یار، اب تم بڑا ظلم کررہے ہو۔ ہمارا حصّہ تو ضرور ہونا چاہیے۔ یہ بے انصافی اب نہیں دیکھی جاتی۔

ترلوکی۔ اجی پرے ہٹو، کس کھیت کی مولی ہو تم! ہوں، بڑے دھنا سیٹھ بن کر آئے ہو وہاں سے، ان کا بھی حصّہ ہو!

سوامی۔ اب تم پٹے میرے ہاتھ سے، آگئی شامت تمھاری۔

ترلوکی۔ تم اب بہت بڑھے جارہے ہو۔ زبان کو لگام دو، نہیں تو ابھی کھینچ کر باہر نکال دوں گا۔ یہ بات سن کر سوامی جی کچھ ناراض ہوگئے۔ اسی بیچ اس ظالم چھوکری نے ان پر فقرہ چست کیا اور ترلوکی نے بڑے زور سے قہقہہ لگایا۔ سوامی جی بے چارے

خوب جھینپ گئے۔ جھینپ مٹانے کی غرض سے انھوں نے مہنت کو ایک ہلکا سا تھپڑ رسید کیا اور اس معشوقہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا۔ ترلوکی کا مزاج تو شراب سے یوں ہی اُبل رہا تھا، اب جو طمانچہ پڑا تو کچھ جھینپ بھی معلوم ہوئی اور کچھ غصہ بھی آگیا۔ انھوں نے بڑھ کر سوامی کو ایک گھونسا رسید کیا۔ سوامی نے وہ لات جڑی کہ مہنت کو چھٹی کا دودھ یاد آگیا۔ مگر انھوں نے بھی ہمت کر کے کھڑاؤں لگانا شروع کی۔ غرض ان دونوں میں خوب گتھم گتھا ہوئی، خوب مارپیٹ ہوئی۔ سوامی جی ذرا ہٹے کٹے آدمی تھے، ان کی جیت ہوئی اور مہنت بے چارے گو کسی طرح کمزور یا مریل نہ تھے، مگر کاہل رہنے کی وجہ سے ان میں طاقت نہ رہ گئی تھی، خوب ہی پٹے۔ وہ تو پٹ کر نکل بھاگے، مگر یہاں سوامی جی کی سٹی پٹی گم ہوگئی۔ تمام نشہ ہرن ہوگیا، سوچا کہ اب خیرت نظر نہیں آتی۔ ترلوکی ناتھ اس وقت بپھرا ہوا ہے، اسی حالت میں جو کچھ نہ کرگزرے تھوڑا ہے۔ اگر میں یہاں رہوں گا تو ناحق کو ذلیل ہونا پڑے گا۔ اس وقت سمجھ داری اسی میں ہے کہ یہاں سے کھسک لوں۔ یہ سوچ کر سوامی جی رفو چکر ہوگئے اور ان کی معشوقہ بھی اُڑن چھو ہوگئی مگر ترلوکی کا غصہ محض گیدڑ بھبکی تھی۔ وہ باہر آئے تو شیو جی کی آرتی کا وقت آگیا تھا۔ آرتی وغیرہ کے بعد احاطے کا پھاٹک بند کر لیا گیا۔

(۲)

ہندو فرقے کے مذہبی رسم و رواج میں تینتیس کروڑ دیوتاؤں میں سے تین دیوتا تمام کائنات کے مالک بیان کیے گئے ہیں۔ شیو جی مہاراج اپنے شاندار جسم پر بھبھوت لگائے، سر پر جٹا بڑھائے، ہر دم اور ہر لمحہ بے وصف خدا سے لو لگائے رہتے ہیں۔ آپ کو ایشور سے کچھ ایسی محبت ہے کہ آٹھوں پہر اسی کی فکر میں اور دن رات اسی کی تعریف کے گیت گانے میں لگے رہتے ہیں۔ اسی کے نام پر بکے ہوئے ہیں اور معرفت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ جب دیکھیے اسی کی یاد میں مشغول ہیں، اپنے محبوب کے جلوؤں میں کھوئے ہوئے ہیں، علم کی شراب سے مست اور ویدانت کے نشے میں چور رہتے ہیں۔ آپ کے تارک الدنیا ہونے کا یہ حال ہے کہ دنیاوی کمال و ارتقاء کی طرف آنکھ اُٹھاکر نہیں دیکھتے،

باوجود اس کے سب کچھ جاننے والے خدا نے آپ کو خاص طور سے دو چھوڑ تین تین آنکھیں دی ہیں۔ آپ مادی چیزوں کو گھاس پھوس سے بھی کم سمجھتے ہیں۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو پل بھر کے سکھ چین کو چھوڑکر اپنی زندگی آخرت کو بنانے کے لیے وقف کرتے ہیں۔ مہاتما ہیں وہ لوگ جو حرص و ہوس کے پھندے میں نہ پھنس کر تارک الدنیا ہوجاتے ہیں۔ کیا خوب کہا ہے مہاراج بھرتری ہری جی نے: اے خردمندوں، تم سمجھتے ہو کہ بڑے بڑے راجاؤں کے پاس ہر طرح کی اچھی اچھی چیزیں ہوتی ہیں اور عیش و عشرت کے تمام سامان مہیا ہوتے ہیں اس لیے ان کی زندگی حسد کرنے کے قابل نہیں ہے۔ مگر میں کہتا ہوں حسن کو ترکِ دنیا کا مزا مل گیا ہے وہ تینوں عالموں کی حکومت کو بھی کچھ نہیں سمجھتے۔ بادشاہوں کے شاندار کمرے ایک سے ایک انوکھی اور نایاب چیزوں سے سجے ہوتے ہیں مگر دنیا کو چھوڑنے والوں کے لیے کسی پہاڑ کی گپھا ہی سجا ہوا کمرا ہے۔ بادشاہوں کے یہاں خوب صورت مسہریاں ہوتی ہیں جن پر نرم نرم تکیے لگے ہوتے ہیں اور ان سے کچھ دیر جسم کو آرام ملتا ہے مگر تارکِ دنیا کے لیے پتھر کی چٹان ہی فطرت کی مسہری ہے اور اپنا ہاتھ ہی جیتا جاگتا تکیہ ہے۔ بادشاہوں کے یہاں اچھے اچھے پنکھے لٹکے ہوتے ہیں اور موی فانوس روشن ہوتی ہے مگر ترکِ دنیا کرنے والوں کے لیے ٹھنڈی خوشبودار ہوا ہی فطری پنکھا ہے اور چاند ہی فطری دیپک ہے۔ بادشاہوں کے یہاں پلنگ پر کوئی نوجوان خوب صورت حسینہ موجود ہوتی ہے جو ان کی جنسی خواہش کو لمحہ بھر کے لیے تسکین پہنچانے کا ذریعہ ہے، مگر دنیا کو چھوڑنے والوں کے لیے ورکنیا ہی وہ حسینہ ہے، جس پر انھوں نے اپنا تن من دھن سب کچھ نچھاور کردیا ہے اور جو ان کے لیے دل و جان سے کوشاں ہوکر ایشور کے دیدار کی ترکیب بتاتی ہے۔ مہادیو جی مہاراج کا حواس پر قابو پانے کا ایک کم تر ثبوت یہ ہے کہ آپ نے کام دیو کو جلا کر خاک کردیا۔ آپ کا سر اس پاکیزہ بہاؤ کا منبع ہے جسے چشمۂ فیض کہا جائے تو صحیح ہے بلکہ چشمۂ کوثر سے تشبیہہ دی جائے تو بجا ہے۔ اس ندی سے ہندوستان کا ایک بڑا حصہ مستفیض ہوتا ہے۔ عوام کا یہ عقیدہ ہے کہ جو لوگ بھول کر بھی اس ندی میں ڈبکی لگاتے ہیں وہ تناسخ کے چکر سے آزاد ہوکر جنت کے مزے اُٹھاتے ہیں اور جو لوگ اس بخشش سے مستفیض ہونے کے لیے منزلیں طے کرکے آتے ہیں، وہ تو دیوتاؤں کے لیے بھی پوجا کے قابل ہوتے ہیں۔ اِندر، کُبیر، نارد، اور دوسرے

اعتقادی دیوتاؤں کو بھی ان کے عظیم قدموں پر سر جھکانے کی تمنا ہوجاتی ہے۔ اور فرشتے ان کے قدموں تلے کی خاک سر اور آنکھوں پر چڑھاتے ہیں۔ اس ندی کی لہروں کا بہاؤ انسان کے گناہوں کو کاٹ کر پھینک دینے کی مشین ہے اور نیکی کے سمندر کے پار اُترنے کی نیا ہے۔ بیل کو، جو آپ کی سواری ہے سارے عالم کا رازق کہیں تو ٹھیک ہوگا۔ نسل انسانی کو جتنے فائدے اس جانور سے حاصل ہوتے ہیں، ممکن نہیں کہ اس کا مقابلہ کسی اور جانور سے ہوسکے۔ مانو سب کو روزی دینے والے خدا نے کائنات کو روزی پہنچانے کا تمام انتظام اسی کے ہاتھ میں دے رکھا ہے۔ شو راتری کا میلا آپ ہی کی یاد میں منعقد ہوتا ہے۔ اس دن سبھی کٹر یقین والے ہندو وَرت رکھتے ہیں اور شیو جی کی پوجا بڑی دھوم دھام سے کی جاتی ہے۔ آج وہ ہی متبرک دن ہے۔ اس وقت عورتوں کی ایک ٹولی چلی جارہی ہے۔ تمام عورتیں کپڑے لتّے سے لیس ہیں، ناک چوٹی سے درست، زیوروں سے گونڈنی کی طرح لدی ہوئی، مارے زیوروں کے جسم پر تل رکھنے کی جگہ نہیں۔ آج وہ قیمتی جوڑے نکالے گئے ہیں جو دھراؤ کہلاتے ہیں اور شادی بیاہ کے وقت بڑے ٹھاٹ باٹ سے پہنے جاتے ہیں۔ ان میں ہرایک بے جوڑ ہے کوئی چھانٹنے کے قابل نہیں۔ کستوری میں بسی ہوئی چوٹیاں، جو نہانے کے بعد کندھوں پر بکھیر دی گئی ہیں، ان کے حُسن کو اور بھی بڑھاتی ہیں۔ ہر ایک عورت کے خوب صورت اور سڈول ہاتھوں میں ایک بہت اچھا پیتل کا کمنڈل لٹک رہا ہے جس میں پوجا کا سامان ہے۔ یہ وَرت کچھ ایسا مقبول ہے کہ بوڑھی تو بوڑھی، جوان اور کمسن عورتیں بھی بڑے سچے دل سے اس کو رکھتی ہیں تاکہ پاروتی، شیو جی کی پیاری بیوی، ان کے سچے کردار سے خوش ہوکر ان کے دل کے سب ارمان پورے کردیں۔
عام رواج کے مطابق یہ عورتیں بھی راستے کی تھکن کو آسان کرنے کی غرض سے ایک پھڑکانے والا گیت الاپتی ہوئی چلی جارہی ہیں۔

جھنجھرے گڑاؤ آ گنگا جل پانی
جھنجھرے گڑاؤ آ گنگا جل پانی
ارے پنیا منہ پہ دھرے موری بہیاں
مورا سیاں گھرے آے رتیاں ۔ مورا سیاں

چُن چُن کلیاں میں سیج بچھاؤ
سیج نہ سوے دھرے موری بہیاں
مورا سیاں گھرے آے رتیاں ۔ مورا سیاں
سونے کی تھاری میں جیونا پرو سیوں
ارے سونے کی تھاری میں جیونا پروسیوں
جیونا نہ جیویں دھرے موری بہیاں
مورا سیاں گھرے آے رتیاں۔ مورے سیاں
مورا سیاں گھرے آئے رتیاں

ایک نوجوان چنچل عورت آگے بڑھ کر اپنی سہیلی سے پوچھنے لگی۔ کیوں دیدی، تم نے کیا مراد مانگی ہے؟ وہ عورت (نوجوان، خوب صورت، گوری چٹی، سینا ابھرا ہوا، عمر قریب بیس سال)۔ مجھ کو وَر اچھا ملے گا۔

پہلی عورت۔ کیا اتنے دنوں میں ایک سے دل بھر گیا جو دوسرا کرنے پر تلی ہوئی ہو؟

وہی عورت۔ کیا کہوں میرا آدمی مجھ کو مانتا ہی نہیں۔

پہلی عورت۔ میں تمھارے بوڑھے کو پاؤں تو چھاتی سے لگا لوں۔ کیسی پیاری پیاری صورت پائی ہے، میرا دل مسوس کر رہ جاتا ہے۔

دوسری عورت۔ آؤ پھر اَدلا بدلی ہوجائے!

پہلی۔ نا بہن، میرا آدمی بے چارا میری سی بیوی کہاں پائے گا! چراغ لے کر ڈھونڈے گا جب بھی بے چارے کو مجھ سے بیوی نہ ملے گی۔

دوسری۔ اخاہ، اب آپ کو بھی حسین ہونے کا دعوا ہے۔ وہی مثل ہے صورت نہ شکل چولہے سے نکل۔ کچی کچی آنکھیں لے کر چلی ہو وہاں سے دون کی لینے! ذرا جاکر آئینے میں منہ تو دیکھو!

ایک تیسری عورت۔(ادھیڑ، بھدلیس، موٹی)، تم چھوکریوں سے آج برس برس کے دن بھی چپ نہیں رہا جاتا۔

پہلی۔ آپ اپنی نصیحت طے کر رکھیے۔ برس برس کا دن ہے، آج بھی آپس میں نہ ہنسے بولیں۔ آخر روز تو منہ میں چابھی دے کر بیٹھنا ہی ہے۔ جس کو آج کا دن دیکھنا

نصیب ہوگا، وہی پھر ادھر سے اس مندر تک آئے گا۔

یہ چنچل جوان عورتیں آپس میں ہنستی بولتی، دل لگی، مذاق کرتی چلی جا رہی تھیں۔ آپس میں چھیڑ چھاڑ بھی ہوتی تھی، بولی ٹھولی بھی ماری جاتی تھی، سخت باتیں بھی کہہ جاتی تھیں، طعنے تشنے کی بھی نوبت آجاتی تھی، پھر ملاف ہوجاتا ہے۔ اسی بیچ ایک بڈھے حضرت ملے۔ ان کی چال ڈھال ان تیکھے بڈھوں کی سی تھی جو آج کل لکھنؤ میں خاک چھانتے پھرتے ہیں، یا ان محمد شاہی نوجوان عاشق مزاجوں کی سی جو گلیوں میں نظریں لڑایا کرتے تھے۔ سفید داڑھی لہریں مارتی ہوئی۔ ایک قُبا نما ٹوپی سر پر، کامدانی کا انگرکھا بدن پر۔ آپ نے جوان پریوں کو دیکھا تو آنکھوں میں دیدار کا شوق پیدا ہوا اور منہ میں پانی بھر آیا۔ آپ قدم بڑھاکر ان سب کے برابر ہوگئے اور ایک بہت ہی چنچل عورت کی طرف گھور کر فرمانے لگے۔

مرد۔ کیوں شریف زادیوں، ذرا مجھے بھی بتلانا آج کون سا میلا ہے جو تم لوگ بَن سنور کر چلی جا رہی ہو؟

عورت۔ (مسکراکر) آج تو شیو راتری کا میلا ہے، ہم لوگ مندر کو جارہے ہیں۔

اب ان حضرت نے جو دیکھا کہ دس بارہ پری زاد عورتیں آنکھیں اُٹھاکر میری طرف دیکھنے لگیں تو آپ کو یہ خیال گذرا کہ یہ سب میری صورت پر لٹو ہوگئیں۔ جیوں ہی آپ کے دل میں یہ خبط سمایا آپ نے فوراً ٹوپی ٹیڑھی کری، کمر کو، جو مُٹاپے کے بوجھ سے جھک گئی تھی، بڑی کوشش سے سیدھا کیا۔ اس طرح دل چُرانے والی چیزوں سے لیس ہوکر آپ نے ان پری زادیوں پر رحم کی نظر ڈالی کہ جیسے آپ کی آنکھیں کہہ رہی ہوں کہ گو تم نے بنا سوچے سمجھے دل دیا ہے مگر میں تمھاری محبت کی قدر کروں گا۔

اب کی دفعہ ایک ادھیڑ عورت نے بولی کسی۔ کیوں میاں، کیا یہاں اپنی ننّھیوں کو گھورتے ہو؟ اس سوال نے میر صاحب کی اَکی بکی بھلادی، بے چارے بے حد شرمائے اور اس فکر میں کوئی موقع کا منہ توڑ جواب دوں، اِدھر اُدھر تاکنا شروع کیا۔ ان سب نے انھیں جو بغلیں جھانکتے دیکھا تو اور بھی دو چار تھپکیاں جمائیں اور قہقہے پر قہقہے پڑنے لگے۔ میر صاحب بے چارے مذاق کا نشانہ بن گئے اور اس

ٹھٹھولی سے کچھ شرمسار ہوئے کہ کچھ بس نہ چلا، رفوچکر ہوگئے۔ گو یہ حضرت ضلع گوئی میں طاق، جگت بازی میں شہرۂ آفاق تھے، ہزاروں ہی مطلب بھری پھبتیاں کہہ ڈالیں تھیں اور اپنی منڈلی میں ہنسی مذاق کے استاد مانے جاتے تھے، مگر ان بے چارے نے کبھی شریر، کمسن چھوکریوں سے مات نہیں کھائی تھی۔ بڑے بڑے چالباز یاروں کے مقابلے میں پالا مارا تھا۔ مگر ایسی لڑکیوں سے، جن کا مذاق سے کوئی واسطہ نہیں، کبھی نیچا نہیں دیکھا تھا۔ آپ کو پچھتاوا ہوا کہ ہائے افسوس، زندگی بھر کی محنت اکارت گئی، اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ان کے مقابلے میں بھی ہار ہوگئی۔ میری وہ طبیعت ہی نہ رہی یا دماغ ہی پر پتھر پڑگئے کہ جواب نہ دے سکا اور جھینپ کر چلا آیا۔ یہ بھی سوچ رہے تھے کہ ایسے بھونڈے مذاق کا جواب تو اس فن کے پُرانے اور نئے استادوں میں سے ایک نے بھی نہیں دیا۔ لٰہذا اگر میں چوک گیا، تو کیا ہوا، اب پالا میرے ہاتھ ہے۔ قصّہ کوتاہ جب میر صاحب اس طرح ہار کھاکر اپنی راہ لگے تو یہاں کنبتیاں ہونے لگیں۔

پہلی۔ تم لوگوں نے اس کی داڑھی کو نہیں دیکھا، معلوم ہوتی تھی جیسے بندر کی دُم۔ موا تاڑ کی طرح تو بڑھتا چلا گیا ہے!

دوسری۔ اور موڑھی کاٹے کی ٹوپی تک میسر نہیں، سر پر ایک ہنڈیا سی اوندھائے ہوئے ہے۔

تیسری۔ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت مگر دم خم وہی ہے۔ ستّر برس کا ہوا بے چارا مگر ابھی جوان ہی بنا پھرتا ہے!

چوتھی۔ (اسی ادھیڑ، موٹی، بھدی عورت سے مسکراکر مذاقیہ کہنے لگی۔) کیوں مامی، یہ مردوا تمھارے جوڑ لائق اچھا تھا نا؟

وہی ادھیڑ۔ واہ رے تیری سمجھ، یہ تو میرے بابا سے بھی دوچار برس نکلتا ہوگا۔

اب یہ ٹولی خوشی خوشی مندر کے قریب پہنچ گئی۔ راستے میں کچھ آوارہ شہدوں سے بھی مٹھ بھیڑ ہوئی۔ ان سب نے بھی فقرے چست کیے۔ ادھر سے بھی جواب ترکی بہ ترکی دیا گیا۔ یہ نوجوان عورتیں مذاق پر کسی طرح بند نہ تھیں۔ ان کے اس روزانہ نہان اور پوجا نے ان کو ذرا نڈر اور چنچل بنا دیا تھا۔ شرم و حیا کا

آنکھوں میں نام نہیں۔ کھلے بندوں سڑک پر بلند لہجے اور اُونچے سُروں میں گاتی ہوئی آخر کار مندر کے احاطے میں داخل ہوئیں۔

آج یہاں پر بڑی زبردست بھیڑ دیکھنے میں آئی۔ ہزاروں ہی آدمی شیو جی کی پوجا کو آئے ہوئے تھے۔ عجب بھیڑیا گھسان لوگ تھے۔ ہرایک اسی دُھن میں تھا کہ پہلے میں جاکر پُن لوٹ لوں۔ جو عورتیں کرموں کی ماری آئی ہوئی تھیں ان کی وہ وہ گت ہوتی تھی کہ پریشان ہو ہوجاتی تھیں۔ وہ دھکم دھکا تھا کہ خدا کی پناہ۔ وہ ریلم ریلا تھا کہ معاذ اللہ۔ جو بے چارے ذرا کمزور تھے، وہ بے دم ہوکر ہانپ رہے تھے تو بھلا عورتیں کس گنتی میں تھیں۔ جن صاحبان نے ذرا ہمت کرکے خاص حد سے آگے قدم بڑھایا انھیں وہ دھکّا پڑا کہ چھٹی کا دودھ یاد آگیا۔ لاچار بے چاریاں ایک کونے میں کھڑی تھیں کہ ذرا بھیڑ چھٹے تو داخل ہوں مگر عورتیں، جن کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں، ایک خاص راستے سے مندر میں داخل ہوگئیں۔ وہاں رسم کے مطابق پوجا کرکے وہ جب باہر نکلیں تو ایک پجاری (یشودانند) نے مسکراکر کہا۔

آج رام کلی کا پتہ نہیں ہے۔ بے چارے بابا جی بیٹھے راہ دیکھتے ہیں۔

رام کلی۔ (ایک انوکھی ادا سے آنچل ہٹاکر)۔ تیری آنکھوں میں تو چھاگئی ہے چربی، موا دیکھ دیکھ اندھا بنتا ہے۔ نِچ دیکھ رہا ہے کہ سامنے کھڑی ہوں مگر بکوری لگائے جاتا ہے! اور یہ تو دیکھو، کہتا ہے بابا جی راہ دیکھ رہے ہیں۔ کون بابا رے بتلا ذرا، بے حیا نہیں تو!

یشودانند۔ بس کرو مہارانی، بس کرو، زیادہ غصہ مت ہو۔ جاؤ مہنت جی کو کچھ دکشنا دینا ہوتو، دے آؤ۔

رام کلی ناز و انداز سے اٹھلاتی پھونک پھونک کر قدم دھرتی مہنت کے کمرے کی طرف چلی۔

یشودانند۔ آج تو رام کلی نے وہ سنگھار کیا ہے کہ شیو جی بے چارے فریفتہ ہوگئے۔

رام کلی۔ معلوم ہوتاہے کہ تم لوگوں کی شامت آگئی ہے۔

یشودانند۔ شامت نہ آئی ہوتی تو تم یوں بچ کر نکل جاتی۔

غرض جب آدمیوں کے دلوں کو لوٹتی اور پازیب کی چھما چھم سے بلا کا شور

کرتی ہوئی رام کلی بابا جی کے کمرے میں داخل ہوئی، اس وقت بابا جی آئینہ سامنے
رکھے چھیلا بنے بیٹھے تھے۔ اس کو جو دیکھا تو مارے خوشی کے اُچھل پڑے۔

مہنت۔ اب تو تمھارے درشن کو آنکھیں ترسا کرتی ہیں۔ گولر کا پھول ہو جاتی ہو!

رام کلی۔ کیا کہوں، میں تو تم سے بھی زیادہ بے چین رہتی ہوں۔

مہنت۔ تو پھر آئی کیوں نہیں؟

رام کلی۔ آج کل ہمارے یہاں کچھ ضروری کام کاج پڑ گیا، نہیں تو بھلا میں کب رُکنے والی
تھی۔

مہنت۔ بہانہ کرنا کوئی تم سے سیکھے لے۔

رام کلی۔ اور بہانہ بھی کروں گی تم سے!

مہنت۔ اجی جاؤ ایسی بہت سی باتیں سُنے بیٹھا ہوں۔

رام کلی۔ جب تمھیں یقین ہی نہ آئے تو اس کا کیا علاج۔

مہنت۔ یقین کرنے کے قابل بات بھی تو ہو۔

رام کلی۔ نرے گوکھے ہی ہو، ارے اب کیا صاف صاف کہلوایا چاہتے ہو!

مہنت۔ (ہنس کر) اخاہ یہ بات تھی، اب سمجھ گیا۔ ہاں ٹھیک ہے، آج چھوتھے دن تمھاری
صورت دکھلائی پڑی ہے۔

یہ کہہ کر ترلوکی نے اس عورت کو مستی سے کھینچا اور جھک کر تابڑ توڑ کئی
بوسے لیے۔

رام کلی۔ ہٹاؤ منہ، نہ معلوم کیسی بو آتی ہے! تم بڑے وہ ہو! آج بھی نہ چھوڑتے بنی۔

مہنت۔ کیا کریں جانی، تمھاری فرقت میں اسی کے سہارے جیتے ہیں۔ غم بھی غلط ہو جاتا اور
کچھ نشہ بھی جم جاتا ہے۔

رام کلی۔ اس کی بو بڑی خراب ہوتی ہے۔

مہنت۔ جو لوگ نہیں پیتے، ان کے لیے بیسوں حیلے ہوتے ہیں۔ مگر جہاں ایک دفع منہ لگی
گئی تو پھر چھوٹنا جانتی ہی نہیں۔

رام کلی۔ بھلا شریف عورتیں تو کاہے کو پیتی ہوں گی؟

مہنت۔ بڑے بڑے گھرانے کی سب عورتیں لڈھاتی ہیں۔ آج کل یہ بھی شرافت اور فیشن

میں داخل ہو گیا ہے۔

رام کلی۔ جو میں پی لوں تو کیسا ہو؟

مہنت۔ پھر تو مزا آجائے۔ میں نے تم سے کچھ نہیں تو ہزاروں ہی دفعہ کہا ہوگا مگر تم نے کبھی اپنی نہیں چھوڑی۔ آج جاکر دیوتا سیدھے ہوئے ہیں۔

رام کلی۔ پینے کو تو پی لوں مگر منہ سے بدبو آئے گی اور سر گھومے گا۔

مہنت۔ بدبو دیسی شراب میں ہوتی ہے اور وہی کسی قدر کڑوی بھی ہوتی ہے۔ میں تم کو ولایتی شراب پلاؤں گا۔ پہلے تو تم اس کی خوشبو ہی سے مست ہو جاؤ گی اور پینے پر تو آنکھیں کھل جائیں گی۔ ایشور جانتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے بیکنٹھ میں بیٹھے ہیں۔

غرض کہ انگریزی شراب کو اور بھی دو چار تعریفوں سے یاد کرنے کے بعد بابا جی نے رام کلی کو ایک گلاس عمدہ شراب کا بھر کر دیا۔ پہلے تو رام کلی نے کچھ منہ سکوڑا، کچھ ہچکچائی مگر ترلوکی کے اس جملے نے "کیا سوچتی ہو آنکھیں موند کر پی جاؤ" اس کی ہمت بڑھائی اور وہ سب کا سب غٹ غٹ کر گئی۔ وہ شراب مزے دار تھی، اس وجہ سے اس نے گلاس پر گلاس چڑھانا شروع کیا اور اگر ترلوکی ناتھ منع نہ کرتے تو وہ قیامت تک بس نہ کرتی۔ جب سرور گٹھا اور مزے میں آئی تو اس نے مہنت کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور گھل گھل کر باتیں کرنے لگی۔

رام کلی۔ تم یہ بھیس کیوں بنائے رہتے ہو؟ آؤ ہم تم کہیں نکل جائیں، بے روک ٹوک مزا اُڑائیں!

مہنت۔ مزا کہاں سے اُڑائیں گے، کوڑی کوڑی کو تو محتاج ہو جائیں گے۔ اس وقت بیس ہزار سالانہ کی آمدنی ہے، اس پر بھی تو خرچ کو کافی نہیں ہوتا، جب ٹکے کی بھی آمدنی ہی نہ ہوگی، تو کیسی میری گت ہوگی۔

رام کلی۔ وہ علاقہ نگوڑا کس دن کام آئے گا؟ اسے بیچ باچ کر ٹھکانے لگا دو اور آؤ کہیں کا راستہ پکڑیں۔

مہنت۔ کیا؟ نہیں، علاقے کو بیع کرنے کا اختیار ہی نہیں ہے جانی، نہیں تو بندہ کب چوکنے والا تھا، اور جو سچ پوچھو تو یہاں بھی چین ہے۔ دن بھر ایک سے ایک سجیلی عورتیں

گھورنے میں آتی ہیں۔ رات بھر ناچ رنگ کی محفل گرم رہتی ہے۔ کبھی کبھی تم بھی آکر گرم کردیتی ہو۔ ہروقت شراب کباب کا دور چلا کرتا ہے۔ یار دوستوں کا جم گھٹ رہا کرتا ہے۔ اتنے آرام کے ہوتے مجھے کیا بھنیسے نے کاٹا ہے کہ کتّے نے کاٹا ہے کہ اِدھر اُدھر مارا مارا پھروں۔

رام کلی۔ تو معلوم ہوگیا کہ تم کو مجھ سے ذرا بھی محبت نہیں ہے، بس جمع خرچ ہے!

مہنت۔ تم تو جانی، کبھی کبھی لڑکپن کی باتیں کرنے لگتی ہو۔

رام کلی۔ بس بس معاف کیجیے، میں اب تک دھوکے ہی دھوکے میں تھی۔

مہنت۔ ہوش میں آؤ پیاری، تمھارے بنا تو مجھے دن بھی اندھیرا معلوم ہوتا ہے اور تم اُلٹے گلے کرتی ہو!

رام کلی۔ تو پھر کیوں نہیں بھاگ چلتے؟

مہنت۔تو یہ خرچ کہاں سے آئے گا؟

رام کلی۔ خرچ آئے گا نہ سہی، ذرا آزادی کے ساتھ دو گال ہنسا بولنا تو نصیب ہوگا۔ یہاں تو چوروں کی طرح ہر دم جی دھڑکا کرتا ہے۔

مہنت۔ جانی، میں تمھارے آرام کے لیے کہتا تھا لیکن جب تم کو خود ہی تکلیف اُٹھانا منظور ہے تو میں کوئی نہ کوئی بندش لگاؤں گا۔

اسی کے بعد کچھ اِدھراُدھر گپ شپ ہوئی۔ جب سرور اور بھی زیادہ ہوا تو چوما چاٹی کی باتیں ہونے لگیں۔

مہنت۔ کیوں جانی، تم کبھی اپنی سسرال گئی ہو کہ نہیں؟

رام کلی۔ ایک دفعہ گئی ہوں۔ اُلٹے پاؤں بھاگی۔ تب سے گھر والے لاکھ لاکھ سر مارتے ہیں مگر میں جانے کا نام نہیں لیتی۔

مہنت۔ تمھارا دولہا کیسا ہے؟ ہے تمھاری مرضی کے موافق۔

رام کلی۔ مارو گولی موے کو! بے چارے نے چار حرف انگریزی کیا پڑھ لی ہے کہ خاصہ انگریز بن بیٹھا ہے۔ہر کام میں ایک نہ ایک قید لگا رکھی ہے۔ مندر مت جاؤ۔ کسی کے گھر بلا وجہ مت جاؤ۔ محلّے کی عورتوں کو فضول مت اکٹھا کرو۔ کتاب لے کر دل بہلایا کرو۔ عورتوں کے فرائض پڑھا کرو۔ سودے سلف کا انتظام رکھو اور نہ معلوم کیا

کیا الم غلم۔ میری تو ناک میں دم آگیا۔ دن بھر چار دیواری کے اندر پڑے پڑے ہول ہوجاتا تھا اور دل بہلے تو کیوں کر۔ آخر کوئی سامان بھی تو ہو۔ نہ کسی سے ہنسنا نہ بولنا، نگوڑی کتابوں کو دیکھ دیکھ میری آنکھیں پھوٹتی تھیں۔جیوں تیوں کر کے چار دن تو میں نے بتائے لیکن پھر نہ رہا گیا۔

مہنت۔صورت شکل کیسی پائی ہے؟

رام کلی۔ خاصہ ہٹا کٹا گورا جوان ہے۔ چہرہ نہایت سلونا ہے۔ جسم بالکل سڈول۔ پڑھنے سے آنکھیں ذرا کمزور ہوگئی ہیں، اس وجہ سے چشمہ لگاتا ہے۔ کپڑے نہایت سادے اور خوب صورت رکھتا ہے کفایت شعار اتنا ہے کہ دانت سے کوڑی اُٹھا لے۔

مہنت۔ سچ سچ بتاؤ ہم اچھے ہیں کہ وہ؟

رام کلی۔ انصاف کی بات تو یہ ہے کہ صورت شکل میں تم اس کے پاسنگ بھی نہیں ہو۔ مگر مجھ کو تمھاری چال ڈھال اچھی معلوم ہوتی ہے۔ تمھارے یہاں جتنی شراب چاہے پی جائے اور وہ شراب سے قطعی نفرت رکھتا ہے۔ شرابیوں سے کوسوں بھاگتا ہے۔ بے چارے کو گوشت کے تو نام سے بھی پرہیز ہے۔ اگر کبھی دمڑی کی چیز کو بھی فرمائش کرو تو منہ بناکر کہتا ہے، بھئی اس فضول خرچی سے تو ہفتے بھر میں دیوالہ نکل جائے گا۔ میرے گاڑھے پسینے کی کمائی اس طرح پھونک دی جائے گی تو میں کہیں کا نہ رہوں گا۔

مہنت۔ ہاں، یہ تو بتاؤ روزی روٹی کا ذریعہ کیا ہے؟

رام کلی۔ وہی ریشم کی دُکان کرتا ہے اور کچھ آمدنی علاقے سے ہورہتی ہے مگر خرچ کرنا جانتا ہی نہیں۔ سُنتی ہوں کئی ہزار بینک گھر میں جمع ہیں۔ نہ معلوم کتنی دُکانوں میں ساجھا ہے، مگر خرچ وہی واجبی واجبی۔ کیا مجال کہ کوئی دھیلے کی چیز بلا ضرورت خرید لے۔

مہنت۔ جانی، باتوں میں وقت جاتا ہے، ذرا خوشی سے ایک چما دے دو۔

رام کلی۔ بھئی، آج وَرت ہے، آج تو معاف کرو۔ کیا اپنے ساتھ مجھے بھی نرک میں گھسیٹنا چاہتے ہو!

مہنت۔ وہ تو میں نے پہلے ہی سمجھ لیا تھا کہ صاف مکر جاؤگی۔

القصہ تھوڑی دیر کے بعد رام کلی اپنی سہیلیوں کے ساتھ مسکراتی ہوئی دکھلائی دی۔ جیوں ہی ان سب نے اس کی جھینپی ہوئی صورت دیکھی، آپس میں آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کرنے لگیں۔ کوئی اس کی طرف دیکھ دیکھ مسکراتی تھی، کوئی اس کو دیکھ کر اپنی ہم جولی کے کان میں کچھ کہتی تھی۔ خوب کانا پھوسی ہو رہی تھی۔ رام کلی گو دیدہ دلیر اور شوخ تھی مگر شرم کے مارے زمین میں گڑی جاتی تھی۔ اس طرح ہر ہنڈیا تو پک رہی تھی مگر زبان سب کی بند تھی اور کیوں نہ بند ہوتی، آخر خود بھی تو اسی گھاٹ کا پانی پی چکی تھیں۔ آخر کار ایک شوخ چلبلی عورت سے نہ رہا گیا، بول ہی اُٹھی۔ بوا رام کلی، اس وقت چہرہ کچھ کُمہلایا ہوا ہے!

رام کلی۔ آپ کی بلا سے۔

وہی۔ نہیں، نہیں آخر کچھ تو وجہ ہوگی! ابھی وہاں سے آ رہی تھیں، تب تو یہی مکھڑا کندن کی طرح دمک رہا تھا اور اب جو دیکھتی ہوں تو وہ چمک دمک کیا اس کا دسواں حصہ بھی نہیں ہے۔ آخر اس کی کوئی وجہ؟

رام کلی۔ میرا چہرہ مرجھایا ہوا سہی، مٹی سے بھی زیادہ میلا سہی، تم سے واسطہ، غرض؟ تمھارا چمکتا ہے تو آپ کو اور میرا اُترا ہوا ہے تو آپ کو!

وہی سہیلی۔ خفا کیوں ہوتی ہو بہن، میں نے تو دل لگی کی تھی۔

رام کلی۔ ایسی دل لگی کو دور ہی سے سلام ہے۔ کسی کے سینے کو چھریوں سے زخمی کرو اور کہو، میں نے تو دل لگی کی تھی! چہ خوش دل لگی کی ایک ہی کہی! صدقے اس انوکھی دل لگی کے!

وہی۔ اچھا اب سچ سچ بتا دو آج کیسی بیتی؟

رام کلی۔ پھر تم نے وہی چھیڑ خانی شروع کی؟

وہی۔ اس میں کون سی چھیڑ خانی ہے۔ آپس میں کیسی لاج شرم!

رام کلی۔ تم تو بڑا بینڈا سوال کرتی ہو، اس کا جواب تو مجھ سے نہ دیا جائے گا۔

وہی۔ اور ہم لوگ بے شرم تھے کہ جو کچھ تم پوچھتی تھیں بلا کھٹکے بتا دیتی تھیں، رتی بھر نہ چھپاتی تھیں۔

رام کلی۔ پھر تم جھگڑنے لگیں؟

وہی۔ جھگڑنے کی تو بات ہی ہے۔ ہم تو دل کا سارا حال کہہ ڈالیں اور تم ہم سے ہر ایک بات چھپاؤ۔ میں تو جب روز کی بیتی کسی سہیلی سے نہ کہہ سناؤں تب تک پیٹ میں پانی نہیں پچتا۔

رام کلی۔ میں نے کون سی ایسی بات چھپا رکھی ہے کہ آپ شکوہ کررہی ہیں؟

وہی سہیلی۔ اب دور کہاں ڈھونڈنے جاؤں، ابھی تم سے ایک بات پوچھ رہی ہوں اور تم صاف مکر رہی ہو۔

رام کلی۔ ارے وہ بات بھی نگوڑی بتلانے کے قابل ہو!

وہی۔ کچھ بھی کیوں نہ ہو، ہم کو اس دم ضرور بتلانا ہوگا۔

رام کلی۔ کیا بتاؤں۔ اچھا بتاتی ہوں۔ نہیں، تم ہنسنے لگو گی۔ قسم کھاؤ، نہ ہنسو گی۔

وہی۔ تیرے سر کی قسم لے نہ ہنسیں گے۔

رام کلی۔ بتا ہی دوں؟ اے لو، دیکھو وہ تم مسکرائی۔ بہن شرم کے مارے زبان بندھ جاتی ہے۔ کسی دوسرے وقت کہہ دوں گی۔

وہی۔ خیر، ہاں کچھ اور ذکر بھی آیا تھا۔

رام کلی۔ کیوں نہیں۔ جب میں آتی ہوں تبھی تو سارے زمانے کی گپ اُڑانے لگتے ہیں۔ اب آج باتوں ہی باتوں میں کہنے لگے کہ رام دُلاری آج کل نہ معلوم کیوں نہیں آتی۔ دس بارہ دن بیت گئے، ابھی تک اس کی پرچھائی بھی نہ دکھائی دی۔ تو میں نے کہا کہ بے چاری کیوں آئے، کیا جان بھاری پڑی ہے!

وہی۔ اے تو انھوں نے بھی تو غضب ہی کردیا تھا، چومتے ہی گال کاٹ لیا! شروعات ہی غلط کردی وہ تو ٹھہری دھان پان، پرلے مرے کے سوکمار اور انھوں نے آتے ہی ہاتھا پائی شروع کردی۔ لازم تھا کہ ذرا دو چار دن معرفت کی باتیں کرکے پرچا لیتے، جب اُسے یہاں آنے کی لت پڑجاتی تو جو چاہتے وہ کرتے۔ اب تو وہ ایسے کھٹک گئی ہے کہ اس کا چنگ پر چڑھنا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔

دوسری۔ ارے وہ تو کہو خیریت ہوگئی کہ اس نے اپنے گھر پر کسی سے کچھ نہیں کہا، نہیں تو لینے کے دینے پڑجاتے۔

تیسری۔ اگر کوئی ایسی ویسی ہوتی تو ضرور اس کے دُم دھاگے میں پڑجاتی۔ مگر دُلاری ایک

چکھڑ، بلا کی نڈر ہے۔ جب دیکھیے، مزدورنوں کی طرح گھر کا کوئی نہ کوئی کام کاج کیا کرتی ہے۔

رام کلی۔ بے چاری کا دولہا تو ہے جیسا بھنا ہوا بیگن۔ کالے توے سے بھی بڑھا ہوا۔ مگر یہ ہے کہ اس پر لٹو ہوئی جاتی ہے۔ جب دونوں میاں بیوی ایک ساتھ بیٹھتے ہوں گے تو کیسا بھونڈا معلوم ہوتا ہوگا جیسے چاند میں گرہن لگ جائے!

تیسری۔ (جس نے بابا جی کے ہاتھوں خوب منہ کی کھائی تھی)۔ بہن، میں تو لگی لپٹی رکھنا نہیں جانتی، کہوں گی منہ ہی پر، چاہے تم کو بُرا لگے، چاہے بھلا، کیا کالے بھجنگ بھنورے سے بھی زیادہ سیاہ ہوتی ہوگی کوئی چیز۔ مگر اس نگوڑے کو دیکھو کہ کنول کے پھولوں کا رس لیتا ہے۔ جب تک کنول کے پتوں پر بھنورا نہ گونجتا ہو، اس کی خوب صورتی ہی نہیں ہوتی۔ تم ایسی گوری چٹی ہو جیسا جلتا ہوا انگارا، مگر جو تمھارے سر پر کالے بال نہ ہوں، تو اس چاند سے مکھڑے کی کیا گت ہو؟ سفید آنکھوں میں کالی پتلی نہ ہو تو آدمی اندھا ہو جائے۔ سرخ اور سفید مکھڑے پر جب تک کالے تل نہ ہو وہ نمکینی ہی نہیں آتی۔ اُجلے کاغذ پر جب تک روشنائی سے نہ لکھیں، کاغذ کی کوئی قیمت ہی نہیں۔

رام کلی۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمھارا میاں بھی کالا بھجنگ ہے، جبھی مفت میں لڑنے لگیں۔

تیسری۔ بہن بُرا نہ مانو تو ایک بات کہوں۔

رام کلی۔ بُرا ماننے کی ہوگی تو خوامخواہ بُری معلوم ہوگی۔

تیسری۔ تم ہمارے میاں کو ایک دفعہ بھی دیکھ پاؤ تو سچ کہتی ہوں، اس پر مرنے لگو۔

رام کلی۔ ایسا کون سا سُرخاب کا پَر لگا ہے ان میں کہ میں دیکھتے ہی عاشق ہو جاؤں گی؟

تیسری۔ جوان ہے، ایسا طرحدار ہے، بالکل سُرخ اور سفید جیسے کوئی ولایتی صاحب۔

رام کلی۔ جبھی تم نے ترلوکی ناتھ کو پھانسا تھا۔ سچ کہو ان سے اچھا ہے؟

تیسری۔ ایسے ایسے غنڈوں کی اس کے سامنے کیا ہستی ہے۔ وہ تو خاصہ کنھیا ہے۔

غرض یہ عورتیں زٹل قافیہ اُڑاتی چلی جارہی تھیں۔ راہ کنارے ایک خوب صورت تالاب بنا ہوا تھا۔ اس جگہ شام کے وقت شریف لوگ اکثر ہوا خوری اور جی بہلانے کے لیے آیا کرتے تھے۔ چنانچہ اس وقت بھی بہت سے لوگ اپنی اپنی

دلچسپی کے مطابق اپنا جی بہلانے کا سامان مہیا کر رہے تھے۔ کہیں کوئی صاحب۔ سلوٹی رکھے بھنگ گھونٹنے میں دل و جان سے لگے ہوئے، اکڑوں بیٹھے ہوئے اپنی طاقت کے زعم میں بے چاری بھنگ کو پیسے ڈالتے تھے۔ ان کے حوالی موالی ان کو بڑھاوا دیتے جاتے تھے۔ واہ گرو، کیوں نہ ہو! اس فن میں تو تم اپنے وقت کے استاد ہو۔ بھائی واہ، اس پھرتی اور صفائی کے ساتھ بھنگ کاٹنا تمھارا ہی کام ہے۔ کوئی کیا کھا کر بھنگ کاٹے گا۔ پہلے کچھ دن تمھاری شاگردی کرے تب بھنگ کاٹنے کا دعوا کرے۔ چوٹی کا پسینہ ایڑی تک آتا ہے تب کہیں جاکر رنگ گھٹتا ہے۔ اس کے لیے بڑا دل گردا چاہیے۔ تم نے تو بھائی حد کردی۔ اب مار لیا ہے استاد، وہ سلوٹی اٹھا چاہتی ہے! یہ کام تمھارے اوپر ختم ہوگیا۔ دھترے کی۔ پہروں کی محنت اب کہیں جاکر ٹھکانے لگی۔

ایک۔ بھائی، یہ بوٹی بھی ایشور نے کیا چیز بنائی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تمام نعمتوں کی سرتاج ہے اور پھر کم خرچ بالا نشیں۔ دمڑی کی لاگت میں سرور گھٹی جاتا ہے۔ ایک جھاڑی اور مست ہوکر تنے بیٹھے ہیں۔

دوسرا۔ واہ گرو، خوب قدر بڑھائی تم نے! اس سوجھ بوجھ کے صدقے!

تیسرا۔ ارے یار، اس انمول جواہر کی قیمت کوئی کیا کھاکر لگائے گا۔ تینوں لوک کی حکومت ایک طرف اور یہ نعمت ایک طرف! شیو جی مہاراج نے اس کے اندرونی فائدوں کو دیکھ بھال کر تب استعمال کرنا شروع کیا تھا۔ ایک گولا۔ پٹیل لیا اور مست ہاتھی کی طرح جھوم رہے ہیں کیا مجال کہ رنج و غم پاس آسکے۔

چوتھا۔ گرو، اس کی گولی بندوق کی گولی ہے جو رنج اور دُکھ کو ایسے تاک کر نشانہ لگاتی کہ تیر اچوک بیٹھتا ہے، وار خالی جانا کیا معنی! ادھر بھنگ کی صورت دیکھی، اِدھر تمام، فکر اور پریشانیاں دُم دبا کر بھاگی۔

پانچواں۔ جس نے چار دن کی زندگی میں اس کو نہ چکھا وہ بھی کہے گا کہ میں آدمی ہوں۔ میں تو اسے عزل الخلائق سمجھتا ہوں۔ چوپایوں سے بھی گیا گزرا۔ وحشی اور چوپائے بھی اس سے اچھے ہیں۔

چھٹا۔ اور گرو چہرہ کیسا لال ہوجاتا ہے!

ساتواں۔ کیا کہنا!

غرض یہ لوگ بے پر کی اڑ رہے تھے، تعریف کے پُل باندھ رہے تھے۔ بھنگ نے ان کو ایسا چنگ پر چڑھایا تھا کہ نام و ننگ کو طاق پر رکھ کر بے درنگ رنگ اُڑا رہے تھے۔ اسی بیچ ایک نوجوان جنٹل مین تشریف لائے لوگوں نے بڑے تپاک سے ان کا خیر مقدم کیا۔

پہلا۔ کیوں میاں جوہؔر، یہ تخلص ہی رکھنا جانتے ہو کہ کبھی کچھ کہا وہا بھی ہے؟

نوجوان۔ (جوہؔر تخلص)۔ کیا بتاؤں یار، میری طبیعت کا شاعری سے میل ہی نہیں بیٹھتا ورنہ اب تک تومار کے تومار کہہ ڈالتا۔ ہاں، تمھارے دل بہلاوے کے لیے نثر میں کچھ لکھا ہے، کہو تو سناؤں۔

یار لوگ۔ ضرور سناؤ، اب اس سے بڑھ کر کون موقع ہاتھ آئے گا۔ ہم لوگ دل و جان سے کان لگائے بیٹھے ہیں۔

جوہر۔ (ہنس کر) کان لگائے بیٹھے ہو، اچھا تو سنو۔

تب باغبانِ قدرت نے اس گلشنِ گیتی کو مخلوق کے گل و بوٹوں سے مزین کر کے نئی نویلی دُلہن کی طرح آراستہ اور قواعد و قوانین کی روشیں کاٹ کر باغِ جنت کی طرح پیراستہ کردیا، صناعیوں کے کرشمے دکھا کر گو شے کو اثر رنگِ چمن بنادیا اور سحر کاریوں کی جلوہ نمائی کر کے ہر کیاری کو نمونۂ باغِ اِرم کر دکھایا۔ باغِ دنیا کی ہر ایک وضع نرالی ہے۔ ہر کیاری اشکِ فردوسِ بریں بنی اور ہر پودھا ثانیٔ طوبیٰ ہوا۔ عقل کے خوشنما حوض میں علم کا شفاف پانی مہیا کردیا اور ریاضت و تفتیش کی دو نالیاں بنادیں جس کے ذریعے نونہالانِ چمن سرسبز و شاداب ہوتے رہیں۔ اسی وقت تمام دیوتا یک زبان اور متفق الرائے ہوکر جگدیشور کی بارگاہِ عرش نگاہ میں بغرض تہنیت و مبارک باد و اظہارِ مسرّت حاضر ہوئے۔

جگدیشور نے آپ لوگوں کی بڑی تواضع و تکریم کی۔ بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ تعارفِ رسمی کے بعد ایک مہاتما اپنے اپنے رُتبے کے موافق متمکن ہوا۔ جب حاضرینِ محفل اطمینان سے بیٹھ گئے تو جگدیشور نے بکمالِ شریں زبانی و فصیح البیانی یوں فرمانا شروع کیا۔

میرے پیارے دوستوں! میں آپ لوگوں کے قدم رنجہ فرمانے کا تہِ دل سے مشکور ہوتا ہوں اور مجھ کو توقع کامل ہے کہ میری یہ بے محل تصدیع دہی معاف فرمائی جائیں گی۔ زہے نصیب میرے کہ آپ صاحبوں نے بغرض تہنیت تشریف فرما ہوکر مجھ کو مرہونِ منّت کیا۔ میرے جان و دل سے پیارے دوستوں، قاعدے کی بات ہے کہ جو مہم بلا مشیرانِ صائب الرائے و دانشمندانِ بیدار مغز کے صلاح و مشورے کے انصرام پاتی ہے اس میں بہ باعثِ لاعلمی ایک نہ ایک نقص، ایک نہ ایک عیب ضرور قابلِ گرفت رہ جاتا ہے۔ بدیں وجہ جملہ اصحاب کی خدمت میں التماس ہے کہ آپ لوگ اس ادھورے اور نامکمل شدہ کام کو بہ نظر غور و تفحص ملاحظہ فرمائیں اور میرے عیوب سے مجھ کو متنبہ فرمائیں تاکہ بقدر انسان اصلاح کی سعی کی جائے۔

وشنو جی مہاراج نے، جو تمام دیوتاؤں پر فضیلت رکھتے ہیں، اور اعزاز و وقار کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں، دست بستہ ایستادہ ہوکر بکمالِ عجز و ادب گزارش کی۔ دینا ناتھ! اس دو انگشت کی زبان میں وہ قوتِ گویائی و زورِ بیان کہا کہ اس قدرتِ کاملہ کا ایک شمہ بھی معرضِ بیان میں لاسکے جس کے محض ادنیٰ اشارے پر یہ گلزار سراپا بہار وجود پذیر ہوا۔ اس دیدۂ کور میں وہ تیزیٔ بصارت کہا کہ اس صنعتِ ایزدی کا مشاہدہ کرسکے جس کی ذات سے یہ گوناگوں خلقت ظہور میں آئی۔ اس طبع ضعیف میں وہ ذکاوت و فراست کی کہ اسرارِ حقیقی کا ایک ذرہ بھی ادراک کرسکے، جن کی نیرنگیاں ایک ایک ذرّے سے منکشف ہیں۔اس شیشۂ دل میں وہ لطافت کہا کہ انوارِ سرمدی کا انعکاس کرسکے جس کی تجلّی سے سارا زمانہ روشن ہے اور جو بسیط جہاں پر یکساں محیط ہے۔ ابھی چند ہی دنوں کی بات ہے کہ بجز تیرہ و تار خلا کے کچھ بھی نہ تھا۔ مگر یدِ قدرت نے طرفۃ العین میں کچھ سے کچھ کر دکھایا۔ اس چمن بے خزاں کو بہ ہمہ صفات موصوف و ازہمہ نقائش منزع و مبرا بنایا۔ پس اس کمترین کا کیا منہ ہے کہ اس کو بہ نظر عیب جوئی دیکھے مگر چونکہ واجب الوجود شہنشاۂ ازل سے نیازمند جیسے قلیل البضاعت مخلوق کی عرضداشت کیے، عام اس سے کہ وہ بہ مصلحت ہو یا بے مصلحت سماعت پذیر ہوا کرتی ہیں، کمترین کو کچھ التماس

کرنے کی جرأت ہوتی ہے۔ اجازت کا ملتجی ہے۔

جگدیشور۔ میرے پیارے دوست، میں تمھارے طرز و انداز سے نہایت محظوظ ہوا۔ میرے دستِ گوش تمھاری زبانِ گُہر بار سے دُر بے بہا چُننے کے لیے ہمہ تن مشتاق ہو رہے ہیں۔

وشنو جی۔ درحالیکہ بکشورِ اعظم رنگا رنگ جمادات، گونا گوں نباتات و نوع بہ نوع حیوانات سے معمور کیا جائے گا۔ موالیدِ ثلاثہ ظہور میں آئے گا۔ حیوانِ ناطق اشرف المخلوقات کہلائے گا مخلوقات یعنی نشو ونما کے لیے تعہد و تکفل کا ہونا امر لابدی ہے۔ اگر جگدیشور اس عبودیت کیش کو بہ نظرِ قدر افزائی خدمتِ رزق رسانی تفویض فرمائیں تو خاکسار بصدقِ دل و سرگرمئی کمال امضائے کارِ مفوّضہ میں سرگرم رہے گا اور انجام دہی خدمتِ معہودہ میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرے گا۔

جگدیشور۔ میں اس امر کا اظہار بکمالِ مسرت کرتا ہوں کہ تم نے اس مہم کی انجام رسانی اپنے سر پر لی اور مجھ کو امیدِ قوی ہے کہ تم اس بارِگراں کو انتظامِ خوش اسلوب و حُسنِ تدبیر سے ہلکا بنا لوگے۔

وشنو جی کی جب یہ استدعا منظور کی گئی تو انھوں نے چند لمحے کی خاموشی کے بعد پھر کہا۔ رحمانِ معتقدین! مرزبوم کو سیراب و شاداب کرنے کا طریقہ افضل ترین یہ ہے کہ کنوئیں سے ایک نالی بنائیں اور ہر کیاری میں پانی پہچائیں۔ اگر ہر پودھے کے لیے ایک ایک نالی بنائی جائے تو وقت بے انتہا اور حرج عظیم واقع ہو۔ یہ احقر بلا عیانتِ ایزدی اپنے فریضے سے سبکدوش ہونے کی قابلیت خود میں نہیں پاتا۔ پس امیدوار ہے کہ جو سخاوت عرصے دراز سے معطل ہے، نہ کوئی اس سے منتفع ہوتا ہے اور نہ وہ خود کسی سے مستفیض ہوتی ہے، احقر کی معین و مددگار بنائی جائے۔ کمترین مزرع خلائق کو آبِ رزق سے سیراب کرے گا۔ ہر ہر پودھے کو جُدا جُدا و فرداً فرداً شاداب کرنا سخاوت کا کام ہوگا۔ لہٰذا اس کی امداد سے خیر اندیش کو امورِ متعلقہ کے انجام دینے میں نہایت آسانی ہوگی۔

جگدیشور نے وشنو جی کی درخواست بہ کمالِ خنداں پیشانی منظور فرمائی اور ان فہم اعلیٰ و ذکاوتِ تاباں پر ازحد مسرور و مبتہج ہوئے۔ بعد ازاں برہما جی مہاراج

نے مؤدب سرو قد کھڑے ہوکر نرمی و عجز سے عرض کیا۔ دینا ناتھ! یہ عاصی بھی کچھ گزارش کیا چاہتا ہے۔ اجازت اقدس کا ملتجی ہے۔

جگدیشور نے نہایت جرأت دلانے والے لہجے میں فرمایا۔ اے معادنِ عقل و مخزنِ دانش! اے مصنفِ وید و بانئ آفرینش! اے دیوتاؤں کے تادیب و تربیت کے موجد! اے رموزِ حق کی کلید۔ میرے چشمِ گوش تمھاری زبانِ طوطئی بیان کو گل افشانی کرتے ہوئے دیکھنے کی نہایت شائق ہیں۔

برہماجی نے بلاغتِ مجسم ہوکر فرمانا شروع کیا۔ درحالیکہ یہ معہودِ گیتی اربابِ جُل ارواح سے آباد ہوگی جن کے اجسام بظاہری تغیر پذیر ہوں گے جس کو بہ تقاضۂ مخلوقات حوائجِ ضروری محسوس ہوں گے۔ اور حیات کا دارومدار کلیتاً رزق پر ہے۔ خلائق کی بالائی کوشش ضرور بہ ضرور فانی ہوگی۔ قیام و بقائے دنیا کے لیے سلسلۂ حیات و ممات جاری رکھنا امر لابدی ہوگا۔ لہٰذا اگر سلسلۂ فنا برابر جاری رہے گا تو مدت قلیل میں یہ دنیا ذی روحوں سے خالی و غیرآباد نظر آئے گی۔ پس بدیں نظر یہ سلسلہ منقطع نہ ہو جسدِ حیوانی کی ترکیب روزمرہ کرنی پڑے گی تاکہ اموات سے جس قدر کمی واقع ہو پیدائشوں سے پوری ہوجائے گی۔ یہ جاں نثار اس خدمت کی تعمیل کا تکفیل ہوتا ہے اور بہ معاونت نجاتِ فرائض متعلقہ کو بکمالِ عرق ریزی و جانفشانی انجام دے گا۔

جگدیشور۔ تم کو نجات کی مدد سے کیا فائدہ متصور ہے؟

برہما۔ مہاراج، بنی نوعِ انسانی میں ہر شخص کے اعمال و افعال متشابہ و مماثل نہ ہوں گے۔ کوئی تو متقی و متشرع، پاک و راست باز ہوگا اور کوئی مفتری و دغا باز، کوئی عفو کا سزاوار ہوگا، کوئی سیاست کا مستوجب، کوئی رقیق القلب ہوگا اور کوئی شقی، کوئی مصرف کوئی بخیل، کوئی سخی کوئی ممسک، کوئی نرم دل اور کوئی سنگ دل، غرض ہر فردِ بشر کے اعمال و خصائل میں بے انتہا اختلاف ہوگا۔ جس شخص کے اوصافِ حمیدہ و اطوار پسندیدہ رہے ہیں، جس نے بہ حینِ حیات خود کسی متنفس کو اذیت نہیں پہنچائی، لذّتِ نفسانی و ترغیباتِ دنیاوی کو پاس پھٹکنے نہ دیا، جادۂ راستی سے منحرف نہ

ہوا اور اپنی تمام حرکات و سکنات میں قوتِ ایمانیہ کی ہدایت پر عمل کیا، وہ شخص ایشور کا نورِ نظر ہوگا اور تا مدت مناسب زیر نجات رہے گا اور جو شخص بہ سپردگی نجات رہے گا وہ سلسلۂ تناسخ سے خلاصی پائے گا، انواع و اقسام کے اسبابِ عیش و عشرت اس کو میسر ہوں گے، روحانی مسرّت کا مزا اُٹھائے گا، بشریت سے علاحدہ ہوکر الٰہیت کا درجہ پائے گا، باغِ جنت اس کی میراث ہوگی اور خلد اس کا قیام گاہ ہوگا۔ پس نجاتِ کمترین کو امتیازِ نیک و بد میں مدد دے گی کیوں کہ جو نیک ہیں وہ بہ محافظتِ نجات باغِ ارم میں مزے لوٹیں گے اور جو بد ہیں وہ پھر اسی دنیا میں راندے جائیں گے۔

برہما جی کی استدعا بھی منظور ہوئی اور وہ خوشی خوشی اپنی جگہ پر آبیٹھے۔ بعد ازاں مہاراج اِندر نے دنیا میں امن و امان قائم رکھنے کا ذمہ لیا اور حب الوطنی کو بطور مد و معاون طلب کیا۔ ان کے بعد بھی چند دیوتاؤں نے اپنی اپنی رائے ظاہر کی مگر شیو جی مہاراج، جوگیوں کے سرتاج، عارفوں کے سالک، دنیاوی معرفت کے مالک، عالموں کے ہادی، فقر کے موجد، نقیبوں کے مرشد، ریاضت کے بانی، بھنگیڑیوں کے حامد، عابدوں کے دستگیر، عالم الغیب و روشن ضمیر، دیوتاؤں کے سرمایۂ ناز، ممتاز از عجز و نیاز جو سر بسجود ہوکر بیٹھے تو ایسے مست ہوئے گویا مراقبے میں بیٹھے ہیں، بالکل دنیا و مافیہ سے بے خبر۔ آخرکار جگدیشور نے آپ کی طرف نظر شفقت مبذول کی اور ایک خفیف تبسم کے ساتھ فرمایا۔ بم بھولا ناتھ! ہمارے احباب نے بہ نظرِ رفاہِ خلائق و بہبودِ عام متعدد اضافے کیے ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ ان کے وجود پذیر ہونے سے کارِ دنیا بے شک بحسن تمام انجام پائے گا۔ مگر تم جو ہمارے حبیبِ خالص و دوست ہو، نہ معلوم کیوں خاموش بیٹھے ہو۔ تم کو لازم ہے کہ اظہارِ مصلحت سے ہرگز تاخیر نہ کیا کرو اور بالاختصاص ایسے موقعوں پر جہاں یہی غرض مدِ نظر رکھی گئی ہے۔

اس کے جواب میں شیو جی نے سر کو جیبِ تفکّر سے باہر نکالا اور اپنے دف کو بجاکر بہ لحنِ داؤدی و خوش الحانی ترنم پرواز ہوئے۔

پربھو، تم میرے آقا

میں ہوں تمھارا چاکر پربھو تم میرے داتا

من موہی سنسار میں باجھا کیوں کر توڑوں ناتا

پربھو، تم میرے آقا

پاپ کی گٹھری سر پہ لدی ہے مکھ سے نہ نکلے باتا

کرپا درشٹی مجھ پر پربھو پھیرو اب کچھ نہ بجھاتا

پربھو، تم میرے آقا

جوگ مہادھن پربھو موہے دھنیہ دھنیہ ہے دھنیہ ودھاتا

جن پراڑی نے یہ دھن پایا اسے اب کچھ نہ سہاتا

پربھو، تم میرے آقا

اس بھجن کو اس لب و لہجے میں ادا کیا کہ تمام حاضرین عش عش کرنے لگے۔ اکثر احباب وجد میں آگئے۔ کامل دو گھنٹے تک محفل میں عجیب ازخود رفتگی کا عالم رہا۔ جب ذرا ہوش بہ رضا ہوا تو شیو جی نے فرمایا۔ دین بندھو، آپ میرے خبط سے واقف ہیں۔ مجھ میں ایک عیب یہ ہے کہ صاف گو ہوں۔ پردہ داری سے مجھ کو سخت نفرت ہے۔ میں دوسروں کے عیب سے چشم پوشی اور اغماز کرنا نہیں جانتا۔ یہ جو برہما، وشنو، اِندر، کبیر اور دیگر اصحاب نے اصلاحیں فرمائیں ہیں وہ میری نظروں میں سب کی سب مذموم ہیں۔ میں دیوتاؤں کی تحقیر نہیں کرتا۔ وہ لوگ ضرور واجب التعظیم ہیں مگر ان کی مصلحت انگیزی قابلِ سماعت ہرگز نہیں۔ دنیا دارِ مکافات ہے۔ دنیا کو دو دن کہتے ہیں۔ دنیا ناہنجار کہلاتی ہے۔ الغرض اس عالمِ ارواح سے اس کشور اجسام میں وہی لوگ جائیں گے جن کا جسم گناہ آلود ہوگیا اور جو اس مقدس سرزمین میں قدم رکھنے کے قابل نہیں ہیں۔ پس جو امور کہ خلائق کے حصولِ نجاتِ دوامی میں سدِّ راہ ہوں وہ ضرور بالضرور مذموم و معیوب ہیں۔ ان حضرات نے جو اضافے فرمائے وہ سب کے سب انسان کو دنیا کی طرف مائل اور راغب کرنے والے ہیں۔ پس میر نظروں میں ہیچ و پوچ۔ آپ ذرا میر طرف

مخاطب ہوجائیں۔ جہاں انسان کو اسبابِ ظاہری پر فریفتہ و مائل کرنے کے لیے بے انتہا امور مہیا و مجمع کیے گئے ہیں وہاں اس کے خیالات کو بقائے ابدی کی طرف رجوع کرنے کے لیے کم از کم ان اسبابِ ثلاثہ کو دنیا میں رائج کیا جانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ فقر و استغنا و بھنگ، اور مجھ کو امید ہے کہ یہی تینوں چیزیں بے انتہا ترغیبوں کی اجتماعی قوت کے مقابلے میں ہرگز کمزور یا ناتواں نہ ٹھہریں گی۔

جگدیشور۔ (قہقہہ لگاکر) کیوں مشفق، بھلا فقرو استغنا، تو خیالاتِ انسانی کو حیاتِ دائمی کی طرف رجوع کریں گی مگر بھنگ سے کس قسم کا فائدہ ملحوظِ خاطر ہے؟

شیو جی۔ حسب التقریر عالم چہار دہن (برہما) دنیا میں ہر متنفس کے اوضاع و کردار، افعال و اطوار میں بے انتہا تفاوت رہے گا۔ میں اس کی تائید کرتا ہوں۔ پس، کوئی تو مفلوک الحال طور پر، کوئی تو کسبِ معاش میں سرگرم اور کوئی تحصیلِ حسنات میں مصروف، اور کوئی مشاغل و جفاکش میں سرگرم ہوسکتے ہیں۔ پر جو لوگ کہ مفلس و کنگال، متحملِ عیال و اطفال، نانِ شبینہ کو محتاج اور تحصیلِ کفاف میں حیران و سرگرداں ہیں، ان کے طبائع کو لذتِ روحانی کا جزوی مزہ چکھانے کے لیے بھنگ اکسیر صفات ہوگی۔ جمیع تفکرات سے پیچھا چھوڑاکر دم بھر کے لیے عالم بالا کی سیر و تفریح کرنے کے لیے یہ بھنگ رہنما ہوگی اور یہی بھنگ ان کے دلوں پر اسرارِ حقیقی کے انکشاف کرنے کا ذریعہ ہوگی۔ کسی شاعر نے اس کے اوصاف کو یوں بیان کیا ہے۔

بھنگ بانیٔ فکر و عرفاں ہے — بھنگ حامیٔ عشقِ یزداں ہے
بھنگ صاحب دلوں کا تحفہ ہے — بھنگ ہی مقبلوں کا ہدیہ ہے
بھنگ ہے اِک عطیۂ عظمیٰ — نعمتِ بے بہا ہوئی ہے عطا
بھنگ نورِ نظر فقیراں ہے — بھنگ خونِ جگر غریباں ہے
بھنگ ہی کے طفیل سے عالم — تا ابد رہے گا یوں ہی قائم
بھنگ سے محن دفعہ ہوتا ہے — بھنگ سے رنج رفع ہوتا ہے
بھنگ ہوتا گر نہ وجود پذیر — سب بلائے جہاں میں ہوتے اسیر
خوشی یک لخت منعدم ہوتی — زندہ طبعی بھی کالعدم ہوتی

معرفت کا نشان مٹ جاتا   صفحۂ ہستی سے نام دھو جاتا

اغنیا از وجود ہو جاتے   انبیاء غت ربود ہو جاتے

شاعروں کا نہ کوئی رہتا معین   ہوتی بے بحر شاعری سے زمین

اختراعاتِ شاعری کا ایسا   مخزن بھلا کہاں ہوتا

طائرِ فکر کس طرح اُڑتا   تنگئ آشیاں میں سر دُھنتا

جودتِ طبع نیم جاں ہوتی   بلبلِ فکر بے زباں ہوتی

روشنئ طبع ہوا ہوتی   تیزئ دل بلائے جاں ہوتی

رہتا باقی نام شاہوں کا   نام مٹ جاتا اہلِ جاہوں کا

بھنگ کا جو کوئی عمل کرے   زیر وہ دیو نفس کو کرے

اس کا دنیا میں بول بالا ہے   اس سے آفاق میں اُجالا ہے

دم قدم سے اس کے سب سکھ ہے   گر نہ ہو یہ تو یاں سبھی تچھ ہے

عیش شیطان کیا ہے بھنگ ہے بھنگ   اسی نے اس کا کیا ہے قافیہ تنگ

بھنگ پی کر جو کوئی جنگ کرے   دم میں دشمن کو اپنے دنگ کرے

ہو مخالف تناور ایک درخت   دست و پا اُس کے مثلِ آہن سخت

دم میں بھنگ اس کا انگ بھنگ کرے   توڑ کر ہاتھ پیر لنگ کرے

گر مخالف ہو مثلِ زندہ پیل   بھنگ اس کو بندھائے رخت رحیل

مرض و امراض ہوگئے معدوم   بھنگ کی جب سے مچ رہی دھوم

ڈھنگ ہی اس کا کچھ نرالا ہے   اس کا ہمسر نہ دیکھا بھالا ہے

ایک معشوق شوخ و شنگ ہے یہ   ملتی عاشق سے بے درنگ ہے یہ

شتر غمزے نہیں یہ کرتی ہے   اپنے عاشق کا دم یہ بھرتی ہے

گو ہے معشوق پر یہ عاشق ہے   یار کی جاں نثار صادق ہے

عشق میں اس کے جو ہوا ہے مگن   گویا اس کو ملا ہے جوگ کا دھن

اس سے بوس و کنار ہے دن رات   سنتے ہیں اس کی میٹھی میٹھی بات

اس کی صحبت سے جو نفور ہوا   غم سے اس کا جگر تنور ہوا

جگدیشور۔ بس کرو یار، بس کرو، اتنے اوصاف جس کے ہوں بھلا وہ کب سفارش کا محتاج ہو سکتا ہے۔

الغرض شیو جی کی رسائی ذکاوت کی خوب تعریف ہوئی۔ بھنگ کی منظوری ہو جانے سے لوگوں نے خوب جشن منایا، تمام دیوتاؤں نے اظہارِ مسرّت کیا، ملائک نے گل افشانی کی، پھولوں کی برکھا ہوئی، گندھرو و اپسرا آئیں اور یہ لاونی الاپنا شروع کیا۔

پیو بھنگ گر رنگ مچایا چاہو
لے لو ہاتھ میں لوٹیا اور سر پہ سلوئی لے لو
گنگا تیر جمع کے آسن بھنگ وہاں پر رگڑو
چھوڑ کے مرچ، بادام، الائچی، سب کا سب تم پی لو
دھیان میں شیو جی کے تب بیٹھو مالا خوب جپو
پیو بھنگ گر رنگ مچایا چاہو

الغرض اس لاونی کے بعد تمام دیوتا معاہدت فرما ہوئے اور جلسہ برخاست ہوا۔

منشی جوہر نے اپنی پُرزور طبیعت کا نتیجہ خاتمے پر پہنچایا۔ چاروں طرف سے تعریفوں کی صدا بلند ہوئی۔ بھنگیڑیوں نے ان کے خیالات کی بلندی اور طبیعت کی سوجھ بوجھ کی خوب تعریف کی۔

ان میں کچھ لوگ نظارہ وہ بازی کررہے تھے۔ اس منڈلی میں سے ایک حضرت جو اپنی حلیے سے شریف اور پڑھے لکھے معلوم پڑتے تھے، نمکین حُسن کے مزوں کا بڑے خوب صورت ڈھنگ سے بیان کررہے تھے اور ان کی منڈلی کے لوگ کان لگا کر سُن رہے تھے۔ کچھ ڈنڈپیل لڑینتیے جوان لنگوٹ کَس کَس کے تالاب میں دھما دھم کود رہے تھے۔ تیراک لوگ اپنے اپنے کرتب دکھا رہے تھے۔ کہیں اکھاڑے میں کشتی ہور ہی تھی۔ پہلوان لوگ اپنے داؤں پیچ لگا کر زور آزمائی کررہے تھے۔ تماشائیوں کی بھیڑ تھی۔ ٹھٹ کے ٹھٹ لوگ جمع تھے۔ یہ عورتیں بھی وہاں سے ہوکر گزریں۔ یار لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑکر گھورنے لگے۔ انگلیاں اُٹھنے لگیں جو حضرت حُسن کے نمک اور رنگ کی سفیدی کے جھگڑوں میں پھنسے ہوئے تھے انھیں اب بوالہوسوں کو براہِ راست مثالیں دے کر اپنی بات ان کے دماغ میں بیٹھا دینے کا

معرفت کا نشان مٹ جاتا — صفحۂ ہستی سے نام دھو جاتا
اغنیا از وجود ہو جاتے — انبیاء غت ربود ہو جاتے
شاعروں کا نہ کوئی رہتا معین — ہوتی بے بحر شاعری سے زمین
اختراعاتِ شاعری کا ایسا — مخزن بھلا کہاں ہوتا
طائرِ فکر کس طرح اُڑتا — تنگئ آشیاں میں سر دُھنتا
جودتِ طبع نیم جاں ہوتی — بلبلِ فکر بے زباں ہوتی
روشنئ طبع ہوا ہوتی — تیزئ دل بلائے جاں ہوتی
رہتا باقی نام شاہوں کا — نام مٹ جاتا اہلِ جاہوں کا
بھنگ کا جو کوئی عمل کرے — زیر وہ دیوِ نفس کو کرے
اس کا دنیا میں بول بالا ہے — اس سے آفاق میں اُجالا ہے
دم قدم سے اس کے سب سکھ ہے — گر نہ ہو یہ تو یاں سبھی تجھ ہے
عیش شیطان کیا ہے بھنگ ہے بھنگ — اسی نے اس کا کیا ہے قافیہ تنگ
بھنگ پی کر جو کوئی جنگ کرے — دم میں دشمن کو اپنے دنگ کرے
ہو مخالف تناور ایک درخت — دست و پا اُس کے مثل آہن سخت
دم میں بھنگ اس کا انگ بھنگ کرے — توڑ کر ہاتھ پیر لنگ کرے
گر مخالف ہو مثل زندہ پیل — بھنگ اس کو بندھائے رخت رحیل
مرض و امراض ہوگئے معدوم — بھنگ کی جب سے مچ رہی دھوم
ڈھنگ ہی اس کا کچھ نرالا ہے — اس کا ہمسر نہ دیکھا بھالا ہے
ایک معشوق شوخ و شنگ ہے یہ — ملتی عاشق سے بے درنگ ہے یہ
شتر غمزے نہیں یہ کرتی ہے — اپنے عاشق کا دم یہ بھرتی ہے
گو ہے معشوق پر یہ عاشق ہے — یار کی جاں نثار صادق ہے
عشق میں اس کے جو ہوا ہے مگن — گویا اس کو ملا ہے جوگ کا دھن
اس سے بوس و کنار ہے دن رات — سنتے ہیں اس کی میٹھی بات
اس کی صحبت سے جو نفور ہوا — غم سے اس کا جگر تنور ہوا

جگدیشور۔ بس کرو یار، بس کرو، اتنے اوصاف جس کے ہوں بھلا وہ کب سفارش کا محتاج ہو سکتا ہے۔

الغرض شیو جی کی رسائی ذکاوت کی خوب تعریف ہوئی۔ بھنگ کی منظوری ہو جانے سے لوگوں نے خوب جشن منایا، تمام دیوتاؤں نے اظہارِ مسرّت کیا، ملائک نے گل افشانی کی، پھولوں کی برکھا ہوئی، گندھرو و اپسرا آئیں اور یہ لاونی الاپنا شروع کیا۔

پیو بھنگ گر رنگ مچایا چاہو
لے لو ہاتھ میں لوٹیا اور سر پہ سلوئی لے لو
گنگا تیر جمع کے آسن بھنگ وہاں پر رگڑو
چھوڑ کے مرچ، بادام، الائچی، سب کا سب تم پی لو
دھیان میں شیو جی کے تب بیٹھو مالا خوب جپو
پیو بھنگ گر رنگ مچایا چاہو

الغرض اس لاونی کے بعد تمام دیوتا معاودت فرما ہوئے اور جلسہ برخاست ہوا۔

منشی جوہر نے اپنی پُرزور طبیعت کا نتیجہ خاتمے پر پہنچایا۔ چاروں طرف سے تعریفوں کی صدا بلند ہوئی۔ بھنگیڑیوں نے ان کے خیالات کی بلندی اور طبیعت کی سوجھ بوجھ کی خوب تعریف کی۔

ان میں کچھ لوگ نظارہ بازی کررہے تھے۔ اس منڈلی میں سے ایک حضرت جو اپنی حُلیے سے شریف اور پڑھے لکھے معلوم پڑتے تھے، نمکین حُسن کے مزوں کا بڑے خوب صورت ڈھنگ سے بیان کررہے تھے اور ان کی منڈلی کے لوگ کان لگا کر سُن رہے تھے۔ کچھ ڈنڈ پیل لڑینتیے جوان لنگوٹ کس کس کے تالاب میں دھما دھم کود رہے تھے۔ تیراک لوگ اپنے اپنے کرتب دکھا رہے تھے۔ کہیں اکھاڑے میں کشتی ہور ہی تھی۔ پہلوان لوگ اپنے داؤں پیچ لگا کر زور آزمائی کررہے تھے۔ تماشائیوں کی بھیڑ تھی۔ ٹھٹ کے ٹھٹ لوگ جمع تھے۔ یہ عورتیں بھی وہاں سے ہوکر گزریں۔ یار لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھورنے لگے۔ انگلیاں اُٹھنے لگیں جو حضرت حُسن کے نمک اور رنگ کی سفیدی کے جھگڑوں میں پھنسے ہوئے تھے انھیں اب بوالہوسوں کو براہِ راست مثالیں دے کر اپنی بات ان کے دماغ میں بیٹھا دینے کا

خوب موقع ہاتھ آیا۔ آپ نے فرمانا شروع کیا۔ دیکھو بھائی، وہ جو گوری گوری لڑکی بدن چرائے ہوئے کمر کو لچکاتی جارہی ہے، اس کے چہرے پر غضب کی نمکینی ہے۔ یہ روپ شوخی سے مل کر کیسی چھب دکھلا رہا ہے۔ دیکھو اس کی آنکھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ نشے میں بھری ہیں! اچھا اب اس اگلی کا ملاحظہ فرمائیں۔ گو روپ اور جوانی میں یہ پہلے والی سے کسی طرح کم نہیں مگر چہرے پر وہ نمک کہاں۔ بالکل روکھا بچھا ہوا! اب تو آپ اس گہرے پوائنٹ کو ضرور ہی سمجھ گئے ہوں گے۔

جب یہ جناب اپنا فلسفیانہ بیان ختم کر چکے تو یاروں کو ساتھ لے کر عورتوں کے ساتھ ہولیے اور قافیے کسنا شروع کیے۔

ایک۔ یار، جو بچپن سے کانوں سُنا کرتے تھے وہ آج آنکھوں دیکھا!

دوسرا۔ کیا ہے بھائی، ذرا میں بھی آنکھ سینک لوں۔

تیسرا۔ آج پاروتی جی کی سہیلیاں، اپسرائیں کیلاش پروت سے اتری ہیں۔ جن کو درشن ملے گا وہ سب تر جائیں گے۔ ہم لوگوں کا فرض ہے کہ ضرور درشن کریں۔ جو چوکے وہ بے وقوف، بالکل خبطی، بلکہ پاگل۔

چوتھا۔ یاروں چھ برس سے پریوں کو بس میں کرنے کا عمل دل و جان سے کررہا ہوں مگر کبھی اکیلے میں بھی دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ آج اس عمل کی اثر پڑا ہے جاکر۔ کیوں استاد، کیا شیشے میں اُتارا ہے ان کو؟

پانچواں۔ یہ نہ کہیے۔ یہ تو آپ ہی کی کارستانی ہے۔ واللہ، بڑے گرو گھنٹال ہو۔

چوتھا۔ اجی، یہ تو اپنے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔ چٹکی بجانے میں ہزاروں پریاں ہاتھ باندھے حاضر ہوجائیں، مگر ان میں یہ نمک اور سادگی کہاں!

پانچواں۔ سادگی! سادگی کی ایک ہی کہی۔ آپ ان کو سادہ مزاج کہیے گا۔ ارے یہ تو کھیلی کھائی ہیں۔ سات گھاٹ کا پانی پیے ہیں۔ دیکھتے نہیں ترچھی نظریں، معلوم ہوتا ہے کہ سیدھے کلیجے میں اتر جائیں گی۔

قصہ مختصر یہ کہ یہ حضرت اِدھر اُدھر چکر لگا رہے تھے، اگر کوئی بھڑکیلی صورت نظر پڑی تو اُسے گھورنے لگے۔ یہ عورتیں نہایت آن بان سے اس جگہ سے بھی آگے بڑھیں اور تالاب سے کوئی دوسو گز کے فاصلے پر ایک باغ میں ہوا کھانے

چلیں۔ یہ باغ نہایت خوش نما بنا ہوا تھا۔ ٹھیک بیچو و بیچ ایک سنگ مرمر کا حوض بنا ہوا تھا۔ حوض کے چاروں طرف خوب صورت کرسیاں رکھی ہوئی تھیں تاکہ اگر کوئی بھلا مانس سیر و تفریح کی غرض سے آئے تو اسے بیٹھنے کی دقت نہ ہو۔ جس وقت یہ عورتیں اس باغ میں داخل ہوئیں، دو جنٹل مین اسی حوض کے کنارے بیٹھے ہوئے کسی بات پر باتیں کررہے تھے۔

پہلا۔ (دقیانوسی خیالات کا آدمی)۔ کیوں حضرت، بھلا یہ بھی کسی کتاب میں منع کیا گیا ہے کہ عورتیں گھر کے باہر قدم نہ نکالیں؟ سب کام گھر میں ہی ہو؟

دوسرا۔ (صاف اور مہذب خیالات کا آدمی، نہ تو یہ انگریزیت کی لیتے تھے اور نہ پرانی لکیر کے فقیر تھے۔ جو کام کرتے تھے سمجھ بوجھ کے ساتھ)۔ میں نے تو آج تک کسی مستند کتاب میں ایسی بات لکھی نہیں دیکھی جس کا یہ موضوع اور مقصد ہو کہ عورتیں گھر کے اندر قید کردی جائیں اور ان کو باہر نکلنے کی قطعی مناہی کردی جائے۔

پہلا۔ تو پھر آپ لوگ اس مسئلے پر کیوں اتنے زوروں کے ساتھ بحث کرتے ہیں؟

دوسرا۔ ہم لوگوں کا یہ منشا نہیں ہے کہ عورتیں گھر میں بند کی جائیں۔ مگر ہم لوگ اس بات کو ہرگز مناسب نہ سمجھیں گے کہ دنیاوی فرائض کے پورا کرنے میں ان کو پوری آزادی دی جائے تو اس سے دنیا کے کاموں میں بڑا خلل پڑے اور غریب لوگوں کا کام تو دَم بھر بھی نہ چلے۔ اس لیے یہ لازم آیا کہ عورتوں کو ضرورتاً اور مجبوری میں گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دی جائے۔ مگر یہ بات دھیان میں رہے کہ وہ حد سے آگے نہ جانے پائیں۔

پہلا۔ اس کو ذرا کھول کر بتلایئے گا، میں ٹھیک سے نہ سمجھا۔

دوسرا۔ میرے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ عورتیں باہر نکلیں مگر مجبوری درجے۔ سیرسپاٹے کے لیے اکیلے ہرگز نہیں۔ بلا ضرورت چُھٹا سانڈ کی طرح مٹرگشتی کرنا بہت بُرا معلوم ہوتا ہے۔

پہلا۔ بلاضرورت کوئی کیوں اِدھراُدھر گھومنے لگا؟

دوسرا۔ اس کی کیا ایسی سخت ضرورت ہے کہ عورتیں صبح میں ضروری کاموں سے فارغ ہوکر مندروں میں پوجا کے لیے آئیں؟ پوجا کے لیے نیت کی سچّائی اور دھیان کی

یکسوئی شرط ہے۔ صرف نمائش سے کچھ حاصل نہیں خاص کر دنیاوی فرائض کو پورا کرنے میں۔ اگر پوجا کا سب سامان گھر میں اکٹھا کردیا جائے تو میری سمجھ میں کوئی دقت نہ ہو۔ سب کا بنا جھنجھٹ چل جائے۔

پہلا۔ آپ نے ابھی فرمایا کہ کتابوں میں باہر نکلنے کی مناہی نہیں۔ اگر عورتیں سچے دل سے اور جی لگا کر ثواب اور نجات حاصل کرنے کے لیے مندروں کو جاتی ہیں تو کیا بُرا کرتی ہیں؟

دوسرا۔ مگر غور کرنے کی بات یہ ہے کہ مندروں میں جانے کے بعد ان کی طبیعت کی سچائی قائم رہ سکتی ہے یا نہیں۔

پہلا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ان کی اخلاقی حالت روز بروز سدھرے گی اور اچھے نتیجے پیدا ہوں گے۔

دوسرا۔ یہ آپ کی غلطی ہے۔ ہرگز ایسا نہیں۔ مندروں کی حالت اس زمانے میں ایسی ہے کہ کچھ نہ کہنا ہی بہتر ہے۔ مہنتوں کے ہتھکنڈوں کا ذکر اگر میں بہت تھوڑے میں ہی کروں تو پوتھے کا پوتھا ہوجائے اور یہ کچھ مہنتوں ہی کی بات نہیں ہے۔ جو لوگ مفت کی چکھوتیاں کریں گے، دوسرے کے سر پر پھلوڑیاں کھائیں گے، وہ آخرکار عیش پسند اور آرام طلب ہوجائیں گے۔ جن دنوں انگلستان کی تہذیب و ثقافت اس بلندی پر نہ پہنچی تھی، وہاں پر یہ رسم تھی کہ شاہی انصاف کرنے والے، پادریوں کے خلاف مقدمے کے سناوائی کے لیے، غیراہل سمجھے جاتے تھے۔ پادری لوگ کیسے ہی سنگین جرم کریں، بڑے سے بڑا گناہ کر بیٹھیں مگر حکومت کچھ پوچھ تاچھ نہ کرتی تھیں۔ ان پادریوں کے معاملے کا فیصلہ پوپ کے دربار سے ہوتا تھا۔ مگر چونکہ وہ خود بھی اسی فرقے کا آدمی تھا اور فرقے کی بدنامی سے ڈرتا تھا اس وجہ سے اکثر ایسے لوگ جو سزا پانے کے قابل تھے، بے لاگ چھوٹ جایا کرتے تھے۔ ان لوگوں نے ایسا اندھیر کیا، ایسا اودھم مچایا کہ عوام کو سخت تکلیفیں پہنچیں اور وہ سب مل کر اپنے وقت کے بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ حضور ان بنے ہوئے پاکھنڈی پادریوں کے مارے ہم لوگوں کا ناک میں دم ہو رہا ہے۔ ان کے ظلم اس حد تک بڑھے ہوئے ہیں کہ جس کی کوئی حد نہیں۔ بچہّ بچہّ ان کے ظلموں سے

دُکھی ہے۔ تمام سلطنت میں واویلا مچا ہوا ہے۔ اگر حضور سنوائی نہ فرمائیں گے تو رعایا باغی ہوجائے گی، گرجوں کو جڑ سے کھودکر پھینک دے گی، محل سے محل اور اینٹ سے اینٹ بجا دے گی، ان سادھوؤں کو قتل کرکے ان کا نام و نشان ہستی کے صفحے سے مٹا دے گی۔ بادشاہ دور اندیش اور معاملے کو سمجھنے والا آدمی تھا، تاڑ گیا کہ یہ سب اس وقت جھلّائے ہوئے ہیں، اگر کوئی بات ان کے خلاف کی گئی تو ضرور بگڑ جائیں گے اور چونکہ خود بھی کئی بار پادریوں کی زیادتیاں دیکھ چکا تھا، اس نے نادر شاہی حکم نکالا کہ آج سے پادریوں کو آپسی فیصلے کا کوئی حق نہ ہوگا۔ سبھی معاملے شاہی افسروں کے ہاتھ طے پائیں گے۔ پادریوں کے کان میں اس خبر کے پڑتے ہی ایک کھلبلی مچ گئی۔ فوراً لارڈ بشپ آف کنٹربری کے یہاں جمع ہوکر اپنے سب سے بڑے مہنت پوپ آف روم کو اس بے عزتی کی خبر دی۔ وہ بہت ہی ناراض ہوئے اور انگلینڈ کے بادشاہ کو دھمکایا۔ اس کے بعد دوسرے ملکوں کے بادشاہوں کو انگلستان سے لڑائی چھیڑنے پر آمادہ کیا اور خود بھی دوسرے دوسرے ذریعے جھگڑے فساد کو بھڑکاتا رہا۔ مگر بادشاہ نے تمام آفتوں کو دَم کے دَم میں دور کردیا کیوں کہ رعایا اس پر جان نچھاور کرنے کے لیے سر ہتھیلی پر لیے ہوئے تھی۔ ایک مورخ لکھتا ہے کہ جس دن یہ اختیار پادریوں کے ہاتھ سے نکلا اسی دن انگلستان کی اس تہذیبی عمارت کی بنیاد پڑی جو آج کل دنیا میں فخر کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔

رعایا نے گھی کے چراغ جلائے۔ گھر گھر جشن مچا۔ آپ اس مثال سے یہ دیکھ سکتے ہیں کہ ان سادھوؤں، سنیاسیوں، پروہتوں، پادریوں کے ہاتھوں رعایا کس قدر مصیبت اُٹھا رہی تھی۔ آج کل ہمارے پجاریوں کا بھی بالکل یہی حال ہے، زمانے بھر کے مفت خور، جاہل، عیش پسند لوگ اسی ذریعے سے اپنی روزی روٹی حاصل کرتے ہیں اور بھولے بھولے سیدھے سادے لوگوں کو اپنی دغا بازیوں کا شکار بناتے ہیں۔ ان کی اخلاقی حالت اتنی بگڑی ہوئی ہے، کہ توبہ ہی بھلی، چراغ لے کر ڈھونڈیے مگر تمام فرقے سے کوئی سیدھا سچا آدمی نہ پایئے گا۔

پہلا۔ حضرت، اس کا تو کسی کافر کو ہی یقین آئے گا کہ مہنت لوگ اتنے خراب ہوتے ہیں۔ آپ نے تو ان کو گناہوں کا پُتلا بنا دیا۔

دوسرا۔ آپ کو بھی ان سے کام نہیں پڑا ہے، جبھی آپ کو ان کے ساتھ اتنی ہمدردی ہے۔ کہیں ایک دفعہ بھی آپ ان کے پھندے میں آگئے تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوجائے گا۔ مجھ سے کہیے تو اسی وقت سو دو سو ایسے لوگوں کا نام بتاؤں جو پرلے درجے کے عیاش ہیں، نمبر ایک کے ظالم ہیں اورانتہا درجے کے بے ایمان ہیں۔

پہلا۔ فرض کیجیے ہم اگر یہ بھی مان لیں کہ وہ ایسے مکار اور چالباز ہوتے ہیں اور ان کا پرائیوٹ رہنا سہنا گرفت کے قابل ہوتا ہے تب بھی ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ان کا پبلک کیریر بھی خراب ہو۔

دوسرا۔ جنابِ من معاف کیجیے آپ غلطی پر ہیں۔ ان کی نجی زندگی کا اثر نوجوان طبیعتوں پر جتنا پڑتا ہے، اس کا اندازہ کرنا ہم لوگوں کی طاقت سے باہر ہے۔

پہلا۔ آپ کی باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اسنان اور پوجا قطعی طور پر منع کردی جائے۔

دوسرا۔ جب اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ خوامخواہ مندر کو جائیں (کیونکہ جہاں کہیں سچّی نیت سے کی جائے گی اس کا ثواب ایک جیسا ہوگا) تو بے فائدہ اتنی سب ماتھا پچّی سے کیا حاصل؟ کتابوں میں اس کا ذکر ہی نہیں آیا، نہ تو مناہی ہے نہ اجازت۔ اس حالت میں ہم کو وہ رویہ اختیار کرنا چاہیے جو موجودہ تہذیب اور ترقی کی شان کے قابل ہے تاکہ دوسری قومیں ہم پر تنقید نہ کریں۔ اگر انصاف کی نظر سے دیکھیے تو یہ بُری رسم خود اپنی ہی نظروں میں بُری معلوم ہوتی ہے۔ کیسی شرم کی بات ہے کہ اونچے اونچے گھرانے کی عورتیں سویرے تڑکے گنگا اسنان کو جائیں، تیرتھ یاترا کے لیے بھی کمر باندھیں، ٹھاکر دواروں میں مٹرگشتی کریں۔ آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ آوارہ لوگوں کی گھورا گھاری، بُرے لوگوں کا سامنا، زمانے کی لالچیں اور شہوت کی منہ زوریاں عورتوں کی فطری حیا و شرم پر کیسا بُرا اثر ڈالتی ہے۔ (ان عورتوں کو دیکھ کر) لیجیے ملاحظہ کیجیے۔ یہ عورتیں دیکھنے میں شریف خاندان کی معلوم ہوتی ہیں مگر ان سے پوچھیے کہ یہاں پوجا کو آنے کی کیا ضرورت تھی۔ دیکھیے کتنے بے ہودہ، نکمے ان کے ساتھ ساتھ چلے آرہے ہیں۔ آپس میں پھبتیاں کستے ہیں۔ موقع محل دیکھ کر ان سے مذاق بھی کر بیٹھتے ہیں اگر یہاں پوجا ٹھیک ڈھنگ سے کی جاتی تو یہ نوبت کیوں آتی؟

یہ عورتیں کھڑی ہوکر حوض میں مچھلیوں کو دیکھنے لگیں۔ اسی بیچ وہاں دس بارہ لڑکے دوڑتے ہوئے آئے اور مچھلیوں کو اِدھراُدھر پھدکتے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

ایک۔ بابا ہمیں پڑھنے کو کتاب لے دو۔

بابا۔ کون سی کتاب لوگے؟

لڑکا۔ قصہ شیر شاہ سوری کی لڑکی اور راجا مالوا کے لڑکے کا۔

یہ ایک کتاب بیچنے والے کی دُکان پر پہنچے اور کتاب دھیلے کو خرید کر اسی حوض پر آئے اور لڑکے نے پڑھنا شروع کیا:۔

قصہ رتن پال اور قمر النساء بیگم

مصنف مولوی محمد طاہر طاہر

ایک روز شیر شاہ سوری اپنے تخت پر بیٹھا ہوا امیروں سے کچھ صلاح مشورہ کررہا تھا کہ ایک خواص محل سرا سے دوڑتی ہوئی نکلی اور نہایت بدحواسی سے، سر کے بال کھلے، اپنا جسم نوچتی کھسوٹتی دربار میں پہنچی۔ بادشاہ اُسے دیکھ کر گھبرا سا گیا اور پوچھا۔ کیوں، کیوں، خیریت تو ہے؟

خواص نے روکر جواب دیا۔ جہاں پناہ، خیریت تو بہت ہے، آج صبح سے قمر النسا بیگم کا پتہ نہیں ہے۔ تمام محل کی انگل انگل خاک چھان ڈالی!

اس خبر کو سُنتے ہی بادشاہ کی تو عقل گم ہوگئی۔ فوراً تخت سے اُٹھا اور ننگے پاؤں دوڑتا ہوا محل سرا میں داخل ہوا۔ دیکھا تو وہاں پٹّس پڑی ہوئی ہے، کہرام مچا ہوا ہے، تمام بیگمیں سر کے بال کھولے، چوڑیاں توڑے، کپڑے لتّے بے سدھ، چھاتی پیٹ رہی ہیں۔ بادشاہ نے اپنی پیاری چہیتی بیگم کو دلاسہ دیا اور پوچھنے لگے کہ ''آخر کچھ ماجرا تو کہو، اس طرح رونے دھونے سے کیا حاصل؟'' اس نے جواب دیا۔ یا خدا، کیا جواب دوں۔ ابھی کل شام کو میں اپنی بچی کے ساتھ باغ کی سیر کو گئی تھی۔ وہاں سے وہ میرے ساتھ واپس آئی۔ ہاں آتے ہی وقت اس کا چہرہ کچھ اُترا ہوا تھا۔ آج صبح سے پتا نہیں ہے۔ نہ معلوم اس بے چاری پر کون بلا آ پڑی۔

اتنا سُن کر بادشاہ دربار میں آیا اور حکم دیا کہ جتنے چالاک جاسوس اس شہر

میں ہیں ابھی میرے دربار میں حاضر ہوں۔ چنانچہ تھوڑی دیر میں ہزاروں جاسوس، ایک سے ایک بڑھ کر، حاضر ہوئے، بادشاہ نے فرمایا۔ شہزادی کا آج صبح سے پتہ نہیں ہے۔ تم میں جو ٹھیک پتہ لگاکر مع قیدی کے سب سے پہلے یہاں حاضر ہوگا، اُسے پانچ ہزار سونے کے دینار انعام دیے جائیں گے۔ یہ حکم سُن کر جاسوس اپنے اپنے ساز و سامان سے لیس ہوکر ٹوہ میں نکلے۔ جس کے جدھر سینگ سمائے، اُدھر چلا ایک بڈھا جاسوس فقیری بھیس بدل کر آہستہ آہستہ اِدھراُدھر دیکھتا بھالتا پورب کی طرف چلا۔ کئی گھنٹے تک وہ برابر دھاوا مارے چلا گیا، کچھ نشان نہ ملا۔ شام کے وقت ایک گاؤں میں پہنچ کر اس نے بازار کی سڑک پکڑی۔ پہنچ کر کیا دیکھتا ہے کہ ایک نوجوان آدمی تمام ہتھیاروں سے لیس حلوائی کی دُکان پر مٹھائیاں لے رہا ہے اور اس کے ساتھ ایک اور نوجوان شخص اس کے کندھے پر ہاتھ دیے کھڑا ہے۔ جاسوس کی تیز آنکھوں نے فوراً پہچان لیا کہ اب شکار پھنس گیا۔ لہٰذا اس نے ان کا پیچھا کیا اور یہ کہتا چلا۔

میں ہوں بے دیسی اک بھک منگا کوئی میرو پار لگادے
تین اپواس کیا ہے ہم نے پرت سیدھ نہیں پاؤ رے
جیا ہمارا بیٹھا جاتا کوئی موہے بھوجن کراوے رے
پترہارا بڑا سوارتھی تیاگ دین دیہیاں رے
سب ڈاکو ملی مار گرایو کوئی میری چھدھا بجھاوے رے

اس نے یہ ترس بھرا ہوا گیت ایسی دردناک آواز میں گایا کہ شہزادی کے دل میں درد کے مارے رُلائی آنے لگی۔ اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔ پیارے رتن پال، یہ غریب فقیر بھوکھا ہے، اسے کچھ کھلا دو۔

رتن پال نے جواب دیا۔ پہلے اس سے یہ پوچھ لینا چاہیے کہ اتنے وقت کون سا راستہ پکڑیں، ہم کو تو کچھ معلوم نہیں اور اس وقت یہاں رہ جانا خطرے سے خالی نہیں۔

لہٰذا شہزادی نے فقیر سے پوچھا۔

میں ہوں بے دیسی ایک مسافر تم ہو بے دیسی فقیر
چھدھا تمھاری ہم بھر دیں گے، کوئی موہے باٹ بتا رے
بھول کے سیدھی راہ یہاں ہم آئے پڑے افسوس
سن لے کوئی ارج ہماری ارو موہے ڈگر بتا دے رے
یہ سن کر فقیر نے کچھ دل میں سوچ کر کہا !
پورب دشا میں چور لگت ہیں اتر دیسی نہی باٹ
دکھن دشا میں ندی پڑت ہے پار نہ کوئی اُتارے رے
پچھم اُور جو جاؤ مسافر سب کچھ ہے بھر پور
چور چکار نہ ڈاکو رہزن کوئی نہی بیچ کھپاوے رے
بچن جو موری مانو مسافر لو پچھم کی راہ
تھوڑی دور ایک نگر پڑت ہے واں آسن تم جمادے رے

یہ سُن کر شہزادی نے رونی صورت بناکر رتن پال سے کہا۔ پیارے، رات یہیں بسر کرو، صبح کو سیدھا راستہ پکڑیں گے۔ اس وقت منزل چلنے میں بڑا ڈر ہے۔ کہیں ڈاکوؤں سے مٹھ بھیڑ ہوجائے تو ناحق کی زحمت ہو۔

پیاری، اگر ڈاکو ہزار جان لے کر آئے تو ایک بھی سلامت نہ لے جائے۔ مگر اس وقت ان سے بچنا ہی مصلحت ہے۔

یہی سوچ سمجھ کر شہزادے نے وہیں بستر جمایا۔ فقیر کو کھلایا، خود کھایا اور دونوں عاشق و معشوق گلے مل کر سورہے۔ جب وہ سونے لگے تو فقیر اُٹھا اور دل میں سوچنے لگا، اس بے چارے کی صورت کتنی پیاری ہے! آج معشوق کے گلے میں اینڈ اینڈ سورہا ہے، کل یہی سر سولی پر ہوگا۔ آج معشوق کی گود میں ہے، کل خود موت کی گود میں ہوگا!

پر اس کی لالچ نے اس کو نہ چھوڑا۔ وہ سیدھا تھانے پر گیا اور داروغہ سے کہا کہ دو شاہی قیدی فلاں پیڑ کے تلے غافل پڑے ہیں، تم اسی وقت روند لے کر جاؤ اور ان کو باندھ لو۔ خبردار ہوشیار رہنا۔ اس میں سے ایک نوجوان بڑا بہادر ہے۔ اس کی بہادری کی دھوم ہے۔

ظالم تھانے دار سواروں سمیت موت کی طرح سر پر پہنچا اور دونوں بدقسمتوں کو قید کر کے تھانے میں لایا۔ یہ سب ایسی غفلت کی سوئے تھے کہ رات کو آنکھ بھی نہ کھلی۔ صبح کو اس بلا میں گھرا ہوا پایا شہزادی نے روکر رتن پال سے کہا۔

ناؤ میری مجدھار میں ڈوبت ہے افسوس
ندی ہے گہری کوئی نہ کھویا، جو بیڑا پار لگاوے رے
بھاگ میں میرے یہی لکھا تھا، میٹ سکے نا کوئے رے
لکھیں ودھاتا جو ماتھے میں وہ کوئی کیسے مٹا دے رے
جان سے پیارے آنکھوں کے تارے مورے پیتم پیارے
میں ہوں ابھاگن ایک تہارن کوئی میت سے موا ملادے رے

شہزادہ رتن پال یہ دُکھ بھرا گیت سُن کر رو دیا اور بڑے محبت آمیز آواز میں بولا۔

دھیرج دھرو موری پیاری، چھوڑو تم مت آس
سانس ہے جب تک آس لگی ہے، ایشور تم کو بچاوے رے
بھاگ تو اپنو ہیں میں کیسے کہوں ای جان
تم ہو ہماری میں ہوں تمھارا کوئی بند سے تم کو چھوڑا دے رے

الغرض دونوں نے آخری دیدار کیے اور موت کے منتظر ہو بیٹھے۔ تھوڑی دیر میں کوتوال نے دونوں کو جدا جدا کٹ گھرے میں بند کیا اور جاسوس کے ساتھ راجدھانی کی طرف چلا۔

بادشاہ نے اپنی لڑکی کو شفقت بھری نظروں سے دیکھ کر کہا۔
پیاری، تم نے اپنے بوڑھے باپ کو ایسا بھلا دیا، اس کا ذرا بھی دھیان نہ کیا!
لڑکی نے روکر کہا۔

پتا پریت ایسی بلا کہ چھوٹے سب گھر بار
یہی لالسا دل میں رہت ہے کوئی پیتم سے ملادے رے

بادشاہ اپنی لڑکی کے جواب پر بے حد غصہ ہوا اور جھلاکر اس نے حکم دیا کہ خاندان کی اس ذلت کو ابھی بندی خانے میں لے جاؤ اور جب تک اس کا خبط دور نہ ہوگا، وہیں پڑی رہے۔ اس کے بعد رتن پال کی طرف مخاطب ہوکر پوچھا۔ کیوں جی تم کہاں سے آتے ہو، تمھارا کیا نام ہے اور یہاں تمھارا کیا کام تھا؟ تم نے بادشاہ کا ذرا بھی لحاظ نہ کیا اور ایسا شرم ناک کام کیا۔ اب تمھاری یہی سزا ہے کہ تم سولی پر چڑھائے جاؤگے اور تمھاری لاش چیل کوؤں کو کھلا دی جائے گی تاکہ دوسرے اس سے نصیحت لیں۔

رتن پال نے جواب دیا۔

پریت کی نگری ہے بڑی واں نہیں پرجا کوئی
نا کوئی راجا راج کرے واں نا دُکھیا کو ستاوے رے

بادشاہ نے اسے اسی وقت سولی پر کھچوا دیا۔ دوسری صبح کو محل سرا سے یہ آواز سُنائی دی۔

(ماتمی گیت)

چل بسی آنکھوں کی پُتلی ہائے ہائے
کچھ نہ دیکھا کچھ نہ بھالا چل بسی وہ ہائے ہائے
زندگی کا سکھ نہ بھوگا چل بسی وہ ہائے ہائے
چل بسی آنکھوں کی پُتلی ہائے ہائے
کیسی پیاری اس کی صورت اس کا رنگ و روپ
تھی ابھی کونپل جوانی چل بسی وہ ہائے ہائے
چل بسی آنکھوں کی پُتلی ہائے ہائے
خود تو پیاری چل بسی پر ہم کو دُکھ دے کر گئی
لیکے ارماں سیکڑوں دنیا سے نکلی ہائے ہائے
چل بسی آنکھوں کی پُتلی ہائے ہائے
ہم کو کیا معلوم تھا ہوگا غضب کا سامنا

ہاتھ سے اپنے چلی جائے گی پیاری ہائے ہائے
چل بسی آنکھوں کی پُتلی ہائے ہائے

ان عورتوں نے اس دردناک قصّے کو سُنا اور شہزادی کی قسمت پر افسوس کرتی ہوئی چلیں مگر غم غلط کرنے کے واسطے ایک گیت ضرور تھا، پس یہ گیت گانے لگیں۔

پیا مورے گلے کا ہار دے، ساجن گھر جاتے

گاتی ہوئی اپنے اپنے گھر پہنچی اور ممتاز گھرانے کی پردہ نشین عورتیں بن بیٹھیں جیسے کچھ نہیں جانتیں۔

(۳)

رام کلی جب سیر سپاٹے کرتی مکان پر پہنچی تو وہاں ایک نیا تماشا دیکھا۔ اس کا شوہر ڈولی کہار لے کر اُسے رخصت کرا لے جانے کو آیا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر رام کلی کا تو کلیجہ سن سا ہوگیا۔ لگی دل میں سوچنے کہ یہ نکھٹ طوفانِ بے تمیزی کی طرح بیچ میں کہاں سے کود پڑا۔ اس کا تو کچھ سان و گمان بھی نہ تھا۔ آخر کچھ پہلے سے لکھا پڑھی کی ہوتی۔ بُرا ہوا۔ کچھ دن اور بھی چین سے کٹتے، پھر دیکھا جاتا۔

آخر بے چاری جب گھر میں گئی تو چپ چاپ مَن مار کر بیٹھ گئی۔ ماں نے جو دیکھا کہ لڑکی گُم سُم ہوگئی اور حالت اچانک کچھ سے کچھ ہوگئی۔ تو سمجھی شاید دن کے فاقے نے یہ بُری گت کردی ہو۔ کچھ دیر تک تو رام کلی یوں ہی گالوں پر ہاتھ دیے بیٹھی رہی۔ آخر کار بخار کا بہانہ کرکے اٹھوائی کھٹوائی لے کر پڑ رہی۔ جب اسے لیٹے دیر ہوئی تو ان کو گمان ہوا کہ لڑکی کھجا گئی۔ پہلے تو سوچا کہ سونے ہی دو شاید اسی سے جی ہلکا ہوجائے۔ مگر بھگوان کی دی ایک بیٹی، نہ رہا گیا۔ بستر کے پاس آکر کہنے لگی۔ بیٹا رام کلی، اُٹھو، کچھ پرساد ورساد تو کھالو۔ کہو جی کیسا ہے۔

رام کلی۔ (بھاری آواز میں) اماں، ہم کو دق مت کرو، ہمارا ماتھا بھاری ہے، مارے درد کے رہا نہیں جاتا۔

ماں۔ تم اٹھو، کچھ تھوڑا سا کھا تو لو۔ دیکھو، ابھی بات کی بات میں سر کا درد دور ہوا جاتا ہے۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ عادت کے خلاف بھوکے رہنے سے سر بھاری ہوگا۔

جہاں تم کھانا کھاکر ذرا لیٹی وہیں طبیعت ہلکی ہوئی۔

رام کلی۔ کیا کہتی ہو اما، سر میں تو وہ درد ہے کہ معلوم ہوتا ہے، پھٹ پڑے گا اور حرارت بھی ہو آئی ہے۔ اس وقت میں کھانا وانا نہیں کھانے کی۔

ماں۔ ارے اور کچھ نہیں سنا، وہ آئے ہیں، للو بھیا نا!

(یہ رام کلی کے شوہر کا دُلارا نام تھا)

رام کلی۔ (کچھ شرما کر) سچ۔

ماں۔ہاں ہاں سچ، اور کیا تم سے جھوٹ بولنے جاؤں گی!

رام کلی۔ کب آئے اور کیا کرنے آئے؟

ماں۔ اور لو، کیا کرنے آئے! ارے ہم لوگ ہردم منہ پسارے رہتے ہیں کی کسی طرح اِدھر بھی آجایا کریں۔ ہردم انھیں پر جی لگا رہتا ہے۔ بوڑھوتی میں نراین دعا سُن لیتے، ایک ناتی دے دیتا، ذرا اس کا بھی سکھ بھوگ لیتی، نہیں تو من کی لالسا من ہی میں رہ جائے گی۔

رام کلی۔ (جھینپ کر) کب آئے؟

ماں۔ ارے ابھی ابھی تو جلتی دُپہریا میں دھاوا مارتے چلے آرہے ہیں۔ کہتے تھے کہ بنّو کو اب کی لِوا لے جائیں گے۔ تمھاری ساس ذرا بیمار ہیں۔

رام کلی۔ مر بھی جائے کسی طرح تو اس آئے دن کی دانتا کلکل سے تو چھٹی ملے! نہ معلوم عاقبت کا بوریا بٹورے گی کیا! سیکڑوں ہی دفعہ تو سُن چکی ہوں کہ بیمار ہیں، مرا چاہتی ہے، دم ٹوٹا چاہتا ہے، گھٹکا لگا ہے، اب تب ہو رہی ہیں، مگر جب دیکھو اچھی خاصی، ہٹی کٹی، موٹی تازی، چاق چوبند، مودی خانے کی چوہیا کی طرح سنڈا بنی بیٹھی رہتی ہیں!

ماں۔ بس کر چھوکری، بس کر، ساس کی خوب ہی عزت کی! یہ بھی کلجگ کا سوبھاو ہے کہ چھوکریاں اپنی بوڑھی، بڑی کو جوتی برابر بھی نہیں سمجھتیں، ان کے لتّے لے ڈالتی ہیں۔ کوئی کسر اُٹھا نہ رکھے اور نند کو پانی پی پی کر کوسیں۔ آج اگر کچھ برا بھلا آپڑے تو وہی کھوسٹ بُڑھیا آڑے آئے گی۔ تیرا نہ معلوم کیا سوبھاو ہے کہ اس بے چاری کا نام زبان پر آیا اور تونے روئی کی طرح تُوم کر دھر دیا۔ وہ تو تیری

دھول جھاڑا کرتی ہیں اور تو چھوٹے منہ سے بات بھی نہیں پوچھتی۔ تیرا بس چلتا تو تو کبھی کا ساس کا وارا کا نیارا کرچکی ہوتی!

ماں کی نصیحت بھری باتیں سُن کر رام کلی کی کچھ کور سے دب گئی اور وہ اور تو کچھ نہ بولی، چپ چپ منہ پھیر کر لیٹی رہی۔ ماں کا کلیجہ بھلا کب ماننے لگا۔ آخر کو بے چاری خود دوڑی ہوئی آئی۔ منا منوکر اُسے چوکے پر لے گی۔ لذیذ کھانا صفائی سے پروس کر مہارانی کے سامنے دھر دیا، مگر مہارانی بلا بھینٹ بھونٹ لیے کیوں سیدھی ہونے لگی تھیں۔ رام کلی برائے نام کچھ منہ جھوٹا کرکے پھر اپنے بستر پر لیٹ رہی۔ جب رات کے کوئی دس بجے ہوں گے تو للو بھیا دبے پاؤں رام کلی کے کمرے میں آئے اور چپ چاپ چارپائی کے ایک کونے پر بیٹھ گئے۔ رام کلی پر کچھ تو دن بھر کی تھکان یوں ہی چھائی ہوئی تھی، اس پر طرہ یہ ہوا کہ مہنت جی کی شراب نے دماغ کو پھرا دیا تھا۔ اس وجہ سے وہ اس وقت اپنے حواس میں نہ تھی، لاج شرم چھوڑ، ٹانگ پھیلا نیند میں بے حال پڑی تھی، مگر چونکہ نکھ سکھ سے درست تھی، بناؤ سنگار بھی خوب کرلیا تھا، رنگ روپ بھی اچھا پایا تھا اور صورت بھی سو دو سو میں ایک، اس کا شوہر باوجود اس کی تنک مزاجی کے اس پر لٹو تھا۔ گو رام کلی دو ہی چار دن سسرال میں رہی ہوگی مگر اتنے ہی دنوں میں اس کے اور للو بھیا کے درمیان کئی بار من موٹاو کا اتفاق ہوچکا تھا۔ اس وجہ سے وہ بے چارہ دل ہی دل میں کٹے جارہے تھے۔ گو طبیعت کے لگاتار تقاضوں سے مجبور ہوکر وہ یہاں تک آئے تھے لیکن اس وقت دل دھڑک رہا تھا کہ کہیں میں نے اس کو چھیڑا اور اس نے لے دے شروع کردی تو بُرا پھنسوں گا۔ زبان دراز تو ہے ہی، اس کا کون ٹھکانا۔ کوئی آدھے گھنٹے تک تو وہ اسی سوچ وچار میں تھے مگر اتنی دیر میں ان کا سہنا بھی کم ہوا اور انھوں نے ڈرتے ڈرتے اس کے جسم پر ہاتھ رکھا۔ اس مکھن جیسے نرم، بھرے پورے جسم کا ہاتھ سے چھونا تھا کہ جسم میں ایک بجلی سی دوڑ گئی۔ سب ضبط ہوا ہو گیا اور کیوں نہ ہوتا۔ آخر اس ضبط کی تاب کہاں سے لاتا۔ انتظار انتظار میں رات بیتی جاتی ہے۔ اس کی بھی کوئی حد ہے۔ انھوں نے رام کلی کو اس طرح نیند میں مست پایا، سر کے بال کھلے اور بکھرے ہوئے، تو سمجھا کہ یہ بھی اس کی

ایک انوکھی ادا ہے اور معشوقانہ انداز ہے۔ انھیں اس بے تکلفی سے یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ اب دیوتا سیدھے ہوگئے۔ بس انھوں خوب ہی آہستہ آہستہ گدگدانا شروع کیا۔ کوئی آدھے گھنٹے کے لگ بھگ تو انھوں نے خوب ہی ناز برداری کی، کبھی گدگدایا، کبھی بوسے لیے، کبھی آہستہ سے ایک چٹکی بھی لے لی۔ مجبور ہوکر پاؤں بھی دبائے، مگر جاگنا تو درکنار، وہ منکی تک نہیں۔ تب وہ بھی کچھ کھجکھجا سا گیا اور ذرا تیز ہوکر زور سے جھنجھوڑنا شروع کردیا۔ مگر وہ تو نشے میں غین تھی۔ دنیا سے بے خبر۔ للّو کی یہ حکمت بھی بے کار گئی۔ لاچار ہوکر انھوں نے لوٹے کا پانی لے کر منہ پر تابڑ توڑ کئی چھینٹے دیے۔ جب دماغ کو سردی پہنچی تو خمار بھی دور ہوا اور رام کلی نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ ان جادوگر آنکھوں کا کیا پوچھنا۔ ایک تو وہ یوں ہی نرگسی آنکھوں والی عورت تھی، دوسرے خمار کی لالی نے اور بھی غضب ڈھا دیا تھا۔ گویا سونے میں سہاگا ہوگیا۔ اب تو للّو سے رہا نہ گیا اور وہ جھٹ سے جھکے کہ منہ چوم لوں مگر ابھی ان کا منہ کئی انچ کے فاصلے پر ہی تھا کہ شراب کی بدبو اور بھبھک ان کے دماغ تک پہنچ گئی۔ انھوں نے چونک کر منہ ہٹا لیا۔ کچھ سوچ کر انھوں نے پھر بوسہ لینا چاہا مگر پھر وہی گت ہوئی۔ انھوں نے شراب تو کبھی کاہے کو پی تھی، اس کے نام سے بھی نفرت تھی، بلکہ میخاروں کی صحبت سے کوسوں دور رہتے۔ اس وقت جو بدبو دماغ میں اتر گئی تو لاچار طبیعت متلانے لگی اور چند لمحے میں ان کو بڑی زور سے قے ہوگئی۔ رام کلی کی تو وہی گت تھی کہ پیر خود ماندہ درگاہ کہاں سے لگے۔ خود ہی الست ہو رہی تھی، اسے یہ سکت کہاں کہ غیروں کی کھوج خبر لیتی۔ بے چارے للّو کو بڑی تکلیف اُٹھانی پڑی۔ ابھی تک للّو کو اس بات کا وہم یا گمان بھی نہ تھا کہ رام کلی نے شراب پی لی ہوگی لہٰذا اس نے اس کی لاپرواہیوں کو اس کا روکھاپن سمجھا۔ ذرا سی مچھلی ہوتی ہے اس کے بھی پتا ہوتا ہے، آخر یہ بے چارا تو آدمی ہی تھا، کہاں تک غصّے کو ٹھنڈا کرتا۔ اس بے نمکی کو دیکھ کر اس کے بدن میں آگ لگ گئی۔ کوئی کیسے ہی صبر وضبط کا پُتلا کیوں نہ ہو، مگر بیوی کی جانب سے ایسی رُکھائی دیکھ کر غصّے کو نہیں روک سکتا۔ غصّے کو روکنا تو درکنار، اس کی صورت سے اُسے نفرت ہو جائے گی، لہٰذا وہ اُٹھا اور مردانے بیٹھک

کو چلا۔ مگر کنڈی باہر سے بند تھی۔ اب کرے تو کیا کرے، نہ غیریت یہ گوارا کرتی تھی کہ کسی کو اتنے وقت آواز دے، آخر گھر والے کیا کہیں گے، اور نہ تو طبیعت یہی گوارا کرتی تھی کہ پھر اسی جگہ جائے جہاں سے ناراضگی دکھلا کر آیا ہے۔ مگر کرتا کیا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ آخر مجبوراً پھر آکر اسی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اب کی اسے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے وہ کسی چڑیل کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔

قارئین، اب یہ کیسی آنکھ کھولنے والی جگہ ہے۔ شوہر کئی میل طے کرکے آیا ہے اور بیوی صاحبہ کو سر پیر کی خبر نہیں۔ کاش للّو کو اتنا ہی معلوم ہوجاتا کہ اس کو اس وقت کچے گھڑے کی چڑھی ہے تو وہ اسے دور ہی سے نہ سلام کرتا، کاہے کو مفت کی ٹھکٹھک اور سر مغزن کرنے جاتا۔

مگر وہ تو سیدھا سادہ شریف آدمی تھا اور گو لین دین، خرید و فروخت، کاروبار میں بڑا شاطر و چوکس تھا مگر عورتوں کے پھیر میں پڑنے کا کم اتفاق ہوا تھا۔ اس نے دیکھا کہ یہ کم بخت ٹکر ٹکر تاک رہی ہے، چارپائی پر لیٹی ہے اور مجھ کو اس کیفیت میں دیکھ رہی ہے اور منہ سے بولتی تک نہیں! آخر اس کی وجہ کیا ہے، ضرور اس میں کوئی نہ کوئی بھید چھپا ہے۔ مگر انا یہ بھی قبول نہیں کرتی تھی کہ کچھ پوچھے، دیکھیں ماجرا کیا ہے۔ لاچار ہوکر چارپائی پر منہ لپیٹ کر سورہا۔ ہتھیلی ہوس بار بار اُبھارتی تھی کہ اتنی دور سے آئے ہو، دو گال ہنس بول تو لو، مگر واہ رے ضبط، بیوی کو آنکھ بھرکر دیکھا بھی نہیں۔ رام کلی کے منہ سے بدبو اس قدر آرہی تھی کہ سانس لینا دوبھر ہوگیا تھا، مگر نہ کہیں جانے کو جگہ تھی، نہ پاؤں بھی اُٹھتے تھے۔ جب تک وہاں رہا، پڑا رہا۔ اپنی قسمت کو جھینکتا رہا۔ لوگ کہتے ہیں کہ عورت مرد کی رونق ہوتی ہے۔ مرد اگر پھلدار پیڑ ہے تو عورت بیل جو اس حالت میں بھی مرد کو بچاکر رکھتی ہے جب طوفان کے جھکورے اس کو ہر طرف سے جھنجھوڑ کر جڑ سے اکھاڑ پھینک دینا چاہتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ بیوی کا بالکل دارو مدار مرد ہی پر ہے۔ بنا بیوی کے مرد ایسا ہے، جیسے بنا روشنی کا چراغ، بنا پھل کا پیڑ، بنا نمک کا حسن، بنا ہریالی کا چمن، بنا اثر کا گیت، بنا خوشبو کا عطر، بنا پھول پتی کا بسنت، بنا دھار کا ہتھیار، بنا کتاب کا مذہب۔ مگر یہاں تو معاملہ بالکل ٹیڑھا نظر

آتا ہے۔ بیوی گھی کے کپّے کی طرح منہ پھلائے پڑی ہے، میاں الگ ٹرائے ہوئے ہیں، نہ ہنسی مذاق، نہ چہل نہ دل لگی، نہ گپ چپ باتیں نہ لگاوٹ، نہ بات چیت۔ ایسی بے تکی بیوی پر خدا کی مار اور شیطان کی پھٹکار۔ میں جانتا ہوتا کہ یہ چڑیل ایسی ادا سے ملے گی تو کاہے کو جان بوجھ کر اپنے اوپر یہ بوجھ لادتا اور مفت کا دردسر لیتا، مگر گلے میں ڈھول پڑی تو بجانا ہی مصلحت ہے۔ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ محبت سب سے اعلیٰ درجے کا میاں بیوی کے درمیان ہوتی ہے، مگر یہاں تو معاملہ ہی دیگر ہے۔ میں تو قے پر قے کررہا ہوں، کمزوری چھا رہی ہے اور بیوی صاحبہ ہیں کہ پلنگ سے اترنا کیا بات تک نہیں پوچھتیں! للّو کے دل میں خیالوں کا ایک دریا لہریں مار رہا تھا اور قریب تھا کہ اس کا ناتجربے کار دل رونے لگ جائے۔ چونکہ اس وقت تک رات زیادہ بیت چکی تھی، اس وجہ سے رام کلی کا نشہ اتر چلا تھا۔ آخر اس نے خاموشی دور کی اور بولی۔ یہ تم کو سوجھی کیا کہ یکایک ڈولی کھٹولی لے کر سر پر آڈٹے۔ اس جلدبازی سے تو شاید مال گزاری وصول کرنے پیادہ بھی نہ آتا ہوگا!

للّو۔ خیر ہزار شکر ہے کہ تمھارے منہ میں زبان تو ہے، میں تو تمھاری زبان کو رو بیٹھا تھا! کہو خیریت سے تو رہی؟

رام کلی۔ بس اسی بِس کی گانٹھ ملی ہوئی باتوں سے تو میرا کلیجہ جلتا ہے۔ صاف دیکھ رہے ہو کہ بدن مارے بخار کے پُھنکا جاتا ہے۔ سر درد سے پھٹا پڑتا ہے، مگر تم اپنی طعنہ زنی سے نہیں چوکتے! ہاں، رہی تو خیریت سے، فرماؤ کیا فرماتے ہو؟

للّو۔ تمھارے چہرے پر تو بخار کا لیش بھی نہیں ہے۔ ہاں آنکھیں البتہ شرابیوں کی طرح چڑھی ہوئی ہیں۔

رام کلی للّو کی زبان سے شرابی کا لفظ سُن کر کچھ کٹ سی گئی۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں، سب نشہ ہرن ہوگیا۔ ڈری کہ کہیں ایسا نہ ہوکہ تاڑ جائے۔ یا میری حرکتوں سے کچھ کھٹک جائے تو ناحق کی شرمندگی ہو اور مفت کی ذلت ہو۔ اس نے فوراً اپنی پریشانی کو اطمینان کے پردے میں چھپایا اور بولی۔ میں تم سے پوچھتی ہوں کہ تم کو ایسی کون سی جلدی پڑی تھی کہ مع ڈولی کہار سر پر آموجود ہوئے؟ آج کل تو یوں ہی میری جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ بیچ میں تم بھی

جلانے کو آدھمکے!

للّو۔ آخر ہے کیا، آپ پر ایسی کون سی مصیبت آپڑی ہے کہ جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں؟

رام کلی۔ وہی مثل ہے کہ جاکے پیر نہ پھٹی بیوائی وہ کیا جانے پیر پرائی۔ آنکھیں کہیں چرنے گئی ہیں، دیکھتے نہیں ہو کہ سوکھ کے کانٹا ہوگئی ہوں، اُٹھنے بیٹھنے کی سکت نہیں۔ یہاں تو بھلا ماں باپ موجود ہیں، نہیں تو کچھ ہوتا تو ذرا میٹھی میٹھی باتیں ہی کرکے دل بہلا دیتے ہیں، ذرا جی کو دھارس ہوجاتی ہے کہ ہے کوئی آگے پیچھے دُکھ درد کا ساتھی۔ تمھارے یہاں تو وہی اُٹھتے جوتی بیٹھتے لات۔ وہ جو تمھاری اماں جان ہیں، ایشور ایسے آدمی سے ساتویں بیری کا ساتھ نہ کرائے، ان کا نام ہی سُن کر میری جان سوکھ جاتی ہے! اور پھر کریلا سو بھی نیم چڑھا، ایک تو ایشور نے انھیں یوں ہی اپنے خاص ہاتھوں سے بنایا ہے دوسرے بیماری نے ان کو اور بھی چڑچڑا، بدمزاج اور غصّے ور بنا دیا ہوگا۔ نا بھیّا میں تمھارے ساتھ ہرگز نہ جاؤں گی! معاف کرو!

للّو بے چارے چپ چاپ فکرمند بیٹھے تھے۔ بیوی کا چکما چل گیا، اور ان کو کچھ کچھ یقین ہو چلا کہ یہ ضرور بیمار ہے۔ اب کریں تو کیا کریں۔ کبھی سوچتے تھے کہ لاؤ لواتے چلو، وہیں چل کے دیکھ لیا جائے گا۔ پھر سوچتے تھے کہ مفت کا ہلکان کون بڑھائے۔ ایک مریض ہے جب تو اس کی دیکھ بھال اور تیمارداری مشکل سے ہوپاتی ہے، جب ایک چھوڑ دو دو ہوجائیں گی تو بھلا کیسے نبھے گی؟ رشتے داروں میں بھی ایسا کوئی نہیں جس کو اس گاڑھے وقت پر تکلیف دی جائے۔ بے چارے اسی کش مکش میں بڑی دیر تک پڑے ہوئے تھے۔ آخرکار ان کے خیالات چلتے پھرتے نظر آئے اور ان کا پکّا ارادہ ہوگیا کہ جو ہو ہو اس کو اب کے لواتے چلنا ہی ٹھیک ہے۔ آخرکار جو ڈولی کہار کا خرچہ پڑگیا تھا وہ بیکار کیوں جائے۔ جب انھوں نے پوری طرح سوچنے و چارنے، اُلٹ پھیر، اونچ نیچے سمجھنے کے بعد پکّا ارادہ کرلیا تو رام کلی سے آکر بولے، گو اس کی رُکھائی نے ان کے دل کو ٹھیس ضرور پہنچائی تھی مگر یہاں پر بے موقع اور بے محل سمجھ کر وہ اس کو ظاہر کرنا ٹھیک نہیں سمجھتے تھے۔

للّو۔ کیوں، تم کو میرے یہاں چلنے میں کوئی عذر ہے؟

رام کلی۔ سراسر۔ اس بوڑھی جیٹ کے ساتھ تو میری چلائی ایکدم نہ چلے گی۔ دن رات توتو میں میں، چوبیسوں گھڑی کی ہے ہے کھے کھے برداشت کرنے کے لیے تو میرے دماغ میں قوت نہیں۔ گھنٹہ بھر تو چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوگا۔ دن رات انھیں سے تلوے سہلاتے بیتے گی۔ باز آئی اس سے۔

للّو۔ بھئی، معاملے کی ایک بات ہم سے سنو۔ ہم میں اور تم میں جو تعلق ہے اس کا تقاضہ یہی ہے کہ تم اماں کی خدمت میں ہردم لگی رہو، ان کی عزّت اپنی ماں سے بھی زیادہ کرو، ان کی مصلحت بھری نصیحتوں اور سکھاون کی باتوں کو سر اور آنکھوں پر چڑھاؤ۔ سسرال میں چار بات سہہ کہ رہنا ہوتا ہے۔ تمھاری زبان تو بڑی، سوا گز کی، اس پر طرہ یہ کہ ماں باپ کے لاڈ پیار نے تمھارے مزاج میں ایک قسم کا طنطنہ اور گھمنڈ پیدا کردیا ہے۔ اس وجہ سے تم کو اس کی سیدھی بات بھی ٹیڑھی معلوم ہوتی ہے، نہیں تو جو کچھ وہ کہتی ہے، تمھارے ہی بھلے کو کہتی ہے۔ اس کی زندگی کا اب آسرا ہی کیا۔ قبر میں پاؤں لٹکا ہی بیٹھی ہے، آج نہ مری، کل مری، کل نہ مری پرسوں مری۔ پھر اگر اس چل چلاؤ کے وقت اس کو آرام نہ دوگی تو اس کو کیا معلوم ہوگا کہ بیٹا بہو سے کون سا سکھ بھوگنا ہوتا ہے۔ سمجھے گی کہ ایسی انہونی اولاد کے بدلے کاش پتھر جنی ہوتی تو اچھا ہوتا۔ بنّو تمھارے مزاج میں کچھ لڑکپن کی بو ابھی باقی ہے۔ تم کو معلوم نہیں کہ لڑکوں پر ماں باپ کے حقوق کتنے زیادہ ہوتے ہیں۔ میری بات مانو، اب کہ میری خاطر سے چلی چلو۔ ذرا اماں کو وقت سے دودھ وغیرہ دینے کا خیال رکھنا۔ اور دوسرا کام ہی کیا ہے۔ کچھ تمھیں اکیلی تو نہیں، ایشور کی کرپا سے دو تین لونڈیاں بھی موجود ہیں۔ اوپر کا کام کاج تو سب وہی کرلیتی ہے۔ تمھارے رہنے سے اماں کو ذرا دھارس ہوتی رہے گی، بس اور کوئی بات نہیں۔

رام کلی۔ یہ سب تمھاری چکنی چپڑی باتیں ہی باتیں ہیں۔ ان خالی خولی باتوں سے کیا حاصل؟ یہاں تو ایسی ملائمیت سے کہہ رہے ہو، وہاں پہنچنے پر ہر بات میں ایک نہ ایک کھوچڑ نکالا کروگے، دوا کیوں نہیں دی گئی، حکیم صاحب کیوں نہیں بلائے گئے، یہ کیوں نہیں کیا گیا وہ کیوں نہیں کیا گیا! وہ تو میں جانتی ہوں۔ تمھارے گھر کا

کارخانہ تو کچھ ایسا بگڑا ہوا ہے کہ اس میں ہاتھ ڈالنے کو جی نہیں چاہتا۔ لونڈیاں جتنی ہیں انسانیت سے خارج۔ زبان دراز، منہ پھٹ، تڑتڑ بات پلٹنے کے سوا اور کچھ جانتی ہی نہیں۔

للّو۔ یہ سراسر جھوٹ الزام ہے۔ ہمارے یہاں کی لونڈیاں ہرگز ایسی نہیں ہیں۔ ان پر الزام لگانا چاند پر تھوکنا ہے۔ (اس مثال پر خود ہی مسکراکر) سب کی سب نمک حلال، ایماندار، با وفا، وقت بے وقت سخت و سُست بھی کہہ دو تو دم نہ لیں۔ رہی یہ بات کہ یہ کیوں نہیں کیا، وہ کیوں نہیں کیا۔ اگر تم سب کام میری مرضی کے موافق کروگی تو میں ایسا کہنے ہی کیوں لگا؟ اور بالفرض اگر دو چار باتیں تاکیداً کہہ بھی دیں تو کیا جسم میں داغ لگ گیا۔ تم کو تو یہ باتیں چابک کی طرح ہونا چاہیے۔ پھر ایسی حرکت ہی کیوں کریں جو بات سُننے کی نوبت آئے۔ بیٹیاں، بہوئیں، کچھ بڑی بوڑھی تو ہوتی نہیں کہ ان کی عزّت اور تعظیم بزرگوں کی طرح کی جائے، ہر شخص ان کے سامنے سر جھکائے۔ انھیں تو ناتجربہ کار اور نادان سمجھ کر گھربھر کے لوگ سکھاون کی باتیں کہتے ہیں، تو اس میں بُرا ماننا کیا۔

رام کلی۔ کچھ میں ایسی اناڑی بھی نہیں ہوں۔ یہ تو میں صاف صاف سمجھتی ہوں کہ بہو کو لازم ہے کہ ساس نند کی عزّت کرے، ان کے چرن دھو دھو پیے، مگر جب وہ اس قابل ہوں بھی۔ وہ تو عقل کے پیچھے لٹھ لیے دوڑ رہی ہیں اور مارے طعنوں کے کلیجے کو چھید رہی ہیں، اور ہم ہیں کہ ان کے قدموں پر گرے جاتے ہیں۔ آخر ان کو بھی تو یہ عقل ہونا چاہیے کہ بے چاری اس قدر چوطرفہ جھاڑ سنا کرتی ہے، اسے اب زیادہ نہ جلاؤ۔ ایسی ساس جائے چولہے میں جو ہروقت جلی کٹی سنایا کرے۔ ایسی نند جائے بھاڑ میں جو بات بات پر ناک بھنوں سکوڑا کرے، طعنے مارا کرے۔ میرا کلیجہ تو ایسا پک گیا ہے کہ اب اس گھر میں قدم رکھنے کی ہمت نہیں ہوتی ہے۔

الغرض، آدھی رات تک ان دونوں میں یہی جحت اور تکرار، بحث و مباحثہ ہوتا رہا۔ للّو اس کو اونچا نیچا سمجھاتے تھے، فرض اور مصلحت کے مسئلے اس کے دل کی تختی پر ثبت کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ مگر وہ تھی کہ اپنی ہٹھ تھی۔ فرض کون چیز ہے۔ ہٹھ دھرمی سے باز نہیں آتی۔ سب کچھ ہوا ہوایا مگر نتیجہ وہی ٹائے ٹائے فس۔

للو۔ بھلا جب تم میری مصیبت میں ہاتھ نہ بٹاؤ گی، میری گتھی نہ سلجھاؤ گی، میرے بھلے بُرے کے نزدیک نہ پھٹکو گی، میرے گھر سے کوئی واسطہ سروکار نہ رکھو گی، تو مجھے تمھارے ہونے سے فائدہ، میرے نزدیک تو تمھارا ہونا نہ ہونا دونوں یکساں ہے۔ جیسے کتنا گھر رہے ویسے رہے بدلیں۔ خیر، اب اس مسئلے پر میں تم سے فضول، سر مغزن نہیں کرنا چاہتا۔ تم چاہے مانو، چاہے نہ مانو، سویرے تڑکے میں تمھارے باپ سے اس بات کا قطعی فیصلہ کرلوں گا۔ اگر اس مرتبہ انھوں نے آنا کانی بتلائی، ٹال مٹول کیا تو بندہ پھر کبھی رخصتی کرانے نہیں آئے گا۔ تب لاچار ہوکر گلے لگاتے پھریں گے۔

رام کلی۔ اجی ہوش کی دوا کرو۔ کچھ بھنگ تو نہیں کھاگئے ہو! ہوں، کیا خوب، اب میرے ماں باپ ایسے بھِک منگے بھی نہیں ہیں، کہ میری روٹی ان کی بھاری ہو۔ دل میں تو پھولے نہ سماتے ہوں گے کہ اچھا ہوا سر کا بوجھ دور ہوا، مفت کا جھنجٹ مٹا، ظاہرداری کے لیے اتنی باتیں اور بھی کہہ ڈالیں۔ لڑکیوں کو داماد کے گلے لگاتے پھرنا تمھارے ہی یہاں ہوتا ہے، ہمارے یہاں لڑکیاں ایسی دور دور، ہٹ ہٹ نہیں ہوتیں۔

للو۔ تو کیا لڑکیوں کو یہاں گھر میں بٹھلاکر اچار ڈالتے ہیں یا کھونٹے میں باندھ کر حل جوتنے میں لگاتے ہیں، آج تو یہ بات انوکھی سنی!

رام کلی۔ ذرا زبان سنبھال کر، کوئی کچی پکی بات نہ نکلنے پائے نہیں تو کہے دیتی ہوں! تمھارے ہی یہاں لڑکیاں حل میں جوتی جاتی ہیں۔ ہے نہ تمھاری ایک بہن، زندگی بھر سے چھاتی پہ کودوں دَل رہی ہے اور تم سے کچھ کرتے دھرتے نہیں بنتا۔ سچ پوچھو تو انھوں نے میرا دم ناک میں کر رکھا ہے۔ جب دیکھو میرے پیورے کو اگھٹ رہی ہیں۔ آخر تمھیں بتاؤ، میرا پورا کیا خراب تھا۔ جب سے میرے قدم تمھارے گھر میں گئے، تمھارے بھی بھاگ لوٹے۔ زمانے بھر کی نحوست دور ہوئی۔ نون تیل بیچتے بیچتے دَم نکلتا تھا، اب مزے سے گدی، مسند لگائے ساہو بنے بیٹھے ہو۔

باتوں ہی باتوں میں بات بڑھتے بڑھتے بڑھ گئی۔ للو ذرا جلدی ناراض ہوجانے والے آدمی تھے، وہ بددماغ ہوکر کمرے سے باہر نکل کر چلے گئے۔

صبح کی سفیدی نظر آرہی تھی۔ اس وجہ سے گھر میں بھی جاگ ہوگئی تھی۔
للّو کے جانے کے بعد رام کلی نے خوب خوب مسودے باندھے، خوب دماغ لڑایا، قوتِ خیال پر خوب زور دیا، مگر کوئی تدبیر چلتی نہ دکھائی دی۔ بیمار تو پہلے بن چکی تھی اور یہ بات بھی خوب سمجھتی تھی کہ اب کہ ماں باپ ضرور رخصت کردیں گے۔ لہٰذا وہ اس اُدھیڑ بُن میں تھی کہ کوئی چال چلے جس سے رخصتی ٹل جائے۔ ایسا پانسا پھینکے کہ ہرگز پٹ نہ پڑے۔ بس اس نے ایک اور ناٹک رچا۔ اس کے پاس جتنے دھراؤ کپڑے و زیور تھے جن کو وہ شادی بیاہ، کام کاج، میلے ٹھیلے، میں پہن کر ٹھسّے سے نکلا کرتی تھی، ان کی ایک چھوٹی سی پوٹلی باندھی اور ایک پُرانے مٹی کے گھڑے میں جو عرصے سے خالی پڑا ہوا تھا، چھپاکر ڈال دیا اور چپ چاپ لیٹ رہی۔ نور کے تڑکے اس کی ماں اس کے پاس آئیں اور کہنے لگیں۔ ارے بٹی رام کلی اٹھو، ہاتھ منہ دھولو، کنگھی چوٹی سے درست ہولو، گہنا کپڑا پہن اوڑھ لو، سویرے سویرے مانگ وانگ بھر دوں، للّو بابو آج ہی جانے پر تُلے ہوئے ہیں۔ بہت سمجھایا مگر وہ کسی کی سنتے ہی نہیں۔ وہی چڑے کی ایک ٹانگ، کہ اماں بیمار ہیں۔ ارے بیمار ہیں تو اچھی ہوجائیں گی، مگر وہ ٹھہرے چھوٹے، اب ان کے منہ کون لگے۔

رام کلی اُٹھی اور معمولات سے فارغ ہوکر ماں کے پاس اداس چہرہ بناکر بیٹھ گئی۔ بے چاری ماں کی یہی اکیلی بچّی تھی۔ جب اس نے اس کو یوں مرجھایا ہوا دیکھا تو بے اختیار اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، مگر آنسو پی کر بولی۔ اب دیر کیوں کرتی ہو بٹی؟ دھوپ تیز ہوجائے گی تو ناحق بہ ناحق کی زحمت اُٹھانی پڑے گی۔ سر میں تیل ڈال لو۔ آؤ تمھاری چوٹی گوندھ دیں۔ بہت زیادہ ٹیم ٹام کی تو کوئی ضرورت ہی نہیں کیوں کہ گھر بھر میں دوہی اور مرغیاں ٹڑوٹوں ہیں۔

رام کلی۔ (آنکھ میں پانی بھرکر)۔ اماں، تم چھاتی پر پتھر رکھ کر مجھ کو وداع کیے دیتی ہو۔ ہاں کیا اتنے ہی میں میں تم کو بھاری ہوگئی؟

ماں۔ نہیں بٹیا، تم میری آنکھوں کی پُتلی ہو۔ جب تک تم نہ رہوگی بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپا کروں گی۔ جس دن پھر تم سے ملوں گی اسی دن گویا میرے دن پھیریں

گے۔ بھلا تمھیں سوچو کہ ایشور نے وہ بھی تو دو چار نہیں دیے کہ انھیں دیکھ کر کلیجہ کو ٹھنڈا کرتی۔ ہماری ساری زندگی کی کمائی تمھیں ہو۔ ناراین کرے تم سدا دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو، کہ تمھاری سرسبزی کی سُن گن پاکر میرا کلیجہ بھی ٹھنڈا ہو۔ تمھارے بنا مجھے چھن بھر تو چین آنے کا نہیں، کبھی بھیتر کبھی باہر بوکھلائی ہوئی دوڑا کروں گی۔ ہمارے سارے ارمان تمھارے ہی ساتھ جڑے ہیں۔ ایشور وہ دن لاتا کہ ہماری آس بھی پوری ہوجاتی۔ بیٹا رنج، مت کرو، ہنسی خوشی جاؤ۔ کچھ کالے کوس تو ہے نہیں، ایشو چاہے گا تو ہم اسی اٹھوارے میں تم کو بُلا بھیجیں گے۔ جب تک ہماری جان میں جان ہے تب تک تم کو کب چھوڑیں گے۔ ہاں جب آنکھ موندلوں گی تب مجبوری ہے۔ سچ ہے، پرائی تریا میں کوئی بس نہیں، نہیں تو ہم تمھیں لاکھ جنم تک چھوڑتے ہی نہیں۔

یہ کہہ کر وہ بے چاری بلک بلک کر رونے لگی۔ اب تو رام کلی نے وہ ناٹک کھیلا، وہ پھیرپھندے رچے کہ خدا کی پناہ۔ کبھی تو باپ کے قدموں کو پکڑ کر آنسوؤں سے تر کردیتی تھی، کبھی ماں کے گلے مل کر خوب گلا پھاڑ پھاڑ کے بیان کرتی تھی۔ ممتا کی ماری ماں بھی آٹھ آٹھ آنسو رو رہی تھی۔ باپ کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کی ندی جاری تھی۔ اڑوس پڑوس کی عورتیں آنکھوں کی کھجلی مٹانے کے واسطے پہنچ گئی تھیں اور جیوں جیوں دن چڑھتا تھا عورتوں کی تعداد زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ کوئی سر کے بال سنبھالتی، دودھ پیتے بچّے کو گود میں کھلاتی چلی آتی تھی، کوئی لہریا دار دوپٹا پھڑکاتی مکان میں داخل ہوتی تھی۔ بڈھی عورتیں مع کنبے بھر کی عورتوں کے چلی آرہی تھیں۔ غرض کہ تھوڑی دیر میں وہ مکان رنگی ہوئی گڑیوں سے بھر گیا۔ کوئی اپنے بچّے کی تعریف کرتی تھیں، کوئی اپنے زیورات کی تعریف میں سرگرم تھی۔ غرض کہ تھوڑی دیر کے واسطے وہ مکان غیب خانہ بن گیا۔

ایک بوڑھی عورت۔ (جھوٹ موٹ آنسو پونچھ کے اور ناک صاف کرکے)۔ چپ رہو بہنا، چپ رہو۔ ہنستی کھیلتی اپنے گھر کو جاؤ کہ ہنستے ہی گھر بستے ہیں۔ ارے یہ مصیبت نگوڑی کچھ تمھارے ہی اوپر نئی نئی تو آئی نہیں۔ ہم میں سے سب کو ایک دفعہ یہ مصیبت اُٹھانی پڑی۔

دوسری عورت۔ کیا کروگی رو رو کے بیٹا، ہم نے پورنج میں نہ معلوم کون سا ایسا پاپ کیا تھا
کہ آج تک اس کی سزا بھوگ رہے ہیں۔ بچپن میں تو ماں باپ کی گود میں پالے
پوسے گئے۔ جب ذرا بھلا بُرا، اپنا پرایا سمجھنے کے قابل ہوئے تو اپنے ہی گھر والوں
نے دشمن بناکر نکال دیا۔ کیا کروگی، یہ رواج نگوڑا تو پُرانے زمانے سے چلا آتا ہے۔
تیسری عورت۔ محبت بھی کیسی بُری چیز ہے۔ اب بے چاری ماں پتھر کا کلیجہ کرکے تب
رخصت کرے گی۔ کیسی داہ ہوتی ہے اولاد کی! ماں نے لاکھ لاکھ اپائے جتن کرکے
تو ان کو اپنے برابر کیا، ان کے پیچھے رات کو رات اور دن کو دن نہ سمجھا، ان کے
آرام کو اپنا آرام اور ان کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھتی رہی، ان کی طبیعت ذرا بھی گڑبڑ
ہوئی کہ اب بے چاری ماں کے جسم میں کپکپی آگئی، اوجھا کو بلاؤ، سوکھا کو دکھاؤ، اِن
کو بلاؤ، اُن کو بلاؤ، جھڑاؤ، پھُکاؤ۔ جب اتنا جتن کرکے بچّے کو بڑا کردیا تو نراین نے
ماں بیٹی کو جنم بھر کے لیے بچھڑا دیا۔ اب اگر ایسا ہی زبردست نصیب ہو تو آپس
میں ملاقات ہو۔
چوتھی۔ (آنسو بہاکر) کیسی سیدھی سچّی، ملنسار اور سب کی پیاری لڑکی تھی بے چاری۔ چاہے
کیسا ہی رنج کیوں نہ ہو لیکن جہاں اس کا ہنس مکھ چہرہ دیکھا کہ سب دُکھ درد بھول
جاتا۔ اب اس گھر پر سیاپا چھا جائے گا۔ یہیں پر ہم جولی سکھیوں، سہیلیوں کا ایک
جمگھٹ رہا کرتا تھا مگر اب تو شاید کوئی بھول کر بھی ادھر نہ آئے گا۔
پانچویں۔ جو کہ ایک نوجوان خوب صورت عورت تھی اپنے پاس کی ایک عورت سے آہستہ
آہستہ کہنے لگی۔ بہنا، یہ سب تو رسمی رونا ہے، یہ بھی کوئی رونا ہے۔ باچھیں تو کھِلی
جاتی ہوں گی، کلیجہ ہاتھو اُچھلتا ہوگا کہ اب کوئی دم میں مزے سے چین اُڑاؤں گی۔
مگر کیا کرے بے چاری، دکھاوے کے لیے اتنا بھی نہ روئے! مجھ کو تو اس کی آواز
صاف صاف بناوٹ کی سی معلوم ہوتی پڑتی ہے!
چھٹویں۔ نراین ساتویں بیری کو بھی اولاد کے بچھڑنے کا دُکھ نہ دے!

القصہ تھوڑی دیر میں تمام ہمدردی کے الفاظ کے خزانے کو خرچ کرکے یہ
عورتیں اپنے اپنے گھر کو چلیں۔ اس وقت تک رخصتی کا سب سامان ہوگیا۔ اب ماں
نے رام کلی کا صندوقچہ کھولا کہ گہنا کپڑے پہنا دے اور خوب بناؤ چناؤ کرے۔ تالا

کھول کر جو دیکھتی ہے تو نہ زیور نہ کپڑا، کلیجہ دھک سے ہوگیا۔ کاٹو تو لہو نہیں۔ جسم میں ایک گنگنی سی آگئی۔ ہانپتی ہوئی رام کلی کے پاس پہنچی اور ہوش و حواس کھوکر اس سے پوچھنے لگی۔ کیوں بتو، تم نے اپنی گہنے والی پوٹلی کہاں رکھی؟

رام کلی اطمینان کے لہجے میں بولی۔ کیوں کیوں، اس قدر پریشان کیوں ہو؟ اس صندوقچی میں تو سب تہ کرکے حفاظت سے رکھا ہوا ہے۔

ماں۔ (مایوسانہ لہجے میں)۔ ارے اس میں تو ایک تنکا بھی نہیں ہے! ہائے رام کلی غضب ہوگیا غضب!

اب تو رام کلی بھی بدحواس بن گئی۔ دونوں کی دونوں جھپٹ کر پھر اسی کمرے میں داخل ہوئیں، دیکھا تو صندوقچہ کھلا پڑا ہے۔ زیور کپڑے کا نام نشان تک نہیں۔ اب تو اماں جان کے رہے سہے حواس بھی کافور ہوگئے۔ سٹی پٹی بھول گئی۔ عورتوں کو گہنے کپڑوں سے جتنی محبت ہوتی ہے، وہ دن کے سورج کی طرح روشن ہے۔ وہ اس کو جان سے بھی زیادہ پیارا سمجھتی ہیں۔ ان کا یکایک غائب ہوجانا کوئی معمولی بات تو نہیں۔ ان کی سمجھ میں تو اس سے بڑھ کر اور کوئی مصیبت آہی نہیں سکتی تھی۔ بڈھی ماں کے ہوش اُڑگئے، کلیجے میں دھک دھکاہٹ پیدا ہوگئی، اور تو کچھ نہ ہوسکا، سینے میں دو ہتر مار کر لگی چیخنے۔ ارے لوگوں، ہائے دوڑو، غضب ہوگیا! ارے میں تو لُٹ گئی، کہیں کی نہ رہی۔ اس ناشدنی قسمت نے کہیں کا نہ رکھا۔ ابھی نامعلوم کہاں کہاں کنویں جھکوائے گی، نہ معلوم کس کس کی جوتی کھلوائے گی! ہائے اب کون منہ دکھلاؤں گی! ارے باپ رے باپ! ارے باپ رے باپ!

یہاں جو یہ چیخنا چلانا، رونا دھونا مچا تو مردانے میں لوگ گھبرا اُٹھے۔ رام کلی کے باپ تو بے چارے بڈھے آدمی، دوڑے ہوئے گھر میں آئے اور بیوی کا ہاتھ پکڑ کر لگے پوچھنے۔ ارے بابا صبر کرو۔ دھیرج دھرو، کچھ تو کہو کیا ہوا۔

ماں۔ ارے غضب ہوگیا غضب! اور کیا ہوا آسمان ٹوٹ پڑا! کہیں منہ دکھانے کے لائق نہ رہی!

باپ۔ ارے کچھ زبان سے کہو بھی تو بھائی کہ اس کا علاج کیا جائے۔ زبان سے تو کچھ کہتی نہیں ہو، ناحق کو رو روکر آسمان سر پر اُٹھائے ہو۔

ماں۔ ارے اس بڑھوتی میں کلنک کا ٹیکا ماتھے لگا۔ جو کچھ کبھی نہ ہوا تھا وہ آج ہوگیا۔ رام اب کون جگت کروں!

باپ۔ (جھلا کر)۔ اب اسی وقت تو تمھارے حواس بگڑے ہوئے ہیں، بوکھلائی ہوئی ہو۔ ذرا صبر سے کام لو، گھبراؤ نہیں، آخر کہو تو کیا ہوا؟

ماں۔ کیا کہوں کیا ہوا۔ میری بچّی کو موس لے گیا۔ ایشور اس کا ستیاناس کرے۔ موڑی کاٹے کے گھر میں کوئی نام لیوا پانی دیوا نہ رہ جائے۔ میں آج اس کی مٹی نکلتے دیکھوں۔

باپ۔ تمھاری انھیں اول جلول باتوں پر غصّہ آتا ہے۔ زبان سے کچھ صاف صاف کہو، آخر ہوا کیا جو تم اس قدر بدحواس ہو گئیں؟

ماں۔ بچّی بنّو کے گہنے اور کپڑے اس صندوقچی میں نہیں ہیں جس میں اس نے کل اُتار کر رکھا تھا۔ ابھی کل میرے سامنے اس نے سب اُتار کر رکھا ہے۔ اب آج ہی اس کی رخصتی کی ساعت ٹھہری، اب کیا کروں۔ میری عقل تو کچھ کام نہیں کرتی۔ ہائے نراین۔

باپ۔ پہلے اپنے گھر میں خوب اچھی طرح تلاش کرلو۔ صندوق کے نیچے اِدھر اُدھر، طاق پر، الماری میں اچھی طرح دیکھ بھال لو، کالا چور تو آیا نہیں تھا، ہوگا تو اسی گھر میں ہوگا۔

ماں۔ ارے اس گھر کا تو چپا چپا چھان چکی نہ معلوم کس اَن دیکھنے نے میری لڑکی کو اس قدر بے پردہ کردیا۔ دیوی مہارانی کا کوپ اس پر آوے۔

باپ۔ خیر، زیور ہی تھے، اگر کوئی اُڑا لے گیا تو اس کا رونا کیا۔ زندگی باقی ہے تو ویسے زیور پھر بن رہیں گے۔ کچھ انھیں سے خاتمہ تو ہو نہیں گیا۔ میں تو سمجھا کوئی آفت نازل ہوئی کہ یکایک گھر کیا ماتم کا گھر ہوگیا۔

ماں۔ تمھاری عقل تو چاٹ گئی دیمک۔ آج ہی تو اس کی وداعی کی ساعت ٹھہری اور آپ فرماتے ہیں کہ زندگی رہی تو پھر بن رہیں گے۔ وہ تو بنتے بناتے رہیں گے مگر جو کھڑاگ اس وقت پھیلا ہوا ہے اسے تو سلجھاؤ۔ جو معاملہ اس وقت درپیش ہے اُسے تو حل کرو۔

باپ۔ اب اس وقت میں کھڑے کھڑے کیا ہوسکتا ہے؟ اکبارگی میرا کیا تو کچھ نہیں ہوسکتا۔

رخصت کردو، اپنے ہی گھر تو جارہی ہے، کسی بے گانے کے گھر تو جا نہیں رہی ہے۔ ہم بہت جلد اس کا انتظام کردیں گے۔

ماں۔ اسی سے تو کہتی ہوں کہ بڑھوتی میں تمھاری عقل دیمک چاٹ گئی۔ ارے اتنی بڑی تو ہوئی، کچھ نہیں تو ہزاروں ہی بہوئیں، لڑکیاں بھیتر باہر آتے جاتے دیکھی ہوں گی۔ بھلا کوئی بھی ایسی چھچھ مُچھ دیکھ پڑی! بدن پر معمولی بھی تو گہنے نہیں، تنکا تنکا تک جھاڑ لے گیا ڈاڑی جار۔ ایشور کرے آج ہی اس کی میت نکلے! جیسے اس نے میری بچّی کو جلایا ہے، ویسے ہی دیوی ماتا اس کو جلائیں!

(فائل میں ۱ر ستمبر ۱۹۰۴ء کا شمارہ نہ ہونے سے ایک قسط نہیں)

(۴)

دلاری۔ کیا؟ کہو خیریت تو ہے؟

رام کلی۔ آج میں ذرا لنکیشور ناتھ کے مندر تک جاتی ہوں، تم بھی میرے ساتھ چلی چلو۔

لنکیشور ناتھ کا نام سنتے ہی رام دلاری کے چہرے کی رنگت کچھ کی کچھ ہوگئی۔ کہاں تو وہ اس بے تکلفی سے بلبل کی طرح چہک رہی تھی، کہاں اس نام نے اس کو سناٹے میں ڈال دیا۔ اس کی نظریں نیچے کی طرف گڑھ گئیں اور اس پر شرم کے مارے گھڑوں پانی پڑگیا۔ وہ جھینپ کے مارے سر نیچا کیے چپ چاپ کھڑی ہوگئی۔

رام کلی۔ کیوں بہن چلتی ہونا؟ چلو سویرے سویرے لوٹ آئیں۔

دلاری۔ بہن، مجھ کو معاف رکھو۔ میں مندر اس وقت نہ جاؤں گی، اسنان پوجا سے فارغ ہوچکی ہوں۔

رام کلی۔ بس لگی نا تو معشوقوں کی طرح نخرے بگھارنے، چل اُٹھ ایشور جانے ابھی لوٹ آئیں گے۔

دلاری۔ تم تو وہاں جاتی ہو، وہیں کی ہو رہتی ہو۔ وہاں لگو گی اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے اور مجھ دیر ہوگی۔

رام کلی۔ واہ رے دیر والی، ایک تو ہی تو انوکھی لڑکی ہے! سارا زمانہ جاتا ہے تو نہیں دیر

ہوتی، ان کو دیر ہوجائے گی، صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتی کہ ہم نہیں جائیں گے۔

دلاری۔ بہن، تم تو ناحق ناراض ہوتی ہو۔ دادا جی تھوڑی دیر میں آتے ہوں گے۔ اماں کی طبیعت ذرا ڈھیلی ہے، نہیں تو چلنے میں کون عذر تھا، جب چاہتی، لوٹتی۔

رام کلی۔ اچھا آج میری خاطر سے چلی چلو۔

دلاری۔ تمھاری خاطر تو ہر حالت میں مجھ کو منظور ہے، مگر ایشور جانے اس وقت نہ معلوم کیوں کلیجے میں دھڑکن ہو رہی ہے۔ کہیں دادا جی خفا نہ ہوں۔

رام کلی۔ خفا ہوکر کیا کرلیں گے، کیا جان مار ڈالیں گے۔ ایک دن میری خاطر سے خفگی بھی سہہ لینا۔

یہ گستاخانہ جملہ اور بے جھجک بات سن کر دلاری اچنبھے میں آگئی اور بڑے تعجب سے رام کلی کے منہ کی طرف ٹکٹکی لگاکر دیکھنے لگی۔ آخرکار اس نے دھیمی آواز سے کہا۔ بہن، میں تمھاری خاطر سب کچھ کرسکتی ہوں مگر ماں باپ کی نافرمانی نہیں کرسکتی۔

رام کلی۔ سارے زمانے میں تمھارے ہی تو ایک باپ ہیں۔ ہم لوگ تو بنا باپ کے ہی پیدا ہوئے ہیں! تمھاری طرح رہتے تو ایک دم نہ چلتی۔ اگر تم اس وقت نہ چلوگی تو پھر مجھ سے اور تم سے کوئی سروکار نہ رہے گا۔

دلاری۔ اے لو، وہ دیکھو دادا جی چلے آئے۔ بہن ناراض نہ ہونا۔ اس وقت میرا کوئی بس نہیں، نہیں تو تمھاری بات سے منہ کبھی نہ پھیرتی۔

رام کلی آخر کار مایوس ہوکر اُٹھی اور اکیلی مندر کی طرف چلی۔ اب کہ فقرہ نہ چلا، اس وجہ سے ذرا دل میں پریشان تھی۔ قاعدے کی بات ہے جو آدمی کنگال ہوتا ہے اس کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ ہر آدمی میری طرح دانے دانے کا محتاج ہوجائے۔ چنانچہ اس کی تصدیق اس دیہاتی مثل سے ہوتی ہے۔ رانڈ کہے کہ سب کا مرے اور سانجھ کہے کہ بجر پڑے۔ جنگلی ہاتھیوں کو پھنسانے کا سب سے عمدہ طریقہ یہ ہے کہ ہتھیال سدھائی جاتی ہیں جو ہاتھیوں کے ساتھ دغا کھیل کر انھیں شکاریوں کے پنجے میں پھنسا دیتی ہیں۔ یہاں بھی بالکل وہی حال تھا۔ ترلوکی ناتھ ایک بلا کا

شکاری تھا جو ایسی آوارہ لڑکیوں کے ذریعے سے شریف خاندان کی لڑکیوں کو پھانس لیا کرتا تھا۔ رام کلی اول اول خود بھی اسی طرح قبضے میں لائی گئی تھی۔ راستے بھر وہ اس خیال میں ڈوبی ہوئی تھی کہ کس طرح اس ذلت کا بدلہ لوں آخر مندر پہنچ گئی۔ یہاں پر پجاری لوگ پہلے ہی سے جمع تھے۔

یشودانند۔ آج ساعت اچھی معلوم ہوتی ہے، صبح ہی صبح بنّو مہارانی کا درشن ہوا۔

رام کلی دھیمے دھیمے ٹھمک چال چلتی ہوئی بابا جی کے کمرے میں داخل ہوئی۔ مہنت جی نہا دھوکر سامنے آئینہ رکھے بالوں کو سنوارنے میں لگے تھے۔ اس کو جو دیکھا تو اُچھل پڑے۔

بابا جی۔ آؤ پیاری، آؤ۔ ہماری آنکھیں تمھاری ہی طرف لگی ہوئی تھیں۔

رام کلی۔ مجھے ذرا دیر ہوگئی۔ ذرا رام دلاری کے یہاں چلی گئی تھے۔

بابا جی۔ یہ کہو تم وہاں کا بھی چکر لگا آئیں۔ کیا کہا؟

رام کلی۔ کہا کیا، کتنا کہہ کے ہار گئی، مگر وہ نہ آئی نہ آئی، مٹھّے بازیاں کرتی رہی۔

بابا جی۔ یہ تو بڑی استاد نکلی جی، ہم نے سمجھا تھا، چٹکی بجانے میں پھنس جائے گی، مگر یہ تو ہم لوگوں کو بھی اُڑن دھائیاں بتلانے لگی۔

رام کلی۔ کیا بتلاؤں تمھاری بدولت اسے بھی ذلیل کرنے کا موقع ہاتھ آگیا۔ نہیں تو اس بے چاری کی کیا ہمّت تھی کہ میرے سامنے سیدھی آنکھیں کرتی۔ ذرا آنکھ ترچھی کرتی تو آنکھ نکال لیتی، مگر ایسے آدمی سے پالا پڑا ہے کہ کیا بتلاؤں۔ کان میں تیل ڈالے رہتے ہو اور سر پیر کی خبر ہی نہیں رکھتے۔

بابا جی۔ اچھا کیا بات ہے، کبھی ناؤ ہاتھی پر، کبھی ہاتھی ناؤ پر۔ آج اس نے تمھیں کڑی سنائی، تمھاری باری بھی کبھی آرہے گی، اس وقت خوب دل کھول کر بخار نکال لینا۔ مگر جانی، ایشور جانے آج تم نے وہ سنگھار کیا ہے، کہ آنکھوں کو دیکھنے سے جی نہیں بھرتا۔

رام کلی۔ کل تو میں ایک مصیبت میں پھنس گئی تھی۔ مگر وہ تو کہو، خیریت ہوگئی، نہیں تو اب تک اپنی سسرال میں ہوتی۔

بابا جی۔ ہاں؟ یہ کیسے؟

رام کلی۔ کل یہاں سے جاکر کیا دیکھتی ہوں کہ وہ مع ڈولی کھٹولی رخصت کرانے کے واسطے
آئے ہوئے ہیں۔ بس کچھ نہ پوچھو۔ میری روح فنا ہوگئی۔ ہاتھ پیر سنسنانے لگے
اس خیال سے کہ اب تمھیں دیکھنے کو آنکھیں ترس جائیں گی، دل کی کچھ عجب
کیفیت ہوگئی۔ اماں بھی رخصت کردینے پر ادھار کھائے بیٹھی تھیں۔ کتنی آرزو منت
کی کہ اماں تھوڑے ہی دن اور رکھ لو مگر اماں نے ایک بھی نہ مانی۔ آخر لاچار ہوکر
میں نے وہ چال چلی کہ سب کے سب بھونچکا رہ گئے۔ ایک سرے سے سب کی
عقل دنگ ہوگئی۔

بابا جی۔ سچ کہو کون سا جادو پھونکا؟ کیسی چال تھی، بھئی کہ گھر بھر کے چھکے چھوڑا دیے؟

رام کلی۔ میں نے دیکھا کہ ان سب کو اس وقت خبط سمایا ہوا ہے۔ اس وقت میری ایک بھی
نہ چلے گی۔ بس، میں نے یہ حکمت کی کہ تمام زیور اور کپڑے ایک پُرانے مٹکے میں
رکھ آئی۔ جب ضرورت کے وقت کھوج ہونے لگی تو ایک کا بھی پتہ نہیں۔ اب تو
سب کے سب چکرائے۔ گھر کی انگل انگل زمین چھان ڈالی، مگر وہاں ہوجب تو نا پتہ
لگے۔ اماں بے چاری تو چھاتی پیٹ رہی تھیں۔ چوطرفہ تلاشم تلاش مچی ہوئی تھی
اور میں دل میں ان کی بے وقوفی پر ہنس رہی تھی۔ آخر جب بہت ہاتھ پیر پٹک کر
ہار گئیں اور کامیابی نہ ہوئی تو رو پیٹ کر بیٹھ گئیں۔ تکلف تو اماں کی گھٹی میں پڑا
ہے۔ وہ بھلا مجھ کو اس طرح لنڈی منڈی رخصت کرتیں؟ جب کچھ نہ ہوسکا، کوئی
صورت نہ نکلی، تو لاچار رخصتی ملتوی کی گئی۔

بابا جی۔ واہ جانی واہ! کیا کام کیا تم نے کہ جی چاہتا ہے، منہ چوم لوں۔

سوامی۔ یہاں پر تو ہم بھی تمھارا لوہا مان گئے۔ وہ ڈھونگ رچا ہے کہ بے اختیار تعریف
کرنے کو جی چاہتا ہے۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ تم کو ایسی بے ڈھب کیسے سوجھ گئی۔
دیکھنے میں تو ایسی بھولی معلوم ہوتی ہو، مگر تمھارے پیٹ میں بڑے بڑے گُن بھرے
ہیں۔ بھائی، سچ کہتا ہوں کہ اگر میں لڑکی ہوتا تو مجھے ہرگز ایسی حکمت نہ سُجھائی
پڑتی۔ عقل کام ہی نہ کرتی تو کرتا کیا۔ مگر یہ تو بتاؤ کیا کسی نے اس مٹکے میں نہیں
ڈھونڈا؟

رام کلی۔ وہاں کسی کے فرشتے خاں کو بھی خبر نہیں تھی کہ اس مٹکے میں پوٹلی پڑی ہے۔

اپنی اپنی ڈھائی چاول کی سب الگ الگ کھچڑی پکاتے تھے، مگر وہاں تک کسی کی عقل نہ دوڑتی تھی۔

غرض کہ رام کلی کی اس حکمت کی لوگوں نے خوب تعریف کی۔ مہنت جی نے جو دیکھا کہ یہ لڑکی مجھ پر واقعی لٹو ہورہی ہے، اور میرے پیچھے گھر بار تج دینے کو تیار ہے تو ان کے جی میں یہ دُھن سمائی کہ اسے کسی طرح جُل دے کر اس کے تمام زیوروں پر ہاتھ صاف کرو۔ اس کے بعد اسے یہاں سے دتکار بتاؤ۔ ان حضرت کو جُل دینے کے فن میں خوب کمال حاصل تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس میں کوئی ان کا مقابلہ نہ کرسکتا تھا۔ آپ نے کتنی ہی نا تجربہ کار لڑکیوں کو اس گھاٹ اُتار دیا تھا۔ وہ پہلے چکنی چپڑی نمک مرچ لگی ہوئی باتوں سے لڑکیوں کو اپنا بھگت بنا لیتا تھا اور پھر جانے مانے اصولوں سے دھیرے دھیرے ان کے نوجوان دل پر قبضہ جما لیتا تھا۔ جب اُسے معلوم ہوتا تھا کہ محبت کا جادو ان پر اچھی طرح چل گیا، شوخ چشمی اور دیدہ دلیری کا قاتل زہر ان کے نازک جسم میں بخوبی پھیل گیا اور وہ اب اس سے ہرگز اُبھر نہیں سکتیں تو فوراً داؤں گھات لگا کر ان کا مال و متاع چھین چھان لیتا تھا۔ مگر اس فریب کے باوجود لڑکیاں اس پر ذرا بھی شک نہیں کرتی تھیں کیوں کہ وہ میٹھی چھری بن کر گہرا زخم لگاتا تھا اور کبھی کبھی ان کے ساتھ اس طرح سلوک کرتا تھا کہ ان کے آنسو پوچھتے تھے اور انھیں شکوے شکایت کا کوئی موقع نہ ملنے دیتا تھا۔ یہی ترکیب اس نے اس نئی آشنا کے ساتھ کرنی چاہی۔ اس کے یہاں کا ڈھنگ ساری خدائی سے نرالا تھا۔ شاعری کی دنیا میں شمشاد کے پیڑ جیسی لمبی چھریری چندر مکھیاں شکاری مانی گئی ہیں اور آدھا حلال کرکے چھوڑ دیے گئے عاشق ان کے شکار۔ ان کی زلفیں وہ جال ہیں جو اُڑتی چڑیا کو ہوا سے اُتار لیتی ہیں اور عاشقوں کے دل کے پنچھی کو مصیبت کا قیدی بناکر اور دُکھ و غم میں مبتلا کرکے در بدر جنگلوں اور ریگستانوں میں آواروں اور پاگلوں کی طرح پھیراتی ہیں۔ انھی سلسلے دار زلفوں کے پیچ میں پڑکر بے چارے لٹے ہوئے تباہ عاشقوں کے لیے دنیا کی نعمتوں سے مزا اُٹھانا حرام ہوجاتا ہے۔ ان کی کمانی دار بھویں دو اصفہانی تلواریں ہیں جن میں عاشقوں کو تڑپا کر قتل کرنے کا مادہ آپ سے آپ موجود ہے،

ان کی پلکوں کی نوک وہ چھری کی نوک ہے، جو عاشقوں کے دل میں چبھ کر ایسا درد پیدا کرتی ہے کہ بے چاروں کی زندگی دوبھر ہوجاتی ہے۔ مختصر یہ کہ ہر حصہ مصلحتاً اسی غرض سے بنایا گیا ہے کہ دوسروں کو اپنا شیدائی بناکر آخرکار ان کو دغا دے، ان کا گھربار چھڑا کر ان کو ادھر اُدھر مارا مارا پھروائے۔ مگر یہاں پر معاملہ بالکل اُلٹا تھا۔ یہاں شکاری کا سرٹیفکیٹ بجائے نازک بدن حسینوں کے مہنت جی جیسے اکھڑ، عڑانٹ آدمی کو ملا تھا۔ گرہ دار زلفوں کے بجائے اس کے پاس دھوکے فریب کا سب سے بڑا جال تھا، جس سے وہ بجائے عاشقوں کے معشوقوں کا شکار کرتا تھا۔ بجائے کمانی دار بھوؤں کے یہاں پر قینچی کی طرح چلنے والی زبان تھی جس سے وہ خوب باتیں بنایا کرتا تھا۔ بجائے پلک کی نوک کے یہاں پر بے دھڑک نونک جھونک اور بے تکلف ہنسی مذاق تھا جو اُٹھتی جوانی کی لڑکیوں کی جان کی بلا ہوکر آخرکار ان کو بدنام کرتا تھا۔ قصہ کوتاہ یہاں کا ڈھنگ ہی نرالا تھا۔ ترلوکی ناتھ شکاریوں کا بھی شکاری تھا۔

پہلے جب رام کلی کمرے میں داخل ہوئی، اس وقت مہنت جی اپنے بالوں کو سجانے میں مصروف تھے اور بہت خوش نظر پڑتے تھے۔ مگر یکایک ان کا چہرہ کمہلا گیا، پیشانی پر بل پڑ گئے جو ان کی اندرونی پریشانی کا پتہ دے رہے تھے۔ منہ کی رنگت کچھ اُتر سی گئی جس سے ان کی فکر ٹپکتی تھی اور وہ اس وقت کسی ادھیڑ بُن میں پھنسے ہوئے تھے۔

رام کلی۔ کیوں بھئی، یہ مردنی کیسی چھائی ہوئی ہے؟ کیا آج نرجل ورت ہے؟

مہنت جی۔ نہیں تو پیاری، آج تو طبیعت سست ہے۔

رام کلی۔ آخر میں بھی تو سنوں کہ وہ نگوڑی طبیعت کیسی ہے جو اب بھی سست ہے۔

مہنت جی۔ کیا بتلاؤں جانی، عجب معاملہ ہے، نہ کہتے بنے، نہ کہتے بنے، ایک سخت آفت میں پھنس جاتے ہیں مگر کچھ کرتے دھرتے نہیں بن پڑتا۔ عجب جھنجھٹ میں جان پڑی ہوئی ہے۔

سنگی ساتھی تو پہلے ہی سے سدھے ہوئے تھے۔ جیوں ہی ان بزرگ نے اپنی حیرانی اور پریشانی کا ذکر چھیڑا تیوں ہی ایک صاحب اچھی خاصی چھانٹی تراشی صورت

بنائے ہوئے آئے۔ ان کو دیکھتے ہی ترلوکی ناتھ بے اختیار اُچھل پڑے۔ نہایت گرم جوشی سے آؤبھگت کیا، اگوانی کی، عطر اور الائچی سے خاطر کی۔ رسمی تعارف کے بعد وہ ایک خاص جگہ پر بیٹھے۔ اب رام کلی پر تو مارے شرم کے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ نہ وہاں سے ہٹ سکتی تھی نہ کوئی ایسا اوٹ ہی تھا جہاں چھپ سکتی تھی۔ بے چاری بڑے جھمیلے میں پھنسی۔ مہنت جی نے اس کی اندرونی ہل چل کو تاڑ لیا، اور ذرا اطمینان دینے والے لہجے میں مسکراکر بولے۔ گھبراؤ نہیں، یہ تو ہمارے لنگوٹیا یار شیخ عیدو خاں ہیں۔ ان سے کون سا پردہ یہ تو ہمارے سچے ہمدرد اور رازدار ہیں۔ میرے پیٹ کی بات تک تو ان سے چھپی نہیں۔ اتنا کہہ کر وہ پھر شیخ جی کی طرف مخاطب ہوئے اور ایک اثر کرنے والے اور مطلب بھرے انداز سے ان کی طرف دیکھا۔ شیخ جی کچھ دیر تک فلسفیوں کی طرح اِدھر اُدھر تکتے رہے، اس کے بعد آپ نے لمبے چوڑے میدان میں اپنی زبان کے گھوڑے کو اس طرح چھوڑا۔ بابا جی، آپ تو یہاں بیٹھے ہوئے پریوں کے جمگھٹ کا مزا لیا کرتے ہیں، تمام وقت راگ رنگ، عیش و عشرت میں خرچ کرتے ہیں، آپ نے علاقے کی طرف سے کچھ ایسا من کھینچ لیا ہے، ایسا کان میں تیل ڈالے بیٹھے ہیں کہ جیسے آپ کو علاقے سے کوئی واسطہ ہی سروکار نہیں، بھلا اس بھلکڑپن سے علاقہ کتنے ہی دنوں تک چلے گا؟ آپ کی اس بے خبری سے تو ہم لوگوں کے دل میں بھی یہی خواہش ہوتی ہے کہ سب چھوڑ چھاڑ کر بیٹھ رہیں۔ مگر نمک کے حق اتنے زیادہ ہیں کہ ...... کیا کہوں، کچھ کہتے سنتے نہیں بنتا۔

مہنت جی۔ شیخ جی، تم تو اس وقت مولوی بن گئے۔ ارے بھئی، یہ سب تکلف بالائے طاق رکھو اور جو کچھ کہنا ہو، کہو۔

شیخ۔ شاید آپ نے نہیں سُنا۔

بلبلہ مژدۂ بہار بیار
خبر بد بہ بوم شوم گزار

(اے بلبل، بہار کی خوش خبری لا۔ بُری خبر منحوس الو کے لیے چھوڑ دے)

مہنت۔ یہ تو آپ نے خوب فرمایا۔ میرے گھر میں آگ لگی ہوئی ہے، تمام مال متاع جل

کر خاک ہو رہا ہے اور مجھ کو ذرا بھی خبر نہیں! تو کیا انسانیت اور دوستی کا تقاضہ یہی ہے کہ خبر کو میرے کان تک پہنچانے میں اتنی دیر کی جائے کہ میرے مکان میں ایک لتّا بھی باقی نہ رہے؟ واہ، اچھا دوستی کا حق ادا کیا!

شیخ۔ اچھا پھر کلیجہ کو مضبوط کر رکھیے۔ یہ تو آپ نے سنا ہی ہے کہ رمن مصرانی نے آپ کے نام دو ہزار روپے کی ڈگری کروائی تھی۔ اس مقدمے میں ہم لوگوں کو جتنی تکلیفیں اُٹھانا پڑیں تھیں، وہ ہرگز نہ بھولیں گے۔ کیسی کیسی مصیبتیں جھیلنی پڑیں کہ اللہ کی پناہ! ایک دم بھی چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوتا تھا۔ اسی دشمن نے اب ڈگری جاری کرنے کی پیروی کی ہے۔ ایک ہفتے کے اندر ہی اندر ایک ڈھائی ہزار کا کسی نہ کسی طرح ضرور بندوبست ہوجانا چاہیے، نہیں تو سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔

سوامی۔ بھئی، تم نے تو وہ بھیانک خبر سنائی کہ ڈھائی ہزار کو کون جھنکھے، یہاں تو ڈھائی سو کا بھی ٹھکانا نہیں۔ بڑا بُرا وقت آپڑا ہے۔ اب اس وقت چاروں طرف اندھیرا نظر آتا ہے، کوئی حامی اور مددگار نہیں دکھائی پڑتا۔

مہنت۔ کچھ روپے علاقے سے کیوں نہیں وصول کر لیتے بھائی؟

شیخ۔ علاقہ تو کنگال ہورہا ہے کہ اس وقت ایک پیسے کا بھی نکاس نہیں۔

مہنت۔ تو مجھ سے کیا کہتے ہو بھائی، کیا میں خود روپے ہوجاؤں! نہیں کوئی بندوبست ہوسکتا تو رہنے ہی دو، علاقے ہی نہ نیلام ہوگا، ہوجانے دو۔ اب میں اس فکر میں کہاں تک جان دوں۔

شیخ۔ تمھاری آنکھوں میں سرسوں پھولی ہے، جب دیکھو علاقے کے پیچھے پڑے رہتے ہو۔ علاقہ نہ ہوگا یہاں، تو کمنڈل لے کر دروازے دروازے گھومتے پھروگے۔

مہنت۔ جب روپے کا بندوبست ہماری طاقت سے باہر ہے تو اس کے سوائے اور کیا چارا ہے؟

شیخ۔ ہاں اس میں بھی کچھ شک ہے، مگر جس دن دس ہزار کی جائداد ایک ہزار پر نیلام ہوجائے گی، تو آنکھیں کھل جائیں گی۔ بس تب یہ سب عیش و آرام بھول جائیے گا۔ ماشاء اللہ آج کل آپ کی کفایت شعاری بھی تو حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ خدا کی پناہ، خاصے کنجوس ہوگئے ہو۔ قسم خدا کی، میں نے کبھی کسی امیر، کبیر کے دربار

میں ایسا خرچہ نہیں دیکھا۔ اگر چندے اور یہی نقشہ رہا تو خدا ہی حافظ ہے۔ ابھی اس قسط کی مال گزاری متھے چڑھی ہوئی ہے اور پھر چڑھے کیوں نہ، روپے تو آپ کے مارے بچتا نہیں۔ آج اگر کسی علاقے کا مناسب انتظام ہوتا تو ایک پل میں دس ہزار کا بندوبست ہوجانا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ مگر ہو تو کہاں سے، جتنے نوکر چاکر ہیں، سب کو اپنی اپنی پڑی ہے، جس کے قبضے میں جو چیز ہے، وہ اپنی ڈھیٹھائی سے اس کو اپنے کام میں لا رہا ہے۔ آپ ہیں کہ اپنی خرگوش کی نیند سے چوکتے ہی نہیں۔

مہنت جی۔ بھائی، نصیحتوں اور فضیحتوں کا تو پھر بھی موقع مل جائے گا۔ مگر بھگوان کے لیے اس وقت چھٹکارے کی کوئی ترکیب نکالو۔ کسی طرح اس بلا سے چھٹکارا مل جائے تو جان میں جان پڑے۔

شیخ۔ اگر تدبیر چھٹکارا پانے کی ہے تو یہی ہے کہ معینہ تاریخ پر ڈھائی ہزار اس وقت کے چالو سکے اس کے سامنے کھناکھن گن دیے جائیں۔ اس کے سوائے تو اور کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی۔

راوی۔ واہ شیخ جی، لفاظی سے ہرگز نہ چوکیے گا۔

شیخ جی کا روکھا اور تمسخر آمیز جواب سُن کر ترلوکی ناتھ بغلیں جھانکنے لگے۔ ان صاحب نے بھی وہ رڈا کسا، ادب اور نصیحت کا وہ دفتر کھولا کہ اگر کوئی کیسا ہی گروگھنٹال کیوں نہ ہوتا، چہرہ پڑھنے والوں کا کوئی ولی پیغمبر ہی کیوں نہ ہوتا مگر وہ بھی باتوں میں آجاتا، شرطیہ دھوکھا کھا جاتا، بھلا رام کلی کس گنتی میں تھی۔ اس کے دل میں یہ خیال پکّا ہوگیا کہ یہ مسلمان ترلوکی ناتھ کا بھلا چاہنے والا ہے۔ اب اس وقت جو وہ نظر اُٹھاکر دیکھتی تھی تو سب کی صورت سے پھٹکار برستی تھی۔ سوامی جی بڑے ہی زندہ دل اور آرام پسند آدمی تھے۔ اس وقت گھٹنوں میں سر دیے بیٹھے تھے، چہرے سے مایوسی جھلکتی تھی۔ شیخ جی جن کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ پرلے سرے کے سوجھ بوجھ والے اور اعلیٰ درجے کے منتظم کار ہیں، خیراندیشی میں طاق، مصائب میں واق، باتی وفاق، ماہی فراق، انتہائے سردی میں بمنزلہ چقماق، شدتِ مرض میں حذاق، مجمع اشفاق و منبع اخلاق ہیں اور ترلوکی ناتھ کے احباب کی ناک میں اس وقت آنکھیں نیچی کیے، گال پر ہاتھ دھرے، ایک عجیب بے بسی کے انداز میں بیٹھے ہوئے تھے۔

ان سب کا یہ حلیہ کچھ ان ماتمی گھروں کے رنج منانے والوں کا سا تھا جہاں کوئی ہونہار جوان اٹھتی جوانی میں اس دنیائے فانی سے کوچ کرجاتا ہے یا ان مصیبت کے مارے ہوئے ٹوٹے ہوئے دل والے بیوپاریوں کا سا تھا جن کا جہاز قیمتی چیزوں سے لدا ہوا کسی غیرملک سے چلا آرہا تھا، مگر راستے میں تیز اور ناموافق ہوا کے تھپیڑے اسے دریا میں ڈبا دیں یا ان معصوم قیدیوں کا سا تھا جن کے مقدمے کی سنوائی پوری ہوچکی ہے اور منصف کاغذ ہاتھ میں لے کر ابھی ابھی فیصلہ سُنایا چاہتا ہے یا ان نامراد، اُجڑے ہوئے، دل جلے، نیم بسمل عاشقوں کا سا تھا جنھوں نے بڑی مدت کے بعد اس وقت موقع پاکر پیا ملن کی درخواست کی ہے مگر امید اور خوف سے ملی ہوئی نظر ان کی طرف پھیرتے ہیں اور ان کے چہرے پر مسکراہٹ کا نشان نہ پاکر کچھ ایسے نا اُمید ہوجاتے ہیں کہ تصویر سے، مھگّے سے رہ جاتے ہیں۔

رام کلی نے جو ان سب کو یوں محرمی صورت بنائے ہوئے بیٹھے دیکھا تو اس کے دل میں ترس پیدا ہوا۔ اس نے سوچا کہ ابھی میں نے کل تک اسی ترلوکی ناتھ کے یہاں خوب خوب مزے اڑائے ہیں، اب جو اس پر اس گھڑی مصیبت آپڑی ہے تو انسانیت کا یہی تقاضہ ہے کہ میں بھی اس کے دُکھ درد میں شریک ہوؤں۔ آخر دوستی اس کا نام تو نہیں کہ جب تک دوست کا اقبال اونچا رہا تب تک تو اس پر جان تک فدا کردینے کو مستعد تھے لیکن جہاں بے چارے پر کوئی مصیبت پڑی وہیں گردن جھاڑ کر الگ ہوگئے۔ میرے پاس اس وقت کچھ نہیں تو سونے چاندی کو ملاکر کوئی ڈیڑھ ہزار کے زیور ہوں گے، سو پچاس روپے نقد بھی ہوں گے۔ اگر ان کے ہوتے ہوئے اس بے چارے کے ہاتھ نہ بٹاؤں تو مجھ سے بڑھ کر طوطا چشم اور احسان فراموش کوئی نہ نکلے گا۔ اس وقت مجھے بھی لازم ہے کہ اپنی بخیا پونجیا ان کے سامنے لاکر رکھ دوں۔ اس وقت اگر اس کی ضرورت میری ذات سے رفع ہوگئی تو پھر اپنی چاندی ہے۔ یہی ترلوکی ناتھ میرے احسان کو یاد کرکے میرا گھر بھر دے گا۔ یہی سب سوچ وچار کرکے وہ موقع کا انتظار کرنے لگی کہ ذرا یہ سب اپنی اپنی راہ لگیں تو میں اپنا ذکر چھیڑوں۔ یاروں نے اس کے خیالات کا اندازہ کرلیا اور فوراً ایک ایک کرکے کھسکنے لگے۔ جب تنہائی ہوگئی تو رام کلی نے مہنت جی سے کہا۔

کیوں جی، اس وقت تمھیں کتنا روپے ملے تو تمھارا گلا چھوٹ جائے؟

مہنت جی نے دھیمی آواز سے جواب دیا۔ کیا کہوں جانی، کوئی پانچ سو روپے تو تحویل میں ہیں، باقی اگر دوہزار کہیں اور ہو تو حساب بے باق ہوتا۔ یہ کہہ کر اس نے چہرے کو ایسا گمبھیر اور سنجیدہ بنا لیا کہ جیسے وہ اپنے دل کے جوش کھاتے ہوئے احساسات کو روک رہا ہے اور باوجود ایسی گاڑھی مصیبت آپڑنے کے دھیرج کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔

رام کلی۔ ''اگر میں کوشش پیروی کر کے دلا دوں تو؟'' یہ جملہ سُن کر ترلوکی ناتھ کے چہرے پر یکایک خوشی کی لالی دوڑ گئی، آنکھیں چمک اُٹھیں، گویا معلوم ہوتا تھا کہ بے چارے ڈوبتے ہوئے کو تنکے کا سہارا دے دیا۔ سوکھے دھان میں پانی پڑگیا۔ مگر اس غیر معمولی خوشی کو (جو سولہہ آنے بناؤٹی تھی) چھپا کر اس نے اداسی سے کہا۔ تم کہاں سے دلا دوگی بھلا؟ اول تو تم خود اپنی مالک نہیں، دوم اتنی بڑی رقم کو مہاجن بلا مناسب کارروائی سے دینے ہی کیوں لگا؟ دمڑی کی ہانڈی تو لوگ خوب ٹھونک بجاکر لیتے ہیں، اسے تو توڑے کا توڑا گننا پڑے گا!

رام کلی۔ تو آخر اس میں حرج ہی کیا ہے؟ اکثر تعلقدار مہاجنوں سے قرض لیا کرتے ہیں۔ ان کو تو تیسوں دن روپے پیسوں کا کام لگا رہتا ہے۔ اگر مہاجن نہ ہوں تو زمینداروں کا تمام کاروبار خاک میں مل جائے۔ تو پھر تم کو اس میں کیا پس و پیش ہے؟

مہنت۔ (ٹھنڈی سانس بھرکر) آہ، کاش مجھ کو بھی وہ آزادی حاصل ہوتی! میں تو قاعدوں کی مضبوط زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوں۔ اگر کہیں مہاراجا صاحب کو یہ سن گن مل گئی کہ یہاں قرض لینے کی نوبت آپہنچی تو غضب ہی ہو جائے گا۔

رام کلی۔ اور اگر صرف بات کے اعتبار پر مل جائے تو؟

اب تو حضرت نے ایسا چہرہ بنا لیا کہ جیسے اچانک کوئی بہت بڑی دولت ہاتھ لگ گئی۔

مہنت۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتا ہے۔ زندگی پر تمھارا بن داموں غلام بنا رہوں گا جب تک اس تن میں جان رہے گی تمھارا گُن گایا کروں گا۔

رام کلی۔ بھائی سنو، بات یہ ہے کہ مہاجن وہاجن میرے گھڑا کیے تو ہونے سے رہا مگر میرے پاس زیور اتنے ہیں کہ اگر ان کو بیچوں تو دوہزار سے کم کسی طرح نہ ملے۔

رام کلی کی زبان سے اس بات کا نکلنا تھا کہ مہنت جی سناٹے میں آگئے، سکتہ سا ہوگیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بری سناونی آئی تھی جس کے سُننے سے ان کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔

مہنت جی۔ افسوس رام کلی، تم اتنے دنوں سے یہاں آرہی ہو مگر تم نے مجھ کو اچھی طرح نہ پہچانا! تم نے مجھ کو ایسا بے حیا سمجھ رکھا ہے؟ چاہے علاقہ کوڑیوں کے مول بِک جائے، میں پھنس جاؤں، مگر میری غیرت اس کو ہرگز نہ قبول کرے گی کہ ایسی ذلیل اور خودغرض حکمت کام میں لاؤں، تمھارے زیور اور میں ان کو بیچوں؟ رام رام، یہ تو مجھ سے جیتے جی ہو ہی نہیں سکتا۔

رام کلی۔ بے شک تم ایسی ذلیل حکمت کو کام میں نہیں لاسکتے کیوں کہ میں تمھاری نظروں میں اس قدر ذلیل ہوں کہ تم میرے زیوروں کو ہاتھ لگانا بھی اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہو! اس غیرت کی میں بھی تعریف کروں گی کہ پھانسی پڑی ہو مگر......

مہنت۔ (بات کاٹ کر) تم نے جانی، ہمارا مطلب نہیں سمجھا۔

رام کلی۔ جی، میں خوب سمجھے بیٹھی ہوں۔ بھلا تمھیں اپنے دل سے سوچو کہ اس سے تمھاری عزت میں کون سا بٹہ لگا جائے گا۔ کیا میں تمھارا بھلا چاہنے والی نہیں ہوں؟ آج اگر تمھاری ...... ہوتی تو کیا اس زیور کو کام میں نہ لاتے۔ میں کہتی ہوں، ضرور لاتے۔ پھر تم کو میرے زیوروں کو کام میں لانے میں کون سی بات روکتی ہے۔

مہنت۔ پیاری، تم تو ایسی تہ کی بات کہتی ہو کہ سیدھے کلیجے میں اُتر جاتی ہے۔ میں اور تمھاری مدد کو ذلیل سمجھوں! مگر مجھے باربار یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ زیور تمھارے جسم کی رونق ہیں، ان سے تم کو خاص محبت ہوگی اور چونکہ میں تم کو جان سے بھی زیادہ پیار کرتا ہوں، میں نہیں چاہتا ......

رام کلی۔ (بات کاٹ کر) پھر وہی عذر۔ نہ معلوم کیا تم کو خبط سما گیا ہے۔ ارے بھائی، اس وقت تو تہذیب کو طاق پر رکھ دو۔ جس طرح بنے اپنا گلا چھڑا لو۔ پھر جب اطمینان سے بیٹھنا تو شکریہ ادا کر لینا۔

مہنت۔ میری غیرت تو اسے کسی طرح قبول نہیں کرتی کہ ایسے شرمناک ذریعے سے اپنا گلا چھڑاؤں۔ مگر کچھ تو تمھارا ہٹھ اور کچھ تمھارے ناراض ہوجانے کا ڈر مجھ کو مجبور کرتا ہے۔ تم ٹھہریں نازک مزاج کلی، بات بات پر کھچڑ نکالتی ہو۔ کہیں کل کو یہ نہ کہنے لگو کہ تم نے میرے زیوروں سے نفرت کی اور انھیں ذلیل سمجھ کر قبول کرنے سے انکار کیا۔ کیا کشمکش میں جان پڑی ہے!

یہ کہہ کر ترلوکی ناتھ خاموش ہوگیا۔ رہ رہ کر کبھی کبھی رام کلی کی طرف ترچھی نظروں سے دیکھتے جاتے تھے اور نظروں ہی نظروں میں اس کا شکریہ بھی ادا کرتے تھے۔ رام کلی کو یہ پوری طور پر معلوم ہوگیا کہ یہ کتنا مہذب، سیدھا سچّا اور اونچے حوصلے کا آدمی ہے کہ باوجود اس کے کہ ایسی گاڑی مصیبت آپڑی ہے، سچائی کے راستے سے اِدھر اُدھر نہیں ہورہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ شام کے وقت زیوروں کے ساتھ آنے کا وعدہ کرکے گھر کو چلی۔ راستے بھر خوش خوش چلی آرہی تھی۔ جب گھر پہنچی تو نہایت بے قراری کے ساتھ سورج ڈوبنے کا انتظار کرتی رہی۔ ادھر سورج ڈوبا اس نے پوٹلی نکال بغل میں دبائی اور سب کی نظروں سے بچاکر مندر کی راہ لی۔

(۵)

سرسوتی مہارانی مہنت جی کی معشوقائے بے مثال حور تمثال بلکہ ثانی حور در جمال جو ایسی اکھڑی اکھڑی گھر پہنچی تو ساجیوں نے گھبراکر کہا۔ کیوں بی، یہ اس طرح بدحواس اور گھبرائی ہوئی کیوں نظر پڑتی ہو؟ ہانپ رہی ہو؟ چہرہ پسینے پسینے ہورہا ہے، یہ ماجرا کیا ہے؟

سرسوتی۔ کیا کہوں اس نگوڑے سوامی نے ہتھے پر ٹوک دیا، نہیں تو آج پالا مار لیا تھا۔ برسوں کی محنت کا انعام آج ضرور مل گیا ہوتا مگر افسوس۔

ساجی۔ کیوں اس نے کیا کیا؟

سرسوتی۔ آج اسی نے تو سب کچھ کیا۔ میں باتوں میں لگاکر ترلوکی کو خوب ڈھرّے پر لائی تھی اور قریب تھا کہ آپس میں باتیں پکی ہوجائیں مگر اس نے دنگا فساد مچاکر تمام

نقشہ بگاڑ دیا۔ واللہ، خوب داؤ پر چڑھایا تھا، اب ایسا موقع شاید ہی آئے۔

سماجی۔ مگر مُٹھی تو کچھ نہ کچھ ضرور ہی گرم ہوئی ہوگی۔ بے چارے میا خیراتی کو افیم کی پڑی ہے، خالی ڈبیا لیے ہوئے رو رہے ہیں، میں اب تک کچھ نہیں تو چرس کے بیسیوں ہی دم لگا چکا ہوتا مگر آج ایک دم کو بھی قسم کھاتا ہوں عجب طبیعت اُچاٹ ہو رہی ہے۔

سرسوتی۔ اجی، تم لوگوں کی تو ہمیشہ سے ہی عادت ہے کہ رویا کرتے ہو۔ تم کو چرس کی سوجھ رہی ہے، خیراتی افیم چلا رہے ہیں، بھلا کسی کو یہ بھی خبر ہے کہ باورچی خانے میں آگ جلی یا نہیں؟ میرا تو مارے بھوک کے برا حال ہے مندر میں انتڑیاں رام نام جپنے لگی تھیں۔ کیا کہوں، کن کن مشکلوں سے اس بھوک نگوڑی کو میں نے روکا ہے مگر بھائی، اب میرے روکے تو نہیں رکتی، کچھ رکھا ہو تو لاؤ، ذرا جان میں جان پڑے۔

جمعراتی۔ رکھا کیا ہے۔ صبح جو کی روٹی اور مسور کی دال پکی تھی، وہ خیراتی بھکیلو بھکوس لے گئے، نہ جانے پیٹ ہے کہ خندق، ہمیں تو آنکھ میں لگانے تک کو بھی نہیں ملی، جب سے ابھی تک تڑپ رہے ہیں۔ ہاں، دوپہر کو چھدام کے خستہ چنے بھنواکر کھاتے تھے، مگر اونٹ کے منہ میں زیرا، بھلا کہیں اس سے بھوک جاتی ہے۔

سرسوتی۔ اور جو میں نے اپنے لیے بیسنی روٹیاں پکوانے کے لیے بیسن اور تیل منگوایا تھا، وہ کیا ہوا؟

جمعراتی۔ ہوا کیا، کیا میں پی گیا! انہی میاں خیراتی کو غسل کرنے کی سوجھ گئی، بیسن تو انھوں نے تھوپ لیا، بھکیلوں کے بال کئی دن سے سوکھ پڑے تھے، انھوں نے تمام تیل سر میں ڈال لیا۔ دیکھتی نہیں ہو، ابھی تک تیل چو رہا ہے۔

سرسوتی۔ (جھلاکر) تم لوگ پرلے سرے کے نمک حرام ہو۔

جمعراتی۔ نمک حرام ہوں گے تو خیراتی اور بھکیلو، میں نے کیا کیا جو نمک حرام بنوں۔ ہاں اس وقت کے واسطے جو تھوڑا سا گوشت آیا ہوا تھا، وہ میں نے اُبال کر اپنے بلبل کو کھلا دیا۔ جو بچا وہ بیسن میں سان کر دوبارا کھلانے کے واسطے رکھ چھوڑا ہے۔

سرسوتی۔ یا اللہ، گوشت بھی بھکوس گئے، بیسن بھی صفا چٹ کر گئے، تیل بھی پیٹ میں

انڈیل لیا، نہ معلوم یہ پیٹ ہے نگوڑا کہ اللہ میاں کی دوزخ، اُبھر کے سب مرتے بھی نہیں!

جمعراتی۔ بیوی، چاہے مجھ کو ہزاروں ہی گالیاں دے لو، جوتیوں سے پیٹ لو، مگر خبردار، میرے بلبل کی شان میں ایک بات بھی خلاف نہ نکلے، نہیں تو، اللہ جانتا ہے، مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہے خدا خدا کر کے تو وہ بے چارا جیا ہے اور اس پر ابھی سے گالیوں کی بھرمار شروع ہوگئی۔ نہ معلوم کیوں بے چارا سب کی نظروں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔ خیراتی اس کے خون کے پیاسے، بھکیلو اس کے جان کے گاہک اور تم تو جیسے اسے کوسنے پر اتارو ہوگئی ہو۔ مگر یاد رکھنا چمار کے کوسے بیل نہیں مرتا۔

خیراتی۔ لے بس، جمعراتی، چونچ سنبھالو، وہ گدڑا دوں گا کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا! بھڑوا نہیں تو! پہر بھر سے اناپ شناپ جو کچھ منہ میں آتا ہے بکتا جاتا ہے، خون کا گھونٹ پی پی کر رہ گیا ہوں نہیں تو بچّہ آج تم بھی یاد کرتے کہ کس سے پالا پڑا تھا۔ کیوں بے، روٹیاں میں نے کھالیں، خود تو ہڑپ کر گیا اور اُلٹا الزام مجھ پر، خود تو کام کرتا ہے اور مفت چُھدا دوسروں پر رکھتا ہے! اور یہ تو دیکھو، اس بے حیا کو شرم نہیں آتی کہ خود تو نمک حلال بنتا ہے اور سب کو نمک حرام بناتا ہے نمک حرام تو ہی ہوگا، بلکہ تیرا سارا گھرانہ!

سرسوتی۔ ارے یاروں، کیوں ناحق آپس میں لڑے مرے جاتے ہو، چاہے کسی نے روٹیاں کھالیں، اب اس کے پیٹ سے تو باہر نکلتی نہیں، اب اس میں کاہے کا ٹنٹا بکھیڑا ہے۔ رہا یہ کہ اب اس وقت روزہ کھولنے کا کوئی بندوبست ہوگا کہ نہیں یا اس وقت بھی فاقے ہی کی ٹھہرے گی؟

جمعراتی۔ کیا بتلاؤں، اس معاملے میں تو میری بھی عقل چکر کھا رہی ہے۔ بھوک کی تکلیف تو برداشت ہوتی نظر نہیں آتی۔ آخر ہوگا کیا؟ گھر میں آٹا دال نام کو نہیں، بنیا جو ہے وہ مردود اس کا نا معلوم کتنا روپے سر پر چڑھا ہے۔ اس کے تقاضوں کے مارے تو اور بھی ناک میں دم ہے۔ جب دیکھو موت کی طرح سر پر موجود اور انصاف تو یہ ہے کہ وعدہ خلافی کی بھی کوئی حد ہے، کوئی سال بھر سے ٹال مٹول، آج کل

ہورہا ہے۔ وہ تو کہو ذرا دبتا ہے، نہیں تو اب تک کب کا نالش داغ چکا ہوتا۔ روپے پیسے کا حال ایسا ہے کہ کچھ نہ کہنا ہی بہتر ہے، کوڑی کفن کو موجود نہیں، خدا نہ کرے آج اگر موت آجائے تو کفن کو کون دے، مٹی بھی نہ ملے!

سرسوتی۔ مگر میں تو اب بھوک برداشت نہیں کرسکتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ پیٹ میں کوئی اینٹھ رہا ہے۔ یا اللہ کون سا بندوبست کروں!

جمعراتی۔ میں نے تو ایک چال سوچی ہے، اگر کہیں سیدھی پڑگئی تو پھر دوچار روز کے لیے بے فکر ہوجائیں گے۔

سرسوتی۔ کیا ہے ذرا میں بھی تو سنوں۔

جمعراتی۔ وہ جو تمھارے گلے میں کنٹھ ہے نہیں، وہ قنوج کا بنا ہوا ہے۔ اس میں اور اصلی میں کتنا فرق ہے، کہ کوئی کیسا ہی پرکھنے والا کیوں نہ ہو، ہرگز پہچان نہیں ہوسکتی۔ سونا ہے آج کل مہنگا، اتنے سونے کی قیمت کم سے کم ڈیڑھ سو روپے ہوگی۔ اگر گھٹتے گھٹاتے سو روپے کو بھی بِکا تو خیال کرو کیسا چین ہوگا۔ مہینے بھر تک تو ہم ہی ہم ہوں گے۔

سرسوتی۔ جی، بجا، بہت درست! اب آپ نے میرا کنٹھا تاک لیا! کھانے میں بڑے حاتم ہو، مگر کمانے کو کوڑی نہیں۔ جانتے بھی ہوکہ وہ کس کا تحفہ ہے۔ مگر اب اس وقت تو مجبوری ہے، لے جاؤ اس کو مناسب قیمت بیچ لاؤ۔ مگر دیکھو معاملہ ذرا گٹھا ہوا رہے۔

جمعراتی۔ بہت خوب۔

اب جمعراتی، خیراتی، بھکیلو اور جھنکوری ان چاروں آدمیوں نے بہت خوشی خوشی کنٹھ ہاتھ میں لیا، اپنے اپنے سازوسامان سے لیس ہوئے، سر پر ٹوپی ٹیڑھی رکھی، اور پھر کیوں نہ رکھتے، زمانے کی رفتار ہی ٹیڑھی ہے۔ جِلد کی طرح سمٹا ہوا انگرکھا پہنا، پاؤں میں عمدہ، خوش رنگ، طرح طرح کی جوتی پہنی، ہاتھ میں ایک ایک سیٹا لے کر اس کنٹھے کو کوڑا کردینے کے واسطے روانہ ہوئے۔ راستے میں خیراتی کو خیال آیا کہ یارو، اس وقت امیرانہ ساز و سامان سے تو ہم لوگ لیس ضرور ہیں مگر ایک کسر رہ گئی، وہ یہ ہے کہ پان حیثیتِ نشان تمغۂ صاحب تمولان، تحفۂ درویشاں اس وقت منہ میں نہیں ہے۔ جو کوئی دیکھتا ہوگا ضرور کہتا ہوگا کہ لوگ

کیسے پھیکے رئیس ہیں کہ منہ میں پان تک نہیں ہے۔ بھئی، پہلے اس بات کا بندوبست کرلو تو آگے قدم رکھو ورنہ بندہ جاتا ہے۔ فاقہ منظور، مگر اپنی بیٹھی کون کرائے۔

جمعراتی۔ میں اس بات کی تائید کرتا ہوں۔ اب آج دیکھو کہ پان کا کتنا عام رواج ہوگیا ہے۔ جو آدمی دن بھر میں دو گنڈے کماتا ہے، وہ بھی ایک دھیلا تمولی کو نظر کرتا ہے۔ بدن پر دیکھو تو کرتا تک ثابت نہیں، مگر منہ میں بیڑا موجود اور جو انصاف سے دیکھو تو اس بیڑے ہی کی بدولت ان کا شمار بھی رئیسوں میں ہوتا ہے۔ ہم لوگ تو اللہ کے فضل سے امیرانہ ٹھاٹ باٹ رکھتے ہیں مگر استاد، اس وقت پان کے نہ ہونے سے مزا کرکرا ہوگیا۔ تم سے کسی تمولی سے جان پہچان تو نہیں؟

خیراتی۔ ارے یار میرے، کیا بتلاؤں، وہ ایک جنگی تمولی بچہ تھا نہیں، تو اس میں اور مجھ میں خوب گھٹتی تھی، میں اسے ٹھیکہ بجانا سکھایا کرتا تھا اور وہ مجھے پان کھلایا کرتا تھا۔ استاد اس وقت اس جانب وہ چین تھا کہ کیا کہوں، جب دیکھو منہ لال، ابھی ایک بیڑا منہ میں لیے ہوئے ہوں مگر دوسرا تیار۔ جب سے وہ بے چارا یہ شہر چھوڑ گیا ہے، مجھے پان کھانا میسر ہی نہیں ہوا۔ یہ بھی کوئی کھانہ ہے کہ دوسرے تیسرے دن دس پانچ بیڑے کھا لیے۔ پان کھانا تو اسے کہتے ہیں کہ ہر وقت منہ بھرا ہوا ہو۔ استاد دیکھو، جیب کس لیے بنایا گیا ہے؟ آخر اس لیے تاکہ اس میں روپے پیسے رکھا جائے؟ جس وقت منہ میں پان نہیں، تو منہ کی وہی حیثیت ہے جو خالی جیب کی۔

جمعراتی۔ لو یارو، اب بازار بھی قریب آگیا، مارے شرم کے تو میرا قدم اب آگے نہیں بڑھتا۔ تم لوگ آگے آگے چلو، پیچھے پیچھے میں بھی چلتا ہوں۔

بھکیلو۔ یارو، تم کو پان ہی کی فکر پڑی ہے اور میں اور ہی مصیبت میں پھنسا ہوں۔

خیراتی۔ وہ کیا؟

بھکیلو۔ میرے پاجامے کے ازاربند میں کنجیوں کا گچھا نہیں، اس کمبخت خیال کو کیا کروں۔ اب مجھ سے آگے نہیں بڑھا جاتا۔ آؤ گھر لوٹ چلیں۔ میں کنجیوں کا گچھا لے لوں گا، تم لوگ پان کھا لینا، بس پھر آئیں گے۔

خیراتی۔ مگر پاندان میں تو پان اسی طرح غائب ہیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

بھکیلو۔ واللہ، ابھی دو تین بیڑے ہوں گے۔ تم لوگوں کو تو کافی ہیں۔ رہا میں، میں نہ کھاؤں گا۔

غرض کہ بہت سوال و جواب کے بعد یہ بات طے پائی کہ ڈیرے کو لوٹیں۔ لہٰذا وہ لوگ قدم بڑھاتے ہوئے مکان میں داخل ہوئے۔ یہاں سرسوتی نے مارے بھوک کے پریشان ہوکر جمعراتی کی بلبل کی خوراک چٹ کرلی طبیعت جو ذرا متلائی تو پاندان کھولا اور خوش قسمتی سے ایک سڑا ہوا ٹکڑا پاکر اس پر قناعت کی۔ جب یہ لوگ کھٹ پٹ کرتے ہوئے داخل ہوئے تو اس نے سمجھا کہ کامیاب ہوگئے۔ بس اس نے یہ بھی نہ پوچھا کہ کہاں پکا، پہلا سوال یہی تھا کہ بازار سے کچھ کھانا وانا بھی لیتے آئے ہو؟

جمعراتی۔ کیا خود ہی کھانا ہوجاؤں؟ ابھی بازار تک جانے کی تو نوبت ہی نہیں آئی۔

سرسوتی۔ ارے خدا کا غضب، ابھی تم سب بازار ہی نہیں گئے! یہیں بیٹھے بیٹھے آسمان اور زمین ایک کررہے ہو!

جمعراتی۔ اب ہم لوگ کچھ غریب مفلس بھوکے ننگے تو ہیں نہیں کہ یوں ہی اُنکرلیس گھوما کریں۔ جس وضعداری کو اب تک نباہ لائے اسے کیوں چھوڑیں۔ بنا پان کھائے ہوئے آج تک کبھی بازار میں نکلنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اگر آج دوچار یار دوست دیکھتے تو آخر ضرور انگلی اُٹھاتے، اس وقت خوا مخواہ چھپنا پڑتا۔ روزے اور ماتم کا دن بھی نہیں ٹھہرا کہ اسی کا بہانہ کرکے ٹالتے۔ آخر کرتے تو کیا کرتے۔

سرسوتی۔ خدا کی پناہ، اس وضعداری پر لعنت، یہاں بھوک نے کام تمام کر رکھا ہے اور تم لوگ وضعداری پر مررہے ہو! ارے جلدی جاؤ بھی خدا کے لیے، دیر مت کرو کہیں ایسا نہ کرنا کہ تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود۔ بس کتے کی چال جاؤ، بلّی کی چال آؤ۔

جمعراتی نے جاکر پاندان کھولا تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہاں پان کا نشان تک نہیں۔ اب توسب بھکیلو پر خوب جھلائے اور اگر وہ کنجیوں کا گچھا لے کر پہلے ہی رفوچکر نہ ہوگیا ہوتا تو بے چارے کی کھوپڑی پلپلی ہوجاتی۔ خوب ہی مار پیٹ کی ٹھہرتی، مگر وہ ایک کائیاں، بھلا وہ کب رکنے والا تھا!

جمراتی۔ کہاں گیا وہ مردک بھکیلو؟ دیکھو نہ نکل بھاگے بے حیا کہیں کا، دیکھنا تو خیراتی کدھر کو بھاگا ہے مردک، ذرا لپک کے دھر تو لو بچہ کو، تو اس بے وقت کی راگنی کا خوب مزا چکھا دوں!

خیراتی۔ ارے وہ بازار میں ہوگا، اس وقت بے ہودہ اپنے کام سے کام تھا، کنجیاں لے کر کھڑک دیا۔

جمراتی۔ اچھا بچہ کہیں تو ملے گا۔ جہاں ملیں گے وہی ٹھیک بناؤں گا۔

خیراتی۔ اور جو کہیں سر بازار مٹھ بھیڑ ہوگئی تو کیا کروگے؟

جمراتی۔ وہیں پر بچہ کو دو چار پٹخیاں دوں گا، بھرکس نہ نکال لیا تو نام نہیں!

خیراتی۔ مگر استاد لوگ دیکھیں گے تو کیا کہیں گے؟ یہی نا کہ یہ لوگ رئیس ہوکر رئیسوں کا نام بدنام کرتے ہیں اور آوارہ بدمعاشوں کی طرح بازاروں میں لڑتے پھرتے ہیں۔

جمراتی۔ یار تم بھی نرے بمبوق ہی نکلے، پہلے میں اس حرام زادے کی جی بھرکر مرمت کرچکتا تو بعد کو دیکھا جاتا۔ مگر اب تو تم نے یاد دلا دی، بھلا کون اپنی عزت کے پیچھے پڑے گا۔

غرض کہ یہ بیرنگ واپس ہوئے۔ جب بازار کے قریب پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ بھکیلو منہ میں پان ٹھونسے بڑے فخر سے ان کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اب ان سب کو جتنا غصّہ آیا ہوگا، اس کا تصور کرنا مشکل ہے۔ ذرا ان حضرت کی کارستانیوں کو ملاحظہ فرمائیں۔ اپنے ساتھیوں کو جھانسا پٹی دے کر ڈیرے پر لوا لے گیا، وہاں سے خود تو کامیاب ہوکر لوٹا اور وہ سب کے سب مایوس ہوکر ایک ایک پان کو روتے رہے، مگر اس نے دھلے کے بیڑے منہ میں بھرلیے۔ جمراتی تو دانت کٹ کٹاکر رہ گیا۔ خیراتی کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ جھنگوری (جو نہایت سنجیدہ آدمی تھا) کی تیوری پر بھی بل پڑگئے اور اگر ان تینوں کو عزت کا خیال نہ ہوتا تو میاں بھکیلو کی خیریت نہ تھی۔ ضرور کھوپڑی رنگی جاتی۔ ایسے بے بھاؤ کی پڑتی کی ہوش پڑے ہوجاتے۔ مگر خیریت ہوگئی۔ اگر کچھ ہوا تو اتنا ہوا کہ ان سب نے غصّے سے بھری ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ مگر وہ ایک چھٹا گرگا، بلا کا جھانسے باز، خود تو سب کے آگے آگے سرداروں کی طرح بیڑے چباتا، مونچھوں پر تاؤ دیتا

چلا اور یہ سب دل ہی دل میں جلتے بھنتے، دشمن کو برا بھلا کہتے، اس کے پیچھے پیچھے اس طرح چلے کہ جیسے اِس وقت اُس سرداری کا کوئی خاص حق حاصل ہے جس کے سبب سے یہ سب بے چارے بنا کان ہلائے چلے جاتے ہیں، چوں تک نہیں کرتے۔ جب بازار پہنچ گئے تو سب سے پہلے یہ رائے قرار پائی کہ للو ساہو کی دُکان پر چلو۔ دیکھو وہ کیا کہتا ہے۔ اگر راضی ہوگیا تو کیا کہنا، ورنہ دوسرا دروازہ دیکھیں گے۔

ساہو جی مسند لگائے بیٹھے ہوئے تھے۔ ماتھے پر چندن کا ٹیکا لگا ہوا تھا۔ گلے میں ایک مالا پڑی ہوئی تھی۔ ہاتھ کی چھنگلی میں کچھ نہیں تو ایک درجن الگ الگ قسموں کی انگوٹھیاں ہاتھ کی رونق بڑھارہی تھیں۔ پیر کے انگوٹھے میں چاندی کے چھلّے پڑے ہوئے تھے اور جناب کے جسم کا کیا پوچھنا، خاصے ڈھوکے ڈھو تھے کوئی دور سے دیکھے، تو اسے یہی گمان ہو کہ ہاتھی کا بچہّ آرہا ہے۔ سامنے پیتل کی ایک بڑی سی دوات، سرکنڈے (لمبائی، چوڑائی، سب برابر) کا قلم، ٹین کی چھوٹی سے ڈبی میں بالو، جو سیاہی سوختہ کا کام دیتی تھی، یہ سب ترتیب وار سلیقے سے اپنی اپنی مناسب جگہوں پر رکھے ہوئے تھے۔ بغل میں منیم جی جلوہ افروز تھے۔ اور ہاتھ میں ایک تمسّک لیے پڑھ رہے تھے۔ دو چار دستاویزیں، رہن نامے وغیرہ اِدھراُدھر پھیلے ہوئے تھے۔ ساہو جی عبارت کو غور سے سنتے جاتے تھے اور بیچ بیچ میں جرح بھی نکال دیتے تھے۔ جب یہ لوگ دُکان پر کھڑے ہوئے تو اس نے ان کی طرف آنکھ اٹھاکر دیکھا اور پوچھا۔ کیا چاہیے؟

اِدھر تو پہلے ہی سے یہ رائے طے پاچکی تھی کہ بھکیلو اس جماعت کا وکیل قرار دیا جائے چونکہ وہ رئیسی اور امیری کی تمام ضروری، تکلف کی چیزوں سے لیس تھا۔ اس وقت سرداری اسی کو پھبتی بھی تھی لہٰذا اس نے بے غرض لہجے میں جواب دیا۔ ہمارے پاس ایک کنٹھا بکاؤ ہے، ضرورت ہو تو لے لیجیے۔

ساہو۔ کیسا مال ہے، ذرا ہاتھ میں دینا، دیکھوں تو۔

اس نے اس زیور کو ہاتھ میں لے کر غور سے دیکھا اور بولا۔ نا بابا ایسا مال ہمارے یہاں نہیں لیا جاتا، اور دروازہ دیکھیے۔

جب یہاں سے ناکام واپس ہوئے اور جس موتی کی تلاش تھی، وہ ہاتھ نہ لگا

تو سب چکرائے کہ اب کون سی حکمت کام میں لائی جائے۔ اپنی اپنی رائے ہر آدمی دینے لگا۔ ماشاء اللہ، بھکیلو ایک ہی جعل ساز تکڑی آدمی تھا۔ سنو یارو، یوں تو یہ پکنے پکانے کا نہیں، ہم لوگ اگر اپنا پُرانا طریقہ اختیار کریں تو ممکن ہے کوئی آنکھ کا اندھا گانٹھ کا پورا پھنس جائے۔

سب نے اس کی سوجھ بوجھ کی خوب ہی داد دی اور منصوبے کے مطابق مسٹر بھکیلو دوسری دُکان پر گئے۔ پہلے وکیل صاحب اکیلے دُکان میں داخل ہوئے۔ یہاں اس وقت ساہو جی کچھ کھانا پانی کرنے گئے ہوئے تھے۔ اور منیم جی، جو ایک نوجوان اور نا تجربہ کار آدمی تھے، ان کی بغل میں ایک صاحب تشریف فرماتھے۔ آہا، ہم نے ان کو پہچان لیا، یہ تو وہی ہمارے لنگیشور ناتھ کے مندر کے سوامی جی ہیں۔ سوامی جی نے اپنی لچھیدار باتوں سے اسے شیشے میں اُتار لیا تھا۔

منیم۔ کیوں بابا جی، آپ تو فرماتے ہیں کہ بس میں کرنا بہت آسان ہے، بھلا ہم کو بھی تو کوئی چھوٹا موٹا ٹکا بتایئے۔

سوامی۔ سنو بھائی، بس میں کرنا سیکھنا بہت ہی سہل ہے کوئی مشکل نہیں، مگر ہم لوگوں کو کسی اَن سکھے سے تعجب آمیز اور حیرت انگیز کاموں کو ابھی کوئی بات چیت کر بہت مناہی ہے۔ لکھا ہے کہ اپنے باپ سے بھی ایسی بات نہ کہو۔ اس لیے تمھاری مسلسل فکر اور خدمت سے میرا دل بہت مطمئن ہوگیا ہے۔ میں بہت خوشی سے تم کو ایک جگایا ہوا منتر بتاؤں گا، ایشور چاہے گا تو تمھارے تمام دلی مقاصد بر آئیں گے۔

منیم۔ باباجی، کہیں ایسا ہوا تو جیتے جی قدم نہ چھوڑوں گا۔

سوامی۔ ارے دوست، کہہ تو دیا کہ ہوگا اور بیچ کھیت میں ہوگا۔ اس میں بالکل ہی شک نہیں ہے۔ اگر وار خالی جائے تو نام بدل ڈالوں۔ یہ بھی کوئی بالکوں کا کھیل تھوڑے ہی ہے کہ تیر لگا، نہ لگا۔ جس نوجوان پر تم فدا ہو وہ دوڑتی ہوئی آئے اور تمھارے دروازے پر ناک رگڑے تو سہی!

منیم۔ تو پھر مہاراج، بتلا دیجیے کہ آپ کے درِ دولت پر کب آؤں؟

سوامی۔ تم کو ہمارے یہاں آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تمھارا کام گھر بیٹھے پورا ہوجائے گا۔ جب میں نے ہی کمر باندھ لی ہے تو پھر کتنی دیر لگتی ہے۔ مگر پہلے اس

کا سامان تو اکٹھا کرلو۔

منیم۔ جو جو چیزیں درکار ہوں انھیں بتلا دیجیے تاکہ اس دن تک سب سامان اکٹھا کر رکھوں۔

سوامی۔ اچھا بتلا دوں گا۔ اس دم تمھارے کام میں خلل پڑے گا۔ یہ میاں کچھ سودا چکانے آئے ہیں ان کا کام پورا ہوجائے اور یہ چلتا دھندا دیکھیں تو میں تفصیل سے بتایا چلوں۔

منیم اس بے وقت کے خلل سے دل میں بہت کڑھا مگر کرتا کیا بے چارا، اس خرید و فروخت کی روٹی کھاتا تھا۔ اس نے بھکیلو سے پوچھا۔ کہیے میاں جی، کیا کام ہے؟

بھکیلو۔ بھئی میرے پاس ایک جڑاؤں کنٹھا ہے، تم کو ضرورت ہو تو لے لو۔

منیم۔ ادھر لاؤ ہاتھ میں، دیکھیں مال چھوکھا ہے کہ نہیں۔

بھکیلو۔ ارے حضرت، آپ اسے کیا ادھر ادھر پھیرپھار رہے ہیں۔ یہ زیور واجد علی شاہ کے زمانے کا ہے، کوئی ایسا ویسا نہیں۔ کچھ وقت ہی ایسا بُرا آپڑا ہے، نہیں تو کیا ایسی انمول اور نایاب چیزیں بیچے جانے کے قابل ہیں۔

منیم۔ ہاں ہاں، مال تو چوکھا نظر آتا ہے۔ دام کام کرو، لے لیں گے۔

اسی بیچ بھکیلو اور سوامی جی نے آنکھوں ہی آنکھوں سے اپنا اپنا مطلب ظاہر کیا۔

سوامی جی۔ (منیم سے) بچہّ ادھر تو بڑھانا، میں بھی دیکھوں کیسا مال ہے۔ (ہاتھ میں لے کر) دوست مال تو کھرا دکھائی پڑتا ہے۔

یہ کہہ کر سوامی جی پھر بھکیلو سے بولے۔ کیوں میاں جی، یہ کنٹھا یقیناً کسی مسلمان بائی کے گلے کا ہوگا۔ ہے نا ٹھیک بات؟

بھکیلو نے پھر سوامی جی کی طرف اشارہ کیا کہ یار دیکھو کہیں بنا بنایا کھیل بگڑ نہ جائے۔ سوامی جی نے نظروں ہی سے سمجھا دیا کہ اجی، کہاں کی بات، تم اطمینان رکھو۔ دیکھو تو اس بمبوق کو کیسا چکما دیتا ہوں، کہ وہ بھی یاد کرے گا کہ کسی نے ہتھے پر چڑھایا تھا۔

سوامی۔ کیوں میاں، اس کی گندھائی پرانی تو ہے، لیکن تم بتلا سکتے ہو کہ کتنی دن کی ہے؟

بھکیلو۔ (اشارہ سمجھ کر) ہوگی کوئی ڈیڑھ دو سو سال کی۔

اب تو سوامی جی ایسے خوش ہوئے کہ جیسے کوئی دبا ہوا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو اور منیم کو ایک کونے میں لے جاکر دھیمے دھیمے کہنا شروع کیا۔ دوست، تم تو بڑے نصیبوں والے جان پڑتے ہو۔ جس شے کے ملنے کی امید نہ تھی، وہ بنا ہاتھ پیر ہلائے مل گئی۔ ہلدی لگی نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا۔ سچ ہے، جس کام کو کروانا ایشور کو منظور ہوتا ہے اس کے تمام سازوسامان آپ ہی آپ اکٹھا ہو جاتے ہیں۔ کہاوت ہے کہ ہونہار بروان کے چکنے چکنے پات۔

منیم۔ (خوش ہوکر) سچ کہیے وہ کون چیز ہے؟

سوامی۔ اجی کسی ملچھ عورت کے کنٹھے کی ایسی گودھن ضروری تھی جو دو سو برس سے کم کی نہ ہو۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ چیزیں بڑی بڑی کھوج کے بعد ہاتھ لگے گی مگر ایشور کی نظر کرم تھی، مل گئی۔

منیم۔ (پھول کر) یہ سب آپ ہی کے قدموں کا فیض ہے مہاراج، نہیں تو بھلا مجھے کون پوچھتا۔

سوامی۔ اب آج تو ہم کو یہ احساس ہوگیا کہ تمھارے خوش نصیب ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔

منیم۔ پھر آج آپ کی بات میں بھی مجھ کو کوئی شک ہوسکتا ہے؟

القصہ اتنی باتیں کرنے کے بعد منیم جی نے میاں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ کیوں صاحب یہ مال کتنے میں آئے گا؟

بھکیلو۔ جتنے کا تول سے ٹھہر جائے، کچھ اٹکل پچو تھوڑے ہی بیچیں گے۔

منیم۔ (تول کر) یہ اس وقت نو روپے کا ٹھہرتا ہے کیوں سوامی جی، ہے نا؟

سوامی۔ سچ ہے تو سب کچھ ہے۔ یہی اپنے ساتھ جائے گا بچہ۔ میری سمجھ میں تو پندرہ روپے کا مال ہوتا ہے۔

وہ لوگ ابھی آپس میں مول تول کرہی رہے تھے کہ میاں جمعراتی ہانپتے ہوئے آئے اور فرمانے لگے۔ واہ رے میاں جمال الدین (بھکیلو) تم بھی کچھ عجیب کینڈے کے آدمی ہو۔ للو ساہو کتنا پکار کے ہار گیا، اور تم شان کے مارے نہ گئے۔ سودا اس بے غرضی سے نہیں چکتا۔

بھکیلو۔ للّو ساہو میں کون سا چاند لگ گیا ہے کہ خواہ مخواہ وہیں جاؤں! یہ تو دل پٹے کا سودا ہے، نہ وہاں، دوسری جگہ سہی۔ کچھ وہ مفت تو روپے دیں گے نہیں، جو مال ٹھہرے گا اسی کی قیمت ہر جگہ ملے گی وہ سمجھتے ہیں کہ ایک دفعہ جھانسا پٹی دے کر سو کا مال دس میں مار لیا ویسا ہی ہر دفعہ کرلوں گا۔ مگر بندہ اب اس چکمے میں ہرگز نہیں آئے گا۔

جمعراتی۔ ارے یار، یہ تو مصیبت سب کچھ کروا رہی ہے نہیں تو کیا ایسی ایسی نایاب چیزیں بیچنے قابل تھیں۔ زمانے کے انقلاب نے ہمیں اس حال کو پہنچا دیا کہ اب گلی گلی زیور بیچتے پھرتے ہیں۔ خیر، اس پر بھی صبر کرنا ہم لوگوں کا فرض ہے۔ ہاں یہ تو بتلاؤ، کچھ دام کام ہوا یا نہیں یا گھنٹوں سے یوں ہی بیکار کھڑے ہو؟

بھکیلو۔ تُل تو گیا ہے، منیم جی نو روپے آنکتے ہیں۔

اس نو روپے کا نام سن کر جمعراتی نے ایسا چہرہ بنایا کہ جیسے اسے بڑے زور کی ہنسی آرہی ہے مگر وہ بڑی بڑی کوشش سے اس کو روک رہا ہے۔

جمعراتی۔ سچ کہو، اجی نو روپے! نہیں، دل لگی کرتے ہو!

بھکیلو۔ اس میں دللگی کیا ہے، خریدار تو سامنے ہی بیٹھا ہے تمھیں پوچھ لونا؟

جمعراتی۔ خیر تو معلوم ہوگیا۔ اسی سے میں کہتا ہوں کہ للّو بڑا گنا آدمی ہے۔ کھوٹے کھرے مال کا خوب پرکھنا آتا ہے اور ایسا جانچ کر دام لگاتا ہے کہ لاگت سے کچھ یوں ہی تھوڑے سی کمی ہوتی ہے اگر پچاس کا مال بیچنے جاؤ تو اس کی دُکان پر چالیس سے کم کسی طرح نہ ملیں گے۔ اور پھر وہ اپنا مہاجن ٹھہرا، وقت بے وقت گوں بیگوں سو پچاس کے لیے 'نہیں' نہیں کرتا۔ اس نے اس کنٹھے کو دیکھ کر ہی کہہ دیا تھا کہ ساٹھ سے زیادہ ملے تو اور جگہ دینا، نہیں، تو میری دُکان پر آنا۔ بھلا کہاں ساٹھ اور کہاں نو! زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ آؤ لوٹ چلو۔

یہ لوگ ابھی باتوں ہی میں لگے تھے کہ میاں خیراتی اکڑتے بربراتے آموجود ہوئے۔

خیراتی۔ اخاہ مرزا جلال الدین، ابھی تم یہیں کھڑے ہو؟ کیوں، کیا ہوا اس بارے میں؟

بھکیلو۔ کیا بتائیں مہربان، یہ عجیب جھمیلے میں جان پڑی ہے۔ للّو مل اس کا دام ساٹھ روپے

آنکتا ہے اور منیم جی نو روپے! میری عقلمندی تو دیکھو کہ میں اس کی دُکان کو دتکار بتاکر یہاں آیا، مگر یہاں تو وہی مثل ہے، اونچی دُکان پھینکا پکوان۔ منیم جی کو کھوٹے کھرے کی تمیز نہیں، اب غیرت نہیں گوارا کرتی کہ جس دُکان پر اینڈی بینڈی سنا کر آئے ہیں پھر منہ لے کر جائیں۔

سوامی جی نے ان لوگوں کی بات چیت غور سے سنی اور سمجھ گئے کہ یہ سب نقلی مال کو زبان چلاکر اصلی کر دکھایا چاہتے ہیں۔ انھوں نے ایسی ایسی ہزاروں چالیں چلیں تھیں۔ ان کو معلوم ہوگیا کہ یہ بیل موڑھے چڑھنے کی نہیں۔ ممکن ہے کہ اس کی قیمت کچھ زیادہ لگ جائے، مگر ایسا اندھا کون ہوگا جس کو کھوٹے کھرے کی پہچان نہ ہوگی۔ انھوں نے جمعراتی کو الگ بلاکر کہا۔ میاں خیر مناؤ، میں چکما دے کر پندرہ روپے دلوائے دیتا ہوں۔ آدھے میرے ہوں گے اور آدھے تمھارے۔ اور جو تم یہ چاہو کہ اس کو اصلی کرکے بیچو، تو بھائی دوسرا دروازہ دیکھو۔ چال وہاں تک چلو جہاں تک گرفت کے قابل نہ ہو۔ اب یہ زیور تو خاصہ پیتل کا بنا ہوا ہے، ملمع تک نہیں، بھلا کس کی آنکھ میں دھول ڈالوگے اور کس کا روپے پڑا ہوا ہے جو یوں پانی میں ڈالے گا۔ وہمی باتیں چھوڑو، آؤ ہاتھ پر ہاتھ مارو، پندرہ روپے لاٹ شاہی دلائے دیتا ہوں۔

خیر معاملہ طے پاگیا۔ سوامی جی نے باتوں ہی باتوں میں اس کی قیمت پندرہ روپے لگا دی سودا چک گیا۔ یہ سب تو اپنی اپنی راہ لگے، سوامی نے منیم کو بہت سی تشفی اور دلاسہ دیا اور دوسرے دن نور کے تڑکے ضروری سامان کے ساتھ آنے کا وعدہ کرکے چلتے ہوئے۔ راستے میں میاں لوگوں سے آدھا حصّہ پٹوا لیا اور مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے چلتے پھرتے نظر آئے۔ جمعراتی وغیرہ اس زیوروں کو بیچ کر مارے خوشی کے پھولے نہ سماتے تھے۔ باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ سمجھتے تھے کہ جگ جیت لیا۔

جمعراتی۔ بھئی واہ، کیا خوب، نو آنے کا مال پندرہ روپے بھر!

بھکیلو ۔ کیوں استاد، نہ کہو گے یہ بندے کی کارستانی ہے ورنہ اس کو تو کوئی کوڑیوں کے مول بھی نہ پوچھتا۔

خیراتی۔ بے شک استاد، تم نے وہ کام کر دکھایا کہ رستم سے بھی نہ ہوگا۔ مگر وہ پجاری نہ ہوتا تو تم لوگوں کے تمام چکمے خاک میں مل جاتے۔ اس نے منیم پر نہ معلوم کون سا جادو پھونک دیا کہ آناً فاناً اس کی عقل سب حر ہوگئی اور اس شاطرپن کو دیکھو کہ دم کے دم میں ساڑھے سات روپے بنالیے۔

جمعراتی۔ یہ سب تو ہوتا ہی رہے گا، اب یہ تو سوچو کہ کیا کیا سودا خریدنے ہیں۔

خیراتی۔ یارو، میں تو ڈیڑھ تولہ افیم ضرور لوں گا اور چار آنے کی ریوڑھی۔

جمعراتی۔ اور میں تو اپنے واسطے چانڈو اور اپنے بلبل کے واسطے گوشت اور بیسن ضرور لوں گا۔

بھکیلو۔ تو گھاٹے میں میں ہی رہا۔ کیا دھرا میرا اور مال ماریں آپ لوگ!

جمعراتی۔ نہیں نہیں، لو استاد، بھلا یہ کب ممکن ہے۔ تم بھی اپنی فرمائش کرو۔

بھکیلو۔ اچھا تو میرے لیے دو بوتلیں شراب کی اور سیر آدھا سیر تمباکو اور سفید پکے ہوئے پان خرید لینا۔

جھنگوری۔ سب لوگ تو جدی جدی فرمائش کرچکے، اب اس غریب کی بھی کوئی سنتا ہے؟

جمعراتی۔ ہاں، ہاں بھائی تم کیوں پھسڈی رہے جاتے ہو، تم بھی فرمائش کرو۔

جھنگوری۔ استاد، میرے لیے اس وقت سیر بھر پوریاں اور سیر بھر مٹھائیاں کافی ہوں گی۔ اور کچھ نہیں چاہتا۔

غرض سب نے علیحدہ علیحدہ فرمائش کی۔ ساڑھے سات روپے کچھ قارون کا خزانہ تو ہے نہیں کہ چاہے جتنا اڑاتے جائیں جیوں کا تیوں بنا رہے۔ جب اپنی اپنی مرضی کے موافق سودے خرید چکے اور حساب پورا ہوا تو میزان کی چول ٹھیک نہ بیٹھی۔ کوئی آدھا گھنٹے کے بعد حساب پورا ہوا تو کل چھے پیسے بچ رہے۔ اب تو ہر شخص کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ کھسیانے ہوکر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگا۔

جمعراتی۔ بھائی، یہ تو بڑا بے ڈھب ہوا۔ ہم لوگوں نے تو اپنی اپنی فکر کرلی، مگر اس بے چاری کے واسطے کچھ بھی نہ چھوڑا۔ اب یہ ڈیڑھ آنے پیسے بچ رہے ہیں تھوڑا سا ستو اور گڈھ لے لو، اس وقت گزر بسر ہوجائے گی، صبح کو اللہ مالک ہے، کہیں نہ کہیں ٹھکانا لگ ہی رہے گا۔

هم خرما و هم ثواب

پہلا باب

سچّی قُربانی

شام کا وقت ہے۔ غروب ہونے والے آفتاب کی سُنہری کرنیں رنگین شیشوں کی آڑ سے ایک انگریزی وضع پر سجے ہوئے کمرہ میں جھانک رہی ہیں۔ جس سے تمام کمرہ بوقلموں ہو رہا ہے۔ انگریزی وضع کی خوب صورت تصویریں جو دیواروں سے لٹک رہی ہیں اس وقت رنگین لباس پہن کر اور بھی خوب صورت معلوم ہوتی ہیں۔ عین وسط میں ایک خوب صورت میز ہے جس کے اِدھر اُدھر نرم مخملی گدّوں کی رنگین کرسیاں بچھی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک پر ایک نوجوان شخص سر نیچا کیے ہوئے بیٹھا کچھ سوچ رہا ہے۔ نہایت وجیہ و شکیل آدمی ہے جس پر انگریزی تراش کے کپڑوں نے غضب کا پھبن پیدا کر دیا ہے۔ اس کے سامنے میز پر ایک کاغذ ہے جس پر وہ بار بار نگاہ ڈالتا ہے۔ اس کے بشرہ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اس وقت اس کے خیالات اُسے بے چین کر رہے ہیں۔ یکایک وہ اُٹھا اور کمرہ سے باہر نکل کر برآمدہ میں ٹہلنے لگا جس میں خوب صورت پھولوں اور پتوں کے گملے سجا کر دھرے ہوئے تھے۔ برآمدہ سے پھر کمرہ میں آیا۔ کاغذ کا ٹکڑا اُٹھا لیا اور ایک بد حواسی کے عالم میں بنگلہ کے احاطہ میں ٹہلنے لگا۔ شام کا وقت تھا۔ مالی پھولوں کی کیاریوں میں پانی دے رہا تھا ایک طرف سائیس گھوڑے کو ٹہلا رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی اور سہانی ہوا چل رہی تھی۔ آسمان پر شفق پھولی ہوئی تھی مگر وہ اپنے خیالات میں ایسا غرق تھا کہ اس کو ان دلچسپیوں کی مطلق خبر نہ تھی۔ ہاں اُس کی گردن خود بخود ہلتی تھی اور ہاتھ کچھ اس طرح اشارے کر رہے تھے گویا وہ کسی سے باتیں کر رہا ہے۔ اسی اثنا میں ایک بائیسکل پھاٹک کے اندر داخل ہوئی اور ایک نوجوان کوٹ پتلون پہنے، چشمہ لگائے، سگار پیتا، جوتے چرمر کرتا اُتر پڑا اور بولا۔ "گڈ ایوننگ مسٹر امرت رائے!"

امرت رائے نے چونک کر سر اُٹھایا اور بولے "او! آپ ہیں مسٹر دان ناتھ!

آیئے تشریف لائیے۔ آپ آج جلسہ میں نظر نہ آئے۔"

دان ناتھ۔ "کیسا جلسہ! مجھے تو اس کی خبر بھی نہیں۔"

امرت رائے۔ (حیرت سے) ایں! آپ کو خبر ہی نہیں۔ آج آگرہ کے لالہ دھنکھ دھاری لال صاحب نے بڑے معرکے کی تقریر کی۔ مخالفین کے دانت کھٹے کر دیے۔"

دان۔ "بخدا مجھے ذرا بھی خبر نہ تھی۔ ورنہ میں ضرور جلسہ میں شریک ہوتا۔ میں تو لالہ صاحب کے تقریروں کے سُننے کا مشتاق ہوں۔ میری بدقسمتی تھی کہ ایسا نادر موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ مضمون کیا تھا؟"

امرت رائے۔ "مضمون سوائے اصلاحِ معاشرت کے اور کیا ہوتا۔ لالہ صاحب نے اپنی زندگی اسی کام پر وقف کردی ہے۔ آج ایسا پُرجوش خادمِ قوم اور با اثر شخص اس صوبہ میں نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ لوگوں کو ان کے اصولوں سے اختلاف ہو مگر ان کی تقریروں میں ایسا جادو ہوتا ہے کہ لوگ خودبخود کھنچتے چلے آتے ہیں۔ مجھے لالہ صاحب کی تقریروں کے سُننے کا بارہا فخر حاصل ہوا ہے مگر آج کی اسپیچ میں کچھ اور ہی بات تھی۔ اس شخص کی زبان میں جادو ہے جادو الفاظ وہی ہوتے ہیں جن کو ہم روز مرّہ کی گفتگو میں استعمال کرتے ہیں۔ خیالات وہی ہوتے ہیں جن پر ہم لوگ یکجا بیٹھ کر اکثر بحث کیا کرتے ہیں۔ مگر طرزِ بیان میں کچھ اس غضب کا اثر ہے کہ دلوں کو لبھا لیتا ہے۔"

دان ناتھ کو ایسی نادر تقریر کے نہ سُننے کا سخت افسوس ہوا۔ بولے "یار میں بڑا بدقسمت ہوں۔ افسوس! اب ایسا موقع پھر نہ ہاتھ آئے گا۔ کیا اب کوئی اسپیچ نہ ہوگی۔"

امرت رائے۔ "امید تو نہیں کیونکہ لالہ صاحب آج ہی لکھنؤ تشریف لے جا رہے ہیں۔"

دان ناتھ۔ کمال افسوس ہوا۔ اگر آپ نے اس تقریر کا کوئی خلاصہ کیا ہو تو مجھے دے دیجیے۔ ذرا دیکھ کر تسکین کرلوں۔"

امرت رائے نے وہی کاغذ کا ٹکڑا جس کو بار بار پڑھ رہے تھے دان ناتھ کی ہاتھوں میں دے دیا اور بولے اثنائے تقریر میں جو حصّے مجھے نہایت اچھے معلوم ہوئے ان کو نقل کرلیا۔ ایسی روانی میں لکھا ہے کہ شاید بجز میرے اور کوئی پڑھ

بھی نہ سکے۔ دیکھیے ہمارے رؤسا و مقتدایانِ قوم کی غفلت و بے پروائی کو کیا بیان کیا ہے۔

> ''حضرات! سب خرابیوں کی جڑ ہماری لاپروائی ہے۔ ہماری حالت بالکل نیم جان مریض کی سی ہے جو دوا کو ہاتھ میں لے کر دیکھتا ہے مگر منہ تک نہیں لے جاتا۔ ہاں صاحبو! ہم آنکھیں رکھتے ہیں مگر اندھے ہیں۔ ہم کان رکھتے ہیں مگر بہرے ہیں۔ ہم زبان رکھتے ہیں مگر گونگے ہیں۔ اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ ہم کو اپنی معاشرت کے نقائص نظر نہ آتے ہوں۔ ہم تمام اچھی باتوں کو جانتے ہیں اور مانتے ہیں۔ مگر جس طرح مسائل اخلاقی پر ایمان رکھ کر بھی ہم گمراہ ہوتے ہیں خدا کے وجود کے قائل ہوکر بھی منکر بنتے ہیں۔ اسی طرح اصلاحِ تمدن کے مسائل سے اتفاق رکھتے ہیں مگر ان پر عمل نہیں کرتے۔''

امرت رائے نے بڑے پُرجوش لہجہ میں یہ عبارت پڑھی۔ جب وہ خاموش ہوئے تو دان ناتھ نے کہا '' بے شک خوب فرمایا ہے۔ بالکل ہمارے حسبِ حال۔''

امرت رائے۔ ''جنابِ من مجھ کو سخت افسوس ہے کہ میں نے ساری تقریر کیوں نہ نقل کرلی۔ اردو زبان پر ایسے ہی وقت غصّہ آتا ہے کاش انگریزی تقریر ہوتی تو صبح ہوتے ہی تمام روزانہ اخباروں میں شائع ہوجاتی۔ نہیں تو شاید کہیں خلاصہ رپورٹ چھپے تو چھپے۔ (ایک لمحہ کی خموشی کے بعد) کیسے گرم الفاظ میں تحریک کی ہے کہ جب سے جلسہ سے آیا ہوں وہی صدائیں برابر کان میں گونج رہی ہیں۔ مائی ڈیر دان ناتھ! آپ میرے خیالات سے واقف ہیں۔ آج کی اسپیچ نے ان خیالات کو عملی صورت اختیار کرنے کی جرأت کی ہے۔ میں اپنے کو قوم پر قربان کردوں گا۔ اب تک میرے خیالات مجھ ہی تک تھے۔ اب وہ ظاہر ہوں گے۔ اب تک میرے ہاتھ سُست تھے۔ مگر اب میں نے ان سے کام لینے کا قصدِ مصمم کیا ہے۔ میں بہت با اختیار شخص نہیں ہوں۔ میری جائداد بھی کثیر نہیں۔ مگر میں اپنے کو اور اپنی ساری جتھا کو قوم پر قربان کردوں گا۔ (آپ ہی آپ) ہاں میں اپنے کو ضرور نثار کردوں گا۔ (جوش سے) اے تھک کر بیٹھی ہوئی قوم! لے تیری حالت پر رونے والوں میں

ایک اور اضافہ ہوا۔ آیا اس سے تجھے کچھ فائدہ ہوگا یا نہیں اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔" یہ کہہ کر امرت رائے زمین کی طرف دیکھنے لگے۔ دان ناتھ جو ان کے بچپن کے ساتھی تھے ان کے مزاج سے خوب واقف تھے کہ جب ان کو کسی بات کی دُھن سوار ہوجاتی ہے تو اس کو بلا پورا کیے نہیں چھوڑتے۔ چنانچہ انھوں نے اونچ نیچ سوجھانا شروع کیا۔

"مہربانِ من! یہ خیال تو کیجیے کہ آپ کیسا خطرناک کام اپنے ذمہ لے رہے ہیں آپ کو ابھی نہیں معلوم کہ جو راستہ صاف نظر آرہا ہے وہ کانٹوں سے بھرا ہوا ہے۔"

امرت رائے۔ "اب تو ہرچہ بادا باد! میں خوب جانتا ہوں کہ مجھے بڑی بڑی دقتوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ مگر نہیں معلوم کچھ عرصے سے میرے دل میں کہاں سے قوت آگئی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں بڑے سے بڑا کام کرسکتا ہوں۔ اور اس کو انجام تک پہنچا کر سرخروئی حاصل کرسکتا ہوں۔"

دان ناتھ۔ "جی ہاں۔ فوری جوشوں کا ہمیشہ یہی حال ہوتا ہے۔ اب ذرا خیالات سے ہٹ کر واقعات پر آئیے۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ شہر بطالت اور استخواں پرستی کا مرکز ہے۔ نئے خیالات یہاں ہرگز نشو ونما نہیں پاسکتے۔ علاوہ بریں آپ بالکل تنہا ہیں۔ جو جوابدہیاں آپ اپنے سر لیتے ہیں ان سے جہاں تک میرا خیال ہے آپ کے دشمن زیادہ ہوجائیں گے۔ اور شاید احباب بھی کنارہ کشی کریں۔ آپ اکیلے کیا بنا لیں گے!"

امرت رائے نے دوست کی باتوں کو سن کر سر اُٹھایا اور بڑی سنجیدگی سے بولے۔"دان ناتھ یہ تم کو کیا ہوگیا ہے؟ مردِ خدا تم کہتے ہو اکیلے کیا بنالو گے۔ اکیلے آدمیوں نے سلطنتیں فتح کی ہیں قوموں کی بنیادیں ڈالیں ہیں۔ اکیلے آدمیوں نے تاریخ کے صفحے پلٹ دیے ہیں۔ گوتم بدھ کیا تھا۔ محض ایک بادیہ گرد فقیر جس کا سارے زمانے میں کوئی مددگار نہ تھا۔ مگر اس کی زندگی ہی میں آدھا ہندستان اس کا مرید ہوچکا تھا آپ کو کتنی مثالیں دوں۔ قوموں کے نام تنہا آدمیوں سے روشن ہیں آپ جانتے ہیں کہ افلاطون ایک بڑا آدمی تھا۔ مگر آپ میں کتنے ایسے ہیں جو

جانتے ہوں کہ وہ کس ملک کا باشندہ ہے۔

دان ناتھ ذی فہم آدمی تھے۔ سمجھ گئے کہ اس وقت جوش زندہ ہے۔ نشیب و فراز سوجھانا فضول ہے۔ پس انھوں نے فہمائش کا نیا ڈھنگ اختیار کیا۔ بولے "اچھا میں نے مان لیا کہ اکیلے لوگوں نے بڑے بڑے کام کیے ہیں اور آپ بھی قوم کی بھلائی کچھ نہ کچھ کرلیں گے مگر اس کا تو خیال کیجیے کہ آپ ان لوگوں کو کتنا بڑا صدمہ پہنچائیں گے۔ جن کو آپ سے کوئی تعلق ہے۔ پریما سے بہت جلد آپ کی شادی ہونے والی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اس کے والدین پرلے سرے کے کٹر ہندو ہیں۔ جب ان کو آپ کے انگریزی وضع و قطع پر اعتراض ہے تو فرمایئے جب آپ قومی اصلاح پر کمر باندھیں گے تو ان کا کیا حال ہوگا۔ غالبًا آپ کو پریما سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔"

یہ تیر کاری لگا۔ دو تین منٹ تک امرت رائے زمین کی طرف تاکتے رہے۔ بعد اس کے انھوں نے سر اُٹھایا آنکھیں سرخ تھیں۔ آنسو نمودار تھا، مگر قومی فلاح نے نفس پر قابو پا لیا تھا۔ بولے۔"حضرت! قوم کی بھلائی کرنا آسان نہیں۔ گو میں نے ان دقتوں کا خیال پہلے نہیں کیا تھا۔ تاہم میرا دل اس وقت ایسا مضبوط ہے کہ قوم کے لیے ہر ایک مصیبت سہنے کو تیار ہوں۔ پریما سے بے شک مجھ کو غائبانہ محبت تھی۔ میں اس کا شیدائی تھا۔ اور اگر کوئی وہ زمانہ آتا کہ مجھ کو اس کے شوہر بننے کا فخر حاصل ہوتا تو میں ثابت کرتا کہ محبت اس کو کہتے ہیں! مگر اب پریما کی صورت میری نگاہوں سے غائب ہوتی جاتی ہے۔ یہ دیکھیے وہ فوٹو ہے جس کی میں اب تک پرستش کیا کرتا تھا۔ آج اس سے بھی کنارہ کش ہوتا ہوں۔ کہتے کہتے انھوں نے تصویر جیب سے نکال لی اور اس کے پُرزے پُرزے کر ڈالے۔" پریما کو جب معلوم ہوگا کہ امرت رائے اب قوم کا عاشق ہوگیا اور خلق کا فدائی۔ اس کے دل میں اب کسی نازنین کی جگہ باقی نہیں رہی تو میری اس حرکت کو معاف کردے گی۔

دان ناتھ۔ امرت رائے! مجھ کو سخت افسوس ہے کہ تم نے اس نازنین کی تصویر کی یہ گت کی۔ جس کو تم خوب جانتے ہو کہ تمھاری دلدادہ ہے۔ پریما نے عہد کرلیا ہے کہ

بجز تمھارے کسی اور سے شادی نہ کرے گی۔ اور اگر تمھارا حافظہ کام دیتا ہو تو سوچو تم نے بھی اس قسم کا کوئی وعدہ کیا تھا یا نہیں۔ کیا تم کو نہیں معلوم کہ اب شادی کا زمانہ بہت قریب آگیا ہے۔ اس وقت تمھاری یہ حرکت اس معصوم لڑکی کی کیا حالت کردے گی۔" ان باتوں کو سن کر امرت رائے واقعی کچھ پژمردہ ہوگئے۔ ہاں برابر یہی کہتے رہے کہ پریما اس خطا کو ضرور معاف کردے گی۔ انھیں باتوں میں آفتاب غروب ہوگیا۔ دان ناتھ نے اپنی بائیسکل سنبھالی اور چلتے وقت بولے "مسٹر رائے! خوب سوچ لو ابھی سے بہتر ہے۔ ان پراگندہ خیالات کو چھوڑو۔ آؤ آج تم کو دریا کی سیر کرا لائیں۔ میں نے ایک بجرا لے رکھا ہے۔ چاندنی رات میں بہت لطف آئے گا۔"

امرت رائے۔ اس وقت آپ مجھے معاف کیجیے کل میں پھر آپ سے ملوں گا۔" اس گفتگو کے بعد دان ناتھ تو اپنے مکان کی طرف راہی ہوئے اور امرت رائے اُسی اندھیرے میں دیر تک بے حس و حرکت کھڑے رہے۔ وہ نہیں معلوم کیا سوچ رہے تھے۔ جب اندھیرا زیادہ ہوا تو دفعتاً وہ زمین پر بیٹھ گئے اور اس تصویر کے پریشان پُرزے اِکٹھا کر لیے ان کو اپنے سینے سے لگا لیا اور کچھ سوچتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

بابو امرت رائے شہر کے نہایت معزز و رؤسا میں سمجھے جاتے تھے۔ آبائی پیشہ وکالت تھا خود بھی وکالت پاس کرچکے تھے۔ اور گو ابھی وکالت زوروں پر نہ تھی۔ مگر خاندانی اقتدار ایسا جما تھا کہ شہر کے بڑے سے بڑے رؤسا بھی ان کے سامنے سر نیاز خم کرتے تھے۔ بچپن ہی سے انگریزی کالجوں میں تعلیم پائی اور انگریزی تہذیب اور طرزِ معاشرت کے دلدادہ تھے جب تک والد بزرگوار زندہ تھے پاسِ ادب سے انگریزیت سے محترز رہتے تھے مگر ان کے انتقال کے بعد کھل کھیلے۔ صرف کثیر سے عین دریا کے کنارے پر ایک نفیس بنگلہ تعمیر کرایا تھا اور اس میں رہتے تھے۔ عمارت کے سب سامان موجود تھے کسی چیز کی کمی نہ تھی بچپنے ہی سے علم کے دلدادہ تھے اور مزاج بھی کچھ اس قسم کا واقع ہوا تھا کہ جس چیز کی دُھن سوار ہوجاتی بس اسی کے ہو رہتے تھے جس زمانہ میں بنگلے کی دُھن سوار تھی۔ آبائی

مکانات کوڑیوں کے مول فروخت کردیئے تھے۔ علاقہ پر بھی ہاتھ صاف کرنے کا ارادہ تھا مگر قسمت اچھی تھی باپ کا جمع کیا ہوا کچھ روپیہ بنک میں نکل آیا۔

مسٹر امرت رائے کو کتابوں سے الفت تھی۔ ممکن نہ تھا کہ کوئی نئی تصنیف شائع ہو اور ان کے کتب خانہ میں نہ پائی جائے۔ علاوہ اس کے فنونِ لطیفہ سے بھی بے بہرہ نہ تھے۔ گانے سے طبیعت کو خاص رغبت تھی۔ گو وکالت پاس کرچکے تھے مگر اب تک شادی نہیں ہوئی تھی۔ انھوں نے ٹھان لیا تھا کہ تا وقتیکہ وکالت زوروں پر نہ ہوجائے شادی نہ کریں گے۔ اسی شہر کے رئیسِ اعظم لالہ بدری پرشاد صاحب ان کو کئی برس سے اپنی اکلوتی لڑکی پریما کے واسطے چنے بیٹھے تھے۔ اسی خیال سے کہ امرت رائے کو اس سے شادی کرنے میں کوئی اعتراض نہ ہو پریما کی تعلیم پر بہت لحاظ رکھا گیا تھا۔ منشی صاحب کے مرضی کے خلاف پریما کی تصویر بھی امرت رائے کے پاس بھیجوا دی گئی تھی اور وقتاً فوقتاً دونوں میں خط کتابت بھی ہوا کرتی تھی کیونکہ پریما انگریزی تعلیم پانے سے ذرا آزاد مزاج ہوگئی تھی۔''

بابو دان ناتھ بچپنے ہی سے امرت رائے کے ساتھ پڑھا کرتے تھے اور دونوں میں سچی محبت ہوگئی تھی۔ کوئی ایسی بات نہ تھی جو ایک دوسرے کے لیے اٹھا رکھے۔ دان ناتھ عرصے سے پریما کی دل میں پرستش کرتا تھا مگر چونکہ اس کو معلوم تھا کہ بات چیت امرت رائے سے ہوگئی ہے اور دونوں ایک دوسرے کو پیار کرتے ہیں اس لیے خود کبھی اپنے خیالات کو ظاہر نہیں کیا تھا۔ اس معشوق کے فراق میں جس کے ملنے کی مرکر بھی امید نہ ہو اسے اپنے اطمینان کی گھڑیاں تلخ رکھی تھیں۔ سیکڑوں ہی بار اس کے نفسانیت نے اُبھارا تھا کہ تو کوئی چال چل کر منشی بدری پرشاد کو امرت رائے سے بدظن کر دے مگر ہر بار اس نے اس نفسانیت کو دبانے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ وہ اعلیٰ درجے کا با اخلاق آدمی تھا۔ وہ مرجانا پسند کرتا بجائے اس کے کہ امرت رائے کی نسبت کوئی غلط بیانی کرکے اپنا مطلب نکالے۔ یہ بھی نہ تھا کہ وہ امرت رائے سے سچی ہمدردی دم سازی کا برتاؤ کرتا ہو۔ نہیں۔ برعکس اس کے وہ ہر موقع پر امرت رائے کو تشفی و دِلاسا دیا کرتا تھا۔ اکثر اسی کے معرفت دونوں شیدائیوں میں تحفے تحائف بھیجے گئے تھے۔ خط و کتابت بھی اسی

کے معرفت ہوا کرتی ہے۔ یہ موقع ایسے تھے کہ اگر دان ناتھ چاہتا تو بہت جلد چاہنے والوں میں نفاق پیدا کردیتا۔ مگر یہ اس کی فطرت سے بعید تھا۔

آج بھی جب امرت رائے نے اپنے ارادے ظاہر کیے تو دان ناتھ نے بلا کم و کاست سب دقتیں بیان کردیں۔اس کا دل کیسا اُچھلتا تھا جب وہ یہ خیال کرتا کہ اب امرت رائے میرے لیے جگہ خالی کر رہا ہے مگر یہ اس کی شرافت تھی کہ اس نے امرت رائے کو ان کے ارادے سے باز رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اگر تم ریفامروں کے زمرہ میں شامل ہوگے تو پریما رو رو کر جان دے دی گی۔ مگر امرت رائے نے ایک نہ سنی۔ ان کا ارادہ مستقل تھا جس کو کوئی ترغیب ڈگا نہیں سکتی تھی۔ دان ناتھ ان کے مزاج اور دُھن سے خوب واقف تھے سمجھ گئے کہ اب یہ اڑتے ہیں اور اڑے رہیں گے۔ چنانچہ اب ان کو کوئی وجہ نہ معلوم ہوئی کہ میں اصل واقعہ بیان کرکے کیوں نہ پیاری پریما کے شوہر بننے کا کوشش کروں۔ یہاں سے روانہ ہوتے ہی وہ اپنے گھر پر آئے اور کوٹ پتلون اُتار کر سیدھے سادھے کپڑے پہن لالہ بدری پرشاد صاحب کے دولت خانے کی طرف روانہ ہوئے۔ اس وقت ان کے دل کی جو کیفیت ہو رہی تھی اس کا بیان کرنا مشکل ہے۔ کبھی تو خیال آتا کہ کہیں میری یہ حرکت غلط فہمی کا باعث نہ ہوجائے۔ لوگ مجھ کو حاسد و بدخواہ سمجھنے لگیں۔ پھر خیال آتا کہیں امرت رائے اپنا ارادہ پلٹ دیں اور کیا تعجب ہے کہ ایسا ہوجائے تو پھر میرے لیے ڈوب مرنے کی جا ہوگی مگر ان خیالات کے مقابلے میں جب پریما کی پیاری پیاری صورت نظروں کے سامنے آگئی تو یہ تمام اوہام رفع ہوگئے اور دم کی دم میں وہ لالہ بدری پرشاد کے مکان پر بیٹھے باتیں کرتے دکھائی دیے۔

دوسرا باب

حسد بُری بلا ہے

لالہ بدری پرشاد صاحب امرت رائے کے والد مرحوم کے دوستوں میں تھے اور خاندانی اقتدار، تموّل و اعزاز کے لحاظ سے اگر ان پر فوقیت نہ رکھتے تھے تو ہیٹے بھی نہ تھے۔ انھوں نے اپنے دوست مرحوم کی زندگی ہی میں امرت رائے کو اپنی بیٹی کے لیے منتخب کرلیا تھا اور اگر وہ دو برس بھی زندہ رہتے تو بیٹے کا سہرا دیکھ لیتے۔ مگر زندگی نے وفا نہ کی۔ چل بسے۔ ہاں دمِ مرگ ان کی آخری نصیحت یہ تھی کہ بیٹا میں نے تمھارے واسطے بیوی تجویز کی ہے اس سے ضرور شادی کرنا۔ امرت رائے نے بھی اِس کا پکّا وعدہ کیا تھا۔ مگر اس واقعہ کو آج پانچ برس بیت چکے تھے۔ اس اثنا میں انھوں نے وکالت بھی پاس کرلی تھی اور اچھے خاصے انگریز بن بیٹھے تھے۔ اسی تبدیلِ طرزِ معاشرت نے پبلک کی نظروں میں ان کا وقار کم کردیا تھا۔ برعکس اس کے لالہ بدری پرشاد پکّے ہندو تھے۔ سال بھر بارھوں ماس ان کے یہاں بھاگوت کی کتھا ہوا کرتی تھی۔ کوئی دن ایسا نہ جاتا کہ بھنڈارے میں سو پچاس سادھوؤں کا جیونار نہ بنتا ہو۔ ان فیاضیوں نے ان کو سارے شہر میں ہردل عزیز بنا دیا تھا۔ ہر روز علی الصباح وہ پیدل گنگا جی کے اشنان کو جایا کرتے۔ اور راستے میں جتنے آدمی ان کی بزرگانہ صورت دیکھتے سرِ نیاز خم کرتے۔ اور آپس میں کانا پھسکی کرتے وقت دعا کرتے کہ یہ غریبوں کا دست گیر ہمیشہ یوں ہی سرسبز رہے۔

گو منشی بدری پرشاد امرت رائے کی انگریزیت کو ذلت و حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور کئی بار ان کو سمجھا کر ہار بھی چکے تھے مگر چونکہ ان کو اپنی جان سے عزیز بیٹی پریما کے لیے منتخب کرچکے تھے اس لیے مجبور تھے۔ کیونکہ ان کو اس شہر میں ایسا ہونہار، خوشرو، باخبر اور اہلِ ثروت داماد نہیں مل سکتا تھا اور دوسرے شہر میں وہ اپنی لڑکی کی شادی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اسی خیال سے کہ لڑکی امرت رائے کے مرضی کے موافق ہو

اس کو انگریزی و فارسی اور ہندی کی تھوڑی تھوڑی تعلیم دی گئی تھی اور ان اکتسابی کمالات پر فطرتی عطیات گویا سونے میں سہاگہ تھے۔ سارے شہر کی جہاندیدہ اور نکتہ رس متفق البیان تھیں کہ ایسی حسین و خوش رو لڑکی آج تک دیکھنے میں نہیں آئی۔ اور جب کبھی وہ سنگار کرکے کسی تقریب میں جاتی تھی تو حسین عورتیں باوجود حسد کے اس کے پیروں تلے آنکھیں بچھاتی ہیں۔ دولھا دُلہن دونوں ایک دوسرے کے عاشق زار تھے۔ اور ہر ایک سال سے دونوں میں خط و کتابت بھی ہونے لگی تھی گو منشی بدری پرشاد صاحب اس چھپاؤ کے سخت برخلاف تھے۔ مگر اپنی بڑے بیٹے کی سفارش سے مجبور رہتے جو نوجوان ہونے کے باعث ان چاہنے والوں کے خیالات کا کچھ اندازہ کرسکتا تھا۔

اس شادی کا چرچہ عرصے سے سارے شہر میں تھا جب چند بھلے مانس اِکٹھا بیٹھتے تو بات چیت ہونے لگتی کہ کیا لالہ صاحب اپنی بیٹی کی شادی اس عیسائی سے کریں گے کیا دوسرا گھر نہیں ہے۔ مگر جب ان کے برابر والے گھرانوں کو گنتے تو مایوس ہوجاتے۔ اب شادی کی دن بہت قریب آگئے تھے۔ لالہ صاحب نے امرت رائے کو مجبور کیا تھا کہ اب میں کچھ دم کا اور مہمان ہوں۔ میرے جیتے جی تم اس جواہر کو اپنے قبضے میں کرلو۔ امرت رائے نے بھی مستعدی ظاہر کی تھی گو یہ وعدہ کرا لیا تھا کہ میں بے معنی رسمیات سے ایک بھی نہ ادا کروں گا۔ لالہ صاحب نے طوعاً و کرہاً اس بات کو بھی منظور کرلیا تھا۔ تیاریاں ہو رہی تھیں دفعتاً آج لالہ صاحب کو معتبر خبر ملی کہ امرت رائے عیسائی ہوگیا ہے اور کسی میم سے شادی کیا چاہتا ہے۔

جیسے کسی ہرے بھرے درخت پر بجلی گر پڑی یہی حال لالہ صاحب کا ہوا پیرانہ سالی کی وجہ سے اعضا مضمحل ہو رہے تھے یہ خبر ملی تو ان کے دل پر ایسی چوٹ لگی کہ صدمے کو برداشت نہ کرسکے اور پچھاڑا کھاکے گر پڑے۔ ان کا بے ہوش ہونا تھا کہ سارا بھیتر باہر ایک ہوگیا۔ تمام نوکر چاکر خویش و اقارب اِدھر اُدھر سے آکر اکٹھے ہوگئے۔ کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ اب ہر شخص کہتا پھرتا ہے کہ امرت رائے عیسائی ہوگئے ہیں۔ اسی صدمے سے لالہ صاحب کی یہ حالت ہوگئی ہے۔ باہر سے دم پے دم میں اندر خبر ہوگئی۔ لالہ بدری پرشاد کی بیوی بے چاری عرصے سے بیمار تھیں اور انھیں کا اصرار تھا کہ بیٹی کی شادی جہاں تک جلد ہوجائے اچھا ہے۔ گو پُرانے خیالات کی عورت تھیں اور شادی بیاہ کے تمام مراسم اور

بیٹی کے حیا و شرم کے پُرانے خیالات ان کے دل میں بھرے ہوئے تھے۔ مگر جب سے انھوں نے امرت رائے کو ایک بار صحن میں دیکھ لیا تھا۔ اسی وقت سے ان کو یہ دُھن سوار تھی کہ میری بیٹی کی شادی ہو تو انھیں سے ہو۔ بے چاری بیٹھی ہوئی اپنی پیاری بیٹی سے باتیں کر رہی تھی کہ دفعتاً باہر سے یہ خبر پہنچی تو سُنتے ہی ماں کے تو ہوش اُڑ گئے۔ وہ بے چاری امرت رائے کو اپنا داماد سمجھنے لگی تھی۔ اور کچھ تو نہ ہوسکا اپنی بیٹی کو گلے لگا کر زار زار رونے لگی اور پریما بھی باوجود ہزار کوشش کے ضبط نہ کرسکی۔ ہائے! اس کے برسوں کے ارمان یکبارگی خاک میں مل گئے اس کو رونے کی تاب نہ تھی۔ ایک ہول دل سا ہوگیا۔ اپنی ماں کو چھوڑ وہ دوڑی ہوئی اپنے کمرے میں آئی چارپائی پر گر پڑی اور اس کے منہ سے صرف اتنا نکلا۔ نارائن کیسے جیوں گی۔ یہ کہتے کہتے اس کے بھی ہوش جاتے رہے۔ تمام گھر کی لونڈیاں اکٹھی ہوگئیں۔ پنکھا جھلا جانے لگا۔ امرت رائے کے فرضی حماقت پر بھیتر باہر افسوس کیا جا رہا تھا۔ پریما کے بھائی صاحب کو اس بات کو یک بارگی یقین نہ ہوا۔ مگر چونکہ یہ بات بابو دان ناتھ کے زبانی سنی تھی اور دان ناتھ کی باتوں کو ہمیشہ سے سچ مانتے آئے تھے شک کا کوئی موقع نہ رہ گیا۔ ہاں اتنا البتہ ہوا کہ ذرا سے واقعے نے ہزاروں زبانوں پر جاری ہوکر اور ہی صورت اختیار کرلی تھی۔ دان ناتھ نے صرف اتنا کہا تھا کہ بابو امرت رائے کی نیت کچھ ڈانوا ڈول معلوم ہوتی ہیں۔ وہ ریفارم کی طرف جھکے ہوئے ہیں۔ اسی ایک سادی سی بات کو لالہ بدری پرشاد نے عیسائیت سمجھ لیا تھا۔ اور گھر بھر میں اسی پر کُہرام مچا ہوا تھا۔

جب اس حادثے کی خبر محلے میں پہنچی تو ہمدردی کے لحاظ سے بہت سی عورتیں اکٹھی ہوگئیں۔ مگر کسی سے کوئی علاج نہ بن پڑا۔ دفعتاً ایک نوجوان عورت آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کو دیکھتے ہی ساری عورتوں نے غل مچایا لو پورنا آگئی اب بچی بہت جلد ہوش میں آتی جاتی ہیں۔ پورنا ایک برہمنی تھی۔ برس بیس ایک کا سن تھا۔ اس کی شادی بسنت کمار سے ہوئی تھی۔ جو کسی انگریزی دفتر میں کلارک تھے۔ دونوں میاں بیوی پڑوس ہی میں رہتے تھے۔ اور دس بجے دن کو جب پنڈت جی دفتر چلے جاتے تو پورنا تنہائی سے گھبرا کر پریما کے پاس چلی آتی اور دونوں میں راز و نیاز کی باتیں شام تک ہوا کرتیں۔ چنانچہ دونوں سکھیوں میں حد درجے کی محبت ہوگئی تھی۔ پورنا گو ایک غریب گھرانے کی لڑکی تھی اور

شادی بھی ایک معمولی ہی جگہ ہوئی تھی۔ مگر فطرتاً نہایت سلیقہ مند، زود فہم، سنجیدہ مزاج اور ہر دل عورت تھی۔ اس نے آتے ہی تمام عورتوں سے کہا ہٹ جاؤ۔ ابھی دم کے دم میں ان کو ہوش آیا جاتا ہے۔ مجمع ہٹا کر اس نے فوراً پریما کو عطریات سنگھائے، کیوڑے اور گلاب کا چھینٹا مُنہ پر دلوایا۔ آہستہ آہستہ اس کے تلوے سہلائے۔ ساری کھڑکیاں کھلوا دیں۔ جب دماغ پر سردی پہنچی تو پریما نے آنکھیں کھول دیں اور اشارے سے کہا تم لوگ ہٹ جاؤ میں اچھی ہوں۔

عورتوں کے جان میں جان آئی۔ سب امرت رائے کو کوستی۔ اور پریما کے سُہاگ بڑھنے کی دعا کرتی اپنے اپنے گھر کو سدھاریں۔ صرف پورنا رہ گئی۔ دونوں سہلیوں میں باتیں ہونے لگیں۔

پورنا "پیاری پریما آنکھیں کھولو یہ کیا گت بنا رکھی ہے۔"

پریما نے نہایت گری ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "ہائے! سکھی میرے تو سب ارمان خاک میں مل گئے۔"

پورنا۔ "پیاری ایسی باتیں نہ کرو۔ تم ذرا اُٹھ تو بیٹھو۔ یہ، اب بتاؤ تم کو یہ خبر کیسے ملی۔"

پریما۔ "کچھ نہ پوچھو سکھی میں بڑی بدقسمت ہوں۔ (روکر) ہائے! دل بھر آتا ہے۔ میں کیسے جیوں گی۔"

پورنا۔ "پیاری ذرا دل کو ڈھارس دو۔ میں ابھی سب پتہ لگائے دیتی ہوں۔ بابو امرت رائے کے نسبت جو کچھ کہا گیا ہے۔ وہ سب جھونٹھ ہے۔ کسی اَن دیکھنے نے یہ پاکھنڈ پھیلایا ہے۔

پریما۔ "سکھی تمھارے منہ میں گھی شکر۔ ایشور کرے تمھاری باتیں سب سچ ہوں۔ مگر ہائے کوئی مجھ کو اس ظالم سے ایک دم کے لیے ملا دے۔ ہاں سکھی ایک دم کے لیے میں اس کٹھ کلیجے کو پاجاؤں تو میری ساری زندگی سہل ہوجائے۔ پھر مجھے مرنے کا افسوس نہ رہے۔"

پورنا۔ "پیاری یہ کیا بہکی بہکی باتیں کرتی ہو۔ بابو امرت رائے نے ہرگز ایسا نہ کیا ہوگا ممکن ہے کہ وہ تمھاری محبت نہ کریں۔ میں ان کو خوب جانتی ہوں۔ میں نے اپنے گھر کے لوگوں کو بار بار کہتے ہوئے سنا ہے کہ امرت رائے کو اگر دنیا میں کسی سے

محبت ہے تو پریما سے۔"

پریما۔ "پیاری اب ان باتوں پر بسواس نہیں آتا۔ میں کیسے جانوں کہ ان کو مجھ سے محبت ہے آج چار برس ہوگئے۔ ہائے! مجھے تو ایک ایک دن کاٹنا دوبھر ہوجاتا ہے اور وہاں کچھ خبر ہی نہیں ہوتی۔ اگر میں خودمختار ہوتی تو اب تک ہمارا ...... رچ گیا ہوتا۔ ورنہ ان کو دیکھو کہ سالوں سے ٹالتے چلے آتے ہیں۔ پیاری پورنا مجھے بعض وقت ان کے اس ٹال مٹول پر ایسا غصہ آتا ہے کہ تم سے کیا کہوں۔ مگر افسوس دل کم بخت بے حیا ہے۔"

یہاں ابھی یہی باتیں ہورہی تھیں کہ بابو کملا پرشاد (پریما کے بھائی) کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کو دیکھتے ہی پورنا نے بھی گھونگٹ نکال لی اور پریما نے جھٹ آنکھوں سے آنسو پونچھ لیے۔ کملا پرشاد نے آتے ہی کہا۔ پریما تم بھی کیسی نادان ہو ایسی باتوں پر تم کو یکایک یقین کیوں کر آگیا۔

اتنا سننا تھا کہ پریما کا چہرہ بشاش ہوگیا۔ فرطِ خوشی سے آنکھیں چمکنے لگیں اور پورنا نے بھی آہستہ سے اس کی ایک انگلی دبائی۔ اب وہ دونوں منتظر ہوگئیں کہ تازی خبر کیا ملے گی۔

کملا پرشاد۔ "بات صرف اتنی تھی کہ ابھی کوئی دو گھنٹے ہوئے بابو دان ناتھ تشریف لائے تھے مجھ سے اور ان سے باتیں ہو رہی تھیں۔ اثنائے تقریر میں شادی بیاہ کا ذکر چھڑ گیا تو انھوں نے کہا کہ مجھے تو بابو امرت رائے کے ارادے اس سال بھی مستقل نہیں معلوم ہوتے ہیں وہ شاید ریفارم پارٹی مین داخل ہونے والے ہیں۔ بس اتنی سی بات کا لوگوں نے بتنگڑ بنا لیا لالہ جی اُدھر بے ہوش ہوکر گرپڑے اب جب تک ان کو سنبھالوں سنبھالوں کہ سارے گھر میں عیسائی ہوگئے عیسائی ہوگئے کا غل مچ گیا۔ عیسائی ہونا کیا کوئی دل لگی ہے۔ اور پھر ان کو ضرورت ہی کیا ہے عیسائی ہونے کی۔ پوجا پاٹ وہ کرتے ہی ہیں۔ شراب و کباب سے ان کو قطعی نفرت نہیں ہے تو کچھ یوں ہی سی رغبت ہے۔ بنگلے میں رہتے ہی ہیں باورچی کا پکایا کھاتے ہی ہیں۔ چھوت بچار مانتے ہی نہیں تو اب ان کو کیا کتے نے کاٹا ہے کہ خواہ مخواہ عیسائی ہوکر نکو بنیں ایسی بے سر پیر کی باتوں پر یقین نہ کرنا چاہیے۔ لے اب رنج و کلفت دھو

ڈالو۔ ہنسی خوشی بات چیت کرو۔ مجھے تمھارے اس رونے دھونے سے سخت افسوس ہوا۔ یہ کہہ کر بابو کملا پرشاد باہر چلے گئے۔ اور پورنا نے ہنس کر کہا۔ سُنا کچھ۔ کہتی تھی کہ یہ سب لوگوں نے پاکھنڈ پھیلایا ہے۔ لے اب منہ میٹھا کراؤ۔" پریما نے فرطِ مسرت سے پورنا کو سینے سے لگا کر خوب دبایا۔ اس کے رخساروں کے بوسے لیے اور بولی۔ "منہ میٹھا ہوا یا اور لوگی۔"

پورنا۔ "ان مٹھائیوں سے بابو امرت رائے کا منہ میٹھا ہوگا۔ مگر۔ سکھی اس منحوس خبر نے تم کو تھوڑی دیر تک پریشان کیا تو کیا۔ تمھاری قلعی کھُل گئی۔ سارے محلے میں تمھارے بے ہوش ہوجانے کی خبریں اُڑ رہی ہیں اور نہیں معلوم اس میں کیا کیا کاٹ چھانٹ کی گئی ہے۔ کیوں اب تو نہ لوگی دون کی۔ اب آج ہی میں امرت رائے کو سب باتیں لکھ بھیجتی ہوں دیکھو کیسا مزہ آتا ہے۔"

پریما۔ "(شرما کر) اچھا رہنے دیجیے یہ سب دل لگی۔ ایشور جانے اگر تم نے آج کی کوئی بات کہی تو پھر تم سے کبھی نہ بولوں گی۔"

پورنا۔ بلا سے نہ بولوگی۔ کچھ میں تمھاری عاشق تو نہیں۔ بس اتنا ہی لکھ دوں گی کہ پریما......

پریما۔ "(بات کاٹ کر) اچھا لکھیے گا تو دیکھوں گی۔ پنڈت جی سے کہہ کر وہ درگت کراؤں کہ ساری شرارت بھول جاؤ۔ پنڈت جی نے تم کو شوخ بنا رکھا ہے ورنہ تم میری بہن ہوتیں تو خوب ٹھیک بناتی۔"

ابھی دونوں سکھیاں جی بھر کر خوش نہ ہونے پائی تھیں کہ آسمان نے پھر بے وفائی کی۔ بابو کملا پرشاد کی بیوی اپنی نند سے خدا واسطے کو جلا کرتی ہیں۔ اپنے ساس سُسر حتیٰ کہ شوہر سے بھی ناراض رہتیں کہ پریما ایسے کون سے چاند لگے ہیں کہ سارا کنبہ ان پر فدا ہونے کو تیار ہے۔ مجھ میں اور ان میں فرق ہی کیا ہے؟ یہی نہ کہ وہ بہت گوری ہیں اور میں اتنی گوری نہیں ہوں۔ شکل و صورت میری ان سے خراب نہیں۔ ہاں میں پڑھی لکھی نہیں ہوں۔ کیا مجھے نوکری چاکری کرنا ہے۔ اور نہ مجھ میں کسبیوں کے سے کپڑے پہننے کی عادت ہے۔ ایسی بے غیرت لڑکی! ابھی شادی نہیں ہوئی مگر آپس میں چٹھی پتر ہوتا ہے تصویریں جاتی ہیں۔ تحفے آتے ہیں ہرجائیوں میں بھی ایسی بے شرمی نہ ہوگی۔ اور ایسی ہی کلونتی کو سارا

کنبہ پیار کرتا ہے سب اندھے ہوگئے ہیں۔ انھیں اسباب سے وہ غریب پریما سے جلا کرتی تھیں۔ بولتی تھیں تو طنزاً مگر پریما اپنی خوش مزاجی سے ان کی باتوں کو دھیان میں نہیں لاتی تھی۔ حتیٰ الوسع ان کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ آج جب اس نے سنا کہ امرت رائے عیسائی ہوگئے ہیں تو جامہ میں پھولی نہ سمائی۔ بابو کملا پرشاد جوں ہی گھر میں آئے اس نے ان سے سچی ہمدردی ظاہر کی۔ بابو صاحب بے چارے بیوی پر شیدا تھے۔ روز طعنے سنتے تھے مگر سب برداشت کرتے تھے۔ بیوی کو زبان سے ہمدردانہ بات چیت سنی تو کھِل گئے۔ تمام واقعہ جو کچھ دان ناتھ سے سنا تھا بے کم و کاست بیان کردیا۔

اس بے چارے کو معلوم نہ تھا کہ میں اس وقت بڑی غلطی کر رہا ہوں۔ چنانچہ وہ اپنی بہن کی تشفی کرکے باہر آئے تو سب سے پہلا کام جو انھوں نے کیا وہ یہ تھا کہ بابو امرت رائے سے ملاقات کرکے ان کا عندیہ لیں۔ وہ تو اُدھر روانہ ہوئے۔ اِدھر ان کی بیوی صاحبہ خراماں خراماں مسکراتی ہوئی پریما کے کمرے میں آئیں اور مسکرا کر بولیں "کیوں پریما آج تو بات پھوٹ گئی" پریما نے یہ سن کر شرما کے سر جھکا لیا مگر پورنا بولی۔"سارا بھانڈا پھوٹ گیا۔ ایسی بھی کیا کوئی لڑکی مردوں پر پھسلے۔"

پریما نے لجاتے ہوئے جواب دیا "جاؤ تم لوگوں کی بلا سے۔ مجھ سے مت اُلجھو۔"

بھاوج ۔"(ذرا سنجیدگی سے) نہیں نہیں دل لگی کی بات نہیں ہے مردوے ہمیشہ سے کٹھ کلیجے ہوتے ہیں۔ ان کے دل میں محبت ہوتی ہی نہیں۔ اس کا ذرا سر دھمکے تو ہم بچاریاں کھانا پینا تیاگ دیتی ہیں مگر ہم مر ہی کیوں نہ جائیں ان کو ذرا بھی پروا نہیں ہوتی۔ سچ ہے مرد کا کلیجہ کاٹھ کا۔"

پورنا نے جواب دیا۔ "بھابھی تم بہت ٹھیک کہتی ہو۔ مرد سچ مچ کٹھ کلیجے ہوتے ہیں۔ میرے ہی یہاں دیکھو جیٹھ میں کم سے کم دس بارہ دن اس موئے صاحب کے ساتھ دورے پر رہتے ہیں۔ میں تو اکیلے سنسان گھر میں پڑے پڑے کراہا کرتی ہوں۔ وہاں کچھ خبر ہی نہیں ہوتی۔ پوچھتی ہوں تو کہتے ہیں رونا گانا عورتوں کا کام ہے۔ ہم روئیں گائیں تو دنیا کا کام کیسے چلے۔"

بھابھی ۔"اور کیا گویا دنیا اکیلے مردوں ہی کے تھامے تو تھمی ہے۔ میرا بس چلے تو ان مردوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھوں۔ اب آج ہی دیکھو۔ بابو امرت رائے کی نسبت ذرا سی بات پھیل گئی تو رانی نے اپنی کیا گت بنا ڈالی۔ (مسکرا کر) ان کی محبت کا تو یہ حال ہے۔ اور وہاں چار برس سے شادی کے لیے حیلہ حوالہ کرتے چلے آتے ہیں۔ رانی خفا نہ ہونا۔ تمھارے خط پر خط جاتے ہیں مگر سنتی ہوں وہاں سے شاید ہی کسی خط کا جواب آتا ہے۔ ایسے آدمی سے کوئی کیا محبت کرے۔ میرا تو ان سے جی جلتا ہے کیا کسی کو اپنی لڑکی بھاری پڑی ہے کہ کنوئیں میں پھینک دے۔ بلا سے کوئی بڑا مالدار ہے۔ بڑا خوبصورت ہے۔ بڑا علم والا ہے۔ جب ہم سے محبت ہی نہ کرے تو کیا ہم اس کے دھن دولت کو لے کر چاٹیں دنیا میں ایک سے ایک لال پڑے ہیں۔ اور پریما جیسی دلہن کے واسطے دُلہوں کا کال! پریما کو بھابھی کی یہ باتیں نہایت ناگوار گزریں۔ مگر پاسِ ادب سے کچھ بول نہ سکی۔ ہاں پورنا نے جواب دیا۔ "نہیں بھابھی! تم بابو امرت رائے پر بڑا ظلم کر رہی ہو۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ ان کو پریما سے سچی محبت ہے۔ ان میں اور دوسرے مردوں میں بڑا فرق ہے۔"

بھابھی ۔"پورنا اب منہ نہ کھلواؤ! محبت نہیں سب کرتے ہیں! مانا کہ بڑے انگریزی داں ہیں کمسنی میں شادی کرنا پسند نہیں کرتے۔ مگر اب تو دونوں میں سے کوئی کمسن نہیں ہے۔ اب کیا بوڑھے ہوکر بیاہ کریں گے۔ اصل بات یہ ہے کہ شادی کرنے کی نیت ہی نہیں ہے ٹال مٹول سے کام نکالنا چاہتے ہیں۔ یہی بیاہ کے لچھن ہیں کہ پریما نے جو تصویر بھیجی تھی وہ کل پُرزے پُرزے کرکے پیروں تلے کچل ڈالی۔ میں تو ایسے آدمی کا منہ نہ دیکھوں۔"

پریما نے اپنے بھاوج کو مسکرا کر بات کرتے ہی سمجھ لیا تھا کہ خیریت نہیں ہے۔ جب یہ مسکراتی ہیں تو ضرور کوئی نہ کوئی آگ لگاتی ہیں۔ وہ ان کی گفتگو کا انداز دیکھ کر سہمی جاتی تھی کہ نارائن خیر کیجو۔ بھابھی کی بات تیر کی طرح سینے میں ترازو ہوگئی۔ ہکابکا ہوکر اس کی طرف تاکنے لگی۔ مگر پورنا کو بالکل یقین نہ آیا۔ بولی "یہ کیا کہتی ہو بھابھی! بھیا ابھی آئے تھے انھوں نے اس کا کچھ بھی ذکر مذکور نہیں کیا۔ پہلے بات کی طرح یہ بھی جھوٹی ہوگی۔ مجھے تو یقین نہیں آتا کہ انھوں نے

نے اپنی پریما کی تصویر کے ساتھ ایسا سلوک کیا ہوگا۔"

بھابھی۔ تمھیں یقین ہی نہ آئے تو اس کا کیا علاج۔ یہ بات تمھارے بھیا خود مجھ سے کہہ رہے تھے اور بھی شک رفع کرنے کے لیے وہ بابو امرت رائے کے یہاں گئے ہوئے ہیں۔ اگر تم کو اب بھی یقین نہ آئے تو اپنی تصویر مانگ بھیجو دیکھو کیا جواب دیتے ہیں۔ اگر یہ خبر جھوٹی ہوگی تو وہ ضرور تصویر بھیج دیں گے۔ یا کم از کم اتنا تو کہیں گے کہ یہ بات جھوٹی ہے۔"

پورنا خاموش ہوگئی۔ اور پریما کے منہ سے آہستہ سے ایک "آہ" نکلی اور اس کے آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں بہنے لگیں۔ بھابھی صاحبہ کے چہرہ پر نند کی یہ حالت دیکھ کر شگفتگی نمودار ہوئی۔ وہ وہاں سے اُٹھیں اور پورنا سے کہہ کر "ذرا تم یہیں رہنا۔ میں ابھی آئی۔ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا۔ "لوگ کہتے ہیں پریما خوبصورت ہے۔ دیکھوں ایک ہفتے میں وہ خوبصورتی کہاں جاتی ہے! جب تک یہ زخم بھرے کوئی دوسرا تبر تیز کر رکھوں۔"

تیسرا باب

ناکامی

بابو امرت رائے رات بھر کروٹیں بدلتے رہے۔ جوں جوں وہ اپنے نئے ارادوں اور نئے حوصلوں پر غور کرتے توں توں ان کا دل اور مضبوط ہوتا جاتا۔ روشن پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد جب انھوں نے تاریک پہلوؤں کو سوچنا شروع کیا تو طبیعت ذرا ہچکی۔ پریما سے تعلق ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہوا۔ مگر جب انھوں نے سوچا کہ کیا میں اپنی قوم کے لیے اپنے ارمانوں کا خون نہیں کرسکتا تو یہ اندیشہ بھی رفع ہوگیا۔ رات تو کسی طرح کاٹی۔ صبح ہوتے ہی حاضری کا کپڑا پہن اور بائیسکل پر سوار ہو اپنے دوستوں کی طرف رخ کیا۔ پہلے پہل مسٹر ہزاری لال۔ بی۔ اے۔ ایل ایل بی کے یہاں داخل ہوئے۔ وکیل صاحب نہایت اعلیٰ خیالات کے آدمی تھے۔ ادو رفارم سے کوششوں سے بڑی ہمدردی رکھتے تھے۔ انھوں نے جب امرت رائے کے ارادے اور ان پر کاربند ہونے کی تجویزیں سُنیں تو بڑے خوش ہوئے اور فرمایا آپ میری جانب سے مطمئن رہیے۔ اور مجھے اپنا سدا سچا ہمدرد سمجھیے۔ مجھے نہایت مسرت ہوئی کہ ہمارے شہر میں آپ جیسے قابل شخص نے اس بارِ گراں کو اپنے ذمے لیا۔ آپ جو خدمت میرے سپرد کریں مجھے اس کے بجا لانے میں مطلق پس و پیش نہ ہوگا میں اس کو باعثِ فخر سمجھوں گا۔ امرت رائے وکیل صاحب کی باتوں پر لٹو ہوگئے۔ تہہ دل سے ان کا شکریہ ادا کیا اور خوش ہوکر کہا، اچھا شگون ہوا۔ اس شہر میں ایک اصلاحی انجمن قائم کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ وکیل صاحب نے اس کو پسند کیا اور معاونت کا سچا وعدہ فرمایا۔ اور بابو امرت رائے خوش خوش بابو دان ناتھ کے دولت خانہ پر جا دھمکے۔ دان ناتھ جیسا ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ امرت رائے کے سچے دوستوں میں تھے۔ ان کو دیکھتے ہی بڑے گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور پوچھا کیوں جناب کیا ارادے ہیں؟

امرت رائے نے سنجیدگی سے جواب دیا۔"ارادے میں آپ پر سب ظاہر کرچکا

ہوں۔ اور آپ جانتے ہیں کہ میں ڈھلمل یقین آدمی نہیں ہوں۔ اس وقت میں آپ کی خدمت میں یہ پوچھنے آیا ہوں کہ اس کارِ خیر میں آپ میری کچھ مدد کرسکتے ہیں یا نہیں؟

دان ناتھ کی امید براریوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس تحریک میں شریک نہ ہوں ورنہ لالہ بدری پرشاد فوراً اس سے بدگمان ہوجائیں گے۔ کیونکہ اس کے پاس نہ وہ خاندانی عظمت تھی نہ وہ جاہ و تمول۔ جس پر امرت رائے کو فخر تھا۔ اس لیے اس نے سوچ کر جواب دیا۔ امرت رائے تم جانتے ہو کہ تمھارے ہر کام سے مجھ کو ہمدردی ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ ابھی میرا شریک ہونا میرے لیے سخت مضر ہوگا۔ میں روپے اور پیسے سے مدد کرنے کے لیے تیار ہوں مگر پوشیدہ طور پر۔ ابھی اس تحریک میں علانیہ شریک ہوکر نقصان اُٹھانا میں مناسب نہیں سمجھتا۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ میری شرکت سے اس انجمن کو ذرا بھی تقویت پہنچنے کی امید نہیں ہے۔

بابو امرت رائے نے ان کی صلاح پسند کی اور ان سے امداد کا وعدہ لے کر اپنی کامیابیوں پر خوش ہوتے ہوئے مسٹر آر۔ بی۔ شرما کے دولت خانے پر پہنچے۔ صاحب موصوف برہمن تھے اور اپنے رتبہ اعلیٰ و عظمت کے اعتبار سے شہر کے معززین میں سمجھے جاتے تھے۔ ان کی مذہبی اور اخلاقی خیالات سے ابھی تک امرت رائے کو ذرا بھی واقفیت نہ تھی۔ مگر جب انھوں نے اس انجمن کی تجویز پیش کی تو پنڈت جی اوچھل پڑے اور فرمایا۔ ''مسٹر امرت رائے مجھے تمھارے خیالات سے نہایت مسرت حاصل ہوئی۔ میں خود اسی طرح کی ایک تجویز بہت جلد پیش کرنے والا تھا آپ نے مجھ کو فرصت دے دی اور مجھے کامل امید ہے کہ آپ اس کارِ عظیم کو میرے دانست میں بہتر طریقے پر انجام دیں گے۔ مجھے اس انجمن کا ممبر تصور کیجیے۔''

بابو امرت رائے کو پنڈت جی کے ہاں ایسی با رونق کامیابی کی امید نہ تھی۔ انھوں نے سوچا تھا کہ پنڈت جی اگر اصولاً اختلاف نہ کریں گے تو عدیم الفرصتی وغیرہ کا ضرور عذر کریں گے مگر پنڈت جی کی گرم ہمدردی و دلچسپی نے ان کا حوصلہ اور بھی بڑھایا۔ امرت رائے یہاں سے نکلے تو وہ اپنے ہی نظروں میں دو اِنچ اونچے معلوم ہوتے تھے۔ یہاں سے سیدھے کامیابی کے زعم میں اینڈتے ہوئے این۔ بی۔ اگروالا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مسٹر اگروالا علاوہ اچھی انگریزی استعداد رکھنے کے زبان سنسکرت کے بھی جید عالم

تھے اور خاص و عام میں ان کی بڑی عزت تھی۔ انھوں نے بھی امرت رائے کے تجاویز سے سچی دل سوزی ظاہر کی۔ الغرض نو بجتے بجتے امرت رائے سارے شہر کے سربرآوردہ و نئی روشنی والے اصحاب سے ملاقات کر آئے۔ اور کوئی ایسا نہ تھا جس نے ان کے اغراض سے دل چسپی نہ جتائی ہو یا مدد دینے کا وعدہ نہ کیا ہو۔

تین بجے کے وقت مسٹر امرت رائے کے بنگلے پر ایک ایسے جلسے کے انعقاد کی تیاریاں ہونے لگیں جو انجمن کو باقاعدہ طور پر منضبط کرے۔ اس کے انصرام کے لیے دستور العمل تیار کرے اور اس کے اغراض اور مقاصد پبلک کے روبرو پیش کرے۔کامیابی کے جوش میں خوب تیاریاں ہوئیں فرش فروش لگائے گئے شیشہ آلات۔ میزیں و کرسیاں سجا کر دھری گئیں۔ حاضرینِ جلسہ کے خورد و نوش کا بھی انتظام کیا گیا اور ان تردداِت سے فرصت پاکر امرت رائے ان کے منتظر ہو بیٹھے۔ دو بج گئے۔ تین بج گئے۔ مگر کوئی صاحب تشریف نہ لائے۔ چار بجے مگر کسی کی سواری نہیں آئی ہاں انجنیر صاحب کے پاس سے ایک نوکر یہ سندیسا لے کر آیا اس وقت میں حاضری سے قاصر ہوں۔ اب تو امرت رائے کا انتشار بڑھنے لگا۔ جیوں جیوں دیر ہوتی تھی ان کا دل بیٹھا جاتا تھا کہ کہیں کوئی صاحب نہ آئے تو میری سخت تضحیک ہوگی اور چاروں طرف نادم ہونا پڑے گا۔ آخر انتظار کرتے کرتے پانچ بج گئے اور ابھی تک کوئی صاحب نظر نہ آئے۔ تب تو امرت رائے کو کامل یقین ہوگیا کہ حضرات نے مجھے دھوکہ دیا۔ منشی گلزاری لال سے ان کو بڑی امید تھی۔ چنانچہ اپنا آدمی ان کے پاس دوڑایا۔ ایک لمحے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ نہیں ہیں پولو کھیلنے تشریف لے گئے۔ اس وقت تک چھ بجے اور جب اس وقت تک بھی کوئی صاحب نہ آئے تو امرت رائے نہایت دل شکستہ ہوگئے۔ کچھ غصہ۔ کچھ ناکامی۔ کچھ اپنی توہین اور کچھ ہمدردوں کی سرد مہری نے ان کو ایسا پریشان کیا کہ سر شام آکر چارپائی پر لیٹ رہے اور لگے سوچنے۔ کہیں مجھ کو نادم تو نہ ہونا پڑے گا۔ افسوس! مجھے ان حضرات سے ایسی امیدیں نہ تھیں۔ اگر نہ آنا تھا تو مجھ سے صاف صاف کہہ دیا ہوتا۔ اب کل تمام شہر میں یہ بات مشہور ہوجائے گی کہ امرت رائے تمام رئیسوں کے گھر دوڑتے پھرے مگر کوئی ان کے دروازے پر بات پوچھنے کو بھی نہ گیا۔ میں جلسے کی تجویز نہ کرتا۔ مفت کی ندامت تو نہ اُٹھانا پڑتی۔ بے چارے انھیں تفکرات میں غوطے کھاتے تھے۔ ابھی نوجوان آدمی تھے اور گو

بات کے دھنی اور دُھن کے پورے تھے مگر ابھی تک پبلک کی سرد مہری اور معاونین کی نا ہمدردی کا تجربہ نہ ہوا تھا اور یہ ناتجربہ کاری جو خدا جانے کتنے پُرجوش دلوں کو سرد کردیتی ہے ان کے ارادوں کو بھی ڈگمگانے لگی مگر یہ بزدلی کے خیالات محض ایک دم کے لیے آگئے تھے جب ذرا آج کی ناکامی کا افسوس کم ہوا تو ارادوں نے اور بھی مستقل صورت پکڑی اپنے دل کو سمجھایا امرت رائے۔ تو ان ذرا ذرا سی باتوں سے مایوس یا دل شکستہ مت ہو۔ جب تو نے صلیب اٹھائی تو نہیں معلوم تجھ کو کیا کیا قربانیاں کرنا پڑیں گی۔ اگر تیری ہمت یہی رہے تو قومی کام تجھ سے ہوچکے دل کو مضبوط کر اور کمر ہمت کو چست باندھ۔

یہ مصمم ارادہ کرکے امرت رائے اپنے کمرے سے نکلے۔ سگار لیا۔ اور باغ کے روشوں میں ٹہلنے لگے۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ ہوا کے دھیرے دھیرے جھونکے آرہے تھے۔ سبزہ کی مخملی فرش پر بیٹھ گئے۔ اور اپنے ارادوں کے پورے ہونے کی ترکیبیں سوچنے لگے۔ مگر وقت ایسا سہانا تھا اور منظر ایسا تعشق خیز کہ بے اختیار خیال پریما کی طرف جا پہنچا۔ اپنی جیب سے تصویر کے پُرزے نکال لیے اور چاندنی رات میں اُسے بڑی دیر تک غور سے دیکھتے رہے ہائے! او ناکام امرت رائے تو کیوں کر ضبط کرے گا! جس کے فراق میں تو نے یہ چار برس رو رو کر کاٹے ہیں اُس کی فراق میں ساری زندگی کیوں کر کاٹے گا۔ ہائے! وہ غریب جب تیرے ارادوں کا حال سُنے گی تو کیا کہے گی۔ اس کو تجھ سے محبت ہے کمبخت! وہ تجھ پر جان دیتی ہے۔ دیکھتا نہیں کہ اس کے خطوط جوشِ محبت سے کیسے بھرے ہوتے ہیں۔ تب کیا وہ تجھے بے وفا، ظالم، مکار نہ بنائے گی۔ کیا تو چاہتا ہے کہ امرت رائے اب سے بھی بھلا ہے۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ ان سب فضول خیالات کو چھوڑو۔ اپنے ارمانوں کو خاک میں نہ ملاؤ۔ دنیا میں تمھارے جیسے بہت سے پُرجوش نوجوان موجود ہیں اور تمھارا ہونا نہ ہونا دونوں برابر ہے لالہ بدری پرشاد منہ کھولے بیٹھے ہیں۔ شادی کرلو۔ پیاری پریما کے ساتھ زندگی کے مزے لوٹو۔ (بے قرار ہوکر) میں بھی کیسا نادان ہوں۔ اس تصویر نے کیا بگاڑا تھا جو خواہ مخواہ اس کو پھاڑ ڈالا ایشو کرے ابھی پریما یہ بات نہ جانتی ہو۔ بابو صاحب کے دل میں یہی خیالات آرہے تھے کہ خدمت گار نے ہاتھوں میں ایک خط دیا۔ گھبرا کر پوچھا۔ کس کا خط ہے؟ نوکر نے جواب دیا لالہ بدری پرشاد کا آدمی لایا ہے۔

امرت رائے نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے خط لیا تو یہ تحریر تھی۔ "بہ ملاحظہ جناب منشی امرت رائے صاحب زاد نوازشہ۔ ہم کو معتبر ذرائع سے خبر ملی ہے کہ اب آپ سناتن دھرم سے منحرف ہوکر اس عیسائی جماعت میں داخل ہو گئے ہیں جس کو غلطی سے اصلاحِ تمدن سے منسوب کرتے ہیں۔ ہم کو ہمیشہ سے یقین ہے کہ ہمارا طرزِ معاشرت وید مقدس کے احکام پر مبنی ہے اور اس میں رد و بدل، تغیر و تبدل کرنے والے اصحاب ہم سے کوئی تعلق نہیں پیدا کرسکتے۔" بدری پرشاد

اس مختصر شقے کو امرت رائے نے دو بار پڑھا۔ اور ان کے دل میں اب ایک جنگ شروع ہوگئی۔ نفسانیت کہتی تھی کہ ایسی نازنین کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے اور جوش قومی کہتا تھا کہ جو ارادہ کیا ہے اس پر قائم رہو۔ زندگی چند روزہ ہے اس کو دوسروں پر قربان کردینے سے بہتر کوئی طریقہ اس کو گزرانے کا نہیں ہے۔ کبھی ایک فریق غالب آتا تھا کبھی دوسرا فریق۔ لڑائی کا فیصلہ بھی دو حروف لکھنے پر تھا آخر بہت رد و کد کے بعد امرت رائے نے بکس سے کاغذ نکالا۔ اور اس خط کا جواب یوں لکھا۔ حبِ قومی نے نفس پر غلبہ پا لیا تھا۔

قبلہ و کعبہ جناب منشی بدری پرشاد صاحب دام اقبالکم

افتخار نامے نے صادر ہوکر ممتاز کیا۔ مجھ کو سخت افسوس ہے کہ آپ نے اس امید کو جو مدت سے بندھی ہوئی تھی یکایک منقطع کردیا مگر چونکہ مجھ کو یقین ہے کہ ہمارا طرزِ معاشرت احکام وید سے متناقض ہے اور جس کو غلطی سے سناتن دھرم کہتے ہیں وہ اُن پُرانے اور بوسیدہ خیال کے لوگوں کی جماعت ہے جو مذہب کے پردے میں ذاتی فلاح ڈھونڈھتے ہیں اس لیے ہم کو مجبوراً اس سے کنارہ کش ہونا پڑا۔ اگر اس حیثیت میں آپ مجھ کو فرزندی میں قبول فرمادیں تو خیر! ورنہ مجھے اپنی بدقسمتی پر افسوس بھی نہ ہوگا۔

نیازمند امرت رائے

قومی خدمات کے جوش میں یہ خط لکھ ڈالا اور ملازم کو دے کر روانہ کیا۔ مگر جب چاندنی میں دیر تک بیٹھے اور اس کے کشش نے دل میں جذبۂ محبت بڑھایا تو اس نقصانِ عظیم کا اندازہ ہوا جو انھوں نے ابھی ابھی اُٹھایا تھا۔ ہائے! میں نے اپنی زندگی۔ اپنے سارے ارمان اور دنیا کی سب سے پیاری چیز کو خیر باد کہہ دیا۔!!

چوتھا باب

جوانا مرگ

وقت ہوا کی طرح اُڑتا چلا جاتا ہے۔ ایک مہینہ گزر گیا جاڑے نے رخصتی سلام کیا۔ اور گرمی کا پیش خیمہ ہولی آموجود ہوئی۔ اس اثنا میں امرت رائے نے دو تین جلسے کیے اور گو حاضرین کی تعداد کسی بار دو تین سے زیادہ نہ رہی مگر اب انھوں نے عہد کرلیا تھا کہ خواہ کوئی آئے یا نہ آئے میں ہفتہ وار جلسے وقت معینہ پر ضرور کیا کروں گا۔

جلسوں کے علاوہ انھوں نے دیہاتوں میں جا جا سلیس ہندی میں تقریر کرنا شروع کی اور اخباروں میں بھی اصلاح تمدن پر مضامین روانہ کیے۔ ان کا تو یہ مشغلہ تھا۔ بے چاری پریما کا حال نہایت ابتر تھا۔ جس دن سے ان کی آخری چٹھی اس کے پاس پہنچی تھی اُسی دن سے وہ قیدِ بستر ہو رہی تھی۔ ہر ہر گھڑی رونے سے کام تھا۔ بے چاری پورنا سرہانے بیٹھی خاموش دیکھا کرتی۔ کبھی کبھی اس کے جی میں آتا کہ امرت رائے نے جو گت میرے تصویر کی کی۔ وہی گت میں ان کی تصویر کی بھی کروں۔ مگر پھر یہ خیال پلٹا کھا جاتا۔ وہ اس تصویر کو آنکھوں سے لگا لیتی اس کا بوسہ لیتی اور اسے سینے سے چمٹا لیتی۔ اس کے دماغ میں اب کچھ خلل آگیا تھا۔ رات کو گھنٹوں پڑے پڑے اکیلے عشق و محبت کی باتیں کیا کرتی۔ جتنے خطوط امرت رائے نے پہلے روانہ کیے تھے وہ اُسے ازسرنو رنگین کاغذ پر جلی حرفوں میں نقل کرلیے تھے۔ اور جب طبیعت بہت بے چین ہوتی تو پورنا سے وہ خطوط پڑھوا کر سنتی اور روتی۔ ہائے! اس نے اپنے دل پر یہ سب ظلم کیے مگر خود داری بھی ایسی نباہی کہ جو اسی کا حصہ تھا۔ اس نے اس آخری خط کے بعد امرت رائے کو ایک خط بھی نہ لکھا۔ گھر کے لوگ اس کے علاج میں روپے ٹھیکریوں کی طرح اُڑا رہے تھے مگر کچھ فائدہ نہ ہوتا تھا۔ اس کی شادی کی بات چیت بھی کئی جگہ سے ہو رہی تھی۔ منشی بدری پرشاد صاحب کے جی میں بار بار یہ بات آتی کہ پریما کو امرت رائے سے بیاہ دیں مگر شماتتِ

ہمسایہ کے خیال سے ارادہ پلٹ دیتے تھے۔ پریما کے ساتھ ساتھ بے چاری پورنا بھی مریضہ بنی ہوئی تھی۔

آخر ہولی کا دن آیا شہر میں چاروں طرف کبیر اور ہولی کی آوازیں آنے لگیں چوطرفہ عبیر اور گلال اُڑنے لگی۔ آج کا دن بے چاری پریما کے لیے سخت آزمائش کا تھا۔ کیونکہ سویرے ہی سے قرابت مندوں کے یہاں سے زنانی سواریاں آنا شروع ہوئیں۔ اور اس کو طوعاً و کرہاً پُر تکلف کپڑے پہن کر مہمانوں کی ضیافت کرنی اور ان کے ساتھ ہولی کھیلنی پڑی۔ مگر ہائے! اس کے چہرے سے آج وہ حسرت برس رہی تھی جو اس سے پہلے کبھی نظر نہ آئی تھی۔رہ رہ کر اس کے کلیجے میں کسک پیدا ہوتی۔ رہ رہ کر فرطِ اضطراب سے دل میں درد اُٹھتا۔ مگر بے چاری بلا زبان سے اُف کہے سب کچھ سہہ رہی تھی۔ روز اکیلے میں رویا کرتی تھی۔ جس سے کچھ تسکین ہوجایا کرتی تھی آج مارے شرم کے روئے کیوں کر۔ سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ روز بروز پورنا بیٹھ کر تشفی آمیز باتیں کرکے اس کا دل بہلایا کرتی۔ آج وہ بھی اپنے گھر تیوہار منا رہی تھی۔

پورنا کا مکان پڑوس میں واقع تھا۔ اس کے شوہر بسنت کمار ایک نہایت حلیم المزاج مگر شوقین و محبت پذیر طبیعت کے نوجوان تھے۔ ہر بات میں اس کی بات پر عمل کرتے۔ انھیں نے اس کو تھوڑا سا پڑھایا بھی تھا۔ ابھی شادی ہوئے دو برس بھی نہ بیتنے پائے تھے اور جیوں جیوں دن گزرتے تھے دونوں کی محبت اور تازہ ہوتی جاتی تھی۔ پورنا بھی اپنے شوہر کی عاشق زار تھی۔ اپنی بھولی بھولی باتوں اور اپنے دلربایانہ اداؤں سے ان کا غم غلط کیا کرتی۔ جب کبھی وہ دورے پر چلے جاتے تو وہ رات بھر زمین پر پڑی کروٹیں بدلتی اور روتی۔ پنڈت جی تیس روپے سے زیادہ مشاہرہ دار نہ تھے مگر پورنا اس پر قانع تھی اور اپنے کو نہایت خوش قسمت عورت خیال کرتی تھی۔ پنڈت جی تحصیلِ زر کے لیے بے انتہا کوششیں کرتے۔ صرف اس لیے کہ پورنا کو اچھے سے اچھے کپڑے پہنائیں اور اچھے سے اچھے گہنوں سے آراستہ کریں۔ پورنا حریص نہ تھی۔ جب پنڈت جی اس کو کوئی چیز تحفتاً دیتے تو جامے میں پھولے نہ سماتی۔۔ مگر کبھی اس نے اپنی خواہشوں کو پنڈت جی سے ظاہر نہیں کیا تھا۔

حق تو یہ ہے کہ سچی محبت کے مزے کے مقابلے میں پہننے اوڑھنے کا شوق کچھ یوں ہی سا رہ گیا تھا۔ ہولی کا دن آگیا۔ آج کے دن کا کیا پوچھنا۔ جس نے سال بھر چیتھروں

ہی پر بسر کیا ہو وہ بھی آج قرض دام ڈھونڈھ کر لاتا ہے اور خوشیاں مناتا ہے۔ آج لوگ لنگوٹی میں پھاگ کھیلتے ہیں۔ آج کے دن رنج کرنا گناہ ہے۔ پنڈت بسنت کمار کی شادی کے بعد یہ دوسری ہولی تھی۔ پہلی ہولی میں بے چارے تہی دستی کی وجہ سے بیوی کی کچھ خاطر نہ کرسکے تھے۔ مگر اس ہولی کے لیے انھوں نے اپنی حیثیت کے موافق بڑی بڑی تیاریاں کی ہیں۔ سو ڈیڑھ سو روپے جو تنخواہ کے علاوہ پسینے بہا بہاکر وصول کیے تھے ان سے اپنی پیاری پورنا کے لیے ایک خوبصورت کنگن بنوایا تھا۔ نہایت نفیس اور خوش رنگ ساریاں مول لائے تھے۔ اس کے علاوہ چند دوستوں کی دعوت بھی کی تھی اور ان کے واسطے کئی قسم کے مربے۔ اچار لوزیات وغیرہ مہیا کیے تھے۔ پورنا آج مارے خوشی کے جامے میں پھولی نہ سماتی تھی۔ اس کے نظروں میں آج اپنے سے زیادہ خوبصورت دنیا میں کوئی عورت نہ تھی۔ وہ بار بار شوہر کی طرف پیار کے نگاہوں سے دیکھتی اور پنڈت جی بھی اس کے سنگار اور پھبن پر آج ایسے شیدا ہو رہے تھے کہ بار بار گھر میں آتے اور اس کو گلے سے لگاتے۔

کوئی دس بجے ہوں گے کہ پنڈت جی گھر میں آئے اور پورنا کو بلاکر مسکراتے ہوئے بولے۔ "پیاری آج تو جی چاہتا ہے تم کو آنکھوں میں بٹھا لوں۔"

پورنا نے آہستہ سے ایک ٹھوکا دے کر اور پیار کی نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔"وہ دیکھو میں تو پہلے ہی سے بیٹھی ہوں۔"

اس ادا پر پنڈت جی ازخود رفتہ ہوگئے۔ جھٹ بیوی کو گلے سے لگاکر پیار کیا۔ ذرا اور دیر ہوئی تو پورنا نے کہا اب دس بجا چاہتے ہیں۔ ذرا بیٹھ جاؤ تو تم کو اُبٹن مل دوں۔ دیر ہوجائے گی تو کھانے میں دیر سویر ہونے سے "سر درد ہوجائے گا۔"

پنڈت جی نے کہا۔ "نہیں نہیں رہنے دو میں اُبٹن نہ ملواؤں گا۔ لاؤ دھوتی دو نہا آؤں۔"

پورنا۔ "واہ! اُبٹن نہ ملوائیں گے۔ آج کی ریت ہی یہ ہے۔ آکے بیٹھ جاؤ۔"

پنڈت۔ "نہیں تم کو خوامخواہ تکلیف ہوگی۔ اور اس وقت گرمی ہے۔ جی نہیں چاہتا۔"

پورنا نے لپک کر شوہر کا ہاتھ پکڑ لیا اور چارپائی پر بیٹھ کر اُبٹن ملنے لگی۔

پنڈت۔ "مگر بھئی ذرا جلدی کرنا۔ آج میں گنگا جی نہانے جایا چاہتا ہوں۔"

پورنا۔ "اب دوپہر کو گنگا جی کہاں جاؤ گے۔ مہری پانی لائے گی۔ یہیں پر نہا لو۔"

پنڈت۔ ''نہیں پیاری! آج گنگا میں بڑا لطف آئے گا۔''

پورنا۔ ''اچھا تو ذرا جلدی لوٹ آنا۔ یہ نہیں کہ اِدھر اُدھر تیرنے لگو۔ نہاتے وقت تم بہت دور تک تیر جایا کرتے ہو۔''

تھوڑی دیر میں پنڈت جی اُبٹن ملوا چکے۔ اور ایک ریشمی دھوتی۔ صابن تولیا اور ایک کمنڈل ہاتھ میں لے کر نہانے چلے۔ وہ بالعموم گھاٹ سے ذرا الگ نہایا کرتے تھے۔ پہنچتے ہی نہانے لگے مگر آج ایسی دھیمی دھیمی ہوا چل رہی تھی۔ پانی ایسا صاف و شفاف تھا اس میں ہلکورے ایسے بھلے معلوم ہوتے تھے اور دل ایسی اُمنگوں پر تھا کہ بے اختیار جی تیرنے پر للچایا وہ بہت اچھے تیراکوں میں تھے۔ لگے تیرنے اور خوش فعلیاں کرنے۔ دفعتاً ان کو بیچ دھارے میں دو سرخ چیزیں بہتی نظر آئیں۔ ذرا غور سے دیکھا تو کمل کے پھول تھے۔ دور سے ایسے خوشنما معلوم ہوتے تھے کہ بسنت کمار کا جی ان پر لہرایا۔ سوچا اگر یہ مل جائیں تو پیاری پورنا کے کانوں کے لیے جھومکا بناؤں۔ کیم و شحیم آدمی تھے۔ ہزاروں بار گھنٹوں متواتر تیر چکے تھے۔ ان کو کامل یقین تھا کہ میں پھول لاسکتا ہوں دور سے پھول ساکت معلوم ہوتے تھے۔ چنانچہ ان کی طرف رخ کیا مگر جیوں جیوں وہ تیرتے تھے پھول بھی بہتے جاتے تھے۔ بیچ میں کوئی ریت ایسا نہ تھا جس پر بیٹھ کر دم لیتے۔ فرطِ جوش میں ان کو یہ خیال گزرا کہ اگر اعضا پھولوں تک پہنچتے پہنچتے شل ہوگئے تو لوں گا کیوں کر۔ پورے زور سے تیرنا شروع کیا۔ کبھی ہاتھوں سے کبھی پیروں سے زور مارتے مارتے بڑی مشکلوں سے دھاروں تک پہنچے مگر اس وقت ہاتھ پاؤں دونوں تھک گئے تھے۔ حتیٰ کہ پھولوں کے لینے کے لیے جو ہاتھ لپکانا چاہا تو وہ قابو میں نہ تھے۔ جب تک ہاتھ پھیلائیں کہ پھول ایک دو قدم اور بہے پھر ان کے پیچھے چلے۔ آخر اس وقت پھول ہاتھ لگے جب کہ ہاتھوں میں تیرنے کی طاقت مطلق نہ باقی رہی تھی۔ ہائے! پھول دانتوں سے دبائے بیچ سوتے سے انھوں نے کنارے کی طرف دیکھا تو ایسا معلوم ہوا گویا ہزاروں کوس کی منزل ہے۔ ان کا حوصلہ پست ہوگیا۔ ہاتھوں میں ذرا بھی سکت نہ تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ جسم میں ہیں ہی نہیں۔ ہائے اس وقت بسنت کمار کے چہرے پر جو حسرت و بے بسی چھائی ہوئی تھی اس کو خیال کرنے ہی سے چھاتی پھٹتی ہے۔ ان کو معلوم ہوا کہ میں ڈوبا جارہا ہوں۔ اس وقت پیاری پورنا کا خیال آیا کہ وہ میرا انتظار کر رہی ہوگی اس کی پیاری پیاری موہنی صورت

نظروں کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ انھوں نے چاہا کہ چلاؤں مگر باوجود کوشش کی زبان سے آواز نہ نکلی۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور افسوس! ایک منٹ میں گنگا ماتا نے ان کو ہمیشہ کے لیے گود میں لے لیا۔

اُدھر کا حال سنیے۔ پنڈت جی کے چلے آنے کے بعد پورنا نے بڑے تکلف سے تھالیں پروسیں۔ ایک برتن میں گلال گھولی۔ اس میں دو چار قطرے خوشبویات کے ٹپکائے۔ پنڈت جی کے لیے صندوق سے نئے کرتے نکالے۔ ٹوپی بڑی خوبی سے چُنی۔ آج پیشانی پر زعفران اور چندن ملنا مبارک سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے نازک نازک ہاتھوں سے چندن رگڑا۔ پان لگائے ۔ میوئے سروتے سے کترکتر طشتری میں رکھے۔ رات ہی کو پریما کے گھر سے خوشبودار کلیاں لینے آئی تھی اور ان کو تر کپڑے سے ڈھانک کر رکھ دیا تھا۔ اس وقت وہ خوب کھل گئی تھیں۔ ان کو تاگے میں گوندھ کر خوبصورت ہار تیار کیا۔ اور اپنے شوہر کا انتظار کرنے لگی۔ اس کے انداز کے مطابق اس وقت تک پنڈت جی کو نہاکر آجانا چاہیے تھا۔ مگر نہیں۔ ابھی کچھ دیر نہیں ہوئی۔ آتے ہی ہوں گے۔ ایک دس منٹ اور راستہ دیکھا۔ اب کچھ انتشار ہوا کیا کرنے لگے! دھوپ سخت ہورہی ہے۔ لوٹتے وقت نہانا یا بے نہانا ایک ہو جائے گا۔ کیا جانے یار دوستوں سے باتیں کرنے لگے ہوں۔ نہیں۔ نہیں میں ان کو خوب جانتی ہوں۔ دریا نہانے جاتے ہیں تو تیرنے کی سوجھتی ہے۔ آج بھی تیر رہے ہوں گے۔ یہ سوچ کر اس نے کامل آدھ گھنٹہ تک شوہر کا اور انتظار کیا۔ مگر جب وہ اب بھی نہ آئے تب تو اس کو ذرا بے چینی معلوم ہونے لگی۔ مہری سے کہا "بلّو! ذرا دوڑ تو جاؤ۔ دیکھو کیا کرنے لگے۔"

مہری بڑی نیک بخت بیوی تھی۔ ہر مہینہ میں بلا مانگے تنخواہ پاتی تھی اور شاید ہی کوئی دن ایسا جاتا تھا کہ پورنا اس کے ساتھ کچھ سلوک نہ کرتی ہو۔ پس وہ ان دونوں کو بہت عزیز رکھتی تھی۔ فوراً لپکی ہوئی گنگا جی کی طرف چلی۔ وہاں جاکر کیا دیکھتی ہے کہ کنارے پر دو تین ملاح جمع ہیں۔ پنڈت جی کی دھوتی۔ تولیا وغیرہ کنارے دھری ہے۔ یہ دیکھتے ہی اس کے پیر من من بھر کے ہوگئے۔ دل دھڑدھڑ کرنے لگا۔ یا نرائن ! یہ کیا غضب ہوگیا! ایک بدحواسی کے عالم میں نزدیک پہنچی تو ایک ملاح نے کہا۔ کاہے بلّو! تمھار پنڈت نہائے آوا۔ ہن۔"

بلّو نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ سر پیٹنے لگی۔ ملاحوں نے اس کو سمجھایا کہ اب روئے پیٹے کا ہوت ہے! ان کا چیج بست لیو اور گھر کا جاؤ، بے چارے بڑے بھل منئی رہن۔

بے چاری بلّو نے پنڈت جی کی چیزیں لیں اور روتی پیٹتی گھر کی طرف چلی جوں جوں وہ مکان کے قریب آتی تھی۔ توں توں اس کے قدم پیچھے کو ہٹے جاتے تھے۔ ہائے! نرائن پورنا کو کیسے یہ خبر سناؤں گی اس کی کیا گت ہوگی۔ بچریا سب تیاری کیے شوہر کا انتظار کر رہی ہے۔ یہ خبر سن کے بے چاری کی چھاتی پھٹ جائے گی۔ انھیں خیالات میں غرق بلو روتی گھر میں داخل ہوئی تمام چیزیں زمین پر پٹک دیں اور چھاتی پر دو ہتڑ مارے ہائے ہائے کرنے لگی۔ غریب پورنا آج ایسی خوش تھی اس کا دل آج امنگوں اور ارمانوں سے ایسا بھرا ہوا تھا کہ یکایک اس صدمۂ جانکاہ کی خبر نے پہنچ کر اس کو مبہوت کردیا وہ نہ روئی۔ نہ چلاّئی۔ نہ بے ہوش ہوکر گری جہاں کھڑی تھی وہیں دو تین منٹ تک بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ یکایک اس کے حواس برجا ہوئے۔ اور اس کو اپنی حالت کے اندازہ کرنے کی قابلیت ہوئی اور تب اس نے ایک چیخ ماری اور پچھاڑ کھاکر گرنے ہی کو تھی کہ بلّو نے اس کو گود میں سنبھال لیا اور اس کو چارپائی پر لٹا کر پنکھا جھلنے لگی۔ دس پندرہ منٹ میں پاس پڑوس کی صدہا عورتیں اندر جمع ہو گئیں۔ باہر بھی بہت سے مرد اکٹھے ہوگئے۔ تجویز ہوئی کہ جال ڈلوایا جاوے۔ بابو کملا پرشاد بھی تشریف لائے تھے۔ فوراً پولیس کو اطلاع کرکے مدد منگوائی۔ پریما کو جوں ہی اس حادثہ روح فرسا کی خبر ملی پیر تلے سے مٹی نکل گئی۔ فوراً چادر اوڑھ لی اور بدحواس زینے سے اتری اور گرتی پڑتی پورنا کے مکان کی طرف چلی۔ ہر چند ماں نے روکا مگر اس نے نہ مانا۔ جس وقت پریما پہنچی ہے۔ پورنا کے حواس بجا ہوگئے تھے۔ اور وہ نہایت دل ہلا دینے والی آواز میں رو رہی تھی۔ گھر میں سیکڑوں عورتیں جمع تھیں۔ مگر کوئی ایسی نہ تھی جس کے آنکھوں سے آنسو نہ بہہ رہے ہوں۔ ہائے ! غریب پورنا کی حالت واقعی قابلِ ترس تھی۔ ابھی ایک گھنٹہ پہلے وہ اپنے کو دنیا کی سب سے خوش قسمت عورتوں میں سمجھتی تھی۔ مگر ہائے! اب اس کا سا بدنصیب کوئی نہ ہوگا۔ بے چاری سمجھانے سے ذرا خاموش ہو جاتی مگر جوں ہی کوئی بات یاد آجاتی ووں ہی پھر دل امنڈ آتا اور آنسو کی جھڑی لگ جاتی۔ ہائے ! کیا ایک دو بات کرنے کی تھی! اس نے دو

برس تک اپنے پیارے شوہر کی محبت کا مزہ لوٹا تھا۔ اس کی ایک ایک بات اس کو یاد آتی جاتی تھی آج اس نے چلتے چلاتے کہا تھا۔ پیاری پورنا جی چاہتا ہے تجھ کو آنکھوں میں بٹھا لوں۔ افسوس ! اب کون پیار کرے گا۔ اس ریشمی دھوتی اور تولیا کی طرف اس کی نگاہ گئی تو بڑے زور سے چیخ اُٹھی۔ یکایک پریما کو دیکھا تو جھپٹ کر اُٹھی اور اس کے گلے مل کر ایسے دل خراش لہجے میں روئی کہ اندر تو اندر باہر منشی بدری پرشاد صاحب، بابو کملا پرشاد اور دیگر حضرات آنکھوں سے رومال دیے بے اختیار رو رہے تھے۔ پریما بے چاری کا مہینوں سے روتے روتے گلا بیٹھ گیا تھا۔ ہاں اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ پہلے وہ سمجھتی تھی کہ میں ہی سارے زمانے میں بدقسمت ہوں۔ مگر اس وقت وہ اپنا دکھ بھول گئی۔ اور بڑی مشکل سے ضبط کرکے بولی "پیاری پورنا! یہ کیا غضب ہوگیا۔"

بے چاری پورنا کی حالت واقعی دردناک تھی۔ اس کی زندگی کا بیڑا پار لگانے والا کوئی نہ تھا۔ اس کے میکے میں بجز ایک بوڑھے باپ کے اور کوئی نہ تھا۔ اور وہ بے چارے بھی آج کل کا مہمان ہو رہا تھا۔ سسرال میں صرف شوہر سے ناتا تھا۔ نہ ساس نہ سسر۔ نہ خویش نہ اقارب۔ کوئی چلو بھر پانی دینے والا نہ تھا۔ اثاثہ بھی گھر میں کچھ نہ تھا کہ زندگی بھر کو کافی ہوتا۔ بے چارہ شوہر ابھی کل دو برس سے نوکری کر رہا تھا۔ اور آمدنی سے خرچ کسی طرح کم نہ تھا۔ روپے کہاں سے جمع ہوتا۔ پورنا کو ابھی تک یہ سب باتیں نہیں سوجھی تھیں۔ ابھی اس کو سوچنے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ ہاں باہر مردانے میں لوگ آپس میں اس امر پر بات چیت کر رہے تھے۔

دو ڈھائی گھنٹہ تک تو اس مکان میں عورتوں کا خوب ہجوم تھا۔ چاروں طرف رونا پیٹنا مچا تھا۔ مگر شام ہوتے ہوتے سب عورتیں اپنے اپنے گھر گئیں۔ بے چاری پریما کو غش پر غش آنے لگے تھے۔ اس لیے لوگ اسے وہاں سے پالکی پر اُٹھاکر لے گئے۔ اور دِیا میں بتی پڑتے پڑتے اس مکان میں بجز بلّو اور پورنا کے کوئی نہ تھا۔ ہائے! یہی وقت تھا کہ بسنت کمار دفتر سے آیا کرتے۔ پورنا اس وقت دروازے پر کھڑی ان کی راہ دیکھا کرتی تھی اور ان کو دیکھتے ہی لپک کر ان کے ہاتھوں سے چھتری لے لیتی تھی۔ روز ان کے لیے جلیبیاں لاکر دھر دیتی تھی۔ جب تک وہ مٹھائیاں کھاتے تھے وہ جھٹ پٹ پان کے بیڑے لگا کر دیتی تھی۔ وہ عاشق زار۔ دن بھر کا تھکا ماندہ ۔ بیوی کی ان خاطروں سے اپنی تمام تکلیفوں کو

بھول جاتا۔ کہاں وہ مسرت افزا خدمتیں اور کہاں آج وہ سناٹا! تمام گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ دیواریں کاٹنے کو دوڑتی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ در و دیوار پر حسرت چھائی ہے۔ بے چاری پورنا آنگن میں خاموش بیٹھی ہے۔ اس کے کلیجے میں اب رونے کی قوت نہیں ہے۔ ہاں آنکھوں سے آنسو کے تار جاری ہیں اس کو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دل سے خون چوس رہا ہے۔ اس کے محسوسات کو بیان کرنے کی ہماری زبان میں قوت نہیں۔ ہائے! اس وقت پورنا پہچانی نہیں جاتی۔ اس کا چہرہ زرد ہوگیا ہے ہونٹوں پر پپڑی چھائی ہے۔ آنکھیں سوج آئی ہیں سر کے بال کھل کر پیشانی پر آ گرے ہیں۔ ریشمی ساری پھٹ کر تار تار ہوگئی ہے۔ جسم پر زیور ایک بھی نہیں ہے۔ چوڑیاں ٹوٹ کر چکنا چور ہوگئی ہیں۔ وہ حسرت۔ حرماں نصیبی۔ ماتم کی مجسم تصویر ہو رہی ہے اس کی یہ حالت اور بھی نا قابلِ برداشت ہو رہی ہے کیونکہ کوئی اس کو تسکین دینے والا نہیں ہے۔ یہ سب کچھ ہوگیا ہے مگر پورنا ابھی تک کلی طور پر مایوس نہیں ہوئی ہے۔ اس کے کان دروازے کی طرف لگے ہیں کہ کہیں کوئی اس کے صحیح و سلامت نکلنے کی خبر نہ لاتا ہو۔ الم زدہ دلوں کا یہی حال ہوتا ہے ان کی آس ٹوٹ جانے پر بھی بندھی رہتی ہے۔

شام ہوتے ہوتے اس پُرحسرت واقعہ کی خبر سارے شہر میں گونج اوٹھی۔ جو سنتا تھا افسوس کرتا تھا۔ بابو امرت رائے کچہری سے آرہے تھے کہ راستے میں ان کو یہ خبر ملی۔ وہ بسنت کمار کو بخوبی جانتے تھے۔ اُنھیں کی سفارش سے پنڈت جی کو دفتر میں وہ جگہ ملی تھی۔ سخت افسوس ہوا۔ مکان پر آتے ہی۔ کپڑے بدل۔ بائیسکل پر سوار ہو۔ پورنا کے مکان کی طرف پہنچے۔ جاکر دیکھا تو چوطرفہ سناٹا چھایا ہوا ہے۔ در و دیوار سے سیاپا برس رہا ہے! پورنا ایسے ہی آوازوں کے سننے کی عادی ہو رہی تھی۔روز اس وقت وہ ان کے جوتے کی آواز کو کان لگا کر سنا کرتی تھی۔ چنانچہ اس وقت جوں ہی اس نے جوتے کی آواز سنی وہ حیرت انگیز تیزی سے دروازے کی طرف دوڑی یہ نہیں معلوم اس کو کیا خیال ہوا! کس امید پر دوڑی۔ مگر جوں ہی دروازے پر آئی اور بجائے اپنے پیارے شوہر کے بابو امرت رائے کو دیکھا ووں ہی حواس بجا ہوگئے۔ شرم سے سر جھکا لیا اور روتی ہوئی اُلٹے قدم واپس ہوئی۔ ایسی مصیبت کے وقتوں پر ہمدرد کی صورت گریہ وزاری کے لیے گویا ایک بہانہ ہوجاتی ہے۔ بابو امرت رائے یہاں بہت کم آیا کرتے تھے۔ اس وقت ان کی آنے نے پورنا کے دل پر ایک تازہ

صدمہ پہنچایا۔ دل پھر اُمڈ آیا اور باوجود ہزار ضبط کے آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور ایسا پھوٹ پھوٹ کر روئی کہ بابو امرت رائے جو فطرتاً نہایت رقیق القلب آدمی تھے اپنے گریہ کو ضبط نہ کرسکے۔ اس وقت تک مہری باہر آگئی تھی۔ اس نے امرت رائے کو بیٹھنے کے لیے ایک کرسی دی اور سر نیچا کر کے رونے لگی۔

امرت رائے نے مہری کو دِلاسا دیا۔ اس کو پورنا کی خبرگیری کی تاکید کی دہلیز میں کھڑے ہو کر پورنا کو سمجھایا۔ اور اس کو ہر طرح کی مدد دینے کا وعدہ کر کے چراغ جلتے جلتے اپنے بنگلے کی طرف روانہ ہوئے۔ اسی وقت پریما غشوں سے بازیافت پاکر مہتابی پر ہوا کھانے نکلی تھی۔ اس کی نگاہیں پورنا کے دروازے کی طرف لگی ہوئی تھی۔ دفعتاً اس نے کسی کو اس کے گھر سے نکلتے دیکھا غور سے دیکھا تو پہچان گئی۔ ہائے! یہ تو امرت رائے ہیں!

پانچواں باب

ایں! یہ گجرا کیا ہو گیا؟

پنڈت بسنت کمار کا دنیا سے اُٹھ جانا صرف پورنا ہی کے لیے جان لیوا نہ تھا۔ پریما کی حالت بھی اُسی کی سی تھی۔ پہلے وہ اپنی قسمت پر رویا کرتی تھی اب پورنا کی ہمدردانہ باتیں دم سازیاں یاد آآکر اس کو رُلاتی تھیں۔ پورنا کبھی اس کو گاکر سناتی۔ کبھی اس کے سامنے کوئی دلچسپ کتاب پڑھتی۔ کبھی اس کو باغ کی سیر کراتی۔ مگر جب سے اس بے چاری پر بپت آپڑی تھی۔ پریما کا غم غلط کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اب اس کو سوائے چارپائی پر پڑے رہنے کے اور کام نہ تھا۔ نہ وہ کسی سے ہنستی بولتی تھی۔ نہ اس کو کھانے پینے سے رغبت تھی۔ شوق سنگار اس کو مطلق نہ بھاتا تھا۔سر کے بال دو دو ہفتے نہ گوندھے جاتے۔ سرمہ دانی الگ پڑی رویا کرتی۔ کنگھی الگ ہائے ہائے کرتی۔ گہنے بالکل اُتار پھینکے تھے۔ صبح سے شام تک اپنے کمرے میں پڑی خدا معلوم کیا کیا کرتی۔ کبھی چارپائی پر لیٹتی۔ کبھی زمین پر کروٹیں بدلتی۔ کبھی اِدھر اُدھر بوکھلائی ہوئی گھومتی۔ اکثر بابو امرت رائے کی تصویر کو دیکھا کرتی۔ اور جب ان کے پرانے خطوط یاد آتے۔ تو روتی۔ اسے معلوم ہوتا تھا کہ اب میں چند دنوں کی اور مہمان ہوں۔

پہلے دو ماہ تک تو بے چاری پورنا کو برہمنوں کی ضیافت و تواضع ۔ شوہر کی کریا و کرم سے سانس لینے کی مطلق فرصت نہ ملی کہ یہاں آتی۔ پریما دو تین بار باوجود ماں کی ممانعت کے وہاں گئی تھی۔ مگر وہاں جاکر بجائے اس کے کہ پورنا کو تشفی دے وہ خود رونے لگتی تھی۔ اس وجہ سے اب اُدھر نہ جاتی۔ ہاں شام کے وقت وہ مہتابی پر جاکر ضرور بیٹھتی۔ اس لیے نہیں کہ اس کو سماں سہانا معلوم ہوتا تھا یا ہوا کھانے کا جی چاہتا تھا۔ یہیں۔ بلکہ صرف اس لیے کہ وہ کبھی کبھی بابو امرت رائے کو اُدھر سے پورنا کے گھر جاتے دیکھتی۔ ہائے! جس وقت وہ ان کو دیکھتی اس کا دل بلیوں اُچھلنے لگتا۔ جی چاہتا کہ کود پڑوں اور ان

کے قدموں پر جان نثار کردوں۔ جب تک وہ نظر آتے وہ ٹکٹکی باندھے ان کو دیکھا کرتی۔ جب وہ نظروں سے چھپ جاتے تب بے اختیار اس کے آنکھوں میں آنسو بھر جاتا اور کلیجہ مسوسنے لگتا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ دل بیٹھا جا رہا ہے! اسی طرح کئی مہینے بیت گئے۔

ایک روز وہ حسبِ معمول اپنے کمرہ میں لیٹی ہوئی کروٹیں بدل رہی تھی کہ پورنا اندر آئی۔ ہائے! اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے کسی مہلک عارضہ سے شفا پائی ہے۔ چہرہ زرد تھا اور اس پر غضب کی پژمُردگی چھائی ہوتی تھی۔ رخسار پچکے ہوئے تھے اور آنکھیں جن میں اب چلت پھرت باقی نہ رہی تھی اندر گھسی ہوئی تھیں۔ سر کے بال شانوں پر بڑی بے ترتیبی سے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ گہنے زیور کا نام نہ تھا۔ صرف ایک نین سکھ کی ساری پہنے ہوئے تھی۔ اس کو دیکھتے ہی پریما دوڑ کر اس کے گلے سے چمٹ گئی اور اس کو لاکر اپنے چارپائی پر بٹھا دیا۔

کئی منٹ تک دونوں سکھیاں خاموش تھیں۔ دونوں کے دلوں میں خیالات کا دریا اُمڈا ہوا تھا۔ مگر زبانوں میں یارائے گویائی نہ تھا۔ آخر پورنا نے کہا۔ پیاری پریما! کیا آج کل طبیعت خراب ہے کیا؟ بالکل گل کر کانٹا ہوگئی ہو۔"

پریما نے مسکرانے کی کوشش کرکے کہا "پورنا تم بھولی جاتی ہو۔ میری طبیعت اچھی کب تھی! تم تو خیریت سے رہیں؟"

پورنا۔ "(چشم پُر آب ہوکر) میری خیریت کیا پوچھتی ہو سکھی۔ خیریت تو میرے لیے سپنا ہوگئی۔ تین مہینے سے زیادہ ہوگئے مگر اب تک میری آنکھیں نہیں جھپکیں۔ معلوم ہوتا ہے نیند آنسو ہوکر بہہ گئی!"

پریما۔ "سکھی ایشور جانتا ہے میرا بھی یہی حال ہے۔ اگر تم بیاہی بدھوا ہو تو میں کنواری بدھوا ہوں۔ ہماری تمھاری ایک ہی گت ہے۔ ہاں سکھی میں نے ٹھان لیا ہے کہ اب اسی سوگ میں زندگی کاٹوں گی۔"

پورنا۔ "کیسی باتیں کرتی ہو۔ پیاری۔ میں ابھاگنی ہوں۔ میرا کیا۔ جتنا سکھ بھوگنا میری قسمت میں بدا تھا بھوگ چکی۔ مگر تم اپنے کو کیوں گھلائے ڈالتی ہو۔ پیاری! میں تم سے سچ کہتی ہوں بابو امرت رائے کی حالت بھی تمھاری ہی سی ہے۔ وہ میرے یہاں کئی بار آئے تھے نہایت متفکر معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے ایک روز دیکھ لیا تھا وہ تمھارے

کاڑھے ہوئے رومال لیے ہوئے تھے۔ پریما کا چہرہ یکایک کھل گیا۔ فرطِ مسرت سے آنکھیں جگمگانے لگیں۔ اس نے پورنا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اس کے آنکھوں سے آنکھیں ملا کر بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔"میری جان سچ بتاؤ! کبھی ان سے اِدھر کی باتیں بھی آتی ہیں۔"

پورنا۔ "(مسکراکر) کیوں نہیں! کئی بار بات چلی۔ میں نے ان سے کہا آپ اپنی شادی کیوں نہیں کرتے۔ مگر انھوں نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ ہاں بشرے سے معلوم ہوا کہ اس قسم کی بات ان کو ناگوار گزرتی ہے۔ اسی خیال سے پھر یہ تذکرہ چھیڑتے ڈرتی ہوں۔"

پریما۔ "تم ان کے سامنے نکلتی ہو؟"

پورنا۔ "کیا کروں بلا سامنے آئے کام تو نہیں چل سکتا اور سکھی اب ان سے کیا پردہ کروں۔ انھوں نے مجھ پر جو جو احسان کیے ہیں ان سے میں کبھی اورن نہیں ہوسکتی۔ پہلے ہی دن جب کہ مجھ پر یہ بپت پڑی۔ اسی رات کو میرے یہاں چوری ہوگئی۔ جو کچھ اسباب تھا ظالموں نے موس لیا۔ سچ مانو اس وقت میرے پاس ایک کوڑی بھی نہ تھی۔ بڑے پھیر میں پڑی ہوئی تھی کہ اب کیا کروں۔ جدھر نظر دوڑاتی اندھیرا نظر آتا تھا۔ اسی دن بابو امرت رائے آئے۔ ایشور ان کو جگ جگ سلامت رکھے انھوں نے بلّو کی تنخواہ مقرر کردی اور میرے ساتھ بھی بہت کچھ سلوک کیا۔ اگر اس وقت وہ آڑے نہ آتے تو شاید اب تک بلا دانہ مر گئی ہوتی۔ سوچتی ہوں کہ وہ اتنے بڑے آدمی ہوکر مجھ بھکھارنی کے دروازے پر آتے ہیں تو ان سے کیا پردہ کروں۔ اور دنیا ایسی ہے کہ اتنا بھی نہیں دیکھ سکتی۔ وہ جو پڑوس میں پنڈائن رہتی ہیں کئی بار میرے مکان پر آئیں اور بولیں کہ سر کے بال منڈا لو۔ بدھواؤں کو سر کے بال نہ رکھنے چاہیں۔ مگر میں نے اب تک ان کا کہنا نہیں مانا۔ اس پر سارے محلّہ میں طرح طرح کی باتیں میری نسبت کی جاتی ہیں۔ کوئی کچھ کہتا ہے۔ کوئی کچھ جتنے منہ اتنی باتیں۔ بلّو آکر سب کہانی مجھ سے کہتی ہے۔ سب سُن لیتی ہوں اور رو دھوکر چپ ہو رہتی ہوں، میری قسمت میں دُکھ بھوگنا۔ لوگوں کی جلی کٹی سننا نہ لکھا ہوتا تو یہ آفت ہی کاہے کو آ پڑتی۔ مگر بالوں نے کیا قصور کیا ہے جو ان کو منڈالوں۔

ایشور نے سب کچھ تو ہر ہی لیا۔ اب کیا ان بالوں سے بھی ہاتھ دھوؤں۔

یہ کہہ کر پورنا نے شانوں پر بکھرے ہوئے لمبے لمبے بالوں کو بڑے اطمینان کی نگاہوں سے دیکھا۔ پریما نے ان کو ہاتھ سے سنبھال کر کہا۔ ”نہیں پیاری پورنا۔ تمھیں ہماری قسم بالوں کو مت منڈانا۔ پنڈائن کو کہنے دو۔ ہو ہٹھ۔ بال منڈالو۔ ایشور جانے کیسے خوبصورت بال ہیں۔ اور گو تم نے کنگھی نہیں کی ہے ”تاہم بہت خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ مصیبت تو جو پڑ گئی اسے دل ہی جانتا ہے۔ بالوں کے منڈانے سے کیا فائدہ یہ دیکھو نیچے کی طرف جو خم پڑ گیا ہے کیسا خوشنما معلوم ہوتا ہے۔

یہ کہہ کر پریما اُٹھی۔ بکس میں سے خوشبودار تیل نکالا اور جب تک پورنا ہائیں ہائیں! کرے! اس نے اس کے سر کی چادر کھسکا کر تیل ڈال دیا اور اس کا سر زانو پر رکھ کر آہستہ آہستہ ملنے لگی۔پورنا بے چاری ان ناز برداریوں کی متحمل نہ ہو سکی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ بولی ”پیاری پریما! یہ کیا غضب کرتی ہو؟ ابھی کیا کم بدنامی ہو رہی ہے؟ جو بال سنوارے نکلوں گی تو نہیں معلوم سب کیا کہیں گے۔ اب تم سے کیا دل کی بات چھپاؤں سکھی۔ ایشور جانتا ہے مجھے یہ بال خود بوجھ معلوم ہوتے ہیں۔ جب اس صورت کو دیکھنے والا ہی جہاں سے اُٹھ گیا تو یہ بال کس کام کے۔ مگر میں جو ان کو رکھ کر پڑوسیوں کے طعنے سہتی ہوں تو صرف اس خیال سے کہ سر کے بال منڈا کر مجھ سے بابو امرت رائے کے سامنے نہ نکلا جائے گا۔ ہائے! سر منڈا کر میں ان کے سامنے کیسے جاؤں گی۔ اور وہ اپنے دل میں کیا سمجھیں گے۔ یہ کہہ کر پورنا پھر چشم پُر آب ہوگئی اور پریما نے آہستہ آہستہ اس کے سر میں تیل ملا اس کے بعد کنگھی کی۔ بے چاری پورنا تو مدت سے ان آرایشوں و بناوٹوں کو خیر باد کہہ چکی تھی۔ ان ہمدردانہ دم سازیوں نے اس کے دلِ دردمند کو مسوسنا شروع کیا۔ مگر پریما نے نہایت محبت آمیز انداز سے اس کے بال گوندھے اور تب آہستہ سے ایک آئینہ لاکر اس کے سامنے رکھ دیا۔ ہائے! پورنا نے تین مہینے سے آئینہ نہیں دیکھا تھا۔ اس کو معلوم ہوتا تھا کہ میری صورت بالکل اتر گئی ہوگی۔ مگر آج جو دیکھا تو سوائے اس کے چہرہ زرد ہوگیا تھا اور کوئی

تبدیلی نہ معلوم ہوئی۔ بلکہ سادگی۔ حسرت اور مایوسی نے ایک نئی کیفیت پیدا کردی تھی۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ "پریما۔ ایشور کے لیے اب بس کرو۔ میری قسمت میں یہ سنگار بدا ہی نہیں ہے۔ پڑوسی دیکھیں گے تو ان کی چھاتی پھٹے گی۔ نہیں معلوم کیا لگا دیں۔ یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔ اور وہ یادگاریں جن کو بھلانے کی کوشش کر رہی تھی تازہ ہو آئیں۔ پریما اس کی صورت کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھی اس کو پورنا کبھی ایسی حسین نہ معلوم ہوئی تھی۔ اسے پیار سے اسے گلے لگا لیا اور بولی۔ پورنا! کیا ہرج ہے اگر تم میرے یہاں اُٹھ آؤ۔ ہم تم دونوں بدھوا ساتھ ساتھ رہیں گے۔ تمھیں میری قسم انکار مت کرو۔"

پورنا۔ "پیاری! اس سے بڑھ کر مجھے کیا خوشی حاصل ہوسکتی ہے کہ میں تمھارے ساتھ رہوں۔ مگر ہائے! اب تو مجھ کو پھونک پھونک کر پیر دھرنا پڑتا ہے۔ نہیں معلوم زمانہ کیا کہے۔ علاوہ اس کے اس معاملے میں بابو امرت رائے کی صلاح کی بھی ضرورت ہے۔ بلا ان کی مرضی کے کیسے آسکتی ہوں۔ زمانہ کیسا اندھا ہے ایسے رحم دل اور غریب پرور شخص کو لوگ کہتے ہیں کہ عیسائی ہوگیا ہے۔ کہنے والوں کے منہ سے نہ معلوم کیسے ایسی جھوٹی بات نکلتی ہے۔ مجھ سے وہ کہتے تھے کہ میں بہت جلد ایک ایسا استھان بنوانے والا ہوں جس میں لاوارث بدھوائیں آکر رہیں گی۔ وہاں ان کے آرام و آسائش کا خیال رکھا جائے گا اور ان کو پڑھنا لکھنا اور پوجا پاٹ کرنا سکھایا جائے گا۔ جس آدمی کے خیالات ایسے پاک ہوں اس کو وہ لوگ عیسائی اور بے دین بناتے ہیں جو بھول کر بھِک منگے کے سامنے ایک کوڑی بھی نہیں پھینکتے۔ کیسا اندھیر ہے!"

پریما نے بڑی دردناک آواز میں جواب دیا "کیا بتلاؤں سکھی! اپنی قسمت پر اتنی مدت تک افسوس کیا کہ اب افسوس بھی نہیں کیا جاتا۔ ہائے! کاش میں ان کی چیری ہوتی۔ ایسے فیاض داتا کی چیری بننا بھی ایک فخر ہے۔ کیوں پورنا کیا وہ اب بیاہ نہ کریں گے؟" یہ کہہ کر شرم سے سر جھکا لیا۔

پورنا۔ "وہ بیاہ! ارے وہ تو منہ کھولے بیٹھے ہیں۔ تمھارے لالہ جی ہی نہیں منظور کرتے۔ میں یہ زور دے کر کہہ سکتی ہوں کہ اگر تم سے ان کی شادی نہ ہوئی تو کنوارے

رہیں گے۔"

پریما۔ "یہاں بھی یہی ٹھان لی ہے کہ چیری بنوں گی تو انھیں کی۔"

کچھ دیر تک یہی باتیں ہوا کیں۔ جب سورج ڈوبنے کا وقت آیا تو پریما نے کہا چلو پورنا تم کو باغ کی سیر کرا لاؤں۔ تین مہینے ہوگئے میں اُدھر بھول کر بھی نہیں گئی۔

پورنا۔ "میرے بال کھول دو تو چلوں۔ تمھاری بھاوج دیکھیں گی تو طعنہ دیں گی۔"

پریما۔ "طعنہ کیا دیں گی کوئی کھیل ہے۔ اگر اس گھر میں اب تم کو کوئی ترچھی نگاہ سے بھی دیکھے تو اپنا اور اس کا خون ایک کرلوں۔"

دونوں سکھیاں اُٹھیں اور ہاتھ میں ہاتھ دیے زینہ سے اُتر کر باغ میں آئیں۔ باغ کیا تھا۔ ایک چھوٹی سی پھلواری بھی جس میں زنانے سے راستہ بنا ہوا تھا۔ پریما کو پھولوں سے بہت زیادہ شوق تھا۔ اس لیے یہاں گلاب۔ موتیا۔ بیلا وغیرہ خوبصورت کیاریوں میں بہ کثرت لگے ہوئے تھے۔ دو تین لونڈیاں خاص اس خطہ کے سیراب کرنے کے لیے نوکر تھیں۔ باغ کے بیچوں بیچ میں ایک گول چبوترہ بنا ہوا تھا۔ دونوں سکھیاں اس چبوترہ پر بیٹھیں۔ شام کا سہانا وقت تھا۔ شفق کی سرخی آسمان پر نمودار تھی ٹھنڈی اور عنبر بیز ہوا چل رہی تھی۔ پریما کو دیکھتے ہی مالن بہت سی کلیاں ایک صاف تر کپڑے میں لپیٹ کر لائی۔ پریما نے ان کو لے کر پورنا کو دینا چاہا مگر وہ آبدیدہ ہوگئی اور بولی۔ "سکھی مجھے معاف رکھو۔ ان کی بوباس تم کو مبارک ہو۔ سہاگ کے ساتھ میں نے پھول بھی تیاگ دیے۔ ہائے! جس دن وہ نہانے گئے تھے اس دن میں نے ایسی ہی کلیوں کا ایک ہار تیار کیا تھا۔ اس دن سے میں نے پھولوں کو ہاتھ نہیں لگایا۔ یہ کہتے کہتے وہ دفعتاً چونک پڑی اور بولی۔ "پیاری اب میں جاؤں گی۔ آج اتوار کا دن ہے۔ بابو امرت رائے عموماً اتوار کو اسی وقت آیا کرتے ہیں۔ شاید آج بھی آجائیں۔ پریما نے زہر خندہ کرکے کہا "نہیں سکھی۔ ابھی ان کے آنے میں آدھ گھنٹہ کی دیر ہے۔ مجھے تو اس وقت کا ایسا اندازہ ہوگیا ہے کہ اگر کمرہ میں بھی بند کردو تو شاید غلطی نہ کروں۔ ہائے! سکھی تم سے سچ کہتی ہوں جھروکے پر بیٹھ کر روز گھنٹوں تک ان کی راہ دیکھا کرتی ہوں۔ کمبخت دل کو بہت سمجھاتی ہوں نہیں مانتا۔"

پورنا۔ ”ذرا پہلے سے جاکر بلّو سے کہہ دوں کمرے میں جھاڑو دیدے۔ کل پھر ملوں گی۔“
پریما۔ ”کل ضرور آنا پیاری۔ نہ آؤگی تو کہے دیتی ہوں کچھ کھا کر سو رہوں گی۔“
دونوں سکھیاں گلے ملیں۔ پورنا شرماتی ہوئی گھونگھٹ سے چہرہ کو چھپائے اپنے گھر کی طرف چلی اور پریما کسی کے دیدار کے اشتیاق میں مہتابی پر جاکر ٹہلنے لگی۔

پورنا کو پہنچے مشکل سے پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ بابو امرت رائے بائیسکل پر فرفر کرتے آ موجود ہوئے۔ آج انھوں نے انگریزی کپڑوں کے بجائے بنگالیوں کی پوشاک زیب بر کی تھی جو اُن پر خوب سجتی تھی۔ غضب کے جامہ زیب و وجیہہ آدمی تھے۔ بازاروں میں جا نکلتے تو لوگ بے اختیار ان کی طرف محو ہوجاتے تھے۔ اور شہر میں ایسی کون سی کنواری لڑکی ہوگی جو ان کی بیوی بننے کے آرزو نہ رکھتی ہو۔ معمول کے خلاف آج ان کی داہنی کلائی پر ایک ہار لپٹا ہوا تھا۔ جس سے خوشبو اُڑ رہی تھی۔ خصوصاً دھانی رنگ کی ریشمی چادر جو ان کے گلے میں پڑی ہوئی تھی ہوا کے نرم نرم جھونکوں سے لہرا لہرا کر ایک کیفیت دکھاتی تھی۔ جوتے کی آواز سنتے ہی بلّو نے بابو صاحب کو کمرہ میں بٹھا دیا۔
امرت رائے۔ ”کیوں بلّو کھیریت؟ (خیریت)۔“
بلّو ۔ ”ہاں سرکار۔ سب کھیریت ہے۔“

اسی اثنا میں نشست گاہ کا اندرونی دروازہ کُھلا اور پورنا نکلی۔ بابو امرت رائے نے اس کی طرف دیکھا تو حیرت میں آگئے۔ اور نگاہیں خود بخود اس کے چہرہ پر جم گئیں۔ پورنا مارے شرم کے گڑی جاتی تھی کہ آج کیوں میری طرف اس طرح تاک رہے ہیں۔ اس کو نہیں معلوم تھا کہ آج میں نے بالوں میں تیل ڈالا ہے۔ کنگھی کی ہے۔ پیشانی پر سیندور کی ایک بندی بھی پڑی ہوئی ہے۔ بابو امرت رائے نے اس کو اس بناؤ۔ چناؤ کے ساتھ کبھی نہیں دیکھا تھا اور نہ ان کو کبھی خیال ہوا تھا کہ وہ ایسی حسین ہوگی۔ چند منٹ تک تو پورنا سر نیچا کیے کھڑی رہی۔ یکایک اس کو اپنے گوندھے ہوئے بالوں کا خیال آ گیا اور اس نے فی الفور شرما کر گردن نیچی کرلی۔ گھونگھٹ کو بڑھا کر چہرہ چھپا لیا۔ اور یہ خیال کرکے شاید بابو صاحب اس بناؤ سنگار سے ناراض ہیں اس نے نہایت بھولے پن کے ساتھ یوں معذرت کی ”میں

کیا کروں! آج پریما کے گھر گئی تھی انھوں نے زبردستی سر میں تیل ڈال کر بال گوندھ دیے۔ میں کل سب بال کٹوا ڈالوں گی۔" یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

ایک تو اس کے بناؤ سنگار۔ دوسرے اس کے بھولے پن نے بابو صاحب کو لبھا لیا۔ بے اختیار بول اُٹھے۔ نہیں نہیں تمھیں میرے سر کی قسم ایسا ہرگز نہ کرنا۔ میں بہت خوش ہوں کہ تمھاری سکھی نے تمھارے اوپر یہ مہربانی کی۔ اگر اس وقت وہ یہاں ہوتیں تو میں ان کا اس احسان کے لیے شکریہ ادا کرتا۔

پورنا پڑھی لکھی عورت تھی۔ ہندی کے مشکل دوہوں کے معنی نکال لیتی۔ اس اشارہ کو سمجھ گئی اور جھینپ کر گردن نیچی کرلی۔

پریما کا نام سن کر بابو صاحب کو خواہش پیدا ہوئی کہ ذرا اس کی نسبت کچھ اور حالت معلوم کریں۔ بولے۔"تمھاری سکھی پریما ہیں تو اچھی طرح؟"

پورنا۔ اچھی طرح کیا ہیں۔ آج اُن کو دیکھ کر میں اپنی مصیبت بھول گئی۔ وہ بالکل سوکھ کر کانٹا ہوگئی ہیں۔ مہینوں سے کھانا پینا برائے نام ہے۔ دن بھر پلنگ پر پڑے پڑے رویا کرتی ہیں۔ گھر والے لاکھ سمجھاتے ہیں نہیں مانتیں۔آج مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور بڑی دیر تک اپنی دُکھ درد کی داستان سناتی رہیں۔ آخر میں انھوں نے کہا پورنا اگر چیری بنوگی تو بابو امرت رائے کی ورنہ کنواری رہوں گی۔

اس خبر کو سن کر امرت رائے کے چہرے پر ایک حسرت سی چھا گئی۔ بولے۔ "سچ؟"

پورنا۔ "جی ہاں ان کی حالت نہایت نازک ہے۔ مجھ سے بار بار پوچھتی تھیں کہ تم سے بابو صاحب سے کبھی اِدھر کا بھی ذکر آتا ہے۔ میں نے کہہ دیا کہ وہ تمھارے فراق میں بہت بے چین۔ اس پر بہت خوش ہوئیں۔"

امرت رائے۔ "ان کو کیسے معلوم ہوا کہ میں پریما کے فراق میں بے چین ہوں۔ کوئی زمانہ وہ تھا جب میں ان کا فدائی تھا۔ اور ان سے شادی کرنے کا ارمان رکھتا تھا۔ مگر اب وہ باتیں گزر گئیں۔ منشی بدری پرشاد نے مجھے اس اعزاز کے قابل نہیں سمجھا۔ مجھے یہ سن کر سخت افسوس ہوا کہ پریما ابھی تک مجھ کو یاد کرتی ہیں۔"

پورنا۔ "بابو صاحب! لونڈی کی گستاخی معاف مجھے تو یقین نہیں آتا کہ پریما کی محبت آپ کے دل میں نہیں ہے لوگ کہتے محبت ایک طرف سے ہو ہی نہیں سکتی۔ ایشور جانے آج جب میں نے ان سے آپ کا ذکر کیا تو پھول کی طرح کھل گئیں۔ چہرہ روشن ہوگیا۔ مجھے گلے لگا کر کہا سکھی ان سے کہہ دینا کہ اگر اب بھی مجھ پر ترس نہ کھائیں گے تو میں ضرور زہر کھالوں گی۔"

امرت رائے۔ "پورنا ہم کو سخت افسوس ہے ان کی حالت پر۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پہلے میں ان پر شیدائی تھا۔ مگر میں نے کامیابی کی کوئی امید نہ دیکھ کر رو روکر اس آگ کو بجھایا۔ اب اس کے بجائے کوئی دوسری ہی تمنا پیدا ہوگئی ہے اور اگر یہ بھی نہ پوری ہوئی تو یقین جانو کہ میں بن بیاہا ہی رہوں گا۔ یہ کہہ کر وہ زمین کی طرف تاکنے لگے۔

پورنا کا خیال تھا کہ بابو امرت رائے کی شادی پریما سے ہو یا نہ ہو وہ اس کی محبت ضرور کرتے ہیں مگر جب اس کو معلوم ہوا کہ ان کی شادی کہیں اور ہونے والی ہے تو ان کی باتوں پر یقین آگیا مسکرا کر شرماتی ہوئی بولی "ایشور آپ کی یہ مراد پوری کرے۔ شہر میں ایسا کون رئیس ہے جو آپ سے ناتا کرنا فخر نہ سمجھتا ہو۔ اگر اس کام میں مجھ سے کوئی خدمت انجام پاجائے گی تو میں اپنے کو نہایت خوش قسمت سمجھوں گی۔ جو کام میرے قابل ہو وہ فرما دیجیے۔ میں بسرو چشم بجا لاؤں گی۔"

امرت۔ (مسکرا کر) "تمھارے بلا تو اُس کام کا انجام پانا ہی محال ہے۔ بلکہ تمھاری ہی رضامندی پر اس تمنا کا دار و مدار ہے۔

پورنا بڑی خوش ہوئی۔ پھولی نہ سمائی کہ میں بھی اب ان کا کچھ کام کرسکوں گی۔ اس کی سمجھ میں اس جملہ کے معنی نہ آئے "تمھاری ہی رضامندی پر اس تمنا کا دارو مدار ہے" اس نے سمجھا شاید مجھے نامہ و پیام کا کام سپرد ہوگا۔ اس نے ان الفاظ کا مطلب چھ مہینے کے اندر ہی اندر اچھی طرح سمجھ لیا۔ بابو امرت رائے کچھ دیر تک یہاں اور بیٹھے۔ ان کی نظریں آج بے اختیار اِدھر اُدھر سے گھوم کر آتیں اور پورنا کے چہرہ پر گڑ جاتیں۔ جب تک وہ بیٹھے رہے پورنا کو مارے شرم کے سر

اُٹھانے کی جرأت نہ ہوئی۔ افسردہ اُٹھے اور چلتے وقت بولے "پورنا میں یہ گجرا آج تمھارے واسطے لایا ہوں۔ امید ہے کہ تم اس کو قبول کروگی۔ دیکھو کیسا خوشنما بنا ہے۔" یہ کہہ کر انھوں نے ہاتھ سے گجرا اس کی طرف بڑھایا۔

پورنا متحیر ہوگئی۔ آج یہ غیر معمولی خاطر کیسی! ایک منٹ تک اس کے دل میں پس و پیش ہوا کہ لوں یا نہ لوں۔ ان گجروں کا خیال آیا جو اس نے اپنے شوہر کے لیے ہولی کے دن بنائے تھے۔ پھر پریما کے کلیوں کا خیال آگیا۔ اس نے ارادہ کیا کہ میں نہ ملوں گی۔ زبان نے کہا "مجھے معاف رکھیے" مگر ہاتھ ایک بے اختیاری طور پر بڑھ گیا۔ بابو صاحب نے خوش خوش گجرا اس کے ہاتھ میں پہنایا۔ اس کو خوب نظر بھر کر دیکھا۔ بعد ازاں باہر نکل آئے۔ بائیسکل پر سوار ہوکر روانہ ہوگئے۔ پورنا کئی منٹ تک نقش تصویر بنی کھڑی رہی۔ اس کو خبر نہ تھی کہ میرے ہاتھ میں گجرے کیسے آگئے۔ میں نے تو انکار کیا تھا جی چاہا کہ پھینک دوں۔ مگر پھر یہ خیال پلٹ گیا۔ اس نے گجرے کو ہاتھ میں پہن لیا۔ ہائے! اس وقت بھی اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس جملہ کا کیا مطلب ہے۔ "تمھاری ہی رضامندی پر اس تمنا کا دار و مدار ہے۔"

اُدھر پریما مہتابی پر ٹہل رہی تھی۔ اس نے بابو صاحب کو آتے دیکھا تھا۔ ان کی وضع اس کے نظروں میں کھپ گئی تھی۔ اس نے کبھی اس بناؤ کے ساتھ نہیں دیکھا تھا سب سے زیادہ تعجب اس کو اس بات کا تھا کہ ان کے ہاتھوں میں گجرا کیوں ہے۔ وہ ان کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کا جی جھنجھلاتا تھا کہ وہ آج اتنی دیر کیوں لگا رہے ہیں۔ کیا باتیں ہورہی ہیں۔ دفعتاً بائیسکل نظر آئی۔ اس نے پھر بابو صاحب کو دیکھا۔ چہرہ شگفتہ تھا۔ ہاتھ پر نظر پڑگئی۔ ایں!! یہ گجرا کیا ہوگیا؟

چھٹا باب

موے پر سو دُرّے

پورنا نے گجرا پہن تو لیا مگر رات بھر اس کی آنکھوں میں نیند نہیں آئی۔ اس کے سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی کہ بابو امرت رائے نے اس کو گجرا کیوں دیا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پنڈت بسنت کمار اس کی طرف نہایت قہر آلود نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اس نے چاہا کہ گجرا اُتار کر پھینک دوں۔ مگر نہیں معلوم کیوں اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ ساری رات اس نے آنکھوں میں کاٹی۔ صبح ہوئی۔ ابھی سورج بھی نہ نکلا تھا کہ پنڈائین وچوبائن و بابو کملا پرشاد کی بوڑھی مہراجن مع سیٹھانی جی اور کئی عورتوں کے پورنا کے مکان میں داخل ہوئیں۔ اس نے بڑے ادب سے سب کو بٹھایا۔ سب کے قدم چھوئے بعد ازاں یہ پنچایت ہونے لگی۔

پنڈائن۔ (جو بڑھاپے کی وجہ سے سوکھ کر چھوہارے کی طرح ہوگئی تھیں) ''کیوں دُلہن؟ پنڈت جی کو گنگا لابھ ہوئے کتنے دن بیتے؟''

پورنا۔ (ڈرتے ڈرتے) ''تین مہینہ سے کچھ زیادہ ہوتا ہے۔''

پنڈائن۔''اور ابھی سے تم سب کے گھر آجانے لگیں۔ کیا نام کہ کل تم سرکار کے گھر چلی گئی تھیں۔ ان کی کنواری کنیا کے پاس دن بھر بیٹھی رہیں بھلا سوچو تو تم نے اچھا کیا یا بُرا۔ کیا نام کہ تمھارا اور ان کا کیا ساتھ! جب وہ تمھاری سکھی تھیں تب تھیں۔ اب تو تم بدھوا ہوگئیں۔ تم کو کم سے کم سال بھر تک گھر سے پاؤں باہر نہیں نکالنا چاہیے تھا۔ یہ نہیں کہ تم درشن کو نہ جاؤ۔ اشنان کو نہ جاؤ۔ اشنان پوجا تو اب تمھارا دھرم ہی ہے۔ ہاں کسی سہاگن یا کسی کنواری کنیا کے اوپر تم کو اپنا سایہ نہیں ڈالنا چاہیے۔

پنڈائن خاموش ہوئیں تو منشی بدری پرشاد کی مہراجن فرمانے لگیں۔ ''کیا بتلاؤں بڑی سرکار اور دُلہن دونوں کا خون کا گھونٹ پی کے رہ گئیں۔ بڑی سرکار تو

ایشور جانے بلک بلک رو رہی تھیں کہ ایک تو بے چاری لڑکی کے یوں ہی جان کے لالے پڑے ہیں دوسرے اب رانڈ بیوہ کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہے۔ نہیں معلوم ایشور کیا کرنے والے ہیں۔ چھوٹی سرکار مارے غصہ کے کانپ رہی تھیں۔ بارے میں نے ان کو سمجھایا کہ آج معاف کیجیے۔ ابھی وہ بے چاری بچہ ہے۔ ریت بیوہار کیا جانے۔ سرکار کی بٹیا نے جب بہت سمجھایا تب جاکے مانیں۔ نہیں تو کہتی تھیں کہ میں ابھی جاکر کھڑے کھڑے نکال دیتی ہوں۔ سو بٹیا اب تم سہاگنوں یا کنیاؤں کے ساتھ بیٹھنے جوگ نہیں رہیں۔ ارے ایشور نے تو تم پر بپت ڈال دی۔ اب تو تمھارا دھرم ہے کہ چپ چاپ اپنے گھر میں پڑی رہو۔ جو کچھ میسر ہو کھاؤ پیو اور سرکار کا بیٹا جیسے جہاں تک ہوسکے دھرم کے کام کرو۔"

پورنا نے چاہا کہ اب کی کچھ جواب دوں کہ چوبائن صاحبہ نے پند و نصائح کا دفتر کھولا۔ یہ ایک موٹی۔ بھدیسل اور ادھیڑ عورت تھی۔ بات بات پر آنکھیں میچا کرتی تھی اور آواز بھی نہایت کرخت تھی۔ بھلا ان سے پوچھو کہ ابھی تمھارے دولھے کو اُٹھے تین مہینے بھی نہیں بیتے اور تم نے ابھی سے آئینہ۔ کنگھی۔ چوٹی سب کرنا شروع کردیا۔ کیا نام کہ تم اب بدھوا ہوگئیں۔ تم کو اب آئینہ کنگھی سے کیا سروکار ٹھہرا۔ کیا نام کہ میں نے ہجاروں عورتوں کو دیکھا ہے جو پتی کے مرنے کے بعد گہنا پاتا نہیں پہنتیں۔ ہنسنا بولنا تک چھوڑ دیتی ہیں۔ نہ کہ آج تو سہاگ اُٹھا اور کل سنگار پٹار ہونے لگا۔ کیا نام کہ میں للّوپتّو کی بات نہیں جانتی۔ کہوں گی سچ چاہے کسی کو تیتا لگے یا میٹھا بابو امرت رائے کا روج۔ روج یہاں آنا ٹھیک نہیں ہے کہ نہیں سیٹھانی جی؟

اس پر سیٹھانی جی نے ہانک لگائی۔ یہ ایک نہایت فربہ اندام۔ موٹے موٹے وزنی گہنوں سے لدی ہوئی بوڑھی تھی۔ گوشت کے لوتھڑے ہڈیوں سے الگ ہوکر نیچے لٹک رہے تھے۔ اس کی بھی ایک بہو بیوہ ہوگئی تھی۔ جس کی زندگی اس نے اجیرن کر رکھی تھیں۔ اس کی عادت تھی کہ بات کرتے وقت ہاتھوں کو مٹکایا کرتی تھی۔"ہے ہے۔ جو سچ بات ہوگی سب کوئی کہے گا۔ بھلا کسی نے کبھی رانڈ بیوہ کو ماتھے پر بندی ویسے دیکھا ہے۔ جب سہاگ اُٹھ گیا تو پھر ٹیکا کیسا۔ میری بھی ایک

بہو بدھوا ہے مگر اس کو آج تک لال ساڑی نہیں پہننے دیتی۔ نہیں معلوم ان چھوکریوں کا جی کیسا ہے کہ بدھوا ہوجانے پر بھی سنگار پر للچایا کرتا ہے۔ ارے ان کو چاہیے کہ بابا اب ہم رانڈ ہوگئے ہم کو نگوڑے سنگار سے کیا لینا ہے۔"

مہراجن۔ "سرکار کا بیٹا جیے تم بہت ٹھیک کہتی ہو سیٹھانی جی۔ کل چھوٹی سرکار نے جو ان کو مانگ میں ٹیکا لگائے دیکھا تو کھڑی ٹھک رہ گئیں۔ سرکار کا بیٹا جیے دانتوں تلے اُنگلی دبائی۔ ابھی تین دن کی بدھوا اور یہ سنگار کرے! سو بیٹا اب تم کو سمجھ بوجھ کر کام کرنا چاہیے تم اب بچہ نہیں ہو۔"

پورنا بے چاری بیٹھی بسور رہی تھی اور یہ سب بے رحم عورتیں اس کی لے دے کر رہی تھیں۔ اس نے چاہا کہ اب کی بار کچھ عذر معذرت کرے۔ مگر کون سنتا ہے سیٹھانی جی پھر گرج اُٹھیں اور ہاتھ چمکاکر فرمانے لگیں۔"اور کیا! جب کہنے کی بات ہوگی تو سب کوئی کہے گا۔ چپ کیوں ہو۔" پنڈائن؟ ان کے لیے اب کوئی راہ باٹ نکال دو۔"

پنڈائن۔ "کیا نام کہ سانچ کو آنچ نہیں۔ دُلہن کو چاہیے کہ سب سے پہلے یہ لمبے لمبے کیس کٹوا ڈالیں۔ اور کیا نام کہ دوسروں کے گھر آنا جانا چھوڑ دیں۔"

چوبائن۔ "اور بابو امرت رائے کو یہاں روج روج آنا کیا جرور؟"

مہراجن۔ "سرکار کا بیٹا جیے میں بھی بات کہنے والی تھی۔ بابو صاحب کے آنے سے بدنامی کا ڈر ہے۔"

چند اور سکھاون کی باتیں کرکے یہ مستورات یہاں سے تشریف لے گئیں۔ مہراجن بھی منشی بدری پرشاد صاحب کے یہاں کھانا پکانے گئیں۔ ان سے اور چھوٹی سرکار سے بہت بنتی تھی۔ وہ ان پر بہت اعتبار رکھتی تھیں۔ مہراجن نے جاتے ہی ان سے ساری کتھا خوب رنگ و روغن۔ نمک مرچ لگا کر بیان کی۔ اور چھوٹی سرکار نے اس واقعہ کو پریما کے جلانے اور سلگانے کے لیے مناسب سمجھ کر اس کے کمرہ کی طرف رخ کیا۔

یوں تو پریما ہر روز ساری رات جاگا کرتی تھی۔ مگر کبھی کبھار گھنٹہ آدھ گھنٹہ کے لیے نیند آجاتی تھی۔ نیند کیا آجاتی تھی! ایک غشی سی عارض ہوجاتی تھی۔

مگر جب سے اس نے بابو امرت رائے کو بنگالیوں کی وضع میں دیکھا تھا۔ اور پورنا کے گھر سے واپس آتے وقت ان کی کلائی پر اس کو گجرا نظر آیا تھا۔ اس وقت سے اس کے پیٹ میں کھلبلی پڑی ہوئی تھی کہ کب پورنا آئے اور کب سارا حال معلوم ہو۔ رات کو بڑی بے چینی سے اُٹھ اُٹھ گھڑی پر نظر دوڑاتی۔ اس وقت جو اس نے پیروں کی چاپ سنی تو سمجھی کہ پورنا آرہی ہے۔ فرطِ اشتیاق سے لپک کر دروازہ تک آئی۔ مگر یوں ہی اپنی بھاوج کو دیکھا۔ ٹھٹک گئی اور بولی "کیسے چلیں بھابھی؟" دُلہن صاحبہ تو چاہتی ہی تھیں کہ چھیڑ چھاڑ کے لیے کوئی ذریعہ ہاتھ آجائے۔ یہ سوال سنتے ہی تنک کر بولیں۔ کیا بتلاؤں کیسے چلی۔ اب سے جب تمھارے پاس آیا کروں گی تو اس سوال کا جواب سوچ کر آیا کروں گی۔ تمھاری طرح سب کا خون تھوڑا ہی سفید ہوگیا ہے کہ چاہے گھی کا گھڑا ڈھلک جائے۔ گھر میں آگ لگی ہے مگر اپنے کمرے سے قدم باہر نہ نکالے۔"

وہ چھوٹا سا جملہ پریما کے منہ سے یوں ہی بلا کسی خیال کے نکل آیا تھا۔ اس کے جو یہ معنی لگائے گئے تو پریما کو نہایت ناگوار گزرا۔ بولی۔ "بھابھی تمھارے تو ناک پر غصہ رہتا ہے۔ ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا دیتی ہو۔ بھلا میں نے کون سی بات بُرا ماننے کی کہی تھی۔"

بھاوج۔ "کچھ نہیں تم تو جو کچھ کہتی ہو گویا منہ سے پھول جھاڑتی ہو۔ تمھاری زبان میں شکر گھولی ہوئی ہے دنیا میں جتنے ہیں ان کی ناک پر غصہ رہتا ہے اور تم بڑی سیتا ہو۔"

پریما۔ "(جھلاکر) بھاوج اس وقت تمھارا مزاج بگڑا ہوا ہے۔ ایشور کے لیے مجھے دق مت کرو۔ میں تو یوں ہی اپنی جان کو رو رہی ہوں۔"

بھاوج۔ "(ٹھمک کر) ہاں رانی میرا تو مزاج بگڑا ہوا ہے۔ سر پھرا ہوا ہے۔ ذرا سیدھی ہوں نہ۔ میں بھی یاروں کو چوری چھپے چٹھی پتر لکھا کرتی ہو، تصویریں بھیجا کرتی۔ انگوٹھیوں کا ادل بدل کرتی تو میں بھی ہوشیار کہلاتی۔ مگر مان نہ مان میں تیرا مہمان! تم لاکھ چٹھیاں لکھو۔ لاکھ جتن کرو مگر وہ سونے کی چڑیا ہاتھ آنے والی نہیں۔"

یہ جلی کٹی سن کر پریما سے ضبط نہ ہوسکا۔ بے چاری کمزور دل کی عورت تھی اور مدتوں سے رنج و محن سہتے سہتے کلیجہ اور بھی پک گیا تھا۔ بے اختیار رونے

لگی۔ بھاوج نے اس کو روتے دیکھا تو آنکھیں جگمگا گئیں۔ ہات تیرے کی یوں سر کرتے ہیں تیر کو! بولی "بلکتی کیا ہو؟ کیا اماں کو سنا کر دیس نکالا کرا دوگی۔ کچھ جھوٹ تھوڑا ہی کہتی ہوں۔ وہی امرت رائے جن کے پاس آپ چپکے چپکے چٹھیاں لکھا کرتی تھیں۔ اب آج دن دھاڑے اس قحبہ پورنا کے گھر آتا ہے اور گھنٹوں وہیں رہتا ہے۔ سنتی ہوں پھول کے گجرے لاکر پہناتا ہے۔ شاید دو ایک قیمتی زیور بھی دیے ہیں۔"

پریما اس سے زیادہ نہ سہہ سکی۔ گڑگڑا کر بولی "بھاوج میں تمھارے پیروں پڑتی ہوں مجھ پر دیا کرو۔ مجھے جو چاہو کہہ لو (رو کر) بڑی ہو۔ مار لو پیٹ لو مگر کسی کا نام لے کر اور اس پر چھدّے رکھ کر میرے غریب دل کو مت جلاؤ۔"

پریما نے تو نہایت لجاجت سے یہ الفاظ کہے مگر چھوٹی سرکار "چُھدے رکھ کر" پر برانگیختہ ہوگئیں۔ چمک کر بولیں۔ ہاں ہاں رانی جو کچھ میں کہتی ہوں وہ چُھدے رکھتی ہوں مجھے تمھارے سامنے جھوٹ بولنے سے مٹھائی ملتی ہے نہ۔ تمھارے سامنے جھوٹ بولوں گی تو تم سونے کے تخت پر بٹھا دوگی۔ مگر میں ایک جھوٹی ہوں۔ سارا زمانہ تو نہیں جھوٹا ہے۔ آج سارے محلے میں گھر گھر یہی چرچا ہو رہا ہے۔ بہت تو پڑھی لکھی ہو۔ بھلا تمھیں سوچو ایک تیس برس کے سنڈے مردوے کا پورنا سے کیا کام ہے! مانا کہ وہ اس کی مدد کرتے ہیں۔ مگر یہ تو دنیا ہے جب ایک پر آ پڑتی ہے تو دوسرا اس کے آڑے آتا ہے۔ مگر شریف آدمی اس طرح دوسروں کو بہکایا نہیں کرتے۔ اور اس چھوکری کو کیا بہکائے گا کوئی۔ وہ تو آپ ہی سات گھاٹ کا پانی پیے ہے۔ میں نے جس دن اس کی صورت دیکھی تھی اس دن تاڑ گئی تھی کہ یہ ایک ہی بس کی گانٹھ ہے۔ ابھی تین دن بھی دولھے کو مرے ہوئے نہیں بیتے کہ سب کو جھمکڑا دکھانے لگی۔ گویا دولھا کیا مرا ایک بلا دور ہوئی۔ کل جب اس کے سبز قدم یہاں آئے تو میں ذرا بال گوندھا رہی تھی۔ نہیں تو ڈیوڑھی کے بھیتر تو قدم دھرنے ہی نہ دیتی۔ چڑیل نہیں تو۔ یہاں آکر تمھاری سہیلی بنتی ہے۔ اسی نے امرت رائے کو اپنا جوبن دکھا دکھا کے اپنا لیا ہے۔ کل کیسا لچک لچک کر ٹھمک ٹھمک کر چلتی تھی۔دیکھ دیکھ جی جلتا ہے۔ ہرجائی نہیں تو۔ خبردار

جو اب کبھی تم نے اس چڑیل کو اپنے یہاں بٹھایا! میں اس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔" زبان وہ بلا ہے کہ جھوٹ بات کا بھی یقین دلا دیتی ہے۔ بہو صاحبہ نے تو جو کچھ فرمایا حرف بہ حرف صحیح تھا۔ بھلا اس کا اثر کیوں نہ ہوتا پہلے تو پریما نے ان کی باتوں کو لغو و شرارت آمیز خیال کیا۔ مگر آخر خیال نے پلٹا کھایا۔ بھاوج کی باتوں میں راستی کی جھلک پائی۔ یقین آگیا۔ تاہم وہ ایسی اوچھی نہیں تھی کہ اسی وقت امرت رائے اور پورنا کو کوسنے لگتی۔ ہاں وہ سینہ پر ہاتھ دھرے یہاں سے اُٹھ کر چلی گئی۔ اور چھوٹی سرکار بھی خراماں خراماں اپنے کمرہ میں تشریف لائیں آئینہ میں رخِ انور کو ملاحظہ کیا اور آپ ہی آپ بولیں۔ "لوگ کہتے ہیں کہ مجھ سے خوبصورت ہیں۔ اب وہ خوبصورتی کہاں گئی؟"

پریما کو تو پلنگ پر لیٹ کر بھاوج کی باتوں کو واقعات سے ملانے دیجیے۔ ہم مردانے میں چلیں۔ یہاں کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے۔ نہایت آراستہ و پیراستہ اور وسیع دیوان خانہ ہے۔ زمین پر مرزا پور کے ساخت کی خوبصورت قالینیں بچھی ہوئی ہیں۔ گدے اور کرسیاں ہر وضع کی قرینہ سے لگی ہوئی ہیں۔ دیواریں خوبصورت تصویروں سے مزین ہیں۔ پنکھا جھلا جارہا ہے اور منشی بدری پرشاد صاحب ایک آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے چشمہ لگائے ایک اخبار پڑھ رہے ہیں۔ ان کے داہنے بائیں کی کرسیوں پر چند دیگر اصحاب رونق افروز ہیں۔ وہ سامنے کی طرف منشی گلزاری لال ہیں اور ان کے بغل میں بابو دان ناتھ۔ داہنے جانب بابو کملا پرشاد منشی جھمن لال سے کچھ کانا پھسکی کر رہے۔ ہیں بائیں جانب دو اصحاب اور جلوہ افروز ہیں جن کو ہم نہیں پہچانتے۔ کئی منٹ تک منشی بدری پرشاد صاحب اخبار پڑھتے رہے۔ آخر انھوں نے سر اُٹھایا اور سنجیدگی سے بولے۔ "بابو امرت رائے کی حرکتیں اب برداشت سے باہر ہوتی جاتی ہیں۔"

گلزاری لال۔ "برداشت! جناب اب ان کی تحریروں اور تقریروں سے یہاں کی سوسائٹی کی سخت توہین ہو رہی ہے۔ ہمارا فرض قومی ہے کہ اب ہم ان کے نشہ کو اُتارنے کی فکر کریں۔"

بابو کملا پرشاد۔ "بیشک آپ بہت درست فرماتے ہیں۔ ہمارا فرض تھا کہ ابتدا ہی سے اس کی

فکر کرتے تاہم ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔"

چمن لال۔ "اگر بگڑا ہے تو ابتدا ہے کہ اسکول اور کالج کے چند لونڈوں نے ان کی پیروی اختیار کی ہے۔ اور مدراس۔ بمبئی کے چند سربرآوردہ اشخاص نے ان کی اعانت کرنے کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ اگر ہم بہت جلد ان کی خبر نہ لیں گے تو پھر آگے چل کر بڑی مشکل درپیش ہوگی۔ دیکھیے اس اخبار میں پانچ ہفتے سے برابر ان کے مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ اور ان کے نئی روشنی والے چھوکرے آس پاس کے دیہاتوں میں غل مچاتے پھرتے ہیں۔ یہ مخفی نہیں ہے کہ دہقانی عموماً کم فہم کور مغز ہوتے ہیں۔ کیا تعجب ہے کہ ان کی باتوں پر عمل کرنے کے لیے مستعد ہوجائیں۔ بابو امرت رائے میں خواہ کسی قسم کی لیاقت ہو یا نہ ہو۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی وکالت اندھا دُھندھ بڑھ رہی ہے۔ مؤکلوں کو تو وہ شخص شیشے میں اُتار لیتا ہے۔"

گلزاری لال۔ "سب سے پہلے ہمارا کام یہ ہونا چاہیے کہ ان کی درخواست جو کمیٹی میں پیش کی گئی ہے اُسے منسوخ کرائیں۔"

بابو دان ناتھ نے جو اِن مباحثوں میں برائے نام حصہ لیے ہوئے تھا پوچھا "کیسی درخواست؟"

گلزاری لال۔ "کیا آپ کو نہیں معلوم۔ حضرت چاہتے ہیں کہ وہ دریا کے کنارے والا سرسبز خطہ ہاتھ آجائے۔ شاید وہاں ایک خیرات خانہ تعمیر کرائیں گے سُنتا ہوں اس میں بیوائیں رکھی جائیں گی۔اور ان کی خورش پوشش کا انتظام کیا جائے گا۔ مگر ایسی قیمتی اور عام فائدہ کی زمین ہرگز اس طرح ضائع نہیں کی جا سکتی۔"

منشی بدری پرشاد۔ "نہیں نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ بچّا! (کملا پرشاد) تم آج اُسی زمین کے لیے ایک درخواست کمیٹی میں پیش کردو۔ ہم وہاں ٹھاکر دوارہ اور دھرم شالہ بنوائیں گے۔"

گلزاری لال۔ "ہم کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ اگر پریسیڈنٹ صاحب بابو امرت رائے کی طرف داری بھی کریں تو ان کے موافق فیصلہ نہ ہو۔ انھوں نے انگریزوں سے خوب ارتباط پیدا کر رکھی ہے کیا رایوں کی تعداد ہمارے طرف زیادہ نہ ہوگی؟"

کملا پرشاد۔ "اس میں کوئی شک بھی ہے۔ یہ دیکھیے ممبروں کی فہرست۔ کل ستائیس حضرات

ہیں۔ ان میں سات اصحاب•یہیں رونق افروز ہیں غالبًا دس بارہ ووٹ اور حاصل کرلینا کچھ مشکل نہ ہوگا۔

جھمن لال۔ ''ہم کو اتنی ہی پر بس نہیں کرنا چاہیے۔ ان مضامین کا دندان شکن جواب دینا بھی ضروری ہے۔ میں نے معتبر خبر سُنی ہے کہ لالہ دھنکھ دھاری صاحب پھر تشریف لا رہے ہیں۔ ہم کو کوشش کرنی چاہیے کہ پبلک ہال میں تقریر کرنے کا موقع ان کو نہ ملے۔''

یہاں یہ حضرات بیٹھے ہوئے یہ چہ میگوئیاں کر رہے تھے کہ یکایک ایک آدمی نے اندر آکر کہا ''بابو امرت رائے تشریف لائے ہیں۔'' امرت رائے کا نام سنتے ہی قریب قریب کل حضرات کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ خصوصاً منشی گلزاری لال اور بابو دان ناتھ کے چہرے کا تو رنگ فق ہوگیا۔ بغلیں جھانکنے لگے۔ اگر کوئی جگہ چھپنے کی ہوتی تو وہ دونوں ضرور چھپ جاتے۔ دان ناتھ سمجھا کہ ہم کو بے وفا خیال کریں گے۔ وہ ابھی تک دل سے امرت رائے کے ہمدرد اور خیرخواہ تھے گو اپنا مطلب نکالنے کے لیے منشی بدری پرشاد سے ربط ضبط بڑھانا شروع کر دیا تھا۔

ایک لمحے میں بابو امرت رائے کوٹ پتلون پہنے۔ سولا ہیٹ لگائے۔ جوتا چرچراتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ ان کو دیکھتے ہی بجز منشی بدری پرشاد صاحب کے اور سب حضرات تعظیماً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ امرت رائے نے جاتے ہی بلا تامل علیک سلیک کے بعد یوں گفتگو کرنا شروع کی میں آپ اصحاب کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ ایک قومی التجا پیش کروں۔ آپ لوگوں پر روشن ہے کہ اس شہر میں ابھی تک کوئی ایسے پناہ کا مقام نہیں ہے جہاں لا وارث عورتوں کے پرورش و پرداخت کا انتظام ہوسکے۔ ایسے عورتوں کو سڑکوں پر پھٹے حالوں اِدھراُدھر مارے مارے پھرتے دیکھنا واقعی نہایت عبرتناک و شرمناک ہے اسے ہماری تہذیب پر ایک نہایت بدنما دھبہ ہے۔ اس صوبہ کے تمام بڑے بڑے شہروں میں قومی مخیّروں نے اس قومی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ انھیں کی دیکھا دیکھی میں نے بھی یہ کوشش کرنی چاہی کہ اگر ممکن ہو تو اس شہر پر سے دھبہ مٹا دوں۔ مگر یہ مہتم بالشان کام

ایسا نہیں ہے کہ مجھ جیسے ہیچ زور و ہیچ منداں سے انجام پاسکے۔ تا وقتیکہ آپ حضرات میری اعانت نہ فرمائیں۔ اسی غرض سے میں نے ایک چندہ کھولا ہے۔ مجھے امیدِ کامل ہے کہ ایسے موقع پر ضرور فیاضی اپنا جوہر دکھائی گی۔ میں بہت جلد ایک پروگرام شائع کرنے والا ہوں جس میں ایک خیرات خانے کے انتظام و انصرام کے متعلق تجاویز پیش کی جائیں گی اور ان پر ہادیانِ قوم کی رائیں مدعو کی جائیں گی۔

یہ کہتے کہتے بابو امرت رائے نے چٹ پٹ جیب سے فہرست نکا لی اور بلا کس کو آپس میں نظربازیاں یا سرگوشیاں کرنے کی مہلت دئے ہوئے اس کو منشی گلزاری لال صاحب کے سامنے پیش کردیا۔ اب منشی جی سخت عذاب میں مبتلا ہیں۔ ایک حبہ دینے کی نیت نہیں ہے۔ مگر یہ خوف ہے کہ کہیں اور حضرات کچھ فیاضی دکھائیں تو میں خوا مخواہ نکو بنوں۔ علاوہ اس کے آپ مسٹر امرت رائے کے سچے ہمدردوں میں تھے اور ان کے اصلاح کے مشغلات سے بڑی دلچسپی جتاتے تھے۔ انھوں نے ایک منٹ تک تامل کیا۔ چاہا کہ اِدھر اُدھر سے کچھ اشارہ کنایہ پاجائیں۔ مگر امرت رائے پہلے سے ہوشیار تھے۔ وہ ان کے سامنے نگاہ روک کر کھڑے ہوگئے اور مسکراکر بولے سوچیے نہیں مجھے آپ سے بہت کچھ امید ہے۔ آخر منشی گلزاری لال نے کوئی مفر نہ دیکھ کر جھینپتے ہوئے اپنے نام کے مقابل پانچ سو روپے کی رقم تحریر فرمائی۔ امرت رائے نے ان کا شکریہ ادا کیا اور گو اور حضرات کچھ کانا پھسکی کرنے لگے تھے مگر اس کا کچھ خیال نہ کرکے انھوں نے فہرست بابو دان ناتھ کے سامنے رکھ دی۔

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ بابو دان ناتھ امرت رائے کے مقاصد سے اتفاق رکھتے تھے۔ مگر پہلے جب انھوں نے چندہ کی فہرست دیکھی تو بڑے پس و پیش میں تھے کہ کیا کروں۔ اگر کچھ دیتا ہوں تو شاید منشی بدری پرشاد بُرا مان جائیں۔ نہیں دیتا تو امرت رائے کے ناراض ہوجانے کا خوف ہے اسی حیص بیص میں تھے کہ بابو گلزاری لال کی مبادرت نے ان کو جرأت دلائی۔ فوراً اپنے نام کے مقابل ایک ہزار کی رقم لکھی۔ امرت رائے کو ان سے اتنی امید نہ تھی۔ بڑے گرم جوشی سے ان کا شکریہ ادا کیا اب یہ تشویش ہوئی کہ فہرست کس کے سامنے پیش کی جائے۔ اگر منشی

بدری پرشاد کے خدمت میں پیش کروں تو شاید وہ کچھ نہ دیں اور ان کا بخل دوسرے اصحاب کو بھی متاثر کرے گا۔ اگر کسی دوسرے صاحب کو دکھاتا ہوں تو شاید منشی جی صاحب بُرا مانیں کہ میری توہین کی۔ ایک لمحہ تک وہ اسی سوچ میں رہے مگر بلا کے حاضر جواب آدمی تھے دماغ نے فوراً فیصلہ کرلیا۔ انھوں نے فہرست لی ادب سے منشی بدری پرشاد کی خدمت میں پیش کرکے کہا۔ "مجھے آپ سے خاص اعانت کی ضرورت ہے نہ صرف یہ کہ آپ میرے بزرگوار ہیں۔ بلکہ تجویز ہے کہ یہ عمارت نام نامی سے تعمیر کرائی جائے۔ میں نے کمشنر صاحب کو بنیادی پتھر رکھنے پر رضامند کرلیا ہے۔"

منشی بدری پرشاد جہاں دیدہ آدمی تھے۔ مگر اس وقت گپّا کھا گئے۔ دیکھا کہ دو معمولی وکیلوں نے ایک ایک ہزار روپے دیے ہیں۔ اور علاوہ اس کے کمشنر صاحب بھی جلسہ میں تشریف لائیں گے۔ عمارت میرے ہی نام سے تعمیر ہوگی اور اس کو تصرف میں لانے کا اختیار بھی مجھ کو ہوگا۔ یہی سوچتے بچارتے اپنے نام نامی کے روبرو دس ہزار کی خاصی رقم تحریر فرمائی۔ پھر کیا تھا۔ طلسم ٹوٹ گیا۔ کل حاضرین نے اپنی اپنی حیثیتوں کے موافق مدد کی۔ ایک دس منٹ میں کوئی سولہ سترہ ہزار روپے ہاتھ آگئے۔ مسٹر امرت رائے کو اپنے حکمت عملی سے کامیابی کی امید تو ضرور تھی مگر اس حد تک نہیں۔ وہ مارے خوشی کے اُچھلے جاتے تھے۔ اس غیر متوقع کامیابی سے چہرہ کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ چندہ کی فہرست جیب میں داخل کرکے بولے۔ "آپ اصحاب نے میرے اوپر بڑا احسان کیا۔ اور میرے اوپر کیا شہر کے بے کس۔ دُکھیا۔ بیواؤں پر۔ مجھے امید ہے کہ جب آپ لوگوں نے مالی اعانت فرمائی ہے تو کل کمیٹی میں میری جو درخواست پیش ہوگی اُس پر بھی نظر عنایت مبذول فرمائیں گے۔ میں نے مجسٹریٹ صاحب سے اپنا مدعا عرض کیا تھا۔ انھوں نے فرمایا کہ اس وقت بورڈ تنگ دست ہو رہی ہے۔ ایسی قیمتی اور عام فائدہ کی زمین بلا معاوضہ کے نہیں دے سکتی۔ میں نے بھی ان سے عرض کی کہ کل کمیٹی کے روبرو میری درخواست پیش ہوگی۔ جو فیصلہ کمیٹی کرے گی اس کے قبول کرنے میں مجھے کوئی عذر نہ ہوگا۔ میں اس کی قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں۔ مگر مجھے کامل توقع ہے

کہ جب آپ نے میری امداد ایسی دریا دلی سے کی ہے تو اس زمین کے حاصل کرنے میں بھی کوشش فرمائیں گے۔"

یہ کہہ کر بابو امرت رائے یہاں سے تشریف لے گئے۔ مگر افسوس! انھیں کیا معلوم تھا کہ اس پردہ کے آڑ سے جو منشی بدری پرشاد کے کرسی کے پیچھے پڑا ہوا تھا اور جہاں سے بالاخانے پر جانے کا راستہ تھا کوئی بیٹھا ہوا ایک ایک بات سُن رہا ہے۔ بابو صاحب کو آتے پریما نے دیکھ لیا تھا!

ساتواں باب

"آج سے کبھی مندر نہ جاؤں گی"

بے چاری پورنا پنڈائن و چوبائن وغیرہم کے چلے جانے کے بعد رونے لگی۔ وہ سوچتی تھی کہ ہائے! اب میں ایسی منحوس سمجھی جاتی ہوں کہ کسی کے ساتھ بیٹھ نہیں سکتی۔ اب لوگوں کو میری صورت سے نفرت ہے۔ ابھی نہیں معلوم کیا کیا بھوگنا بھاگ میں بدا ہے۔ یا نارائن! تو ہی مجھ دُکھیا کا بیڑا پار لگا۔ میری شامت آئی تھی کہ خواہ مخواہ سر میں تیل ڈلوا لیا۔ یہی بال کمبخت نہ ہوتے تو کاہے کو آج فضیحتا ہوتا۔ انھیں باتوں کا خیال کرتے کرتے جب یہ جملہ یاد آگیا "بابو امرت رائے کا روج روج آنا ٹھیک نہیں" تو اس نے سر پر ہاتھ مار کر کہا۔

"وہ آتے ہیں تو میں کیسے منع کروں۔ میں تو ان کا دیا کھاتی ہوں۔ سوائے ان کے اب میری خبر لینے والا اور کون ہے۔ ان سے کیسے کہہ دوں کہ تم مت آؤ۔ اور پھر ان کے آنے میں ہرج ہی کیا ہے۔ بے چارے سیدھے سادھے شریف آدمی ہیں۔ کچھ شہدے نہیں۔ آوارہ نہیں۔ پھر ان کے آنے میں کیا ہرج ہے۔ نہیں نہیں! مجھ سے منع نہ کیا جائے گا۔ اب تو مجھ پر مصیبت آ ہی پڑی ہے۔ اب جس کے جی میں جو آوے کہے نہیں معلوم کل مجھے کیا ہوگیا تھا۔ کیا بھنگ کھا گئی تھی کہ پریما کے یہاں جاکر آج اتنی فضیحتا کروائی۔ اب بھول کر بھی اُدھر کا رُخ نہ کروں گی۔ مگر ہائے! پیاری پریما کے دیکھے بغیر کیوں کر رہا جائے گا۔ میں نہ جاؤں گی تو وہ اپنے دل میں کیا سمجھیں گی! سمجھیں گی کیا۔ ان کے ماں نے ان کو پہلے ہی سے منع کردیا ہوگا۔"

ان خیالوں سے فرصت پاکر اس نے حسبِ معمول گنگا جی کا قصد کیا۔ جب سے پنڈت جی کا انتقال ہوا تھا وہ روز بلا ناغہ گنگا نہانے جایا کرتی تھی۔ مگر منہ اندھیرے جاتی اور سورج نکلتے نکلتے لوٹ آتی۔ آج اِن بن بلائے مہمانوں کے وجہ سے دیر ہوگئی تھوڑی دور چلی تھی کہ راستے میں سیٹھانی جی کی بہو سے ملاقات ہوگئی۔ اس کا نام رام کلی تھا۔

بے چاری دو برس سے رنڈاپا بھوگ رہی تھی اس کا سن بھی مشکل سے سولہ سترہ برس ہوگا۔ چہرہ مہرہ بھی بڑا نہ تھا۔ خط و خال نہایت دل فریب۔ اگر پورنا آم کی طرح زرد تھی تو اس کا چہرہ جوشِ جوانی سے گلابی ہو رہا تھا۔ بال میں تیل نہ تھا۔ نہ آنکھوں میں کاجل نہ مانگ میں سیندور۔ نہ دانتوں پر مسی۔ تاہم اس کی آنکھوں میں وہ شوخی تھی۔ چال میں وہ لچک اور ہونٹوں پر وہ تبسم جن سے اِن بناوٹی آرائشوں کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔ وہ مٹکتی۔ اِدھراُدھر تاکتی۔ مسکراتی چلی جا رہی تھی کہ پورنا کو دیکھتے ہی ٹھنک گئی اور بڑے انداز سے ہنس کر بولی۔ ’’آؤ بہن آؤ۔ تم تو ایسا چلتی ہو جانوں بتاشے پر پیر دھر رہی ہو۔‘‘

پورنا کو یہ جملہ ناگوار معلوم ہوا۔ مگر اس نے بڑے نرمی سے جواب دیا ’’کیا کروں بہن! مجھے تو اور تیز نہیں چلا جاتا۔‘‘

رام کلی۔ ’’سنتی ہوں کل ہماری ڈائن کئی چڑیلوں کے ساتھ تم کو جلانے گئی تھی۔ مجھے ستانے سے ابھی تک جی نہیں بھرا۔ کیا کہوں بہن! یہ سب ایسا دُکھ دیتی ہیں کہ جی چاہتا ہے زہر کھالوں۔ اور اگر یہی حال رہا تو ایک نہ ایک دن یہی ہونا ہے۔ نہیں معلوم ایشور کا کیا بگاڑا تھا کہ ایک دن بھی زندگی کا سکھ نہ بھوگنے پائی!

بھلا تم تو اپنے پتی کے ساتھ دو برس تک رہیں بھی۔ میں نے تو اس کا منہ بھی نہیں دیکھا۔ جب تمام عورتوں کو بناؤ سنگار کیے ہنسی خوشی چلتے پھرتے دیکھتی ہوں تو چھاتی پر سانپ سا لوٹنے لگتا ہے۔ بدھوا کیا ہوگئی گھر بھر کی لونڈی بنا دی گئی۔ جو کام کوئی نہ کرے وہ میں کروں۔ اس پر روز اُٹھتے جوتی بیٹھتے لات۔ کاجل مت لگاؤ۔ مسی مت لگاؤ۔ بال مت گوندھاؤ۔ رنگین ساڑیاں مت پہنو۔ پان مت کھاؤ۔ ایک روز ایک گلابی ساڑی پہن لی تھی تو وہ چڑیل مارنے اٹھی تھی۔ جی میں تو آیا کہ سر کے بال نوچ لوں مگر زہر کا گھونٹ پی کے رہ گئی۔ اور وہ تو وہ! اس کی بیٹیاں اور دوسری بہوئیں میری صورت سے نفرت رکھتی ہیں۔ صبح کو کوئی میرا منہ نہیں دیکھتا۔ ابھی پڑوس سے ایک شادی ہوئی تھی۔ سب کی سب گہنے سے لد لد گاتی بجاتی گئیں۔ ایک میں ہی ابھاگن گھر میں پڑی روتی رہی۔ بھلا بہن اب کہاں تک کوئی ضبط کرے۔ آخر ہم بھی تو آدمی ہیں۔ ہماری بھی تو جوانی ہے۔ دوسروں کی خوشی چہل پہل دیکھ دیکھ خوامخواہ دل میں حوصلے ہوتے ہیں۔ جب بھوک لگتی ہے اور کھانا نہیں ملتا تو چوری کرنا پڑتی ہے۔‘‘

یہ کہہ کر رام کلی نے پورنا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مُسکرا کر آہستہ آہستہ ایک گیت غُن غُنانے لگی۔ پورنا کو یہ بے تکلفیاں سخت ناگوار معلوم ہوتی تھیں مگر مجبور تھی۔

راستے میں ہزاروں ہی آدمی ملے۔ سب کی نظریں اِن دونوں عورتوں کی طرف پھرتی تھیں۔ فقرے چست کیے جاتے تھے۔ مگر پورنا سر کو اوپر اُٹھاتی ہی نہ تھی ہاں رام کلی مسکرا مسکرا کر معشوقانہ انداز سے اِدھراُدھر دیکھتی تھی ایک آدھ برجستہ جواب بھی دیتی۔ پورنا جب سڑک پر مردوں کو کھڑے دیکھتی تو بچا کے کترا کر نکل جاتی۔ مگر رام کلی کو ان کے بیچ میں گھُس کر نکلنے کی ضد تھی۔ نہیں معلوم کیوں اس کی چادر سر سے بار بار ڈھلک جاتی جس کو وہ ایک انداز سے اوڑھتی تھی۔
اسی طرح دریا کنارے پہنچی یہاں ہزاروں مرد عورتیں اور بچے نہا رہے تھے۔

رام کلی کو دیکھتے ہی ایک پنڈے نے کہا۔ ''اِدھر سیٹھانی جی اِدھر!''

پنڈا۔ (گھور کر) ''یہ کون ہیں؟''

رام کلی۔ (آنکھیں نیچا کر) ''کوئی ہوں گی۔ کیا تم کاجی ہو گیا؟''

پنڈا۔ ''جرا نام سُن کے کان کھس کرلیں۔''

رام کلی۔ ''یہ میری سکھی ہیں۔ اس کا نام پورنا ہے۔''

پنڈا۔ ''(ہنس کر) اہاہا! کیا اچھا نام ہے۔ ہیں بھی تو پورن چندرماں کی طرح۔ اچھا جوڑا ہے!''

پورنا بے چاری سخت جھینپیں۔ یہ مذاق اس کو نہایت ناگوار معلوم ہوا مگر رام کلی نے اپنے سر کے لٹ ایک ہاتھ سے پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے چھٹکا کر کہا۔

''خبردار ان سے دل لگی مت کرنا۔ یہ بابو امرت رائے سے پجواتی ہیں۔''

پنڈا۔ ''اوہوہو! کھوب گھر تاکا ہے۔ ہیں بھی تو چندرماں کی طرح۔ بابو امرت رائے بھی بڑے رسیا ہیں۔ کبھوں کبھوں یہاں چلے آتے ہیں وہ دیکھو جو نیا گھاٹ بن رہا ہے وہ بابو صاحب بنوائیے رہے ہیں۔ پھر ایسی منوہر صورتوں کا درسن ہم کو کیسے ملے گا۔''

پورنا دل میں سخت پشیماں تھی کہ کاہے کو اس کے ساتھ آئی۔ اب تک تو نہا دھو کے گھر پہنچی ہوتی رام کلی سے بولی۔ ''بہن! نہانا ہو تو نہاؤ۔ مجھ کو دیر ہوتی

ہے اور اگر تم ابھی دیر میں جاؤ تو میں اکیلے جاؤں۔"

پنڈا۔ "نہیں نہیں رانی ہم گریبوں پر اتنی کھپا (خفا) مت ہو۔ جاؤ سیٹھانی جی اِن کو نہلا لاؤ۔ سنتا ہوں آج کچہری بند ہے۔ بابو صاحب گھر پر ہوں گے۔"

پورنا نے چادر اُتار کر دھر دی اور ساڑی لے کر نہانے کے لیے اُترنا چاہتی تھی کہ یکایک سب پنڈے اُٹھ اُٹھ کر کھڑے ہونے لگے۔ اور ایک لمحہ میں بابو امرت رائے ایک سادہ کُرتہ پہنے۔ سادی ٹوپی سر پر رکھے چشمہ لگائے ہاتھ میں پیمائش کا فیتہ لیے چند ٹھیکہ داروں کے ساتھ ادھر آتے دکھائی دیے۔ ان کو دیکھتے ہی پورنا نے ایک لمبی گھونگھٹ نکال لی۔ اس نے چاہا کہ نیچے کے زینے پر اُتر جاؤں۔ مگر شرم و حیا نے اس کے پیروں کو وہیں باندھ دیا۔ بابو صاحب کو ان زینوں کی چوڑائی لمبائی ناپنا تھی۔ چنانچہ وہ پورنا سے دو قدم کے فاصلے پر کھڑے ہوکر نپوانے لگے اور پنسل سے کاغذ پر کچھ لکھنے لگے۔ لکھتے لکھتے آگے کو جو قدم بڑھایا تو پیر زینے کے نیچے جا پڑا۔ اور قریب تھا کہ وہ اوندھے منہ گریں اور اسی وقت اس قیمتی زندگی کا خاتمہ ہوجائے کہ پورنا نے جھپٹ کر ان کو سنبھال لیا۔ بابو صاحب نے چونک کر دیکھا تو داہنا ہاتھ ایک نازنین کے ہاتھ میں ہے۔ جب تک پورنا اپنا گھونگھٹ بڑھائے وہ اس کو پہچان گئے اور بولے "اخاہ! تم ہو پورنا۔ تم نے میری جان بچائی۔"

پورنا نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ بلکہ سر نیچا کیے ہوئے زینے سے نیچے اُتر گئی۔ جب تک بابو صاحب پیمائش کرواتے رہے وہ گنگا کی طرف رُخ کیے کھڑی رہی جب وہ چلے گئے تو رام کلی مُسکراتی ہوئی آئی اور بولی۔ "بہن آج تو تم نے بابو صاحب کو گرتے گرتے بچا لیا۔ آج سے تو وہ اور بھی تمھارے پیروں پر سر رکھیں گے۔"

پورنا۔ (کڑی نگاہوں سے دیکھ کر) "رام کلی! ایسی باتیں نہ کرو۔ مجھے ایسی فضول دل لگی بھلی نہیں معلوم ہوتی۔ آدمی آدمی کے کام آتا ہے۔ اگر میں نے ان کو بچا لیا تو اس میں کیا انوکھی بات ہوگئی۔"

رام کلی۔ "اے لو تم تو جامہ سے باہر ہوگئیں۔ بس اسی ذرا سی بات پر!"

پورنا۔ ''نہیں میں غصہ میں نہیں ہوں۔ مگر ایسی باتیں مجھ کو اچھی نہیں لگتیں۔ نہا کر چلو گی بھی یا آج سارا دن یہیں بِتاؤ گی۔''

رام کلی۔ ''جب تک اِدھر اُدھر جی بہلے اچھا ہے۔ گھر پر سوائے جلتے انگاروں کی اور کیا رکھا ہے۔''

کچھ دیر میں دونوں سکھیاں یہاں سے روانہ ہوئیں تو رام کلی نے کہا۔ ''کیوں بہن! پوجا کرنے نہ چلو گی؟''

پورنا۔ ''نہیں سکھی مجھے بہت دیر ہوجائے گی۔ اور نہ میں کبھی مندروں میں پوجا کرنے گئی ہوں۔''

رام کلی۔ ''آج تم کو چلنا پڑے گا۔ ذرا دیکھو تو کیسی بہار کی جگہ ہے۔ اگر دو چار دن جاؤ تو پھر بلا روز گئے طبیعت نہ مانے۔ یہی دو تین گھنٹہ جو اشنان پوجا میں کٹتا ہے میری خوشی کا وقت ہے۔ باقی دن رات سوائے گالیاں سُننے کے اور کوئی کام نہیں۔''

پورنا۔ ''تم جاؤ۔ میں نہ جاؤں گی۔ جی نہیں چاہتا۔''

رام کلی۔ ''چلو۔ چلو۔ نخرے نہ بگھارو۔ دم کی دم میں تو لوٹے آتے ہیں۔''

راستے میں ایک تمبولی کی دُکان پڑی۔ کاٹھ کے زینہ نما تختوں پر سفید کپڑے پانی سے بھیگا کر بچھائے ہوئے تھے۔ اس پر بنگلہ و دیسی و ماگھی پان بڑے صفائی سے چُنے ہوئے تھے۔ اور ایک چھوٹی سی چوکی پر خوشبویات کی شیشیاں اور مصالحوں کی ڈبیاں خوبی سے سجا کر دھری ہوئی تھیں۔ تمبولی ایک سجیلا جوان تھا۔سر پر دوپلی ٹوپی چن کر کج رکھی تھی۔ بدن میں آب رواں کا چنت پڑا ہوا کرتہ تھا۔ گلے میں سونے کی تعویذیں۔ آنکھوں میں سرمہ۔ پیشانی پر سُرخ ٹیکہ، ہونٹ پر پان کی لالی نمودار۔ ان دونوں عورتوں کو دیکھتے ہی بولا۔ ''سیٹھانی جی۔ سیٹھانی جی۔!! آؤ پان کھاتی جاؤ۔''

رام کلی نے چٹ سر سے چادر کھسکا دی اور پھر اس کو ایک انداز سے اُڑھ کر اور دل ربایانہ انداز سے ہنس کر کہا۔

''ابھی ٹھاکر جی کا پرشاد نہیں پایا ہے۔''

تمبولی۔ ''آؤ آؤ یہ بھی تو پرشاد سے کم نہیں ہے سنتوں کے ہاتھ کی چیج پرشاد سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ آج کل تو کئی دن سے تمہارے درشن ہی نہیں ہوئے۔ یہ تمہارے

ساتھ کون شکتی ہیں؟"

رام کلی۔ "(مٹک کر) یہ ہماری سکھی ہیں۔ بے ڈھب تاک رہے ہو کیا کچھ جی للچا رہا ہے۔"

تمبولی۔ "وہ تو ہماری طرف تاکتی ہی نہیں۔ ہاں بھائی۔ بڑے گھر کی ہیں نا۔ ہم جیسے تو تلوؤں سے سر رگڑتے ہوں گے۔"

یہ کہہ کر تمبولی نے بیڑے لگائے اور ایک پتے میں لپیٹ کر رام کلی کی طرف تکلف سے ہاتھ بڑھایا۔ جب اس نے لینے کے لیے اپنا ہاتھ پھیلایا تو تمبولی نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور ہنس کر بولا۔

"تمھاری سکھی لیں تو دیں۔"

رام کلی۔ "سکھی پان کھاؤ۔"

پورنا۔ "میں نہ کھاؤں گی۔"

رام کلی۔ "تمھاری کون سی ساس بیٹھی ہے جو کوسے گی۔ میری تو ساس منع کرتی ہے اس پر بھی ہر روز پان کھاتی ہوں۔"

پورنا۔ "تمھاری عادت ہوگی۔ میں پان نہیں کھاتی۔"

رام کلی۔ "آج میری خاطر سے کھاؤ! تمھیں ہمارے سر کی قسم لو۔"

ناچار پورنا نے گلوریاں لیں اور شرماتے ہوئے کھائیں۔ اب ذرا دھوپ تکلیف دہ معلوم ہونے لگی تھی۔ اس نے رام کلی سے کہا۔"کدھر ہے تمھارا مندر! وہاں تک چلتے چلتے تو شاید شام ہوجائے گی۔"

رام کلی۔ "جتنی دیر یہاں ہو ہونے دو۔ گھر پر کیا دھرا ہے۔"

پورنا خاموش ہوگئی۔ اس کو بابو امرت رائے کے پیر پھسلنے کا خیال آگیا ہائے! جو کہیں وہ آج گر پڑتے تو دشمنوں کے جان پر بن جاتی۔ بڑی خیریت ہوگئی۔ میں بڑے موقع سے آگئی تھی۔ آج دیر میں آنا سپھل ہوگیا۔ انھیں خیالوں میں محو تھی کہ دفعتاً رام کلی نے کہا۔

"لو سکھی آگیا مندر۔"

پورنا نے چونک کر داہنے جانب دیکھا تو ایک نہایت عالی شان سنگین عمارت ہے دروازہ سطحِ زمین سے بہت اونچا ہے اور وہاں تک جانے کے لیے دس بارہ زینے

بنے ہوئے ہیں۔ رام کلی پورنا کو اس عمارت میں لے گئی۔ اندر جاکر کیا دیکھتی ہے کہ ایک پختہ وسیع صحن ہے جس میں سیکڑوں مرد اور عورت جمع ہیں۔ داہنے جانب ایک بارہ دری ہے جو تمام تکلفات سے آراستہ و پیراستہ نظر آتی ہے۔ اس بارہ دری میں ایک نہایت وجیہ و شکیل شخص زر و ریشم کی مرزائی پہنے۔ سر پر خوبصورت گلابی رنگ کی پگڑی باندھے۔ مسند پر تکیہ لگائے بیٹھا ہے۔ پیچوان لگا ہوا ہے۔ اس کے رو برو سازندے بیٹھے سُر ملا رہے ہیں اور ایک مہہ پارہ نازنین پشواز پہنے بصد ناز و انداز جلوہ افروز ہے سیکڑوں آدمی اِدھر اُدھر بیٹھے ہیں۔ اور سیکڑوں کھڑے ہیں۔
پورنا نے انداز کی یہ کیفیت دیکھی تو چونک کر بولی۔
"کیوں یہ تو ناچ گھر سا معلوم ہوتا ہے۔ تم کہیں بھول تو نہیں گئیں۔"

رام کلی۔ (مسکراکر) "چپ ایسا بھی کوئی کہتا ہے۔ یہی تو دیبی جی کا مندر ہے۔ وہ مہنت جی بیٹھے ہیں۔ دیکھتی ہو کیسا سجیلا جوان ہے۔ آج سومبار ہے۔ ہر سومبار کو یہاں کنچنیوں کا ناچ ہوتا ہے۔"

اسی اثنا میں ایک بلند قامت شخص آتا دکھائی دیا۔ کوئی چھ فٹ کا قد تھا۔ اور نہایت لحیم اور شحیم۔ بالوں میں کنگھی کی ہوئی تھی۔ منہ پان سے بھرے۔ ماتھے پر بھبوت رمائے۔ گلے میں بڑے بڑے دانوں کا رودراکچھ مالا پہنے۔ شانوں پر ایک ریشمی دوپٹہ رکھے۔ بڑی بڑی اور سرخ آنکھوں سے اِدھراُدھر تاکتا اِن دونوں عورتوں کے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔
رام کلی نے اس کی طرف ایک انداز سے دیکھ کر کہا۔
کیوں بابا اندردت؟ کچھ پرشاد ورشاد نہیں بنایا؟

بابا اندردت نے فرمایا۔"تمھارے کھاتر سب ہاجر ہے۔ پہلے چل کر ناچ تو دیکھو۔ یہ کنچی کاسمیر سے بلائی گئی ہے۔ مہنت جی بے ڈھب ریجھے ہیں۔ ایک ہجار روپیے اِنام دے چکے ہیں۔"

رام کلی نے یہ سُنتے ہی پورنا کا ہاتھ پکڑا اور بارہ دری کی طرف چلی۔ بے چاری پورنا جانا نہ چاہتی تھی مگر وہاں سب کے سامنے انکار کرتے بھی نہ بن پڑتا تھا۔ جاکر ایک کنارے کھڑی ہوگئی۔ بے شمار عورتیں جمع تھیں ایک سے ایک

حسین گہنے سے گوندنی کی طرح لدی ہوئی۔ بے شمار مرد تھے ایک سے ایک خوش رو۔ اعلیٰ درجہ کی پوشاکیں پہنے ہوئے۔ سب کے سب ایک ہی جگہ ملے جلے کھڑے تھے۔ آپس میں نظر بازیاں ہو رہی تھیں۔ نظربازیاں ہی نہیں۔ بلکہ دست درازیاں بھی ہوتی جاتی تھیں۔ مسکرا مسکرا کر راز و نیاز کی باتیں کی جارہی تھیں۔ عورتیں مردوں میں۔ مرد عورتوں میں۔ یہ میل جول۔ خلط ملط پورنا کو کچھ تعجب خیز معلوم ہوا۔ اس کی ہمت اندر گھسنے کی نہ پڑی۔ ایک کونے میں باہر ہی دبک گئی۔ مگر رام کلی اندر گھس گئی۔ اور وہاں کوئی آدھ گھنٹہ تک اس نے خوب گلچھرّے اُڑائے۔ جب وہ نکلی ہے تو پسینے میں غرق تھی۔ تمام کپڑے مسل گئے تھے۔

پورنا نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ "کیوں بہن؟ پوجا سے فارغ ہو گئیں۔ اب بھی گھر چلوگی یا نہیں؟"

رام کلی۔ (ہنس کر) "ارے! تم باہر ہی کھڑی تھیں کیا۔ ذرا اندر چل کر دیکھو کیا بہار ہے۔ ایشور جانے کنچنی گاتی کیا ہے دل مسوس لیتی ہے۔ اب آج اس کی چاندی ہے ہزاروں روپے لے جائے گی۔"

پورنا۔ "درشن بھی کیا یا گانا ہی سنتی رہیں۔"

رام کلی۔ "درشن کرنے آتی ہے میری بلا۔ یہاں تو ذرا دل بہلنے سے کام ہے تمھارے ساتھ نہ ہوتی تو کہیں گھنٹوں میں گھر جاتی بابا اندردت نے ایسا لذیذ پرشاد بنایا ہے کہ کیا بتاؤں۔"

پورنا۔ "کیا ہے؟ چرنامرت؟"

رام کلی۔ (ہنس کر) "چرنامرت کا باوا ہے۔ بھنگ۔"

پورنا۔ "اے ہے۔ تم نے بھنگ پی لی۔"

رام کلی۔ "یہی تو پرشاد ہے دیبی جی کا۔ اس کے پینے میں کیا ہرج ہے۔ سبھی پیتے ہیں۔ دیوی جی کو شراب بھی چڑھتی ہے۔ کہو تو تم کو پلواؤں۔"

پورنا۔ "نہیں بہن مجھے معاف رکھو۔"

ادھر یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ دس پندرہ آدمی بارہ دری سے آکر اِن دونوں عورتوں کے اِردگرد کھڑے ہوگئے۔

ایک۔ "(پورنا کی طرف گھور کر) ارے یارو! یہ تو کوئی نیا سروپ ہے۔"
دوسرا۔ "ذرا بچ کر چلو بچ کر۔"

اتنے میں کسی نے پورنا کے شانے کو آہستہ سے دھکا دیا۔ وہ بے چاری سخت عذاب میں مبتلا ہے۔ جدھر دیکھتی ہے آدمی ہی آدمی نظر آتے ہیں۔ کوئی۔ ادھر سے قہقہہ لگاتا ہے کوئی اُدھر سے آوازے کستا ہے۔ رام کلی ہنس رہی ہے مذاقوں کا برجستہ جواب دیتی ہے۔ کبھی چادرہ کو کھسکاتی ہے۔ کبھی دوپٹہ کو سنبھالتی ہے۔ ایک آدمی نے اس سے پوچھا۔

"سیٹھانی جی۔ یہ کون ہیں؟"

رام کلی۔ "یہ ہماری سکھی ہیں۔ ذرا درشن کرانے لوا لائی تھی۔"
دوسرا۔ "نہیں ضرور لایا کرو۔ اوہو! کیا روپ ہے!"

بارے خدا خدا کر کے اِن آدمیوں سے نجات ملی۔ پورنا بے تحاشا بھاگی۔ رام کلی بھی اس کے ساتھ ہوئی۔ گھر پر آکر پورنا نے عہد کیا کہ اب کبھی مندر نہ جاؤں گی۔

آٹھواں باب

دیکھو تو دل فریبیٔ انداز نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی .کیا گل کتر گئی

بے چاری پورنا نے کان پکڑے کہ اب مندر کبھی نہ جاؤں گی۔ ایسے مندروں پر اندر کا بجر بھی نہیں گرتا۔ اس دن سے وہ سارے دن گھر ہی پر بیٹھی رہی وقت کاٹنا پہاڑ ہو جاتا۔ نہ کسی کے یہاں آنا نہ جانا۔ نہ کسی سے ربط ضبط نہ کوئی کام نہ دھندھا۔ دن کٹے تو کیوں کر! پڑھی لکھی تو ضرور مگر پڑھے کیا؟ دو چار قصے کہانیوں کی کتابیں پنڈت جی کے زمانے کی پڑی ہوئی تھیں مگر ان میں اب جی نہیں لگتا تھا۔ بازار جانے والا کوئی نہ تھا جس سے کتابیں منگواتی۔ خود جاتے ہوئے اس کی روح فنا ہوتی تھی۔ بلّو اس کام کی نہ تھی۔ اور سودا سلف تو وہ بازار سے لاتی مگر غریب کتابوں کا مول کیا جانے۔ دو ایک بار جی میں آیا کہ کوئی کتاب پریما کے گھر سے منگواؤں مگر پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو رہی۔ گل بوٹے بنانے اس کو آتے ہی نہ تھے۔ کپڑے سینا جانتی تھی مگر سیئے کیا۔ یہ روز کی بے شغلی اس کو بہت کھلتی تھی۔ اور ہر دم اس کو متفکر و مغموم رکھتی تھی۔ زندگی کا چشمہ خموشی کے ساتھ بہتا چلا جاتا تھا۔ ہاں کبھی کبھی پنڈائن و چوبائن مع اپنے چیلے چاپڑوں کے آکر کچھ سکھاون کی باتیں سُنا جاتی تھیں۔ اب ان کو پورنا سے کوئی شکایت باقی نہ رہ گئی تھی۔ بجز اس کے کہ بابو امرت رائے کیوں آیا کرتے ہیں۔ پورنا نے بھی کُھلم کُھلا کہہ دیا تھا کہ میں ان کو آنے سے روک نہیں سکتی اور نہ کوئی ایسا برتاؤ کرسکتی ہوں جس سے ان کو معلوم ہو کہ میرا آنا اس کو ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ پورنا کو اب اِن ملاقاتوں میں مزہ آنے لگا تھا۔ ہفتہ بھر کسی ہمدرد کی صورت نظر نہ آتی۔ کسی سے ہنس کر بولنے کو جی ترس جاتا۔ پس جب اتوار آتا تو صبح ہی سے امرت رائے کے خیرمقدم کی تیاریاں ہونے لگتیں۔ بلّو بڑی تن دہی سے سارا مکان صاف کرتی۔ دروازہ کے مقابل کا صحن بھی صاف کیا جاتا۔

کمرے۔ کرسیاں۔ تصویریں بہت قرینہ سے آراستہ کی جاتیں۔ ہفتہ بھر کا جما ہوا گرد و غبار دور کیا جاتا۔ پورنا خود بھی معمول سے اچھے اور صاف کپڑے پہنتی۔ ہاں سر میں تیل ڈالنے یا آئینہ کنگھی کرتے ہوئے وہ ڈرتی تھی۔ جب بابو امرت رائے آجاتے تو نہیں معلوم کیوں پورنا کا مدھم چہرہ کندن کی طرح دمکنے لگتا۔ اس کی پیاری صورت اور زیادہ معلوم ہونے لگتی، جب تک بابو صاحب بیٹھے رہتے وہ اسی کوشش میں رہتی کہ کیا بات کروں جس میں یہ یہاں سے خوش خوش جاویں۔ وہ ان کی خاطر سے ہنستی بولتی۔ بابوصاحب ایسے ہنس مکھ تھے کہ روتے کو بھی ایک بار ضرور ہنسا دیتے۔ یہاں وہ خوب بلبل کی طرح چہکتے۔ کوئی ایسی بات نہ کرتے جس سے پورنا کے دل میں رنج و ملال کا شائبہ بھی پیدا ہو۔ جب ان کے چلنے کا وقت آتا تو پورنا کی خاطر سے کچھ دیر اور بیٹھتے اسی طرح کبھی کبھی گھنٹوں بیت جاتے۔ جب چراغ میں بتی پڑنے کا وقت آجاتا تو بابو صاحب چلے جاتے اور پورنا کچھ دیر تک اِدھر اُدھر بوکھلائی ہوئی گھومتی۔ جو جو باتیں ہوئی ہوتیں ان کو پھر سے دُہراتی۔ یہ وقت اس کو ایک دل خوش کن خواب سا معلوم ہوتا۔

اسی طرح کئی مہینے گزر گئے۔ اور آخرش جو بات بابو امرت رائے کے دل میں تھی وہ قریب قریب پوری ہوگئی۔ یعنی پورنا کو اب معلوم ہونے لگا کہ میرے دل میں ان کی محبت سماتی جاتی ہے۔ اب بے چاری پورنا۔ پہلے سے بھی زیادہ اُداس رہنے لگی۔ ہائے! او دل خانہ خراب! کیا ایک بار محبت کرنے سے تیرا جی نہیں بھرا جو تو نے نئی کلفت مول لی۔ وہ بہت کوشش کرتی کہ امرت رائے کا خیال دل میں نہ آنے پائے۔ مگر کچھ بس نہ چلتا۔

اپنے دل کی حالت کے اندازہ کرنے کا اس کو یوں موقع ملا ایک روز بابو امرت رائے وقت معینہ پر نہیں آئے۔ تھوڑی دیر تک تو ضبط کیے ان کی راہ دیکھتی رہی مگر جب وہ اب بھی نہ آئے تب تو اس کا دل کچھ مسوسنے لگا۔ بڑی بے صبری سے دوڑی ہوئی دروازے پر آئی اور کامل آدھ گھنٹہ تک کان لگائے کھڑی رہی۔ قلب پر کچھ وہی کیفیت طاری ہونے لگی جو پنڈت جی کے دورے پر جانے کے وقت ہوا کرتی۔ شبہہ ہوا کہ کہیں دشمنوں کی طبیعت ناساز تو نہیں ہوگئی۔ آنکھوں میں آنسو بھرا ہے۔ مہری سے کہا۔ بلّو ذرا جاؤ دیکھو تو بابو صاحب کی طبیعت کیسی ہے۔ نہیں معلوم کیوں میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔ بلّو کو بھی بابو صاحب کے برتاؤ نے گرویدہ بنا لیا تھا۔ اور پورنا کو تو وہ اپنی لڑکی سمجھتی تھی۔ اس

کو معلوم ہوتا جاتا تھا کہ پورنا ان سے محبت کرنے لگی ہے مگر اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس محبت کا نتیجہ کیا ہوگا۔ یہی سوچتے بچارتے وہ بابو صاحب کے دولت خانہ پر پہنچی۔ معلوم ہوا کہ وہ آج دو تین خدمت گاروں کو ساتھ لے کر بازار گئے ہوئے ہیں۔ ابھی تک نہیں آئے۔ پُرانا بوڑھا کہار جو باوجود بابو صاحب کے متواتر تقاضوں کے آدھی ٹانگ کی دھوتی باندھتا تھا بولا۔ "بٹیا بڑا خراب جمانا آوا ہے۔ ہجار کا سودا ہوئے تو دوی ہجار کا سودا ہوئے تو ہم ہی لیاوت رہن۔ آج کھود آپ گئے ہن۔ بھلا اتنے بڑے آدمی کا اس چاہت رہا۔ باکی پھر اب انگریجی جمانا آوا ہے۔ انگریجی پڑھ پڑھ کے جون نہ ہوئے جائے تون اچرج ناہین ہے۔"

بلّو یہاں سے خوش خوش بوڑھے کہار کے سر ہلانے پر ہنستی ہوئی گھر کو واپس ہوئی۔ اُدھر جب سے وہ آئی تھی پورنا کی عجیب کیفیت ہورہی تھی کسی پہلو چین ہی نہ آتا تھا اُسے معلوم ہوتا تھا کہ بلّو کے واپسی میں بھی دیر ہو رہی ہے۔ اسی اثنا میں جوتوں کی آواز سُنائی دی وہ دوڑ کر دروازے پر آئی اور بابو صاحب کو ٹہلتے ہوئے پایا تو گویا اس کو کوئی نعمت مل گئی۔ جھٹ پٹ اندر سے دروازہ کھول دیا۔ کرسی قرینے سے رکھ دی اور اندرونی دروازے پر سر نیچا کرکے کھڑی ہوگئی۔ بابو صاحب لبادہ پہنے ہوئے تھے ایک کرسی پر لبادہ رکھا اور بولے۔

"بلّو کہیں گئی ہے کیا۔"

پورنا۔ (لجاتے ہوئے) جی ہاں آپ ہی کے ہاں تو گئی ہے۔

امرت رائے۔ "میرے یہاں کب گئی۔ کیوں کوئی ضرورت تھی۔"

پورنا۔ "آپ کے آنے میں بہت دیر ہوئی تو میں نے سمجھا شاید دشمنوں کی طبیعت کچھ ناساز ہوگئی ہو اس کو بھیجا کہ جاکر دیکھ آ۔"

امرت رائے۔ "(پیار کی نگاہوں سے دیکھ کر) مجھے سخت افسوس ہوا کہ میرے دیر کرنے سے تم کو تکلیف اُٹھانا پڑی اب پھر ایسی خطا نہ ہوگی۔ میں ذرا بازار چلا گیا تھا۔"

یہ کہہ کر انھوں نے ایک بار زور سے پُکارا۔ سُکھئی اندر آؤ۔

اور ایک لمحے میں دو آدمی کمرے میں داخل ہوئے۔ ایک کے ہاتھ میں ایک خوبصورت لوہے کا صندوق تھا اور دوسرے کے ہاتھ میں تہہ کیے ہوئے کپڑے تھے،

سب سامان تخت پر دھر دیا گیا۔ بابو صاحب نے فرمایا۔

"پورنا مجھے امید ہے کہ تم یہ سب چیزیں قبول کروگی چند روزانہ ضروریات کی چیزیں ہیں (ہنس کر) یہ دیر میں آنے کا جرمانہ ہے۔"

پورنا ان لوگوں میں نہ تھی۔ جو کسی چیز کو لینا تو چاہتے ہیں مگر وضع کی پابندی کے لحاظ سے دو چار بار نہیں نہیں کرنا فرض سمجھتے ہیں۔ ہاں اس نے اتنا کہا۔ "بابو صاحب میں آپ کا اس عنایت کے لیے شکریہ ادا کرتی ہوں مگر میرے پاس تو جو کچھ آپ کی فیاضی کے بدولت ہے وہی ضرورت سے زیادہ ہے میں اتنی چیزیں لے کر کیا کروں گی۔"

امرت رائے۔ "جو تمھارا جی چاہے سو کرو تم نے قبول کرلیا اور میری محنت ٹھکانے لگی۔"

اسی اثنا میں بلّو پہنچی اور کمرے میں بابو صاحب کو دیکھتے ہی نہال ہوگئی۔ جب تخت پر نگاہ پہنچی اور ان چیزوں کو دیکھا تو بولی۔"کیا اس کے لیے آپ بجار گئے تھے۔ کیا نوکر چاکر نہیں تھے۔ بوڑھا کہار رو رہا تھا کہ میری دستوری ماری گئی۔"

امرت رائے۔ (ہنس کر دبی زبان سے) وہ سب کہار میرے نوکر ہیں میرے لیے بازار سے چیزیں لاتے ہیں۔ تمھارے سرکار کا میں نوکر ہوں بلّو یہ سن کر مسکراتے ہوئی اندر چلی گئی مگر پورنا نے کہا۔

"بجا فرماتے ہیں میں تو خود آپ کے لونڈیوں کی لونڈی ہوں۔"

اس کے بعد چند اور باتیں ہوئیں۔ ماگھ پوس کا زمانہ تھا سردی سخت پڑ رہی تھی۔ بابو امرت رائے زیادہ دیر تک نہ بیٹھ سکے اور آٹھ بجتے بجتے دولت خانے کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کے جاتے ہی پورنا نے فرطِ اشتیاق سے لوہے کا صندوق کھولا تو دنگ رہ گئی۔ اس میں زنانے سنگار کی تمام چیزیں موجود تھیں اور جو چیز بھی اعلیٰ درجے کی خوش نما۔ آئینہ۔ کنگھی۔ خوشبودار تیلوں کی شیشیاں۔ موباف۔ ہاتھوں کے کنگن۔ اور گلے کا ہار۔ جڑاؤ نگینے دار چوڑیاں۔ ایک نہایت نفیس پان دان۔ روح پرور عطریات سے بھری ہوئی ایک چھوٹی سی صندوقچی لکھنے پڑھنے کے سامان۔ چند قصہ کہانی کی کتابیں۔ علاوہ ان کے چند اور تکلفات کی چیزیں قرینے سے سجا کر دھری ہوئی تھیں۔ کپڑے کھولے تو۔ اچھی سی اچھی ساڑیاں نظر آئیں شربتی

گلناری۔ دھانی گلابی ان پر ریشمی گل بوٹے بنے ہوئے۔ چادریں خوش نما باریک۔ خوش وضع۔ بلّو ان کو دیکھ دیکھ جامے میں پھولی نہ سماتی تھی بولی۔

"بہو یہ سب چیزیں جب تم پہنوگی تو رانی ہو جاؤ گی۔ رانی۔"

پورنا۔ "(گری ہوئی آواز سے) کچھ بھنگ کھا گئی ہو کیا بلّو۔ میں یہ چیزیں پہنوں گی تو جیتی بچوں گی۔ چوبائن و سیٹھائن طعنے دے کر مار ڈالیں گی۔"

بلّو۔ "تانے کیا دیں گی کوئی دل لگی ہے۔ ان کے باپ کا اس میں کیا اجارا۔ کوئی ان سے کچھ مانگنے جاتا ہے۔"

پورنا نے بلّو کو حیرت اور استعجاب کے نگاہوں سے دیکھا۔ یہی بلّو ہے جو ابھی دو گھنٹے پہلے چوبائن اور پنڈائن کی ہم خیال تھی۔ مجھ کو پہنے اُڑھنے سے بار بار منع کیا کرتی تھی۔ یکایک یہ کیا کایا پلٹ ہوگئی۔ بولی۔"مگر ۔زمانے کے نیک و بد کا بھی تو خیال ہوتا ہے۔"

بلّو۔ "میں یہ تھوڑے کہتی ہوں کہ ہر دم یہ چیزیں پہنا کرو۔ بلکہ جب بابو صاحب آئیں۔"

پورنا۔ "(شرما کر) یہ سنگار کر کے مجھ سے ان کے سامنے کیوں کر آیا جائے گا تمھیں یاد ہے ایک بار پریما نے میرے بال گوندھ دیے تھے جس کو آج مہینوں بیت گئے۔ اس دن وہ میری طرف ایسا تاکتے تھے کہ بے اختیار دل قابو سے باہر ہوا جاتا تھا۔ مجھ سے پھر ایسی بھول نہ ہوگی۔"

بلّو۔ "نہیں بہو ان کی مرجی یہی ہے تو کیا کروگی۔ انھیں چیجوں کے لیے وہ بجار گئے تھے۔ سیکڑوں نوکر چاکر ہیں۔ مگر ان چیجوں کو کھود جاکر لائے۔ تم ان کو نہ پہنوگی تو وہ کیا کہیں گے۔"

پورنا۔ "پورنا (چشم پُر آب ہوکر) بلّو بابو امرت رائے نہیں معلوم کیا کرنے والے ہیں۔ کچھ تمھیں بتلاؤں میں کیا کروں۔ وہ مجھ سے دن دن زیادہ محبت جتاتے جاتے ہیں اور میں اپنے دل کو کیا کہوں تم سے کہتے شرم آتی ہے وہ بھی کچھ بے بس ہوا جاتا ہے۔ محلے والے الگ بدنام کر رہے ہیں۔ نہیں معلوم ایشور کو کیا کرنا منظور ہے۔"

بلّو۔ "بہو بابو صاحب کا مزاج ہی ایسا ہے کہ دوسروں کو لبھا لیتا ہے۔ اس میں تمھارا کیا قصور ہے۔ اس گفتگو کے بعد پورنا تو سونے چلی گئی اور بلّو نے تمام چیزیں اُٹھا کر

قرینہ سے رکھیں۔ صبح اُٹھ کر پورنا نے وہ کتابیں پڑھنا شروع کیں جو بابو صاحب لائے تھے اور جوں جوں وہ پڑھتی اس کو معلوم ہوتا کہ کوئی میرا ہی قصہ کہہ رہا ہے۔ جب وہ ایک صفحہ پڑھ لیتی، تو ایک محویت کے عالم میں گھنٹوں دیوار کی طرف تاکتی اور روتی۔ اس کو بہت سی باتیں اپنی حالت سے ملتی ہوئی نظر آتیں ان قصوں میں جو جی لگا تو اِدھر اُدھر کے تفکر خیز خیالات دور ہوگئے اور وہ ہفتہ اس نے پڑھنے میں کاٹا پھر آخر اِتوار کا دن آیا۔ صبح ہوتے ہی بلّو نے ہنس کر کہا۔ "آج بابو صاحب کے آنے کا دن ہے۔ آج جرور سے جرور تم کو گہنے پہننے پڑیں گے۔"

پورنا۔ "(دبی ہوئی آواز سے) آج تو میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔"

بلّو۔ "نوج۔ تمھارے بیری کا سر درد نہ کرے جو تم کو دیکھ نہ سکے اس بہانے سے پیچھا نہ چھوٹے گا۔"

پورنا۔ "اور جو کسی نے مجھے طعنہ دیا تو تم جاننا۔"

بلّو۔ "جانے بھی دو بہو کیسی بات منہ سے نکالتی ہو۔ کون ہے کہنے والا۔"

صبح ہی سے بلّو نے پورنا کا بناؤ سنگار شروع کیا۔ مہینوں سے سر نہ ملا گیا تھا۔ آج خوشبودار مصالح سے ملا گیا۔ تیل ڈالا گیا۔ کنگھی کی گئی۔ ریشمی موباف لگا کر بال گوندھے گئے اور جب سہ پہر کو پورنا نے گلابی کرتی پہن کر اُس پر ریشمی کام کی شربتی ساڑی پہنی۔ ہاتھوں میں چوڑیاں اور کنگن سجائے تو وہ بالکل حور معلوم ہونے لگی۔ کبھی اس نے ایسے بیش قیمت اور پُر تکلف کپڑے نہ پہنے تھے۔ اور نہ وہ کبھی ایسی سوگھڑ معلوم ہوئی تھی۔ اور کچھ افسوس بھی کرتی تھی۔ جب شام کا وقت آیا تو پورنا کچھ اُداس معلوم ہونے لگی تاہم اس کی آنکھیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ پانچ بجتے بجتے معمول سے سویرے بابو امرت رائے تشریف لائے۔ بلّو سے خیر و عافیت پوچھی اور کرسی پر بیٹھ کے کسی کے دیدار کے اشتیاق میں اندرونی دروازے کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگے۔ مگر پورنا وہاں نہ تھی کوئی دس منٹ تک تو بابو صاحب نے خموشی سے انتظار کیا بعد ازاں بلّو سے پوچھا۔

"کیوں مہرن آج تمھاری سرکار کہاں ہیں۔"

بلّو۔ "(مسکرا کر) گھر ہی میں تو ہیں۔"

امرت رائے۔ ''تو آئیں کیوں نہیں۔ آج کچھ ناراض ہیں کیا؟''
بلو۔ ''(ہنس کر) ان کا من جانے۔''
امرت رائے۔ ''ذرا جاکر لوا لاؤ۔ اگر ناراض ہوں تو چل کر مناؤں۔''

یہ سن کر بلو ہنستی ہوئی اندر گئی اور پورنا سے بولی۔ بہو اُٹھوگی یا وہ آپ ہی منانے آتے ہیں۔ پورنا نے اب کوئی چارہ نہ دیکھا۔ وہ اُٹھی اور شرم سے سر جھکائے اور گھونگھٹ نکالے بدن کو چُراتی لجاتی۔ بل کھاتی ایک ہاتھ میں گلوری دان لیے دروازے پر آکر کھڑی ہوگئی۔ امرت رائے نے متحیر ہوکر دیکھا۔ آنکھیں چوندھیا گئیں ایک لمحے تک تو محویت کا عالم طاری رہا۔ بعد ازاں مسکرا کر بولے چشم بد دور۔

پورنا۔ ''(لجاتی ہوئی) مزاج تو آپ کا اچھا ہے۔''
امرت رائے۔ ''(ترچھی نگاہوں سے دیکھ کر) اب تک تو اچھا تھا مگر اب خیریت نہیں نظر آتی۔''

پورنا سمجھ گئی۔ امرت رائے کے سنجیدہ مذاق کا مزہ لیتے لیتے وہ کچھ حاضر جواب ہوگئی ہے بولی۔''اپنے کیے کا کیا علاج۔''
امرت رائے۔ ''کیا جان سے کسی کو خواہ مخواہ کی دشمنی ہے۔''

پورنا نے شرما کے منہ پھیر لیا بابو امرت رائے ہنسنے لگے اور پورنا کی طرف پیار کے نگاہوں سے دیکھا۔ اس کی حاضر جوابی ان کو بہت بھائی۔ کچھ دیر تک اور ایسے ہی لطف آمیز باتوں کا مزہ لیتے رہے۔ پورنا کا بھی خیال نہ تھا کہ میری یہ بے تکلفی اور بذلہ سنجی میرے لیے موزوں نہیں ہے۔ اس کو اس وقت نہ پنڈائن کا خوف تھا نہ پڑوسوں کا ڈر باتوں ہی باتوں میں اس نے مسکرا کر امرت رائے سے پوچھا۔''آپ کو آج کل پریما کی کچھ خبر ملی ہے۔''
امرت رائے۔ ''نہیں پورنا۔ مجھے ادھر ان کی کچھ خبر نہیں تھی۔ ہاں اتنا البتہ جانتا ہوں کہ بابو دان ناتھ سے قرابت کی بات چیت ہو رہی ہے۔''
پورنا۔ ''سخت افسوس ہے کہ ان کی قسمت میں آپ کی بیوی بننا نہیں لکھا ہے۔ مگر ان کا جوڑ ہے تو آپ ہی سے۔ ہاں آپ سے بھی تو کہیں بات چیت ہو رہی تھی۔ فرمایے

وہ کون خوش نصیب ہیں وہ دن جلد آتا کہ میں آپ کی معشوقہ سے ملتی۔''

امرت رائے۔ ''(پُرحسرت لہجے میں) دیکھیں کب تک قسمت یاوری کرتی ہے۔ میں نے اپنی کوشش میں تو کچھ اُٹھا نہیں رکھا۔''

پورنا۔ ''تو کیا اُدھر ہی سے کھچاؤ ہے۔ تعجب ہے۔''

امرت رائے۔ ''نہیں پورنا میں ذرا بدقسمت ہوں۔ ابھی تک کوئی کوشش کارگر نہیں ہوئی مگر سب کچھ تمھارے ہی ہاتھوں میں ہے اگر تم چاہو تو میرے سر کامیابی کا سہرا بہت جلد بندھ سکتا ہے۔ میں نے پہلے کہا تھا اور اب بھی کہتا ہوں کہ تمھارے ہی رضامندی پر میرے کامیابی کا دارو مدار ہے۔''

پورنا۔ ''حیرت سے امرت رائے کی طرف دیکھنے لگی۔ اس نے اب کی بار بھی ان کا مطلب صاف صاف نہ سمجھا۔ ''بولی میرے طرف سے آپ خاطر جمع رکھیے مجھ سے جہاں تک ہوسکے گا اُٹھا نہ رکھوں گی۔''

امرت رائے۔ ''ان الفاظ کو یاد رکھنا پورنا۔ ایسا نہ ہو بھول جاؤ۔ نہیں تو مجھ بے چارے کے سب ارمان خاک میں مل جائیں۔ یہ کہہ کر بابو امرت رائے اُٹھے اور چلتے وقت پورنا کی طرف دیکھا۔ بے چاری پورنا کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں گویا التجا کر رہی ہیں کہ ذرا دیر اور بیٹھیے مگر امرت رائے کو کوئی ضروری کام تھا انھوں نے اس کا ہاتھ آہستہ سے لے لیا اور ڈرتے ڈرتے اس کو چوم کر بولے۔''پیاری پورنا اگلی باتوں کو یاد رکھنا۔'' یہ کہا اور دم کے دم غائب ہوگئے پورنا کھڑی روتی رہ گئی اور ایک دم میں ایسا معلوم ہوا کہ کوئی دل خوش کن خواب تھا جو آنکھ کھلتے ہی غائب ہوگیا۔

نواں باب

تم سچ مچ جادوگر ہو

بابو امرت رائے کے چلے جانے کے بعد کچھ دیر تک بد حواسی کے عالم میں کھڑی رہی۔ بعد ازاں اِن خیالات کے جُھرمٹ نے اس کو بے قابو کر دیا۔

آخر وہ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ میں تو ان سے کہہ چکی کہ میں آپ کی کامیابی کی کوشش میں کوئی بات اٹھا نہ رکھوں گی۔ پھر یہ مجھ سے کیوں اس قدر محبت جتاتے ہیں؟ کیوں خواہ مخواہ مجھ کو گنہگار کرتے ہیں۔ میں ان کی اس موہنی مورت کو دیکھ کر بے بس ہوجاتی ہوں۔ ہائے آج انھوں نے چلتے وقت مجھ کو پیاری پورنا کہا تھا۔ اور میرے ہاتھوں کے بوسے لیے تھے۔ نارائن! وہ مجھ سے کیا چاہتے ہیں افسوس! اس محبت کا نتیجہ کیا ہوگا۔ یہی خیال کرتے کرتے اس نے نتیجہ جو سوچا تو مارے شرم کے چہرہ چھپا لیا اور خود بخود بولی۔

"نہ! نہ! مجھ سے ایسا نہ ہوگا۔ اگر ان کا یہ برتاؤ میرے ساتھ بڑھتا گیا تو میرے لیے سوائے جان دینے کے اور کوئی علاج نہیں ہے۔ میں ضرور زہر کھالوں گی۔"

انھیں خیالات میں غلطاں تھی کہ نیند آگئی۔ سویرا ہوا۔ ابھی نہانے جانے کی تیاری کر رہی تھی کہ بابو امرت رائے کے آدمی نے آکر بلّو کو باہر سے زور سے پکارا اور اس کو اک سربہ مہر لفافہ مع ایک چھوٹے سے بکس کے دے کر اپنی راہ لگا۔ بلّو تعجب کرتی ہوئی اندر آئی اور پورنا کو وہ صندوقچہ دکھا کر خط پڑھنے کو دیا۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے خط کو کھولا تو یہ لکھا تھا۔

"پیاری پورنا۔ جس دن سے میں نے تم کو پہلے پہل دیکھا ہے اُسی دن سے تمھارا شیدائی ہو رہا ہوں۔ اور یہ محبت اب انتہا تک پہنچ گئی ہے۔ میں نے نہیں معلوم کیسے اس آگ کو اب تک چھپایا ہے۔ پر اب یہ سنگاپا نہیں سہا جاتا۔ میں تم کو سچے دل سے پیار کرتا ہوں اور اب میری تم سے التجا ہے کہ مجھ کو اپنی غلامی میں قبول کرو۔ میں کوئی ناجائز ارادہ

نہیں رکھتا۔ نارائن! ہرگز نہیں۔ میں تم سے باقاعدہ طور پر شادی کیا چاہتا ہوں۔ ایسی شادی تم کو بیشک انوکھی معلوم ہوگی۔ مگر میری بات کا یقین مانو کہ اب اس دیس میں ایسی شادیاں کہیں کہیں ہونے لگی ہیں۔ اس خط کے ساتھ میں تمھارے لیے ایک جڑاو کنگن بھیجتا ہوں۔ شام کو میں تمھارے درشن کو آؤں گا۔ اگر کنگن تمھاری کلائیوں پر نظر آیا تو سمجھ جاؤں گا کہ میری درخواست قبول ہوگئی۔ ورنہ دوسرے دن شاید امرت رائے پھر تم سے ملاقات کرنے کے لیے زندہ نہ رہے۔"

تمھارا شیدائی امرت رائے

پورنا نے اس خط کو غور سے پڑھا۔ اس کو اس سے ذرا بھی تعجب نہیں ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی کی منتظر تھی۔ اس نے ٹھان لیا تھا کہ جس دن بابو صاحب مجھ سے کھلم کھلا تعشق جتائیں گے اور کوئی ناجائز تجویز پیش کریں گے اسی دن میں ان سے بالکل قطع کرلوں گی۔ ان کی تمام چیزیں ان کے حوالے کردوں گی اور پھر جیسے بیتے گا بیتاؤں گی۔ مگر اس خط کو پڑھ کر اس کو اپنے ارادے میں کچھ کمزوری معلوم ہونے لگی۔ کیونکہ اس کو خواب میں بھی خیال نہ تھا کہ بابو صاحب باقاعدہ شادی کریں گے اور نہ اس کا وہم بھی تھا کہ بیواؤں کی شادیاں ہوتی ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ بات تھی کہ برہمن اور چھتری میں تعلق کیا میں برہمنی۔ وہ چھتری پس میرا ان کا کیا علاقہ۔ کچھ نہیں ان کی چالاکی ہے وہ مجھے اپنے گھر رکھا چاہتے ہیں۔ مگر یہ مجھ سے نہ ہوگا میرے دل میں ان کی محبت ضرور ہے۔ مجھے آج تک ایسی محبت کسی اور کی نہیں معلوم ہوئی مگر مجھ سے محبت کے خاطر اتنا بڑا پاپ نہ اُٹھایا جائے گا۔ میری خوشی تو اسی میں ہے کہ اُن کو نظر بھر کے دیکھا کروں اور اُن کی صحت کی خوش خبری پایا کروں مگر ہائے اس خط کے آخری جملے غضب کے ہیں۔ کہیں میرے انکار سے اُن کے دشمنوں کا بال بھی بیکا ہوا تو میں بے موت مر جاؤں گی۔ یا ایشور! میں کیا کروں۔ میری تو کچھ عقل کام نہیں کرتی۔

بلّو پورنا کے چہرے کا چڑھاؤ اور اُتار بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ جب وہ خط کو پڑھ چکی تو اُس نے پوچھا۔ "کیوں بہو کیا لکھا ہے۔"

پورنا۔ "(سنجیدہ آواز سے) کیا بتاؤں کیا لکھا ہے۔"

بلّو۔ "کیوں کھیریت تو ہے۔ کوئی بُری سناونی تو نہیں ہے۔"

پورنا۔ "ہاں بلّو اس سے زیادہ بُری سناونی ہو ہی نہیں سکتی۔ بابو امرت رائے کہتے ہیں کہ مجھ سے ....۔"

اُس سے اور کچھ نہ کہا گیا۔ بلّو سمجھ گئی مگر وہیں تک پہنچی جہاں تک اُس کی عقل نے مدد دی۔ وہ امرت رائے کی بڑھتی ہوئی محبت کو دیکھ دیکھ کر دل میں سمجھ گئی تھی کہ وہ ایک نہ ایک دن پورنا کو اپنے گھر ضرور ڈالیں گے۔ پورنا اُن کی محبت کرتی ہے اُن پر جان دیتی ہے۔ وہ پہلے بہت پس و پیش کرے گی مگر آخر مان جائے گی۔ اُس نے سیکڑوں رئیسوں کو دیکھا تھا کہ نائنوں۔ کہارنوں کو گھر ڈال لیا کرتے ہیں غالبًا اس حالت میں بھی ایسا ہوگا۔ اس میں اس کو کوئی بات انوکھی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ اس کو یقین تھا کہ بابو صاحب پورنا سے سچی محبت کرتے ہیں۔ مگر بے چارے سوائے اس کے اور کر ہی کیا سکتے ہیں کہ اس کو گھر ڈال لیں۔ چنانچہ جب اُس نے پورنا کو یوں باتیں کرتے دیکھا تو تاڑ گئی کہ آج آزمائش کا موقع ہے وہ جانتی تھی کہ اگر پورنا راضی ہوئی تو اس کی بقیہ زندگی بڑے آرام سے کٹے گی۔ بابو صاحب بھی نہال ہوجائیں گے اور میں بوڑھی بھی اُن کی بدولت آرام کروں گی۔ مگر کہیں اُس نے انکار کیا تو دونوں کی زندگی تلخ ہوجائے گی۔ یہ باتیں سوچ کر اُس نے پورنا سے پوچھا۔ "تم کیا جواب دوگی۔"

پورنا۔ "جواب! اس کا جواب سوائے انکار کے اور ہو ہی کیا سکتا ہے۔ بھلا بدھواؤں کی شادی کہیں ہوئی ہے اور وہ بھی برہمنی کی چھتری سے۔ میں نے اس قسم کے چند قصے اُن کتابوں میں پڑھے تھے جو بابو امرت رائے مجھے دے گئے ہیں مگر وہ قصے ہیں تم نے کبھی ایسا ہوتے بھی دیکھا ہے۔ بلّو سمجھی تھی کہ بابو امرت رائے اُس کو گھر ڈالنے کی کوشش میں ہیں۔ شادی کا تذکرہ سنا تو حیرت میں آگئی بولی۔ "بھلا ایسا کہیں بھیا ہے۔ بال سپید ہوگئے مگر ایسا بیاہ نہیں دیکھا۔"

پورنا۔ بلّو یہ شادی بیاہ سب بہانے بازی ہے اُن کا مطلب میں سمجھ گئی مجھ سے ایسا نہ ہوگا۔ میں زہر کھالوں گی۔"

بلّو۔ "بہو ایسی باتیں زبان سے مت نکالو وہ بے چارے بھی تو اپنے دل سے لاچار ہیں۔ کیا کریں۔"

پورنا۔ ''ہاں بلّو اُن کو نہیں معلوم کیوں مجھ سے کچھ محبت ہوگئی ہے۔ اور میرے دل کا حال تو تم سے چھپا نہیں مگر کاش وہ میری جان مانگتے تو میں ابھی دے دیتی۔ ایشور جانتا ہے۔ میں اُن کے ذرا سے اشارے پر اپنے کو نچھاور کرسکتی ہوں۔ مگر وہ جو چاہتے ہیں وہ مجھ سے نہیں ہونے کا۔ اُس کا خیال کرتے ہی میرا کلیجہ کانپنے لگتا ہے۔''

بلّو۔ ''ہاں بھلے مانسوں میں تو ایسا نہیں ہوتا۔ کمینوں میں ڈولا آتا ہے۔ مگر بہو سچ تو یہ ہے اگر تم انکار کروگی تو اُن کا دل ٹوٹ جائے گا۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں وہ جان پر نہ کھیل جائیں۔ اور یہ تو میں کہہ سکتی ہوں کہ اُن سے بچھڑنے کے بعد تم سے ایک دم بے روئے نہ رہا جائے گا۔ چاہے تم کو بُرا لگے یا بھلا۔''

پورنا۔ ''یہ سب تو تم سچ کہتی ہو۔ آخر میں کیا کروں۔ وہ مجھ سے جھوٹ سچ شادی کرلیں گے۔ شادی کیا کریں گے شادی کا نام کریں گے۔ مگر زمانہ کیا کہے گا لوگ ابھی سے بدنام کر رہے ہیں۔ تب تو نہیں معلوم کیا ہوجائے گا۔ سب سے بڑھ کر یہی ہے کہ جان دے دوں۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ اُن کو دو چار دن تک افسوس ہوگا آخر بھول جائیں گے۔ میری تو عزت بچ جائے گی۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسی شادیاں کہیں کہیں ہوتی ہیں۔ جانے کہاں ہوتی ہیں۔ یہاں تو ہوتی نہیں۔ یہاں کی بات یہاں ہے۔ زمانے کی بات زمانے میں ہے۔''

بلّو۔ ''ذرا اس صندوقچی کو تو کھولو دیکھو اس میں کیا ہے۔''

پورنا خط پڑھ کر ایسی پریشان ہو رہی تھی کہ ابھی تک صندوقچی کو چھوا بھی نہ تھا اب جو اس کو کھولا تو اندر سبز مخمل میں لپٹا ہوا ایک قیمتی کنگن پایا۔

بلّو۔ ''اوہو اس پر تو جڑوا کام کیا ہوا ہے۔''

پورنا۔ ''اُنھوں نے اس خط میں لکھا ہے کہ میں شام کو آؤں گا اور اگر تم کو یہ کنگن پہنے دیکھوں گا تو سمجھ جاؤں گا کہ میری بات منظور ہے۔ نہیں تو دوسرے دن دشمن زندہ نہ رہیں گے۔''

بلّو۔ ''کیا آج ہی شام کو آئیں گے۔''

پورنا۔ ''ہاں آج ہی شام کو تو آئیں گے۔ اب تمھیں بتلاؤ کیا کروں۔ کس سے جاکر علاج پوچھوں۔ یہ کہہ کر پورنا نے دونوں ہاتھوں سے اپنی پیشانی ٹھونکی اور خاموش بیٹھ کر

سوچنے لگی۔ نہانے کون جاتا ہے۔ کھانے پینے کی کس کو سدھ ہے دوپہر تک بیٹھی سوچا کی۔ مگر دماغ نے کوئی قطعی فیصلہ نہ کیا۔ ہاں جوں جوں شام کا وقت قریب آتا تھا تو اس کا دل دھڑدھڑ کرتا تھا کہ اُن کے سامنے کیسے جاؤں گی۔ اگر وہ کلائیوں پر کنگن نہ دیکھیں گے تو کیا کریں گے کہیں جان پر نہ کھیل جائیں مگر طبیعت کا قاعدہ ہے کہ جب کوئی بات حد سے زیادہ محو کرنے والی ہوتی ہے تو اُس پر تھوڑی دیر تک غور کرنے کے بعد دماغ بالکل بیکار ہوجاتا ہے۔ پورنا سے اب سوچا بھی نہ جاتا تھا۔ وہ پیشانی پر ہاتھ دیے بیٹھی دل دار کی طرف تاک رہی تھی۔ بلّو بھی خاموش من مارے بیٹھی ہوئی تھی۔ تین بجے ہوں گے کہ یکایک بابو امرت رائے کی مانوس آواز دروازے پر 'بلّو بلّو' کہتے ہوئے سنائی دی بلّو باہر دوڑی اور پورنا اپنے کمرے میں گھس گئی اور دروازہ بھیڑ لیا اور اُس وقت اُس کا دل بھر آیا اور وہ زار قطار رونے لگی۔ اِدھر بابو امرت رائے از حد بے چین تھے۔ بلّو کو دیکھتے ہی اُن کی مشتاق نگاہیں بڑی تیزی سے اُس کے چہرے کی طرف اُٹھیں مگر اُس پر اپنی کامیابی کی کوئی باامید جھلک نہ پاکر زمین کی طرف گڑ گئیں۔ دبی ہوئی آواز میں بولے۔ "بلّو تمھاری اُداسی دیکھ کر میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔ کیا مجھے کوئی خوش خبری نہ سناؤگی۔ بلّو نے حسرت سے آنکھیں نیچی کرلیں اور امرت رائے نے آبدیدہ ہوکر کہا مجھے تو اِس کا خوف پہلے ہی سے تھا قسمت کو کوئی کیا کرے۔ مگر ذرا تم اُن سے میری ملاقات کرا دیتیں مجھے امید ہے کہ وہ مجھ پر اپنی عنایت ضرور کریں گی میں اُن کو آخری بار دیکھ لیتا یہ کہتے کہتے امرت رائے کی آواز بے اختیار کانپنے لگی۔ بلّو نے اُن کو روتے دیکھا تو گھر میں دوڑی گئی اور بولی "بہو بہو بے چارے کھڑے رو رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مجھ سے ایک دم کے لیے مل جائیں۔"

پورنا۔ "نہیں بلّو میں اُن کے سامنے نہ جاؤں گی۔ ہائے رام! کیا وہ بہت رو رہے ہیں۔"

بلّو۔ "کیا بتاؤں بے چاروں کی دونوں آنکھیں لال ہیں۔ رومال بھیگ گیا ہے۔ کہا ہے کہ ہم کو آخری بار اپنی صورت دِکھا جائیں۔"

ہائے یہ وقت بے چاری کمزور دل والی پورنا کے لیے نہایت نازک تھا۔ اگر کنگن پہن کر امرت رائے کے سامنے جاتی تو زندگی کے سارے ارمان پورے ہوتے

ہیں ساری امیدیں بر آتی ہیں۔ اگر بلا کنگن پہنے جاتی ہے تو ان کے ارمانوں کا خون کرتی اور اپنی زندگی کو تلخ۔ اُس حالت میں بدنامی ہے اور رسوائی۔ اس حالت میں حسرت ہے اور ناکامی۔ اُس کا دل دبدھے میں ہے۔ آخر بدنامی کا خیال غالب آیا وہ گھونگھٹ نکال کر نشست گاہ کی طرف چلی۔ بلّو نے دیکھا کہ اس کے کلائیوں پر کنگن نہیں ہے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور چاہا کہ کنگن پہنا دے مگر پورنا نے ہاتھ کو جھٹکا دے کر چھڑا لیا اور دم کی دم میں وہ باہر والے کمرے کے اندرونی دروازے پر آکر کھڑی ہوگئی۔ اُس نے امرت رائے کی طرف دیکھا آنکھیں لال تھیں اُنھوں نے اس کی طرف دیکھا چہرہ سے حیرت برس رہی تھی۔ دونوں نگاہیں ملیں۔ امرت رائے بے اختیارانہ جوش سے اُس کی طرف بڑھے اور اُس کا ہاتھ لے کر کہا "پورنا ایشور کے لیے مجھ پر رحم کرو۔ان کی منہ سے کچھ اور نہ نکلا آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی پورنا کی خود داری آج تک کبھی ایسے امتحان میں نہ پڑی تھی۔ اس نے روتے روتے اپنا سر امرت رائے کے کندھے پر رکھ دیا۔ کچھ کہنا چاہا مگر آواز نہ نکلی۔ ہائے! خود داری کا باندھ ٹوٹ گیا اور وہ تمام جوش جو رُکا ہوا تھا اُبل پڑا۔ امرت رائے غضب کے نبض شناس تھے سمجھ گئے کہ اب میرا موقع ہے۔ اُنھوں نے آنکھوں کے اشارے سے بلّو سے کنگن منگوایا۔ پورنا کو آہستہ سے کرسی پر بیٹھا دیا۔ وہ ذرا بھی نہ جھجکی۔ اُس کے ہاتھوں میں کنگن پہنایا پورنا نے ذرا بھی ہاتھ نہ کھینچا۔ تب امرت رائے نے جرأت کرکے اُس کے ہاتھوں کو چوم لیا اور ان کی آنکھیں مارے خوشی کے جگمگانے لگیں۔ روتی ہوئی پورنا نے محبت بھری نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھا اور بولی "پیارے امرت رائے تم سچ مچ جادوگر ہو۔"

دسواں باب

شادی ہوگئی

تجربہ کی بات ہے کہ بسا اوقات بے بنیاد خبریں دور دور تک مشہور ہوجایا کرتی ہیں۔ تو بھلا جس بات کی کوئی اصلیت ہو اس کو زبان زد ہر خاص و عام ہونے سے کون روک سکتا ہے۔ چاروں طرف مشہور ہو رہا تھا کہ بابو امرت رائے اُس برہمنی کے گھر آیا جایا کرتے ہیں۔ سارے شہر کے لوگ حلف اُٹھانے کو تیار رہتے کہ دونوں میں ناجائز تعلق ہے۔ کچھ عرصے سے چوبائن و پنڈائن نے بھی پورنا کے شوق و سنگار پر حاشیہ چڑھانا چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ وہ اب اُن کی دانست میں اُن قیود کی وہ پابند نہ تھی جن کا ہر ایک بیوہ کو پابند ہونا چاہیے۔ جو لوگ تعلیم یافتہ تھے اور ہندستان کے دیگر صوبجات کی بھی کچھ خبر رکھتے تھے وہ ان قصوں کو سُن سُن کر خیال کرتے تھے کہ شاید اس کا نتیجہ نقلی شادی ہوگی۔ ہزاروں بااثر اشخاص گھات میں تھے کہ اگر یہ حضرت رات کو پورنا کے مکان کی طرف جانے لگیں تو زندہ واپس نہ جائیں۔ اگر کوئی ابھی تک امرت رائے کی نیت کی صفائی پر اعتبار کرتا تھا تو وہ پریما تھی۔ وہ بے چاری وفادار لڑکی غم پر غم اور دُکھ پر دُکھ سہتی تھی۔ مگر امرت رائے کی محبت اس پر صادق تھی۔ اُس کی آس ابھی تک بندھی ہوئی تھی۔ اس کے دل میں کوئی بیٹھا ہوا کہتا تھا کہ تمھاری شادی ضرور امرت رائے سے ہوگی۔ اسی امید پر وہ جیتی تھی۔ اور جتنی چیزیں امرت رائے کی نسبت مشہور ہوئی تھیں اُن پر وہ کچھ یوں ہی سا یقین لاتی تھی۔ ہاں اکثر اس کو یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ وہ پورنا کے گھر بار بار کیوں آتے ہیں۔ اور شاید دیکھتے دیکھتے اور اپنی بھاوج و سارے گھر کی باتیں سنتے سنتے وہ امرت رائے کی بے وفا و بداخلاق سمجھنے لگی ہے مگر ابھی تک اُن کی محبت اُس کے دل میں بجنسہ موجود تھی۔ وہ اُن لوگوں میں تھی جو ایک بار دل کا سودا چکا لیتے ہیں تو پھر افسوس نہیں کرتے۔

آج بابو امرت رائے مشکل سے بنگلہ پر پہنچے ہوں گے کہ اُن کی شادی کی خبر ایک کان سے دوسرے کان پھیلنے لگی اور شام ہوتے ہوتے سارے شہر میں یہی خبر گونج رہی تھی۔ جو شخص پہلے سنتا تو اعتبار نہ کرتا۔ اور جب اُس کو اس خبر کی صحت کا یقین ہو جاتا تو امرت رائے کو صلواتیں سناتا۔ رات تو کسی طرح کٹی۔ صبح ہوتے ہی منشی بدری پرشاد صاحب کے دولت خانے پر شہر کے شرفا و علماء، اُمراء و غرباء مع کئی ہزار برہمنوں اور شہدوں کے جمع ہوئے اور تجویز ہونے لگی کہ کیوں کر یہ شادی روکی جائے۔

پنڈت بھرگودت۔ "بدھوا بواہ برجت ہے۔ کوئی ہم سے شاسترارتھ کرلے۔ کئی آوازوں نے مل کر ہانک لگائی۔"ہاں ہاں ضرور شاستراتھ ہو۔" اب اِدھر اُدھر سے سیکڑوں پنڈت ودیارتھی بغلوں میں پوتھیاں دبائے سر گھٹائے۔ انگوچھیا کاندھے پر رکھے۔ منہ میں تمباکو بھرے ایک جا جمع ہوگئے اور آپس میں جھک جھک ہونے لگی کہ ضرور شاستراتھ ہو۔ یہ اشلوک پوچھا جائے اور اس کے جواب کا یوں جواب دیا جائے۔ اگر جواب میں ویاکرن کی ایک غلطی بھی نکلے تو پھر فتح ہمارے ہاتھ ہے۔ بہت سے کٹھ مُلّے گنوار بھی اسی جماعت میں شریک ہوکر شاستراتھ چلا رہے تھے۔ بدری پرشاد صاحب جہاندیدہ آدمی تھے۔ جب ان آدمیوں کو شاستراتھ پر آمادہ دیکھا تو فرمایا۔"کس سے شاستراتھ کیا جائے گا۔مان لو۔ وہ شاستراتھ نہ کریں تب۔"

سیٹھ دھونی مل۔ "بلا شاستراتھ کے بیاہ کرلیں گے۔ (دھوتی سنبھال کر) تھانہ میں رپٹ کردوں گا۔"

ٹھاکر زور آور سنگھ۔ "(موچھوں پر تاؤ دے کر) کوئی ٹھٹھا ہے بیاہ کرنا۔ سر کاٹ لوں گا۔ خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔"

راؤ صاحب۔ "بارات کی بارات کاٹ ڈالی جائے گی۔

اس وقت سیکڑوں آوارہ شہدے یہاں آڈٹے اور آگ میں ایندھن لگانا شروع کیا۔

ایک۔ "جرور سے جرور سر کاٹ ڈالوں گا۔"

دوسرا۔ "گھر میں آگ لگا دیں گے۔ بارات کی بارات جل بھن جائے گی۔"

تیسرا۔ "پہلے اُس عورت کا گلا گھونٹ دیں گے۔"

اِدھر تو یہ ہڑبونگ مچا ہوا تھا۔ خاص نشست گاہ میں وکلاء بیٹھے ہوئے شادی کے نا جائز ہونے پر قانونی بحث کر رہے تھے۔ بڑی سرگرمی سے ضخیم جلدوں کی ورق گردانی ہو رہی تھی۔ سالہا سال کی پرانی نظریں پڑھی جا رہی تھیں تاکہ کوئی قانونی گرفت ہاتھ آجائے۔ کئی گھنٹہ تک یہاں چہل پہل رہا آخر خوب سر کھپانے کے بعد یہ رائے ہوئی کی پہلے ٹھاکر زور آور سنگھ امرت رائے کو دھمکا دیں۔ اگر وہ اس پر بھی نہ مانیں تو جس دن بارات نکلے سر بازار مار پیٹ ہو۔ یہ رزولیوشن پاس کرنے کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

بابو امرت رائے شادی کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ ٹھاکر زور آور سنگھ کا شقہ پہنچا۔ لکھا تھا۔

"بابو امرت رائے کو ٹھاکر زور آور سنگھ کا سلام بندگی بہت بہت طرح سے پہنچے۔ آگے ہم نے سنا ہے کہ آپ کسی بدھوا براہمنی سے بیاہ کرنے والے ہیں۔ ہم آپ سے کہے دیتے ہیں کہ بھول کر بھی ایسا نہ کیجیے گا۔ ورنہ آپ جانیں اور آپ کا کام۔"

زور آور سنگھ علاوہ ایک متمول اور باثر آدمی ہونے کے شہر کے لٹھیتوں اور شہدوں کا سردار تھا۔ اور بارہا بڑے بڑوں کو نیچا دِکھا چکا تھا۔ اُس کی دھمکی ایسی نہ تھی جس کا امرت رائے پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ اس رقعہ کو پڑھتے ہی اُن کے چہرہ کا رنگ فق ہوگیا۔ سوچنے لگے کہ اُس کو کس حکمت سے پھیروں کہ ایک دوسرا شقہ پھر پہنچا۔ یہ گمنام تھا اور مضمون بھی پہلے ہی رقعہ سے ملتا جلتا تھا۔ اُس کے بعد شام ہوتے ہوتے ہزاروں ہی گمنام پُرزے آئے۔ کوئی کہتا تھا اگر پھر بیاہ کا نام لیا تو گھر میں آگ لگا دیں گے۔ کوئی سر کاٹنے کو دھمکاتا ہے۔ کوئی پیٹ میں تیغہ بھونکنے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ اور کوئی موچھ کے بال اُکھاڑنے کے لیے چٹکیاں گرم کر رہا تھا۔ امرت رائے یہ تو جانتے تھے کہ شہر والے مخالفت ضرور کریں گے۔ مگر اس قسم کی مخالفت کا اُن کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ ان دھمکیوں نے اُنھیں واقعی خوف زدہ کر دیا اور اپنے سے زیادہ اندیشہ اُن کو پورنا کی بارے میں تھا کہ کہیں ظالم اُس بے چاری کو کوئی اذیت نہ پہنچا دیں۔ چنانچہ وہ اُسی وقت کپڑے پہن، بائیسکل پر سوار ہو چٹ پٹ مجسٹریٹ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور اُن سے تمام و کمال

واقعہ بیان کیا۔ انگریزوں میں ان کا اچھا رسوخ تھا۔ نہ اس لیے کہ وہ خوشامدی تھے بلکہ اس لیے کہ وہ روشن خیال اور صاف گو تھے۔ مجسٹریٹ صاحب اُن کے ساتھ بڑے اخلاق سے پیش آئے۔ ان سے ہمدردی جتائی اور اسی وقت سپرنٹنڈنٹ پولیس کو تحریر کیا کہ آپ بابو امرت رائے کی محافظت کے لیے پولیس کا ایک گارد روانہ کر دیں۔ اور تا وقتیکہ شادی نہ ہوجائے خبر لیتے رہیں۔ تاکہ مارپیٹ اور خون خرابہ نہ ہوجائے۔ شام ہوتے ہوتے تیس مسلح سپاہیوں کی ایک جماعت اُن کی مدد کے لیے آگئی جن میں سے پانچ مضبوط اور جسیم جوانوں کو انھوں نے پورنا کے مکان کی حفاظت کے لیے روانہ کردیا۔

شہر والوں نے جب امرت رائے کی پیش بندیاں دیکھیں تو نہایت برافروختہ ہوئے اور منشی بدری پرشاد صاحب نے مع کئی بزرگواروں کے مجسٹریٹ کی خدمت میں حاضر ہوکر فریاد مچائی کہ اگر سرکار دولت مدام نے اس شادی کے روکنے کا کوئی بندوبست نہ کیا تو بلوہ ہوجانے کا اندیشہ ہے۔ مگر مجسٹریٹ نے صاف صاف کہہ دیا کہ سرکار کو کسی شخص کے فعل میں دست اندازی کرنا منظور نہیں ہے۔ تا وقتیکہ عوام کو اس فعل سے کوئی نقصان نہ پہنچے۔ یہ ٹکا سا جواب پاکر منشی جی سخت محجوب ہوئے۔ وہاں سے جل بھُن کر مکان پر آئے اور اپنے مشیروں کے ساتھ بیٹھ کر قطعی فیصلہ یہ کیا کہ جس وقت بارات چلے۔ اسی وقت پچاس آدمی اُس پر ٹوٹ پڑیں۔ پولیس والوں کی بھی خبر لیں اور امرت رائے کی ہڈی پسلی بھی توڑ کے دھر دیں۔

بابو امرت رائے کے لیے واقعی یہ نازک وقت تھا۔ مگر وہ قوم کا دلدادہ بڑے استقلال اور جانفشانی سے تیاریوں میں مصروف تھا۔ شادی کی تاریخ آج سے ایک ہفتہ پر مقرر کی گئی۔ کیونکہ زیادہ تاخیر کرنا خطرہ سے خالی تھا۔ اور یہ ہفتہ بابو صاحب نے ایسی پریشانی میں کاٹا جس کا صرف خیال کیا جاسکتا ہے۔ علی الصباح دو دو کانسٹبلوں کے ساتھ پستولوں کی جوڑی لگائے روز ایک بار پورنا کے مکان پر آتے۔ پورنا بے چاری مارے ڈر کے مری جاتی تھی۔ وہ اپنے کو بار بار کوستی کہ میں نے کیوں ان کو امید دلا کر یہ زحمت مول لی۔ اگر ظالموں نے کہیں ان کے دشمنوں کو کوئی گزند پہنچایا تو اُس کا کفارہ میری ہی گردن پر ہوگا۔ گو اُس کی محافظت کے لیے کانسٹبل مامور تھے۔ مگر وہ رات بھر جاگا کرتی۔ پتہ بھی کھڑکتا تو وہ چونک کر اُٹھ بیٹھتی۔ جب بابو صاحب صبح کو آکر اُس کو تسکین دیتے تب ذرا

اُس کے جان میں جان آتی۔

امرت رائے نے خطوط تو اِدھراُدھر روانہ کرہی دیے تھے شادی کی تاریخ کے چار دن پہلے سے شرفا آنے شروع ہوئے۔ کوئی بمبئی سے آتا تھا کوئی مدراس کوئی پنجاب کوئی بنگال سے۔ بنارس میں ریفارم سے انتہا درجے کا اختلاف تھا اور سارے ہندوستان کے ریفامروں کے جی سے لگی ہوئی تھی کہ چاہے جو ہو بنارس میں ریفارم کی روشنی پھیلانے کا ایسا نادر موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا چاہیے۔ وہ اتنی دور کی منزل طے کرکے اسی لیے آئے تھے کہ شادی کو کامیابی کے ساتھ انجام تک پہنچائیں۔ وہ جانتے تھے کہ اگر اس شہر میں یہ شادی ہوگئی۔ تو پھر اس صوبے کے دوسرے شہروں کے ریفارمروں کے لیے بڑی آسانی ہو جائے گی۔ امرت رائے مہمانوں کی آؤ بھگت میں مشغول تھے اور ان کے پُرجوش پیرو جن کی تعداد کالج کے دس بارہ طلبا پر محدود تھی۔ صاف ستھرا پوشاکیں پہنے اسٹیشن پر جاکر مہمانوں کی تقدیم کرتے اور ان کے تواضع و تکریم میں بڑی سرگرمی دکھاتے تھے۔ شادی کے دن تک یہاں کوئی ڈیڑھ سو شرفاء مجتمع ہوگئے۔ اگر کوئی شخص ہندوستان کی روشنی حب الوطنی و جوشِ قومی کو یکجا دیکھنا چاہتا ہو تو اس وقت بابو امرت رائے کے مکان پر دیکھ سکتا تھا۔ بنارس کے پُرانے خیال والے اصحاب ان تیاریوں اور مہمانوں کی کثرت کو دیکھ دیکھ کر دل میں حیران ہوتے تھے۔ منشی بدری پرشاد صاحب اور ان کے ہم خیال آدمیوں میں کئی بار مشورے ہوئے اور ہر بار یہی قطعی فیصلہ ہوا کہ چاہے جو ہو مگر مار پیٹ ضرور کی جائے۔ چنانچہ سارا شہر آمادۂ جنگ و کارزار تھا۔

شادی کے قبل شام کو بابو امرت رائے اپنے پُرجوش پیروؤں کو لے کر پورنا کے مکان پر پہنچے اور وہاں ان کو باراتیوں کی خاطر و تواضع کرنے کے لیے مامور کیا۔ بعد ازاں پورنا کے پاس گئے وہ اِن کو دیکھتے ہی آبدیدہ ہوگئی۔

امرت رائے (گلے سے لگا کر) "پیاری پورنا ڈرو مت، ایشور چاہے گا تو دشمن ہمارا بال بھی بیکا نہ کرسکیں گے۔ ہم کوئی گناہ نہیں کر رہے ہیں۔ کل جو بارات تمھارے دروازے پر آئے گی ویسی بارات آج تک اس شہر میں کسی کے دروازہ پر نہ آئی ہوگی۔"

پورنا۔ مگر میں کیا کروں مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کل ضرور مار پیٹ ہوگی۔ میں چاروں

طرف یہ خبر سن رہی ہوں اس وقت بھی منشی بدری پرشاد کے یہاں لوگ جمع ہیں۔

امرت رائے۔ "پیاری تم باتوں کا ذرا بھی اندیشہ نہ کرو منشی جی کے یہاں تو ایسے مشورے مہینوں سے ہو رہے ہیں اور ہمیشہ ہوا کریں گے۔ اس کا کیا خوف ہے۔ تم دل کو مضبوط رکھو بس یہ رات اور درمیان ہے کل پیاری پورنا میرے غریب خانے پر ہوگی۔ ہائے! میرے لیے کیسا خوشی کا وقت ہوگا۔"

پورنا یہ سن کر واقعی اپنے خوف کو بھول گئی۔ اس نے امرت رائے کو پیار کی نگاہوں سے دیکھا اور جب بابو صاحب چلنے لگے تو ان کے گلے سے لپٹ گئی اور بولی "پیارے امرت رائے۔ تم کو میری قسم ان ظالموں سے بچتے رہنا افواہوں کو سُن سُن کے میری روح فنا ہوئی جاتی ہے۔" امرت رائے نے اُسے سینے سے لگا لیا اور تشفی و دلاسا دے کر اپنے مکان کو روانہ ہوئے۔ شام کے وقت پورنا کے مکان پر کئی پنڈت جن کی شکل سے شرافت برس رہی تھی۔ ریشمی مرزائیاں پہنے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالے آئے اور وید کی ریت سے رسومات ادا کرنے لگے۔ پورنا دُلہن کی طرح سجائی گئی۔ بھیتر باہر گیس کی روشنی سے منور ہورہا تھا۔ کانسٹبل دروازے پر ٹہل رہے تھے۔ وہ نئے خون اور نئی روشنی کے طلباء جن کو امرت رائے یہاں پر تعینات کر گئے تھے تیاریوں میں مصروف تھے۔ دروازے کا صحن صاف کیا جا رہا تھا۔ فرش بچھایا جارہا تھا کرسیاں آرہی تھیں۔ ساری رات انھیں تیاریوں میں کٹی اور علی الصباح بارات امرت رائے کے گھر سے روانہ ہوئی۔

ما شاء اللہ کیا مہذب بارات تھی اور کیسے مہذب باراتی نہ باجوں کا دھڑدھڑ پڑپڑ نہ بِگلوں کی دھوں دھوں پوں پوں نہ پالکیوں کا جھرمٹ۔ نہ سجے ہوئے گھوڑے کی چلپوں۔ نہ مست ہاتھیوں کا ریل پیل۔ نہ وردی پوش عصا برداروں کی قطار۔ نہ گل نہ گلدستے۔ بلکہ سفید پوشوں کی ایک جماعت تھی جو آہستہ آہستہ چہل قدمی کرتے اپنی سنجیدہ رفتار سے اپنی مستقل مزاجی کا ثبوت دیتی ہوئی چلی جارہی تھی۔ ہاں ایجاد یہ تھی کہ دو رویہ جنگی پولیس کے آدمی وردیاں ڈالے سوٹے لیے کھڑے تھے۔ سڑک کے اِدھر اُدھر جابجا جھنڈ کی جھنڈ آدمی لاٹھیاں لیے جمع نظر آتے تھے اور بارات کی طرف دیکھ دیکھ کر دانت پیستے مگر پولیس کا وہ رعب تھا کہ کسی کو قدم ہلانے کی جرأت نہ پڑتی۔ باراتیوں سے پچاس قدم کے فاصلے

پر رزرو پولیس کے سوار ہتھیاروں سے لیس گھوڑوں پر ران پڑی جمائے، بھالے چمکاتے اور گھوڑوں کو اُچھالتے چلے جاتے تھے۔ تاہم ہر لمحہ یہ اندیشہ تھا کہ کہیں پولیس کے خوف کا یہ طلسم ٹوٹ نہ جائے۔ باراتیوں کے چہرے سے بھی کامل اطمینان نہیں ظاہر ہوتا تھا اور بابو امرت رائے جو اس وقت نہایت خوبصورت وضع کی نوشیروانی پہنے ہوئے تھے چونک چونک کر اِدھر اُدھر دیکھتے تھے۔ ذرا بھی کھٹ پٹ ہوتی تو سب کے کان کھڑے ہوتے۔ ایک مرتبہ ظالموں نے واقعی دھاوا کردیا۔ فوراً چوطرفہ سناٹا چھاگیا مگر ملٹری پولیس نے ایک مارچ کیا اور دم کی دم میں چند شورہ پشتوں کی مشکیں کس لی گئیں۔ پھر کسی کو اپنی مفسدہ پردازی کو عملی صورت میں لانے کا گردہ نہ ہوا۔ بارے خدا خدا کرکے کوئی آدھ گھنٹے میں بارات پورنا کے مکان پر پہنچی وہاں پہلے ہی باراتی اصحاب کے خیرمقدم کا سامان کیا گیا تھا۔ صحن میں فرش لگا ہوا تھا۔ کرسیاں قرینے سے دھری ہوئی تھیں۔ ایک طرف چند پنجابی برہمن ایک کنڈ کھودے ہوئے ہون کرنے میں مصروف تھے اور کنڈ کے اردگرد چند پنڈت بیٹھے ہوئے وید کے اشلوک بڑی خوش الحانی سے گا رہے تھے۔ ہون کی خوشبو سے سارا محلّہ معطر ہو رہا تھا۔ باراتیوں کے آتے ہی سب کے پیشانی پر چندن اور زعفران ملا گیا۔ سب کے گلوں میں خوبصورت ہار پہنائے گئے۔ بعد ازاں دُلہا مع چند اصحاب کے مکان کے اندر گیا اور وہاں وید ریت سے شادی کی رسم ادا کی گئی۔ نہ گیت ہوا نہ ناچ۔ نہ گالی نہ گلوج۔ بے چاری پورنا کو سنبھالنے والا کوئی نہ تھا صرف بلّو مشاطہ کا کام بھی کرتی تھی اور جلیس کا بھی۔

اندر تو شادی ہو رہی تھی۔ باہر ہزاروں آدمی لاٹھیاں اور سوٹے لیے غل مچا رہے تھے۔ پولیس والے ان کو روکے ہوئے مکان کے گرد ایک حلقہ باندھے کھڑے تھے۔ تمام باراتی دم بخود تھے۔ اس اثنا میں پولیس کا کپتان بھی آ پہنچا۔ اُس نے آتے ہی حکم دیا کہ بھیڑ ہٹا دی جائے۔ اور دم دم میں پولیس والوں نے سوٹوں سے مار مار کر اس طوفان بے تمیزی کو ہٹانا شروع کیا۔ جنگی پولیس نے ڈرانے کے لیے بندوقوں کی دو چار باڑھیں ہوا میں سر کردیں۔ اب کیا تھا چوطرفہ بھگدڑ مچ گئی مگر عین اسی وقت ٹھاکر زور آور سنگھ دوہری پستول باندھے نظر پڑا۔ اس کی موچھیں کھڑی تھیں۔ آنکھوں سے انگارے اُڑ رہے تھے۔ اُس کو دیکھتے ہی وہ بے قاعدہ جماعت جو تتر بتر ہو رہی تھی پھر جمع ہونے لگی جس

طرح سردار کو دیکھ کر بھاگتی ہوئی فوج دم پکڑلے۔ ایک لمحے میں کوئی ہزار آدمی اکٹھے ہوگئے اور دلآور ٹھاکر نے جوں ہی ایک دفعہ نعرہ مارا ''جے دُرگا جی کی'' ووں ہی ساری جماعت کے دلوں میں گویا کوئی تازہ روح آگئی۔ جوش بھڑک اُٹھا۔ خون میں حرکت پیدا ہوئی اور سب کے سب دریا کی طرح امنڈتے ہوئے آگے بڑھے۔ ملٹری پولیس والے بھی سنگینیں کھولے ہوئے قطار کی قطار حملے کے منتظر کھڑے تھے۔ چوطرفہ ایک خوف ناک سناٹا چھایا ہوا تھا دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اب کوئی دم میں خون کی ندی بہا چاہتی ہے۔ پولیس کپتان بڑی پامردی سے اپنے آدمیوں کو اُبھار رہا تھا کہ دفعتاً پستول کی آواز آئی اور کپتان کی ٹوپی زمین پر گر پڑی مگر زخم نہیں لگا۔ کپتان نے دیکھ لیا تھا کہ یہ پستول زورآور سنگھ نے سر کیا ہے۔ اُس نے بھی چٹ اپنی بندوق سنبھالی اور بندوق کا شانے تک لانا تھا کہ ٹھاکر زورآور سنگھ چاروں شانے چت زمین پر آرہا۔ اُس کا گرنا تھا کہ دلآور سپاہیوں نے دھاوا کیا اور وہ بے قاعدہ جماعت بدحواس ہوکر بھاگی جس کے جہاں سینگ سمائے چل نکلا۔ کوئی آدھ گھنٹے میں وہاں چڑیے کا پوت بھی نہ دکھائی دیا۔

باہر تو یہ طوفان بپا تھا اندر دُلہا دُلہن مارے ڈر کے سوکھے جاتے تھے۔ پورنا تھرتھر کانپ رہی تھی۔ اس کو بار بار رونا آتا تھا کہ یہ مجھ ابھاگنی کے لیے اتنا خون خچر ہو رہا ہے۔ امرت رائے کے خیالات کچھ اور ہی تھے وہ سوچتے تھے کہ کاش میں پورنا کے ساتھ کسی طرح بخیریت مکان تک پہنچ جاتا تو دشمنوں کے حوصلے پست ہوجاتے۔ پولیس ہے تو کافی۔ ارے! یہ بندوقیں چلنے لگیں۔ لیجیے بے چارا زور سنگھ مارا گیا۔ آدھ گھنٹے کے ہی اندر جو امرت رائے کو کئی برسوں کے برابر معلوم ہوتا تھا۔ میاں بیوی ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے ملا دیے گئے۔ اور تب یہاں سے بارات کی رخصتی کی ٹھہری۔ پورنا ایک فینس میں بٹھائی گئی اور جس طرح بارات آئی تھی اسی طرح روانہ ہوئی۔ اَب کی مخالفین کو سر اُٹھانے کی جرأت نہ ہوئی۔ آدمی اِدھراُدھر ضرور جمع تھے۔ اور قہرآلود نگاہوں سے اس جماعت کو دیکھتے تھے۔ اِدھراُدھر سے پتھر بھی چلائے جا رہے تھے۔ تالیاں بجائی جارہی تھیں۔ مُنہ چڑایا جا رہا تھا۔ مگر ان شرارتوں سے ایسے مستقل مزاج ریفارمروں کے سنجیدگی میں کیا خلل آسکتا تھا۔ ہاں اندر فینس میں بیٹھی ہوئی پورنا رو رہی تھی۔ غالبًا اس لیے کہ دُلہن دُلہا کے گھر جاتے وقت ضرور رویا کرتی ہے۔ بارے خدا خدا کرکے بارات ٹھکانے پر

پہنچی۔ دُلہن اُتاری گئی باراتیوں کے جان میں جان آئی۔ امرت رائے کی خوشی کا کیا پوچھنا وہ دوڑ دوڑ سب سے ہاتھ ملانے پڑتے تھے۔ اچکن کھلی جاتی تھیں۔ جوں ہی پورنا اس سجے ہوئے کمرے میں رونق افروز ہوئی جو خود بھی دُلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ امرت رائے نے آکر اس سے کہا "پیاری لو ہم بخیریت پہنچ گئے۔ ایں! تم تو رو رہی ہو۔ یہ کہتے ہوئے انھوں نے رومال سے اس کے آنسو پونچھے اور اس کو گلے سے لگا لیا۔"

پورنا کو کچھ تھوڑی سی خوشی محسوس ہوئی۔ اس کی طبیعت خود بخود سنبھل گئی۔ اُس نے امرت رائے کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی "آپ یہیں میرے پاس بیٹھیے آپ کو باہر نہ جانے دوں گی۔ افوہ! ظالموں نے کیسا اودھم مچایا۔"

اس مبارک رسم کے بعد باراتیوں کے چلنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ مگر سب نے اصرار کیا کہ لالہ دھنک دھاری لال سب کو اپنی تقریر سے ایک بار فیضیاب کریں۔ چنانچہ دوسرے دن امرت رائے نے بنگلے کے مقابل والے صحن میں ایک شامیانہ نصب کرایا اور بڑے دھوم دھام کا جلسہ ہوا۔ وہ دھواں دھار تقریریں ہوئیں کہ سیکڑوں آدمیوں کے کفر ٹوٹ گئے۔ ایک جلسہ کی کامیابی نے ہمت بڑھائی، دو جلسے اور ہوئے اور دونی کامیابی کے ساتھ سارا شہر ٹوٹا پڑتا تھا۔ پولیس کا برابر انتظام رہا۔ وہی لوگ جو کل ریفارم کے خلاف لاٹھیاں لیے ہوئے تھے آج ان تقریروں کو غور سے سنتے تھے اور چلتے وقت گو اُن باتوں پر عمل کرنے کے لیے تیار نہ ہوں مگر اتنا ضرور کہتے تھے کہ یار یہ سب باتیں تو ٹھیک کہتے ہیں۔ ان جلسوں کے بعد دو بیواؤں کی اور شادیاں ہوئیں۔ دونوں دُلہے امرت رائے کے پُرجوش پیرووں میں سے تھے اور دلہنوں میں سے ایک پورنا کے ساتھ گنگا نہانے والی رام کلی تھی۔ چوتھے دن تمام حضرات رخصت ہوئے۔ پورنا بہت کنی کاٹتی پھری مگر تاہم باراتیوں سے مزاج پرسی کرنا پڑی اور لالہ دھنک دھاری نے تو تین دن آدھ آدھ گھنٹے تک اس کو اخلاقی تلقین کی۔

شادی کے چوتھے دن بعد پورنا بیٹھی ہوئی تھی کہ ایک عورت نے آکر اس کو ایک سر بہ مہر لفافہ دیا، پڑھا تو پریما کا خط تھا۔ اُس نے اس کو مبارک بادی دی تھی اور بابو امرت رائے کو وہ تصویر جو برسوں سے اس کے گلے کا ہار ہو رہی تھی پورنا کے لیے بھیج دی تھی۔ اُس خط کے آخری سطریں یہ تھیں۔

"سکھی تم بڑی بھاگوان ہو ایشور سدا تمھارا سہاگ قائم رکھے میری ہزاروں امیدیں اس تصویر سے وابستہ تھیں۔ تم جانتی ہو کہ میں نے اس کو جان سے زیادہ عزیز رکھا مگر اب میں اس قابل نہیں کہ اس کو اپنے سینے پر رکھوں۔ اب یہ تم کو مبارک ہو پیاری مجھے بھولنا مت اپنے پیارے پتی کو میری طرف سے مبارک باد دینا اگر زندہ رہی تو تم سے ضرور ملاقات ہوگی۔"

تمھاری ابھاگی سکھی پریما

پورنا نے اس کو بار بار پڑھا اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس تصویر کو گلے میں پہن لیا اور نہایت ہمدردانہ لہجے میں اس خط کا جواب لکھا۔

"افسوس! آج کے پندرھویں دن بے چاری پریما بابو دان ناتھ کے گلے باندھ دی گئی۔ بڑے دھوم دھام سے بارات نکلی ہزاروں روپے لٹا دیا گیا۔ کئی دن تک سارا شہر منشی بدری پرشاد صاحب کے دروازے پر ناچ دیکھتا رہا لاکھوں کا وارا نیارا ہوگیا۔ شادی کے تیسرے ہی دن منشی جی راہی ملک بقا ہوئے۔ خدا ان کو مغفرت کرے۔"

گیارھواں باب

دشمن چہ کند چو مہربان باشد دوست

مہمانوں کی رخصتی کے بعد یہ امید کی جاتی تھی کہ مخالفین اب سر نہ اُٹھائیں گے۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ ان کی طاقت منشی بدری پرشاد و ٹھاکر زور آور سنگھ کے مر جانے سے نہایت کمزور سی ہو رہی تھی۔ مگر اتفاق میں بڑی قوت ہے۔ ایک ہفتہ بھی نہ گزرنے پایا تھا۔ اندیشہ کچھ کچھ کم ہو چلا تھا کہ ایک روز صبح کو بابو امرت رائے کی تمام شاگرد پیشے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہمارا استعفا لے لیا جائے۔ بابو صاحب اپنے نوکروں سے بہت اچھا برتاؤ رکھتے تھے۔ پس ان کو اس وقت سخت تعجب ہوا۔ بولے۔ تم لوگ کیا چاہتے ہو۔ کیوں استعفا دیتے ہو؟"

نوکر۔ "ہجور اب ہم لوگ نوکری نہ کریں گے۔"

امرت رائے۔ "آخر اس کی کوئی وجہ بھی ہے۔ اگر تمھاری تنخواہ کم ہو تو بڑھائی جاسکتی ہے۔ اگر کوئی دوسری شکایت ہو تو رفع کی جاسکتی ہے۔ یہ استعفا کی بات چیت کیسی؟ اور پھر سب کے سب ایک ساتھ!

نوکر۔ "ہجور تنکھاہ کی ہم کو جرا بھی سکایت نہیں۔ ہجور تو ہمکا مائی باپ کی طرح مانت ہیں۔ مُدا اب ہمارا کچھ بس ناہیں جب ہمار برادری جات سے باہر کرت ہے۔ ہُکا پانی بند کرت ہے۔ سب کہت ہیں کہ ان کے یہاں نوکری مت کرو۔"

بابو امرت رائے بات کی تہہ پر پہنچ گئے۔ مخالفین نے اپنا اور کوئی بس چلتا نہ دیکھ کر ستانے کا یہ ڈھنگ نکالا ہے بولے "ہم تمھاری تنخواہ دوگنی کردیں گے اگر اپنا استعفا پھیر لوگے۔ ورنہ تمھارا استعفا نا منظور تا وقتیکہ ہم کو اور کہیں خدمت گار نہ مل جائیں۔"

نوکر۔ "(ہاتھ جوڑکر) سرکار ہمارے اوپر مہربانگی کی جائے۔ برادری ہم کو آج ہی کھارج کردے گی۔"

امرت رائے۔ "(ڈانٹ کر) ہم کچھ نہیں جانتے۔ جب تک ہم کو نوکر نہ ملیں گے ہم ہرگز استعفا منظور نہ کریں گے تم لوگ اندھے ہو۔ دیکھتے نہیں ہو کہ بلا نوکروں کے ہمارا کام کیوں کر چلے گا۔"

نوکروں نے دیکھا کہ یہ اس طرح ہرگز چھٹی نہ دیں گے چنانچہ اس وقت تو وہاں سے.چلے آئے دن بھر خوب دل لگا کر کام کیا آٹھ بجے رات کے قریب جب بابو امرت رائے سیر کرکے آئے تو کوئی ٹم ٹم تھامنے والا نہ تھا۔ چاروں طرف گھوم گھوم کر پکارا مگر صدائے نہ برخاست۔ سمجھ گئے کم بختوں نے دھوکا دیا۔ خود گھوڑے کو کھولا۔ پھیرنے کی کہاں فرصت۔ ساز اُتارا اصطبل میں باندھ دیا اندر گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ پورنا بیٹھی کھانا پکا رہی ہے اور بلّو اِدھراُدھر دوڑ رہی ہے۔ نوکروں پر دانت پیس کر رہ گئے۔ پورنا سے کہا "پیاری آج تم کو بڑی تکلیف ہو رہی ہے کم بختوں نے سخت دھوکہ دیا۔"

پورنا۔ (ہنس کر) آج آپ کو اپنے ہاتھ کی رسوئیں کھلاؤں گی۔ کوئی بھاری انعام دیجیے گا۔ امرت رائے کو اس وقت دل لگی کہاں سوجھتی تھی۔ بے چارے چاول دال کھانا بھول گئے تھے۔ کشمیری برہمن نہایت نفیس کھانے تیار کرتا تھا۔ دس شہر میں ایسا با ہنر باورچی کہیں نہ تھا۔ کتنے شرفاء اس کو نوکر رکھنے کے لیے منہ پھیلائے ہوئے تھے۔ مگر کوئی ایسے دریا دلی سے تنخواہ نہیں دے سکتا تھا۔ اس کے جانے کا بابو صاحب کو سخت افسوس ہوا۔

بیوی سے پوچھا یہ بدمعاش تم سے پوچھنے بھی آئے تھے یا یوں ہی چلے گئے۔

پورنا۔ "مجھ سے تو کوئی بھی نہیں پوچھنے آیا۔ مہراج البتہ آیا اور روتا تھا کہ مجھے لوگ مارنے کو دھمکا رہے ہیں۔

امرت رائے۔ "(غصے سے ہاتھ مل کر) نہیں معلوم یہ ظالم کیا کرنے والے ہیں۔ یہ کہہ کر باہر آئے۔ کپڑے اُتارے۔ کہاں تو روز خدمت گار آکر کپڑے اُتارتا تھا جوتے کھولتا تھا۔ ہاتھ منہ دھلواتا اور مہراج اچھے سے اچھے کھانے تیار رکھتا اور کہاں یکایک

گیارھواں باب

دشمن چہ کند چو مہربان باشد دوست

مہمانوں کی رخصتی کے بعد یہ امید کی جاتی تھی کہ مخالفین اب سر نہ اُٹھائیں گے۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ ان کی طاقت منشی بدری پرشاد و ٹھاکر زور آور سنگھ کے مر جانے سے نہایت کمزور سی ہو رہی تھی۔ مگر اتفاق میں بڑی قوت ہے۔ ایک ہفتہ بھی نہ گزرنے پایا تھا۔ اندیشہ کچھ کچھ کم ہو چلا تھا کہ ایک روز صبح کو بابو امرت رائے کی تمام شاگرد پیشے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہمارا استعفا لے لیا جائے۔ بابو صاحب اپنے نوکروں سے بہت اچھا برتاؤ رکھتے تھے۔ پس ان کو اس وقت سخت تعجب ہوا۔ بولے۔ تم لوگ کیا چاہتے ہو۔ کیوں استعفا دیتے ہو؟"

نوکر۔ "ہجور اب ہم لوگ نوکری نہ کریں گے۔"

امرت رائے۔ "آخر اس کی کوئی وجہ بھی ہے۔ اگر تمھاری تنخواہ کم ہو تو بڑھائی جاسکتی ہے۔ اگر کوئی دوسری شکایت ہو تو رفع کی جاسکتی ہے۔ یہ استعفا کی بات چیت کیسی؟ اور پھر سب کے سب ایک ساتھ!

نوکر۔ "ہجور تنکھاہ کی ہم کو جرا بھی سکایت نہیں۔ ہجور تو ہمکا مائی باپ کی طرح مانت ہیں۔ مُدا اب ہمارا کچھ بس ناہیں جب ہمار برادری جات سے باہر کرت ہے۔ ہُکا پانی بند کرت ہے۔ سب کہت ہیں کہ ان کے یہاں نوکری مت کرو۔"

بابو امرت رائے بات کی تہہ پر پہنچ گئے۔ مخالفین نے اپنا اور کوئی بس چلتا نہ دیکھ کر ستانے کا یہ ڈھنگ نکالا ہے بولے "ہم تمھاری تنخواہ دوگنی کردیں گے اگر اپنا استعفا پھیر لوگے۔ ورنہ تمھارا استعفا نا منظور تا وقتیکہ ہم کو اور کہیں خدمت گار نہ مل جائیں۔"

نوکر۔ ”(ہاتھ جوڑکر) سرکار ہمارے اوپر مہربانگی کی جائے۔ برادری ہم کو آج ہی کھارج کردے گی۔“

امرت رائے۔ ”(ڈانٹ کر) ہم کچھ نہیں جانتے۔ جب تک ہم کو نوکر نہ ملیں گے ہم ہرگز استعفا منظور نہ کریں گے تم لوگ اندھے ہو۔ دیکھتے نہیں ہو کہ بلا نوکروں کے ہمارا کام کیوں کر چلے گا۔“

نوکروں نے دیکھا کہ یہ اس طرح ہرگز چھٹی نہ دیں گے چنانچہ اس وقت تو وہاں سے.چلے آئے دن بھر خوب دل لگا کر کام کیا آٹھ بجے رات کے قریب جب بابو امرت رائے سیر کرکے آئے تو کوئی ٹم ٹم تھامنے والا نہ تھا۔ چاروں طرف گھوم گھوم کر پکارا مگر صدائے نہ برخاست۔ سمجھ گئے کم بختوں نے دھوکا دیا۔ خود گھوڑے کو کھولا۔ پھیرنے کی کہاں فرصت۔ ساز اُتارا اصطبل میں باندھ دیا اندر گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ پورنا بیٹھی کھانا پکا رہی ہے اور بلّو اِدھراُدھر دوڑ رہی ہے۔ نوکروں پر دانت پیس کر رہ گئے۔ پورنا سے کہا ”پیاری آج تم کو بڑی تکلیف ہو رہی ہے کم بختوں نے سخت دھوکہ دیا۔“

پورنا۔ (ہنس کر) آج آپ کو اپنے ہاتھ کی رسوئیں کھلاؤں گی۔ کوئی بھاری انعام دیجیے گا۔ امرت رائے کو اس وقت دل لگی کہاں سوجھتی تھی۔ بے چارے چاول دال کھانا بھول گئے تھے۔ کشمیری برہمن نہایت نفیس کھانے تیار کرتا تھا۔ دس شہر میں ایسا با ہنر باورچی کہیں نہ تھا۔ کتنے شرفاء اس کو نوکر رکھنے کے لیے منہ پھیلائے ہوئے تھے۔ مگر کوئی ایسے دریا دلی سے تنخواہ نہیں دے سکتا تھا۔ اس کے جانے کا بابو صاحب کو سخت افسوس ہوا۔

بیوی سے پوچھا یہ بدمعاش تم سے پوچھنے بھی آئے تھے یا یوں ہی چلے گئے۔

پورنا۔ ”مجھ سے تو کوئی بھی نہیں پوچھنے آیا۔ مہراج البتہ آیا اور روتا تھا کہ مجھے لوگ مارنے کو دھمکا رہے ہیں۔

امرت رائے۔ ”(غصے سے ہاتھ مل کر) نہیں معلوم یہ ظالم کیا کرنے والے ہیں۔ یہ کہہ کر باہر آئے۔ کپڑے اُتارے۔ کہاں تو روز خدمت گار آکر کپڑے اُتارتا تھا جوتے کھولتا تھا۔ ہاتھ منہ دھلواتا اور مہراج اچھے سے اچھے کھانے تیار رکھتا اور کہاں یکایک

آج سناٹا ہوگیا۔ بے چارے ناک بھوں سکوڑے اندر پھر گئے۔ پورنا صاف تھالیوں میں کھانا پروسے بیٹھی ہوئی تھی اور دل میں خوش بھی تھی کہ آج مجھے ان کی یہ خدمت کرنے کا موقع ملا۔ مگر جب ان کا چہرہ دیکھا تو سہم گئی۔ کچھ بولنے کی جرأت نہ پڑی۔ ہاں بلّو نے کہا۔ "سرکار آپ کھامکھاہ اُداس ہوتے ہیں۔ نوکر چاکر تو پیسے کے یار ہیں۔ یہی سب دو ایک روز اِدھر اُدھر رہیں گے پھر آپ ہی آپ جھک مار کر کے آئیں گے۔"

امرت رائے۔ "(غصے کو ضبط کرکے) نہیں معلوم بلّو یہ کن لوگوں کی شرارت ہے۔ انھیں ظالموں نے تمام نوکروں کو اُبھار کر بھگا دیا ہے اور ابھی نہیں معلوم کیا کرنے والے ہیں۔ مجھے تو خوف ہے کہ سارے شہر میں کوئی آدمی ہمارے یہاں نوکری کرنے نہ آئے گا۔ ہاں علاقے پر سے کہار آسکتے ہیں۔ مگر وہ سب دیہاتی گنوار ہوتے ہیں بجز باربرداری کے اور کسی کام کے نہیں ہوتے۔" یہ کہہ کر کھانے بیٹھے۔ دو چار نوالے کھائے تو کھانا مزیدار معلوم ہوا۔ پورنا نہایت لذیذ کھانے بنا تھی۔ اس فن میں اُس کو خاص ملکہ تھا مگر جلدی میں بجز معمولی چیزوں کے اور کچھ نہ بنا سکتی تھی۔ تا ہم بابو صاحب نے کھانے کی بڑی تعریف کی اور عملی طور پر اِس کا ثبوت بھی دیا۔ رات تو اس طرح کام چلائے علی الصباح وہ بائیسکل پر سوار ہوکر چند انگریزوں سے ملنے گئے۔ اور بلّو بازار سودا خریدنے گئی۔ مگر اُسے کتنا تعجب ہوا جب کہ بنیوں نے اس کو کوئی چیز بھی نہ دی۔ جس دُکان پر جاتی وہیں ٹکا سا جواب پاتی۔ سارا بازار چھان ڈالا مگر کہیں سودا نہ ملا۔ ناچار مایوس ہوکر لوٹی اور پورنا سے سارا قصہ بیان کیا۔ پورنا نے آج ارادہ کیا تھا کہ ذرا اپنے فن کے جوہر دکھلاؤں گی۔ چیزوں کے نہ ملنے سے دل میں اینٹھ کر رہ گئی ناچار سادے کھانے پکاکر دھر دیے۔

اسی طرح دو تین دن گزرے چوتھے دن بابو صاحب کے علاقے پر سے چند موٹے تازے ہٹے کٹے کہار آئے جن کے بھدے بھدے ہاتھ پاؤں اور پھولے ہوئے کندھے اس قابل نہ تھے کہ ایک تہذیب یافتہ جنٹلمین کی خدمت کرسکتے۔ بابو صاحب ان کو دیکھ خوب ہنسے اور کچھ زادِ راہ دے کر اُلٹے قدم واپس کیا اور اسی

وقت منشی دھنک دھاری لال کے پاس تار بھیجا کہ مجھ کو چند خدمت گاروں کی اشد ضرورت ہے۔ منشی جی صاحب پہلے ہی سے سوچے ہوئے تھے کہ بنارس جیسے شہر میں جس قدر مخالفت ہو تھوڑی ہے۔ تار پاتے ہی انھوں نے اپنے ہوٹل سے پانچ خدمت گاروں کو روانہ کیا جن میں ایک کشمیری مہراج بھی تھا۔ دوسرے دن یہ نئے خادم آ پہنچے۔ سب کے سب پنجابی تھے۔ جو نہ برادری کے غلام تھے اور نہ جن کو برادری سے خارج ہونے کا خوف تھا۔ اُن کو بھی مخالفین نے برانگیختہ کرنا چاہا مگر کچھ داؤں نہ چلا۔ نوکروں کا انتظام تو اس طرح ہوا۔ سودے کا یہ بندوبست کیا گیا کہ لکھنؤ سے تمام روزانہ ضروریات کی چیزیں اکٹھی منگالیں جو کئی مہینوں کے لیے کافی تھیں۔ مخالفوں نے جب دیکھا کہ ان شرارتوں سے بابو صاحب کو کوئی گزند نہ پہنچا تو اور ہی چال چلے۔ ان کے موکلوں کو بہکانا شروع کیا کہ وہ تو عیسائی ہوگئے ہیں۔ بدھوا بواہ کیا ہے۔ سب جانوروں کا گوشت کھاتے ہیں۔ چھوت بچار نہیں مانتے ان کو چھونا گناہ ہے۔ گو دیہات میں بھی ریفارم کے لکچر دیے گئے تھے اور امرت رائے کے پُرجوش پیرو متواتر دورے کر رہے تھے۔ مگر ان لکچروں میں ابھی تک بدھوا بواہ کا ذکر مصلحتاً نہیں کیا گیا تھا۔ چنانچہ جب ان کے موکلوں نے جن میں زیادہ تر راجپوت اور بھومہار تھے۔ یہ حالات سُنے تو قسم کھائی کہ ان کو اپنا مقدمہ نہ دیں گے۔ رام! رام! بدھوا سے بواہ کرلیا! عنقریب دو ہفتے تک بابو امرت رائے صاحب کے موکلوں میں یہ باتیں پھیلیں اور مخالفین نے ان کے خوب کان بھرے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بابو صاحب کی وکالت کی سرد بازاری شروع ہوگئی۔ جہاں مارے مقدموں کے سانس لینے کی فرصت نہ ملتی تھی وہاں اب دن بھر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کی نوبت آگئی۔ حتیٰ کہ تیسرے ہفتے میں ایک مقدمہ بھی نہ ملا۔ ان کی بازار ٹھنڈی ہوئی تو منشی گلزاری لال و بابو دان صاحب کی چاندی ہوگئی۔ جب تین ہفتے تک بابو امرت رائے صاحب کو کسی اجلاس پر جانے کو نوبت نہ آئی تو جج صاحب کو تعجب ہوا۔ وہ بابو امرت رائے صاحب کی ذہانت و طباعی کی بڑی قدر کرتے تھے اور اکثر ان کے اپنے مکان پر بلا کر پیچیدہ مقدمات میں ان کی رائے لیا کرتے تھے اور بارہا ان کو سنگین مقدمات کی تحقیقاتی کمیشن کا پریسیڈنٹ بنایا تھا۔

انھوں نے سررشتہ دار سے ان کے اس طرح مفقود ہوجانے کا سبب پوچھا۔ سررشتہ دار صاحب قوم کے مسلمان اور نہایت راست باز آدمی تھے انھوں نے من و عن سب حال کہہ سنایا۔ دوسرے دن امرت رائے کو اجلاس پر خودبخود بلایا اور دیہاتی زمینداروں کے روبرو ان سے دیر تک آہستہ آہستہ گفتگو کی۔ امرت رائے بھی بے تکلفی سے مسکرا مسکرا کر ان کی باتوں کا جواب دیتے تھے۔ کئی وکیل اس وقت صاحب بہادر کے پاس کاغذات ملاحظہ کے لیے لائے مگر صاحب نے ذرا بھی توجہ نہ کی۔ جب امرت رائے چلے تو صاحب نے کرسی سے اُٹھ کر ان سے ہاتھ ملایا اور ذرا بلند آواز میں بولے۔

اچھا بابو شاب! جیسا آپ کہتا ہے ہم اس مکدمے میں اسی ماپھک کرے گا۔

جج صاحب یہ چال چل کر منتظر تھے کہ دیکھیں اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔ چنانچہ جب کچہری برخاست ہوئی تو ان زمینداروں میں جن کے مقدمے آج پیش تھے یوں باتیں ہونے لگیں۔

ٹھاکر صاحب۔ (پگڑی باندھے۔ مونچھیں اینٹھے۔ مرزائی پہنے اور گلے میں بڑے بڑے دانوں کا مالا ڈالے) "آج جج صاحب امرت رائے سے کھوب کھوب بات کرت رہن۔ جرور سے جرور انہی کے رائے کے متابک پھیسلا ہوئے۔"

مصرجی۔ (سر گھٹائے۔ ٹیکا لگائے برہنہ تن۔ انگوچھا کندھے پر رکھے ہوئے)۔"ہاں جان تو ایسے پڑت ہے۔ جب بابو صاحب چلے لاگن تو جج صاحب بولن کہ آپ جیسا کہیں گے ویسا کیا جائے گا۔"

ٹھاکر۔ کاو کہی امرت رائے سامان وکیل پر تھی ماں ناہیں با، باکی پھر عیسائی ہوئے گوا۔ رانڈ سے بیاہ کہس۔

مصرجی۔ "اتنے تو بیچ پڑا ہے۔ ہم کا تو جان پڑت ہے کہ جرور مکدمہ ہار جائے۔ اتنا وکیل ہیں۔ باکی ان کو برابری کوؤ ناہین نا۔ کئس بحث کرت ہے۔ مانو سرسوتی جبھا پر بیٹھی ہے۔ سو اگر ان کا وکیل کیے ہویت تو جرور ہمار جیت ہوئی جات۔"

اسی طرح کی باتیں دونوں میں ہوئیں اور چراغ جلتے جلتے دونوں بابو امرت رائے کے پاس آئے اور مقدمے کی روئداد بیان کی اور اپنے خطاؤں کی معافی

چاہے۔ بابو صاحب نے پہلے ہی سمجھ لیا تھا کہ مقدمہ میں جان نہیں ہے تاہم انھوں نے اس کو لے لیا اور دوسرے دن ایسی پُرزور اور مدلل بحث کی کہ فریق ثانی کے وکلاء کھڑے منہ تاکا کیے اور شام ہوتے ہوتے میدان امرت رائے کے ہاتھ تھا۔ اس مقدمے کا جیتنا کہیے اور کچہری برخاست ہونے کے بعد جج صاحب کا ان کو مبارکباد دینا کہیے کہ گھر جاتے جاتے بابو صاحب کے دروازے پر موکلوں کی بھیڑ لگ گئی اور ایک ہفتے کے اندر اندر ان کی وکالت دونی آب و تاب سے چمکی۔ مخالفوں کو پھر نیچا دیکھنا پڑا۔ ''سچ ہے خدا مہربان ہو تو کل مہربان۔''

اسی اثناء میں وہ گھاٹ جو بابو صاحب صرفِ کثیر سے بنوا رہے تھے تیار ہوگیا اور مخالفین کو بھی مجبوراً معترف ہونا پڑا کہ ایسا خوبصورت گھاٹ اس صوبے میں کہیں نہیں۔ چوطرفہ سنگیں چہار دیواری کھنچی ہوئی تھی اور دریا سے نہروں کے راستہ پانی آتا تھا۔ اناتھ آلہ تیار ہوگیا اہا! کیسی عالی شان پختہ عمارت تھی۔ عین دریا کے کرارے پر۔ اُس کے چاروں طرف احاطہ گھیر کر پھول لگا دیا تھا۔ پھاٹک پر سنگِ مرمر کے دو تختے وصل کیے ہوئے تھے۔ ایک پر اُن اصحاب کے اسمائے گرامی کھدے ہوئے تھے۔ جن کی فیاضی سے وہ عمارت تعمیر ہوئی تھی اور دوسرے پر عمارت کا نام اور اس کے اغراض جلی حروف میں لکھے ہوئے تھے۔ گو عمارت تعمیر ہوچکی تھی مگر ابھی تک دستور العمل کی پوری پیروی نہ ہوسکتی تھی۔ دقت یہ تھی کہ سینا پرونا۔ گل بوٹے کاڑھنا جراب وغیرہ بنانا سکھانے کے لیے ہندو استانیاں نہ ملتی تھی۔ ہاں لالہ دھنک دھاری لال صاحب پر ان کے مہیا کرنے کا بار ڈالا گیا تھا اور بہت جلد کامیابی کی امید تھی۔ اس عمارت کا افتتاحی جلسہ بڑے دھوم دھام سے ہوا۔ دلدار نگر کے مہا راجا صاحب نے جو خود بھی نہایت فیاض اور نیک مرد تھے عمارت کو دست مبارک سے کھولا اور گو خود بدھوا بواہ کے مخالفین میں سے تھے مگر اس اناتھ آلے کے ساتھ سچی ہمدردی ظاہر کی اور بابو امرت رائے کے مساعی جمیلہ کی قرار واقعی داد دی۔ شہر کے تمام شرفاء بلا استثناء اس جلسے میں شریک ہوئے اور مہا راجا کی با موقع فیاضی نے دم کے دم میں کئی ہزار روپے وصول کرا دیا اور آج امرت رائے کو معلوم ہوا کہ میں نے اپنی زندگی میں کچھ کام کیا ہے۔

جب سے شادی ہوئی تھی پورنا نے بابو صاحب کو کبھی اتنا خوش نہ پایا تھا جتنا شادی سے پہلے پاتی تھی۔ اس پورے مہینے بھر بے چارے ترددات میں مبتلا تھے۔ ایک ہفتہ مہمانوں کی رخصتی میں لگا۔ ایک ہفتے تک نوکروں نے تکلیف دی بعد ازاں دو تین ہفتے تک وکالت کی سرد بازاری رہی جو اس وجہ سے اور بھی تشکر کا باعث ہو رہی تھی۔ گھاٹ اور اناتھ آلہ کے ٹھیکے داروں کے بل ادا کرنے تھے۔ جب ذرا وکالت سدھری تو اِس افتتاحی جلسے کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ غرض اس ڈیڑھ مہینے تک ان کو تفکرات سے آزادی ملی۔ آج جب وہ آئے تو از حد خوش تھے چہرہ سوز ہو رہا تھا۔پورنا ان کو متفکر دیکھتی تو اس کو نہایت رنج ہوتا تھا اور ان کی فکر دور کرنے کی برابر کوشش کیا کرتی تھی۔ آج ان کو خوش دیکھا تو نہال ہوگئی۔ بابو صاحب نے اُسے گلے سے لگا کر کہا۔

"پیاری پورنا ہم کو آج معلوم ہوتا ہے کہ زندگی میں کوئی کام کیا۔"

پورنا۔ "ایشور آپ کے ارادوں میں برکت دے۔ ابھی آپ نہ معلوم کیا کیا کریں گے۔"

امرت رائے۔ "تم کو اس اناتھ آلے کی نگرانی کرنا ہوگی۔ کیوں اچھا ہوگا نا۔"

پورنا۔ (ہنس کر) "تم مجھے سکھا دینا۔"

امرت رائے۔ "میں تم کو لے کر مدراس اور پونا چلوں گا وہاں کے خیرات خانوں کا انتظام دیکھوں گا اور ضرورت کے موافق ترمیم کرکے وہی قواعد یہاں بھی جاری کروں گا۔ ہاں پیاری کل سے تم کو مس ولیم گانا سکھانے آیا کریں گی۔"

پورنا۔ "(ہنس کر) تم مجھے کیا کیا سکھلاؤ گے۔ مجھ سے بیاہ کرنے میں تم نے دھوکہ کھایا۔"

امرت رائے۔ "بیشک دھوکہ کھایا۔ محبت کی بلا اپنے سر لی۔"

اسی طرح دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ آج سے دونوں میاں بیوی بڑے چین سے بسر کرنے لگے۔ جوں جوں دونوں کی فطرتی خوبیاں ایک دوسرے پر ظاہر ہوتی تھی ان کی محبت بڑھتی جاتی تھی۔ بیوی شوہر کی عاشق اور شوہر بیوی کا دلدادہ۔ دونوں ایک جان دو قالب تھے۔ جب بابو امرت رائے کچہری جاتے تو پورنا گانا سیکھتی۔ جب وہ کچہری سے آجاتے تو ان کو گانا سناتی۔ بعد ازاں دونوں شام کو باغ میں سیر کرتے اسی طرح ہنستی خوشی سے ایک مہینہ طے ہوگیا۔ خوشی کے ایام جلد کٹ جاتے ہیں۔

بارھواں باب

شکوۂ غیر کا دماغ کسے
یار سے بھی مجھے گلا نہ رہا

پریما کی شادی ہوئے دو ماہ سے زیادہ گزر چکے ہیں۔ مگر اس کے چہرے پر مسرت و اطمینان کی علامتیں نظر نہیں آتیں۔ وہ ہر دم کچھ متفکر سی رہا کرتی ہے۔ اس کا چہرہ زرد ہے۔ آنکھیں بیٹھی ہوئی۔ سر کے بال بکھرے پریشان اس کے دل میں ابھی تک بابو امرت رائے کی محبت باقی ہے۔ وہ ہر چند چاہتی ہے کہ دل سے ان کی صورت نکال ڈالے مگر اس کا کچھ قابو نہیں چلتا۔ گو بابو دان ناتھ اس کے ساتھ سچی محبت ظاہر کرتے ہیں اور علاوہ وجیہہ شکیل نوجوان ہونے کے۔ نہایت ہنس مکھ۔ ظریف طبع و ملنسار آدمی ہیں۔ مگر پریما کا دل اُن سے نہیں ملتا۔ وہ اُن کی خاطر کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں فروگزاشت کرتی۔ جب وہ موجود ہوتے ہیں تو وہ ہنستی بھی ہے بات چیت بھی کرتی ہے۔ محبت بھی جتاتی ہے۔ مگر جب وہ چلے جاتے ہیں تو وہ پھر غمگین ہوتی ہے۔ اپنے میکے میں اس کو رونے کی آزادی تھی یہاں رو بھی نہیں سکتی۔ یا روتی ہے تو چھپ کر۔ اس کی بوڑھی ساس اس کو پان کی طرح پھیرا کرتی ہے۔ نہ صرف اس وجہ سے کہ وہ اس کا پاس و لحاظ کرتی ہے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ اپنے ساتھ نہایت بیش قیمت چیز لائی ہے۔ بے چاری پریما کی زندگی واقعی نا قابلِ رشک ہے اس کی ہنسی زہر خندہ ہوتی ہے۔ اس کے گفتگو کے لہجے میں بے چارگی اور دل افتادگی سی پائی جاتی ہے وہ کبھی کبھی ساس کے تقاضے سے سنگار بھی کرتی ہے۔ مگر اس کے چہرے پر وہ رونق اور چمک دمک نہیں پائی جاتی جو دلی اطمینان کا پرتو ہوتی ہے۔ وہ زیادہ تر اپنے ہی کمرے میں بیٹھی رہتی ہے۔ ہاں کبھی کبھی گا کر دل بہلاتی ہے۔ مگر اس کا گانا اس لیے نہیں ہوتا کہ اس کو خوشی حاصل ہو۔ برعکس اس کے وہ دردناک نغمے گاتی ہے اور اکثر روتی ہے۔ اس کو معلوم ہوتا ہے کہ میرے دل پر کوئی بوجھ دھرا ہوا ہے۔

بابو دان ناتھ اتنا تو شادی کرنے کے پہلے ہی جانتے تھے کہ پریما امرت رائے پر جان دیتی ہے۔ مگر انھوں نے سمجھا تھا کہ اس کی محبت معمولی محبت ہوگی جب میں اس کو بیاہ کر لاؤں گا اور اس کے ساتھ اخلاص و پیار سے پیش آوں گا تو وہ سب کچھ بھول جائے گی۔ اور پھر ہماری زندگی بڑے اطمینان سے بسر ہوگی۔ چنانچہ ایک مہینے تک انھوں نے اس کی دل گرفتگی کی بہت زیادہ پروا نہ کی۔ مگر ان کو کیا معلوم تھا کہ وہ محبت کا پودھا جو پانچ برس تک خون دل سے سینچ سینچ کر پروان چڑھایا گیا ہے۔ مہینے دو مہینے میں ہرگز نہیں مرجھا سکتا۔ انھوں نے دوسرے مہینے بھر بھی ضبط کیا۔ مگر جب اب بھی پریما کے چہرے پر شگفتگی و بشاشت نہ نظر آئی تب تو ان کو صدمہ ہونے لگا۔ محبت اور حسد کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دان ناتھ سچی محبت کرتے تھے مگر سچی محبت کے عوض سچی محبت چاہتے بھی تھے۔ ایک روز وہ معمول سے سویرے مکان پر واپس آئے اور پریما کے کمرے میں گئے تو دیکھا کہ وہ سر جھکائے ہوئے بیٹھی ہے۔ ان کو دیکھتے ہی اُس نے سر اُٹھایا۔ ہائے! محبت لہجے میں بولی "مجھے آج نہ معلوم کیوں لالہ جی کی یاد آگئی تھی بڑی دیر سے رو رہی ہوں۔"

دان ناتھ نے اس کو دیکھتے ہی سمجھ لیا تھا کہ امرت رائے کے فراق میں یہ آنسو بہائے جا رہے ہیں۔ اُس پر پریما نے جو یوں ہوا بتلائی تو اُن کو نہایت ناگوار معلوم ہوا۔ روکھے لہجے میں بولے۔ "تمھاری آنکھیں ہیں اور تمھارے آنسو بھی۔ جتنا رویا جائے رو لو۔ چاہے یہ رونا کسی زندہ آدمی کے لیے ہو یا مُردہ کے لیے۔"

پریما اس آخری جملے پر چونک پڑی اور بلا کچھ جواب دیے شوہر کی طرف مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ دان ناتھ نے پھر کہا۔ "کیا تاکتی ہو پریما میں ایسا احمق نہیں ہوں۔ میں نے بھی آدمی دیکھے ہیں اور آدمی پہچانتا ہوں۔ گو تم نے مجھ کو بالکل گوکھا سمجھ رکھا ہوگا۔ میں تمھاری ایک ایک حرکت کو غور سے دیکھتا ہوں مگر جتنا ہی دیکھتا ہوں اُتنا ہی زیادہ صدمہ دل کو ہوتا ہے۔ کیونکہ تمھارا برتاؤ میرے ساتھ پھیکا ہے گو تم کو یہ سننا ناگوار معلوم ہوگا۔ مگر مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں۔ میں نے اب تک اس نازک معاملے پر زبان کھولنے کی جرأت نہیں کی اور ایشور جانتا ہے میں تمھاری کس قدر محبت کرتا ہوں۔ مگر محبت چاہے جو کچھ برداشت کرے بے نیازی نہیں برداشت کرسکتی اور وہ بھی کیسی بے نیازی جس کا وجود کسی رقیب کے فراق سے ہو۔ کوئی آدمی خوشی سے نہیں

دیکھ سکتا کہ اس کی بیوی دوسرے کے فراق میں آنسو بہائے۔ کیا تم نہیں جانتی ہو کہ ہندو عورت کو شاستر کے مطابق اپنے شوہر کے علاوہ کسی دوسرے کا خیال کرنا بھی گنہگار بنا دیتا ہے۔ پریما۔ تم ایک اعلیٰ درجے کی شریف خاندان کی بیٹی ہو اور جس خاندان کی تم بہو ہو وہ بھی اس شہر میں کسی سے ہیٹا نہیں کیا تمھارے لیے یہ باعثِ ننگ و شرم نہیں ہے کہ تم اُس آدمی کے فراق میں ·آنسو بہاؤ جس نے باوجود تمھارے والد کے متواتر تقاضوں کے ایک آوارہ رانڈ برہمنی کو تم پر ترجیح دی۔ افسوس ہے کہ تم اس آدمی کو دل میں جگہ دیتی ہو جو تمھارا بھول کر بھی خیال نہیں کرتا۔ انھیں آنکھوں نے امرت رائے کو تمھاری تصویر پُرزہ پُرزہ کرکے پیروں تلے روندتے دیکھا ہے۔ انھیں کانوں نے ان کو تمھاری شان میں جا و بے جا باتیں کہتے سنا ہے۔ تم کو تعجب کیوں ہوتا ہے پریما، کیا میری باتوں کا یقین نہیں آیا؟ کیا امرت رائے نے اِن سردمہریوں کا اعلیٰ ثبوت نہیں دے دیا۔ کیا اُنھوں نے ڈنکے کی چوٹ نہیں ثابت کردیا کہ وہ خاک برابر تمھاری قدر نہیں کرتے۔ مانا کہ کوئی زمانہ وہ تھا جب وہ تم سے شادی کرنے کا ارمان رکھتے تھے مگر اب وہ امرت رائے نہیں رہ گیا۔ اب وہ امرت رائے ہے جس کے آوارہ گی اور بد چلنی کی شہر کا بچہ بچہ قسم کھا سکتا ہے۔ مگر افسوس! تم ابھی تک اس ننگ خاندان کے فراق میں آنسو بہا بہا کر اپنی اور میرے خاندان کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا لگاتی ہو۔"

دان ناتھ غصّے کے جوش میں تھے۔ چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ اور گو آنکھوں سے شعلے نہ نکلتے ہوں مگر ان میں انتہا درجے کی روشنی ضرور پائی جاتی تھی۔ پریما بے چاری سر نیچا کیے کھڑی رو رہی تھی۔ شوہر کی ایک ایک بات اس کے سینے کے پار ہوئی جاتی تھی۔ سنتے سنتے کلیجے منہ کو آگیا۔ آخر نہ ضبط ہوسکا نہ رہا گیا۔ دان ناتھ کے پیروں پر گر پڑی اور گرم گرم اشک کے قطروں سے ان کو بھگا دیا۔ دان ناتھ نے فوراً پیر کھسکا لیا۔ پریما کو چارپائی پر بیٹھا دیا اور بولے۔

پریما روؤ مت۔ تمھارے رونے سے میرے دل کو صدمہ ہوتا ہے۔ میں تم کو رولانا نہیں چاہتا مگر ان باتوں کو کہے بلا رہ بھی نہیں سکتا جو اگر دل میں رہ گئیں تو نتیجہ بُرا ہوگا۔ کان کھول کر سنو میں تم کو جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ تمھاری آسایش کے لیے میں اپنی جان نچھاور کرنے کے لیے حاضر ہوں میں تمھارے ذرا سے اشارے پر اپنے کو

صدقے کرسکتا ہوں۔ مگر تم کو سوائے اپنے کسی اور کا خیال کرتے نہیں دیکھ سکتا۔ ہاں پریما مجھ سے اب یہ نہیں دیکھا جا سکتا۔ ایک مہینے سے مجھ کو یہی دقت ہو رہی ہے مگر اب دل پک گیا ہے۔ اب وہ ذرا سی ٹھیس بھی نہیں برداشت کرسکتا۔ اگر اس آگہی پر بھی تم اپنے دل پر قابو نہ پاسکو تو میرا کچھ قصور نہیں۔ بس اتنا کہے دیتا ہوں کہ ایک عورت کے دو شوہر نہیں زندہ رہ سکتے۔

یہ کہتے ہوئے بابو دان ناتھ غصّے میں بھرے باہر چلے آئے۔ بے چاری پریما کو ایسا معلوم ہوا کہ گویا کسی نے کلیجے میں چھری مار دی۔ اس کو آج تک کسی نے بھول کر کوئی کڑوی بات نہیں سنائی تھی۔ اس کی بھاوج کبھی کبھی طعنے دیا کرتی تھیں مگر وہ ایسے سخت نہیں معلوم ہوتے تھے۔ وہ گھنٹوں روتی رہی۔ بعد ازاں اس نے شوہر کی ساری باتوں کو سوچنا شروع کیا اور اس کے کانوں میں یہ آخری الفاظ گونجنے لگے۔"ایک عورت کے دو شوہر زندہ نہیں رہ سکتے۔"

ان کا کیا مطلب ہے؟

تیرھواں باب

چند حسرت ناک سانحے

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ تمام ترددات سے آزادی پانے کے بعد ایک ماہ تک پورنا نے بڑے چین سے بسر کی۔ رات دن چلے جاتے تھے۔ کسی قسم کی فکر کی پرچھائیں بھی نہ دیکھائی دیتی تھی۔ ہاں یہ تھا کہ جب بابو امرت رائے کچہری چلے جاتے تو اکیلے اس کا جی بہت گھبراتا۔ پس اس نے ایک روز ان سے کہا ''کہ اگر کوئی ہرج نہ ہو تو رام کلی اور لچھمی کو اسی جگہ بلا لیجیے تاکہ ان کی صحبت میں وقت کٹ جایا کرے۔ رام کلی کو ناظرین جانتے ہیں۔ لچھمی بھی ایک کایستھ کی لڑکی تھی اور گونے ہی کے دن بیوہ ہوگئی تھی ان دونوں عورتوں نے پورنا کی شادی ہوجانے کے بعد اپنی رضامندی سے دوسری شادیاں کی تھیں اور بابو امرت رائے نے ان کے لیے ایک مکان کرایہ پر لیا تھا اور ان کے خانہ داری کے اخراجات کے متحمل بھی ہوتے تھے۔ بابو صاحب کو پورنا کی تجویز بہت اچھی معلوم ہوئی اور دوسرے ہی دن رام کلی اور لچھمی اسی بنگلے کے ایک حصے میں ٹھہرا دی گئیں۔ پورنا نے اِن دونوں عورتوں کو شادی ہونے کے بعد نہ دیکھا تھا۔ اب رام کلی کو دیکھا تو وہ پہچانی نہ جاتی تھی اور لچھمی نے بھی خوب رنگ روپ نکا لے تھے۔ دونوں عورتیں پورنا کے ساتھ ہنسی خوشی رہنے لگیں۔ بابو صاحب کی تجویز تھی کہ ان عورتوں کی تعلیم اچھی ہوجائے تو اناتھ آلے کی نگرانی انھیں کے سپرد کردوں۔ چنانچہ ایک ہنرمند لیڈی سہ پہر کو آتی اور تینوں کو شام تک پڑھایا کرتی۔ رام کلی اب بھی دل لگی میں اپنی ساس کو کوسا کرتی تھی۔ ایک روز پورنا نے اس سے مسکراکر پوچھا۔''کیوں۔ رمن آج کل مندر پوجا کرنے نہیں جاتی ہو۔'' رام کلی نے جھینپ کر جواب دیا۔ سکھی تم بھی کہاں کا ذکر لے بیٹھیں۔ اب تو مجھ کو مندر کے نام سے بھی نفرت ہے۔''

لچھمی کو رام کلی کے پہلے حالات معلوم تھے۔ وہ اکثر اس کو چڑایا کرتی اس وقت بھی نہ رہا گیا بول اُٹھی۔

"ہاں بوا اب مندر کاہے کو جاؤگی۔ اب تو ہنسے بولنے کا سامان گھر ہی پر موجود ہے۔"

رام کلی۔ "(تنک کر) تم سے کون بولتا ہے جو لگیں زہر اُگلنے۔ بہن اِن کو منع کردو یہ ہماری باتوں میں نہ دخل دیا کریں نہیں تو میں بھی کبھی کچھ کہہ بیٹھوں گی تو روتی پھریں گی۔"

پچھمی۔ "(مسکرا کر) میں نے کچھ جھوٹ تھوڑے کہا تھا جو تم کو ایسا کڑوا معلوم ہوا۔ سو اگر سچ بات کہنے میں ایسی گرم ہوتی ہو تو جھوٹ ہی بولا کروں گی۔ گر ایک بات بتلا دو۔ مہنت جی نے تم کو منتر دیتے وقت تمھارے کان میں کیا کہا تھا۔ہماری بھتی کھائے جو جھوٹ بولے۔"

پورنا ہنسنے لگی مگر رام کلی روندھی ہوکر بولی۔ "سنو پچھمی۔ ہم سے شرارت کروگی تو ٹھیک نہ ہوگا۔ میں بتنا ہی طرح دیتی ہوں۔ تم اُتنا ہی سر چڑھی جاتی ہو۔ آپ سے مطلب۔ مہنت نے میرے کان میں کچھ ہی کہا تھا۔ بڑی آئیں وہاں سے سیتا بن کے۔"

پورنا۔ "پچھمی تم ہمارے سکھی کو ناحق ستاتی ہو۔ جو بات پوچھنا ہو ذرا ملائمیت سے پوچھنا چاہیے۔ کہ یوں۔

ہاں بوا تم ان سے نہ بولو۔ مجھ کو بتلا دو۔ اس تمبولی نے تم کو پان کھلاتے وقت کیا کہا تھا۔

رام کلی۔ "(بگڑ کر) اب تمھیں بھی چھیڑخانی کی سوجھی۔ میں کچھ کہہ بیٹھوں گی تو بُرا مان جاؤگی۔"

اسی طرح تینوں سکھیوں میں ہنسی مذاق بولی ٹھولی ہوا کرتی تھی۔ ساتھ پڑھتیں ساتھ ہوا کھانے جایا کرتیں کئی مرتبہ گنگا اشنان کو گئیں۔مگر اُسی زنانے گھاٹ پر جو امرت رائے نے بنوایا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ تینوں بہنیں ہیں۔ انھیں خوشیوں میں ایک مہینہ گزر گیا۔ گویا وقت بھاگا جاتا تھا۔ مگر فلک ناہنجار سے کسی کی خوشی کب دیکھی جاتی ہے۔ ایک روز پورنا اپنے سکھیوں کے ساتھ باغ میں ٹہل ٹہل کے گہنے بنانے کے لیے پھول چُن رہی تھی کہ ایک عورت نے آکے اس کے ہاتھ میں ایک خط دیا۔ پورنا نے حرف پہچانا پریما کا خط۔ یہ لکھا ہوا تھا۔

''پیاری پورنا۔ تم سے ملاقات کرنے کا بہت جی چاہتا ہے مگر یہاں گھر سے باہر پاؤں نکالنے کی ممانعت ہے۔ اس لیے مجبوراً یہ خط لکھتی ہوں۔ مجھے تم سے ایک ضروری بات کہنی ہے جو خط میں نہیں لکھ سکتی۔ اگر تم کسی معتبر عورت کو اس خط کا جواب دے کر بھیجو تو اس سے زبانی کہہ دوں گی۔ نہایت ضروری بات ہے۔''

تمھاری سکھی پریما

خط پڑھتے ہی پورنا کا چہرہ زرد ہوگیا۔ اس کو اس خط کی مختصر عبارت نہیں معلوم کیوں کھٹکنے لگی۔ فوراً بلّو کو بلایا اور پریما کے خط کا جواب دے کر اُدھر روانہ کیا۔ اور اس کے واپس آنے میں آدھ گھنٹہ جو لگا وہ پورنا نے نہایت بے چینی سے کاٹا۔ نو بجتے بجتے بلّو واپس آئی۔

چہرہ زرد۔ رنگ فق۔ بدحواس۔ پورنا نے اس کو دیکھتے ہی پوچھا۔''کیوں بلّو؟ خیریت تو ہے؟''

بلّو۔''(پیشانی ٹھونک کر) کیا کہوں بہو کچھ کہے نہیں بنتا۔ نہ جانے ابھی کیا ہونے والا ہے۔''

پورنا۔ (گھبرا کر) ''کیا کہا کچھ خط وط تو نہیں دیا۔''

بلّو۔ ''کھت کہاں سے دیتیں۔ ہم کو اندر بلاتے ڈرتی تھیں۔ دیکھتے ہی رونے لگیں اور کہا بلّو میں کیا کروں۔ میرا جی یہاں بالکل نہیں لگتا۔''

میں اکثر پچھلی باتیں یاد کر کے رویا کرتی ہوں۔ ایک دن انھوں نے (بابو دان ناتھ) مجھے روتے دیکھ لیا۔ بہت بگڑے بہت جھلائے اور چلتے وقت دھمکا کر کہا کہ ایک عورت کے دو چاہنے والے نہیں زندہ رہ سکتے۔''

یہ کہہ کر بلّو خاموش ہوگئی پورنا کے سمجھ میں پوری بات نہ آئی۔ اُس نے کہا۔ ہاں ہاں خاموش کیوں ہوئیں۔ جلدی کہو۔ میرا دم رُکا ہوا ہے۔ بلّو نے روکر جواب دیا۔ ''بہو اب اور کیا کہوں۔ دان ناتھ کی نیت بُری ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ پریما بابو امرت رائے کی محبت میں روتی ہے۔''

اتنا سننا تھا کہ پورنا پر ساری باتیں روشن ہوگئیں۔ پیر تلے سے مٹی نکل گئی۔ کچھ غش سی آگئی۔ دونوں سکھیاں دوڑی ہوئی آئیں اس کو سنبھالا۔ پوچھنے لگیں کیا ہوا کیا ہوا۔ پورنا نے بہانے کر کے ٹال دیا۔ مگر یہ منحوس خبر اس کے کلیجے میں

تیر کی طرح ترازو ہوگئی۔ ایشور سے دعا مانگنے لگی کہ آج کسی طرح وہ صحیح سلامت گھر آجاتے تو ان سے سب باتیں کہتی پھر خیال آیا کہ ابھی ان سے کچھ کہنا مناسب نہیں۔ گھبرا جائیں گے۔ اسی حیص بیص میں پڑی تھی۔ شام کے وقت جب بابو امرت رائے حسبِ معمول کچہری سے آئے تو دیکھا کہ پورنا پستول لیے کھڑکی سے کسی چیز پر نشانہ لگا رہی ہے۔ ان کو دیکھتے ہی اس نے پستول الگ رکھ دیا۔ امرت رائے نے ہنس کر کہا، شکار کے لیے نظریں کافی ہیں۔ پستول پر مشق کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

پورنا نے اپنی سراسیمگی کو چھپایا اور بولی ''مجھے پستول چلانا سکھا دو۔ میں نے دو تین بار چلایا مگر نشانہ ٹھیک نہیں پڑتا۔''

بابو صاحب کو پورنا کے اس شوق پر اچنبھا ہوا۔ کہاں تو روز ان کو دیکھتے ہی سب دھندھا چھوڑ کر خدمت کرنے کے لیے دوڑتی تھی اور کہاں آج پستول چلانے کی دُھن سوار ہے۔ مگر حسینوں کے انداز کچھ نرالے ہوتے ہیں یہ سوچ کر انھوں نے پستول کو ہاتھ میں لیا! اور دو تین مرتبہ نشانہ لگا کر اس کو چلانا سکھایا۔ اور اب پورنا نے فیر کیا تو نشانہ ٹھیک پڑا۔ دوسرا فیر کیا وہ بھی ٹھیک۔ چہرہ خوشی چمک گیا۔ پستول رکھ دیا اور شوہر کی خاطر و مدارات میں مصروف ہوگئی۔

امرت رائے۔ ''پیاری آج میں نے ایک نہایت ہوشیار مصور بلایا ہے جو تمھاری پورے قد کی تصویر بنائے گا۔''

پورنا۔ ''میری تصویر کھینچا کر کیا کروگے۔''

امرت رائے۔ ''کمرے میں لگاؤں گا۔''

پورنا۔ ''تم بھی میرے ساتھ بیٹھو۔''

امرت رائے۔ ''آج تم اپنی تصویر کھنچوا لو پھر دوسرے دن ہم دونوں ساتھ بیٹھیں گے۔''

پورنا تصویر کھنچانے کی تیاریاں کرنے لگی۔ اس کی دونوں سکھیاں اس کا بناؤ سنوار کرنے لگیں مگر اس کا دل آج بیٹھا جاتا تھا کسی نامعلوم حادثہ کا خوف اس کے دل پر غالب ہوتا جاتا تھا۔ چار بجے کے قریب مصور آیا۔ اور ڈیڑھ گھنٹہ تک پورنا کے تصویر کا خاکہ کھینچتا رہا۔ اس کے چلے جانے کے بعد پورنا نے پھر پستول اُٹھا لیا

اور اکیلے اپنی کھڑکی سے نشانہ لگایا جب غروب آفتاب کے وقت بابو امرت رائے حسبِ معمول سیر کے لیے جانے لگے تو پورنا نے پوچھا "کہاں جا رہے ہیں؟"

امرت رائے۔ "ذرا سیر کرتا آؤں۔ دو چار صاحبوں سے ملاقات کرنا ہے۔"

پورنا۔ (پیار سے ہاتھ پکڑ کر) "آج میرے ساتھ باغ میں سیر کرو آج نہ جانے دوں گی۔"

امرت رائے۔ "پیاری میں ابھی لوٹا آتا ہوں دیر نہ ہوگی۔"

پورنا۔ "نہیں میں آج نہ جانے دوں گی۔"

یہ کہہ کر پورنا نے شوہر کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ وہ بیوی کے اس بھولی ضد پر از حد خوش ہوئے۔ گلے لگا کر کہا۔ "اچھا لو پیاری۔ آج نہ جائیں گے۔"

بڑی دیر تک پورنا اپنے پیارے پتی کے ہاتھ میں ہاتھ دیے روشوں میں ٹہلتی رہی اور ان کی پیاری باتوں کو سُن سُن اپنے کانوں کو خوش کرتی رہی۔ وہ بار بار چاہتی کہ ان سے دان ناتھ کا سارا بھید کھول دوں مگر پھر سوچتی کہ ان کو خواہ مخواہ تکلیف ہوگی۔ جو کچھ سر پر آئے گی ان کے خاطر سے میں اکیلے بھگت لوں گی۔

سیر کرنے کے بعد تھوڑی دیر تک سکھیوں نے چند نغمے الاپے۔ بعدازاں کئی صاحب ملاقات کے لیے آگئے۔ ان سے باتیں ہونے لگیں۔ اسی اثنا میں نو بجنے کو آئے۔ بابو صاحب نے کھانا کھایا اور اخبار لے کر لیٹے اور پڑھتے پڑھتے سو گئے۔ مگر غریب پورنا کے آنکھوں میں نیند کہاں۔ دس بجے تک وہ ان کے سرہانے بیٹھی ایک قصہ کی کتاب پڑھتی رہی۔ جب تمام کنبہ کے لوگ سو گئے اور چاروں طرف سناٹا چھا گیا تو اسے اکیلے ڈر معلوم ہونے لگا۔ ڈرتے ہی ڈرتے وہ اُٹھی اور چاروں طرف کے دروازے بند کرلیے۔ جب ذرا اطمینان ہوا تو پنکھا لے کر شوہر کو جھلنے لگی۔ جوانی کی نیند۔ ہزار ضبط کرنے پر بھی ایک جھپکی آ ہی گئی۔ مگر ایسا ڈراؤنا خواب دیکھا کہ چونک پڑی۔ ہاتھ پاؤں تھر تھر کانپنے لگے۔ دل دھڑکنے لگا۔ بے اختیار شوہر کا ہاتھ پکڑا کہ جگاوے مگر پھر یہ سمجھ کر کہ ان کی پیاری نیند اُچٹ جائے گی تو ان کو تکلیف ہوگی ان کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اب اس وقت اس کی حالت ناگفتہ بہ ہے چہرہ زرد ہو رہا ہے۔ ڈری ہوئی نگاہوں سے اِدھر اُدھر تاک رہی ہے۔ پتا بھی کھڑکتا ہے تو چونک پڑتی ہے۔ لیمپ میں شاید تیل نہیں ہے اس کی دھندلی روشنی میں وہ

سناٹا اور بھی خوفناک ہو رہا ہے۔ تصویریں جو دیواروں کی زینت دے رہی ہیں اس وقت اس کو گھورتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ یکایک گھنٹے کی آواز کان میں آئی۔ گھڑی کی سوئیوں پر نگاہ پڑی۔ بارہ بجے تھے۔ وہ اُٹھی کہ لیمپ گل کردے۔ دفعتاً اس کو کئی آدمیوں کے پاؤں کی آہٹ معلوم ہوئی۔ اس کا دل بانسوں اچھلنے لگا۔ جھٹ پستول ہاتھ میں لے لیا اور جب تک وہ بابو امرت رائے کو جگائے کہ وہ مضبوط دروازہ آپ ہی آپ کھل گیا اور کئی آدمی دھڑدھڑاتے اندر گھس آئے پورنا نے فوراً پستول سر کیا۔ تراقے کی آواز آئی۔ اور اس کے ساتھ ہی کچھ کھٹ پٹ کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ دو آوازیں پستول کے چھوٹنے کی اور ہوئیں۔ پھر دھماکے کی آواز آئی۔ اتنے میں بابو امرت رائے چلائے دوڑو! دوڑو! چور! چور! اس آواز کے سنتے ہی دو آدمی ان کی طرف لپکے مگر اتنے میں دروازے پر لالٹین کی روشنی نظر آئی۔ اور کئی سپاہی وردیاں ڈالے کمرہ میں داخل ہوگئے۔ چور بھاگنے لگے۔ مگر دو کے دونوں پکڑے گئے۔ سپاہیوں نے لالٹین لے کر زمین پر دیکھا تو دو لاشیں نظر آئیں۔ ایک پورنا کی لاش تھی اس کو دیکھتے ہی بابو امرت رائے ہائے! ہائے! کرکے گر پڑے اور بے ہوش ہوگئے۔ دوسری لاش ایک مرد کی تھی۔ سپاہیوں نے غور سے دیکھا تو چونک کر بولے ارے! یہ تو بابو دان ناتھ ہیں۔ سینے میں گولی لگ گئی!!!

خاتمہ

پورنا کو دنیا سے اُٹھے ایک برس بیت گیا ہے۔ شام کا وقت ہے۔ ٹھنڈی، روح پرور ہوا چل رہی ہے۔ سورج کی رخصتی نگاہیں کھڑکی کے دروازوں سے بابو امرت رائے کے آراستہ و پیراستہ کمرے میں جاتی ہیں اور پورنا کے قدِ آدم تصویر کے قدموں کا چپکے سے بوسہ لے کر کھسک جاتی ہیں۔ سارا کمرہ جگمگا رہا ہے۔ رام کلی اور کچھی کے چہرے اس وقت کھلے جاتے ہیں۔ کمرہ کی آرائش میں مصروف ہیں۔ اور رہ رہ کر کھڑکی کے اوٹ سے تاکتی ہیں۔ گویا کسی کے آنے کا انتظار کر رہی ہیں۔ دفعتاً رام کلی نے خوش ہوکر کہا۔ "سکھی! وہ دیکھو! وہ آرہے ہیں۔ اس وقت ان کے لباس کیسے خوش نما معلوم ہوتے ہیں۔"

ایک لمحہ میں ایک نہایت خوبصورت فٹن پھاٹک کے اندر داخل ہوئی اور برآمدہ میں آکر رُکی۔ اس میں سے بابو امرت رائے اُترے۔ مگر تنہا نہیں ان کا ایک ہاتھ پریما کے ہاتھ میں تھا۔ بابو امرت رائے کا وجیہہ چہرہ گو زرد تھا مگر اس وقت ہونٹوں پر ایک ہلکا سا تبسم نمایاں تھا۔ اور گلابی رنگ کی نوشیروانی اور دھانی رنگ کا بنارسی دوپٹا اور نیلے کنارے کی ریشمی دھوتی اس وقت ان پر قیامت کا پھبن پیدا کررہی تھی۔ پیشانی پر زعفران کا ٹیکہ اور گلے میں خوبصورت ہار اس زیبائش کے اور بھی پر لگا رہے تھے۔

پریما حُسن کی تصویر اور جوانی کی تصویر ہو رہی تھی۔ اس کے چہرہ پر وہ زردی اور نقاہت۔ وہ نقاہت۔ وہ پژمردگی اور خموشی نہ تھی جو پہلے پائی جاتی تھی۔ بلکہ ان کا گلابی رنگ۔ اس کا گدرایا ہوا بدن۔ اس کا انوکھا بناؤ چناؤ اسے نظروں میں کھپائے دیتے ہیں۔ چہرہ کندن کی طرح دمک رہا ہے۔ گلابی رنگ کی سبز حاشیہ کی ساڑی۔ اور اودے رنگ کی کلائیوں پر چنٹ کی ہوئی کرتی اس وقت غضب ڈھا رہی ہے۔ اس پر ہاتھوں میں جڑاؤ کڑے۔ سر پر آڑی رکھی ہوئی جھومر اور پاؤں میں زردوزی کے کام کے خوش نما جوتے اور بھی سونے میں سہاگہ ہو رہے ہیں۔ اس وضع اور اس بناؤ سے بابو صاحب کو خاص اُلفت ہے کیونکہ پورنا کی تصویر بھی یہی لباس پہنے دکھائی دیتی ہے اور نظرِ اول میں کوئی مشکل سے کہہ سکتا

ہے کہ اس وقت پریما ہی کی صورت منعکس ہوکر آئینہ میں یہ جوبن نہیں دکھا رہی ہے۔
بابو امرت رائے نے پریما کو اس کرسی پر بٹھا دیا جو خاص اسی لیے بڑے تکلف سے سجائی گئی تھی اور مسکرا کر بولے۔"پیاری پریما۔ آج میری زندگی کا سب سے مبارک دن ہے۔"
"پریما نے پورنا کی تصویر کی طرف حسرت آلود نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔"ہماری زندگی کا کیوں نہیں کہتے۔"
پریما نے یہ جواب دیا ہی تھا کہ اس کی نظر ایک سُرخ چیز پر جا پڑی جو پورنا کی تصویر کے نیچے ایک خوبصورت دیوار گیری پر دھری ہوئی تھی۔ اس نے فرطِ شوق سے اُسے ہاتھ میں لے لیا۔ دیکھا تو پستول تھا۔ بابو امرت رائے نے گری ہوئی آواز میں کہا۔ یہ پیاری پورنا کی آخری یادگار ہے اس دیوی نے اسی سے میری جان بچائی تھی۔
یہ کہتے کہتے آواز کانپنے لگی اور آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔
یہ سن کر پریما نے اس پستول کا بوسہ لیا اور پھر بڑے ادب کے ساتھ اس کو اسی مقام پر رکھ دیا۔

جلوۂ ایثار

وندھیاچل پہاڑ آدھی رات کی ڈراؤنی تاریکی میں کالے دیو کی طرح کھڑا تھا۔ اس پر اُگے ہوئے چھوٹے چھوٹے درخت ایسے نظر آتے تھے گویا اس کی جٹائیں ہیں اور آشٹ بھجی دیوی کا مندر جس کے کلس پر سیاہ پتاکے ہوا کے دھیمے دھیمے جھونکوں سے لہرا رہے تھے اس دیو کا سر معلوم ہوتا تھا۔ مندر میں ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ نظر آتا تھا جس پر کسی دھندلے تارے کا گمان ہوتا تھا۔

آدھی رات گزرچکی تھی۔ چاروں طرف ہیبت ناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گنگا جی کی سیاہ لہریں پہاڑ کے نیچے سکون بخش روانی کے ساتھ بہہ رہی تھیں اور اُن کے بہاؤ سے ایک دلآویز نغمہ کی صدا نکل رہی تھی۔ جابجا کشتیوں پر اور کگاروں کے آس پاس ملاحوں کے چولھوں کی آنچ نظر آجاتی تھی۔ ایسے وقت میں ایک سفید پوش عورت آشٹ بھجی دیوی کے سامنے ہاتھ باندھے بیٹھی ہوئی تھی اُس کا متین چہرہ زرد تھا۔ اور بشرے سے شرافت برس رہی تھی۔ اُس نے دیر تک سر جُھکائے رہنے کے بعد کہا:

"ماتا! آج بیس سال سے کوئی منگل کا دن ایسا نہیں گزرا کہ میں نے تمھارے چرنوں پر سر نہ جُھکایا ہو۔ ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا کہ میں نے تمھارے چرنوں کا دھیان نہ کیا ہو۔ تم جگ تارنی مہرانی ہو مگر تمھاری اتنی سیوا کرنے پر بھی میرے دل کی آرزو پوری نہ ہوئی۔ میں تمھیں چھوڑکر اب کہاں جاؤں۔"

ماتا! میں نے سینکڑوں برت رکھے دیوتاؤں کی اُپاسنائیں کیں۔ تیرتھ جاترائیں کیں مگر منورتھ نہ پورا ہوا تب تمھارے سرن آئی۔ اب تمھیں چھوڑکر کہاں جاؤں۔ تم نے سدا اپنے بھگتوں کی مرادیں پوری کی ہیں۔ کیا میں تمھارے دربار سے نراش جاؤں۔

سُباما اسی طرح دیرتک بنتی کرتی رہی۔ یکایک اُس کے دل پر بے خبر کردینے والی محویت کا غلبہ ہوا۔ اُس کی آنکھیں بند ہوگئیں اور کان میں آواز آئی:

"سباما! میں تجھ سے بہت خوش ہوئی۔ مانگ کیا مانگتی ہے۔"

سباما کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اور کلیجہ دھڑکنے لگا۔ آج بیس سال کے بعد مہارانی نے درشن دیے۔ کانپتے ہوئے بولی۔"جو کچھ مانگوں گی وہ مہارانی دیں گی؟"

"ہاں ملے گا۔"

"میں نے بڑی تپسیا کی ہے اس لیے بڑا بھاری بَردان مانگوں گی۔"

"کیا لے گی؟ کُبیر کا دھن؟"

"نہیں"

"اِندر کا بل"

"نہیں"

"سرسوتی کی وِدیا؟"

"نہیں!"

"سنسار کا سب سے اُتم پدارتھ!"

"وہ کیا ہے؟"

"سپُوت بیٹا"

"جو کُل کا نام روشن کرے؟"

"نہیں"

"جو ماں باپ کی سیوا کرے؟"

"نہیں"

"جو وِدیاوان اور بلوان ہو؟"

"نہیں"

"پھر سپوت بیٹا کسے کہتی ہے؟"

"جو اپنے دیس کا اُپکار کرے۔"

"تیری بُدھی کو دھنیہ ہے۔ جا تیر اِچھا پوری ہوگی۔"

ویراگ

منشی سالگ رام بنارس کے پُرانے رئیس تھے۔ پیشہ وکالت تھا اور موروثی جائداد وافر۔ دساسمیدھ گھاٹ پر ان کا عالیشان مکان آسمان سے باتیں کرتا تھا۔ فیاض ایسے کہ پچیس تیس ہزار کی آمدنی خرچ کو کافی نہ ہوتی۔ سادھوؤں اور برہمنوں کے پکّے معتقد۔ جو کچھ کماتے برہم بھوج اور سادھوؤں کی تواضع و تکریم میں صرف ہوجاتا شہر میں کوئی سادھو۔ کوئی مہاتما آجائے وہ منشی جی کا مہمان تھا۔ سنسکرت کے ایسے عالم کہ بڑے بڑے پنڈت اُن کا لوہا مانتے۔ ویدانت کے اُصولوں کے پابند تھے اور طبیعت کا میلان ویراگ کی طرف تھا۔

منشی جی کو قدرتاً بچّوں سے بہت اُنس تھا۔ سارے محلّے کے بچّے اُن کی شفقت اور پیار سے فیضیاب ہوتے تھے۔ جب وہ گھر سے نکلتے تو بچّوں کا ایک لشکر ساتھ ہوتا۔ ایک بار کوئی سنگ دل ماں اپنے بچّے کو مار رہی تھی۔ لڑکا بلک بلک کر روتا تھا۔ منشی جی سے ضبط نہ ہوسکا دوڑے۔ بچّے کو گود میں اُٹھا لیا اور عورت کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔ اُس دِن سے اُس نے اپنے لڑکے کو مارنے کی قسم کھالی۔ جو شخص غیروں کے لڑکوں کا ایسا دلدادہ ہو وہ اپنے بچّے کو کتنا پیار کرے گا اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ جب سے بیٹا پیدا ہوا منشی جی دُنیا کے کل کاموں سے کنارہ کش ہوگئے۔ کہیں لڑکے کو ہنڈولے میں جُھلا رہے ہیں اور خوش ہورہے ہیں کہیں اسے خوش نما سیر گاڑی میں بٹھا کر خود کھینچ رہے ہیں۔ ایک لمحہ کے لیے اُسے اپنے پاس سے جُدا نہ کرتے۔ لڑکے کی محبت میں اپنے تئیں بھول گئے۔

سُباما نے لڑکے کا نام پرتاپ چندر رکھا تھا اور جیسا اُس کا نام تھا ویسے ہی اُس کے اوصاف تھے۔ بلا کا ذہین۔ نہایت خوش رو۔ باتیں کرتا تو سُننے والے محو ہوجاتے ستارۂ بلندی پیشانی پر چمکتا تھا۔ اعضا ایسے قوی کہ دوگنے قدوقامت کے لڑکوں کی کچھ حقیقت نہ سمجھتا۔ اس کم سنی ہی میں اُس کا چہرہ ایسا روشن اور متین تھا کہ یکایک کسی غیر شخص کے سامنے آکر کھڑا ہوجاتا تو وہ حیرت سے تکنے لگتا تھا۔

اس طرح ہنستے کھیلتے چھ برس گزر گئے۔ عیش کی دن ہوا کی طرح سَن سے گزر جاتے

ہیں اور خبر نہیں ہوتی۔ وہ سیہ بختی کے دن اور مصیبت کی راتیں ہیں جو کاٹے نہیں کٹتیں۔
پرتاپ کو پیدا ہوئے ابھی کتنے دن گزرے! مبارک باد کی دلآویز صدائیں کانوں میں گونج ہی رہی تھیں کی چھٹی سال گرہ آ پہنچی اور چھٹے سال کا خاتمہ بڑے دنوں کا آغاز تھا۔ منشی سالگ رام کا دُنیاوی تعلق محض نمائشی تھا۔ وہ بے لوث اور بے لگاؤ زندگی بسر کرتے تھے۔ اگرچہ ظاہر میں نگاہوں میں وہ معمولی دنیا داروں کی طرح دُنیا کی کلفتوں سے رنجیدہ اور خوشیوں سے خوش نظر آتے مگر اُن کا دل ہمیشہ اُس اعلیٰ اور پُرسرور سکون کے مزے لیا کرتا تھا۔ جس پر رنج کے جھونکوں اور خوشی کی تھپکیوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

ماگھ کا مہینہ تھا۔ الہ آباد میں کمبھ کا میلہ تھا۔ ریل گاڑیوں میں جاتری روئی کی طرح بھر بھر کر الہ آباد پہنچائے جارہے تھے۔ اسّی ۸۰ اسّی ۸۰ برس کے بڈھے جنھیں برسوں سے اُٹھنا دوبھر تھا۔ لنگڑاتے۔ لاٹھیاں ٹیکتے۔ منزلیں طے کرکے پریاگ راج کو جارہے تھے۔ بڑے بڑے سادھو مہاتما جن کے درشنوں کا اشتیاق لوگوں کو ہمالیہ کی تاریک گپھاؤں میں کھینچ لے جاتا تھا۔ اُس وقت گنگا جی کی پاک لہروں سے گلے ملنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ منشی سالگ رام کا بھی جی للچایا۔ سُباما سے بولے۔"کل اشنان ہے۔"

سُباما۔ "سارا محلّہ سُونا ہوگیا۔ کوئی آدمی نہیں نظر آتا۔"

منشی۔ تم چلنے پر راضی نہیں ہوتیں ورنہ بڑا لُطف رہتا۔ ایسا میلہ تم نے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔

سُباما۔ ایسے میلوں سے میرا جی گھبراتا ہے۔

منشی۔ میرا تو جی نہیں مانتا۔ جب سے سُنا ہے کہ سوامی پرمانند جی آئے ہوئے ہیں۔ تب سے اُن کے درشن کے لیے طبیعت بے قرار ہو رہی ہے۔

سُباما پہلے تو اُن کے جانے پر راضی نہ ہوئی مگر جب دیکھا کہ یہ روکے نہ رُکیں گے تب مجبوراً مان گئی۔ اُسی دن گیارہ بجے رات کو منشی جی پریاگ راج چلے۔ چلتے وقت پرتاپ کا بوسہ لیا اور بیوی کو پیار سے گلے لگا لیا۔ سُباما نے اُس وقت دیکھا کہ اُن کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں۔ اُس کا کلیجہ دھک سے ہوگیا۔ جیسے چیت کے مہینے میں کالی کالی گھٹاؤں کو دیکھ کر کسان کا کلیجہ کانپنے لگتا ہے۔ اُسی طرح منشی جی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر سُباما لرز گئی۔ آنسو کی وہ بوندیں ویراگ اور تیاگ کا اتھاہ سمندر تھیں۔ دیکھنے میں وہ کیسے

ننھے ننھے پانی کے قطرے تھے مگر کیسے گہرے! اور کیسے وسیع!

اُدھر منشی جی مکان سے باہر نکلے اور سُباما نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ کسی نے اُس کے دل میں کہا کہ اب تجھے اپنے پتی کے درشن نہ ہوں گے۔ دو دن گزرے۔ تین دن گزرے۔ چوتھا دن آیا اور چلا گیا۔ یہاں تک کہ پُورا ہفتہ گزر گیا اور منشی جی نہ لوٹے۔ تب تو سُباما کو بیکلی ہونے لگی۔ تار دیے۔ آدمی دوڑائے۔ مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ دوسرا ہفتہ بھی دوادوش میں ختم ہوگیا۔ اور منشی جی کی واپسی کی جو کچھ رہی سہی آمیدیں تھیں وہ بھی خاک میں مِل گئیں۔

منشی جی کا مفقود الخبر ہونا نہ صرف اُن کے خاندان بلکہ سارے شہر کے لیے ایک افسوسناک واقعہ تھا۔ بازاروں میں۔ دُکانوں پر نشستگاہوں میں غرض ہر چہار طرف یہی مرکزِ گفتگو تھا، جو سُنتا افسوس کرتا۔ کیا امیر کیا غریب یہ ماتم عام تھا۔ اُن کی ذات سے چاروں طرف زندہ دلی پھیلی رہتی تھی۔ اب ایک ماتم چھایا ہوا تھا۔ جن گلیوں سے وہ بچّوں کی فوج لے کر نکلتے تھے وہاں اب خاک اُڑ رہی تھی۔ بچّے بار بار اُن کے پاس آنے کے لیے روتے اور ضِد کرتے۔ اُن بے چاروں کو کیا خبر تھی کہ اب وہ محفل ویران ہوگئی۔ اُن کی مائیں آنچل سے مُنہ ڈھانپ کر روتیں۔ جیسے اُن کا کوئی عزیز مر گیا ہو۔

یوں تو منشی جی کے غائب ہونے کا رونا سبھی رو رہے تھے۔ مگر سب سے گاڑھے آنسو اُن آڑھتیوں اور سوداگروں کی آنکھوں سے نکلتے تھے جن کا ابھی حساب و کتاب نہیں ہوا تھا۔ دس بارہ دن تو انھوں نے جوں توں کر کے صبر کیا۔ مگر آخر کب تک ایک ایک کر کے حساب کی فردیں پیش ہونے لگیں۔ کسی برمھ بھوج میں دو سو روپے کا گھی آیا ہے اور قیمت نہیں دی گئی۔ کہیں سے دوسو من میدہ آیا ہوا ہے۔ بزاز کا ہزاروں کا حساب ہے۔ مندر بنواتے وقت ایک مہاجن سے بیس ہزار قرض لیا گیا تھا۔ وہ ابھی جوں کا توں پڑا ہوا ہے۔ مطالبات کا تو یہ حال تھا اور اثاثہ کا یہ حال کہ بجز ایک عالیشان عمارت اور اُس کے لوازمات کے کوئی ایسی جائداد نہ تھی جس سے کوئی رقم کثیر کھڑی ہوسکے اس کے سوا اب کوئی تدبیر نہ تھی کہ علاقہ نیلام پر چڑھا دیا جائے اور اُس کے محاصل سے مطالبات ادا کیے جائیں۔

بے چاری سُباما سر جُھکائے بوریے پر بیٹھی ہوئی تھی اور پرتاپ چند اپنے

لکڑی کے گھوڑے پر سوار آنگن میں ٹخ ٹخ کر رہا تھا کہ پنڈت موٹے رام شاستری جو خاندان کے پروہت تھے مُسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ انھیں خوش دیکھ کر مایوس سُباما چونک کر اُٹھ بیٹھی کہ شاید یہ کوئی خوشخبری لائے ہیں۔ اُن کے لیے آسن بچھا دیا۔ اور اُمیدوار نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ پنڈت جی آسن پر بیٹھے اور سونگھنی سونگھتے ہوئے بولے۔''تم نے مہاجنوں کا حساب دیکھا؟''

سُباما۔ (مایوسانہ لہجہ میں) ''ہاں دیکھا تو''

موٹے رام۔رکم بڑی گہری ہے۔ منشی جی نے آگا پیچھا کچھ نہ سوچا۔ اپنے یہاں کوئی حساب کتاب نہ رکھا۔

سُباما۔ ہاں اب تو یہ رقم گہری ہے۔ نہیں تو اتنا اتنا روپیہ ایک ایک بھوج میں اُٹھ گیا ہے کیا؟

موٹے رام۔سب دن برابر نہیں جاتے۔

سُباما۔ اب تو جو ایشور کرے گا وہ ہوگا۔ میں کیا کر سکتی ہوں۔

موٹے رام۔ہاں ایشور کی اِچھا تو مُول ہی ہے۔ مگر تم نے بھی کچھ سوچا ہے۔

سُباما۔ ہاں علاقہ نیلام کروں گی۔

موٹے رام۔ رام رام یہ کیا کہتی ہو۔ عِلاکہ بک گیا تو پھر بات کیا رہ جائے گی۔

سُباما۔ اس کے سوا اب کوئی تدبیر نہیں ہے۔

موٹے رام۔ بھلا علاکہ ہاتھ سے نکل گیا تو تم لوگوں کا گجربسر کیسے ہوگا۔

سُباما۔ ہمارا ایشو مالک ہے۔ وہ بیڑہ پار لگا دے گا۔

موٹے رام۔ یہ تو بڑے اپسوس کی بات ہوگی کہ ایسے اُپکاری آدمی کے لڑکے بالے دُکھ اُٹھائیں۔

سُباما۔ ایشور کو یہی منظور ہے تو کسی کا کیا بس؟

موٹے رام۔بھلا میں ایک جُگت بتاؤں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

سُباما۔ ہاں بتلایئے آپ کا بڑا اُپکار ہوگا۔

موٹے رام۔پہلے تو ایک درکھاس لکھوا کر کلکٹر صاحب کو دے دو کہ مالگجاری ماپھ کی جائے۔ باکی روپے کا بندوبست ہمارے اوپر چھوڑ دو۔ ہم جو چاہیں گے کریں گے مگر

اِلا کے پر آنچ نہ آنے پائے گی۔

سُباما۔ کچھ معلوم تو ہو آپ اتنا روپے کہاں سے لائیں گے؟

موٹے رام۔ تمھارے لیے روپے کا کلیان۔ منسی جی کے نام پر بلا لکھا پڑھی کے پچاس ہجار روپے کا بندوبست ہوجانا کوئی بڑی بات نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ روپے رکھا ہوا ہے۔ تمھارے منہ سے ہاں نکلنے کی دیر ہے۔

سُباما۔ شہر کے رئیسوں نے جمع کیا ہوگا۔

موٹے رام۔ ہاں بات کی بات میں روپے جمع ہوگیا۔ صاحب کا اسارہ بہت تھا۔

سُباما۔ (کچھ سوچ کر) معافی کی درخواست مجھ سے نہ لکھوائی جائے گی اور نہ اپنے پتی کے نام پر قرض لینا چاہتی ہوں۔ میں سب کا ایک ایک پیسہ علاقہ سے ادا کروں گی۔

یہ کہہ کر سُباما نے رُکھائی کے ساتھ مُنہ پھیر لیا اور اُس کے زرد اور افسوسناک چہرہ پر ہلکا سا غصہ دکھائی دیا۔ موٹے رام نے دیکھا بات بگڑا چاہتی ہے تو سنبھل کر بولے:۔

"اچھا جیسی تمھاری مرجی۔ اس میں کوئی جبرجستی نہیں ہے۔ مدا ہم نے تم کو کسی طرح کا دُکھ اُٹھاتے دیکھا تو اُس دن پرلے ہوجائے گا۔ بس اتنا سمجھ لو۔"

سُباما۔ تو آپ کیا چاہتے ہیں کہ میں اپنے پتی کے نام پر دوسرون کے احسان کا بوجھ رکھوں۔ میں اسی گھر میں جل مروں گی۔ فاقے کرتے کرتے مرجاؤں گی۔ مگر کسی کا احسان نہ اُٹھاؤں گی۔

موٹے رام۔ چھی چھی! تمھارے اوپر اوسان کون کرسکتا ہے۔ کیسی بات مُنہ سے نکالتی ہو۔ کرج لینے میں کوئی سرم نہیں ہے۔کون رئیس ہے جس پر لاکھ دولاکھ کاکرج نہ ہو۔

سُباما۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ اس قرض میں احسان شامل نہیں ہے۔

موٹے رام۔ سُباما! تمھاری بُدھ کہاں گئی ہے۔ بھلا تم سب طرح کے دُکھ اُٹھا لوگی۔ مگر کیا تمھیں اس بالک پر ترس نہیں آتا۔

موٹے رام کی یہ چوٹ کاری پڑی۔ سُباما آبدیدہ ہوگئی اور بیٹے کی طرف پُرحسرت نگاہوں سے دیکھا۔ اس بچّے کے لیے کون کون سی تپسیا نہیں کی۔ کیا اب اس کی تقدیر میں دُکھ اُٹھانا لکھا ہے۔ جو پودا کل ہوا کے تیز جھونکوں سے بچایا جاتا

تھا۔ جس پر آفتاب کی تیز کرنیں نہ پڑنے پاتی تھی۔ جو تروتازگی کے ہنڈولے میں جھول رہا تھا۔ کیا وہ آج اس جلتی ہوئی دُھوپ اور اُس آگ کی لپیٹ میں مرجھائے گا۔سُباما کئی منٹ تک اسی فکر میں بیٹھی رہی۔ موٹے رام دل میں خوش ہو رہے تھے کہ اب بازی مار لی۔ اتنے میں سُباما نے سر اُٹھایا اور بولی۔ جس کے باپ نے لاکھوں کو جلایا کھلایا وہ دوسروں کا آسریت نہیں بن سکتا۔ اگر آپ کا دھرم اس کی مدد کرے گا تو وہ خود دس کو کھلاکر کھائے گا (لڑکے کو بُلاتے ہوئے) "بیٹا! ذرا یہاں آؤ۔ کل سے تمھاری مٹھائی بند۔ دُودھ گھی سب بند ہوجائے گا روؤگے تو نہیں۔" یہ کہہ کر اس نے بیٹے کو پیار سے گود میں بٹھایا اور اُس کے گلابی رُخساروں سے پسینہ پونچھ کر ایک بوسہ لے لیا۔

پرتاپ۔کیا کہا کل سے مٹھائی بند ہوگی۔ کیوں؟ کیا حلوائی کی دُکان میں مٹھائی نہیں ہے؟"

سُباما۔ "مٹھائی تو ہے مگر اس کا روپیہ کون دے گا۔"

پرتاپ۔ "ہم بڑے ہوں گے تو اُس کو بہت سا روپے دیں گے۔ چل ٹخ ٹخ۔ دیکھو اماں کیسا تیز گھوڑا ہے۔" سُباما کی آنکھوں میں پھر آنسو اُمڈ آئے۔ افسوس! کیا اس حسن و نزاکت کے پُتلے پر ابھی سے افلاس کی مصیبتیں آجائیں گی۔ نہیں نہیں۔ میں خود سب بھگت لوں گی مگر اپنے پیارے بچے پر مصیبت کی پرچھائیں نہ آنے دوں گی۔ ماں تو یہ خیال کر رہی تھی۔ اور بیٹا اپنے مُنہ زور بد لگام اسپ چوبیں کو زیر کرنے میں ہمہ تن مصروف تھا۔ بچّے ہوتے ہیں دل کے بادشاہ!

الغرض موٹے رام نے بہت کچھ جال پھیلایا۔ بہت فصاحت و بلاغت صرف کی مگر سُباما نے ایک دفعہ نہیں کرکے ہاں نہ کی۔ اُس کی اس وضعداری کا تذکرہ جس نے سُنا واہ واہ کی۔ لوگوں کے دل میں اُس کی عزّت دوچند ہوگئی۔ اُس نے وہی کیا۔ جو ایسے سیر چشم اور دریا دل آدمی کی بیوی کے شایان شان تھا۔

اس کے پندرھویں دن علاقہ نیلام پر چڑھا۔ پچاس ہزار کی رقم وصول ہوئی کل مطالبے چکا دیے گئے۔ گھر کے بے ضرورت سامان فروخت کردیے گئے۔ مکان میں بھی سُباما نے اندر سے اونچی اونچی دیواریں کھنچوا کے دو علاحدہ علاحدہ درجے کیے ایک میں خود رہنے لگی اور دوسرا کرایہ پر اُٹھا دیا۔

نئے پڑوسیوں سے میل جول

منشی سجیون لال جنھوں نے سُباما کا مکان کرایہ پر لیا تھا۔ اعلیٰ درجہ کے روشن خیال آدمی تھے۔ پہلے ایک سرکاری عہدہ پر ممتاز تھے مگر اپنی آزاد طبیعت کے باعث افسروں کو خوش نہ رکھ سے۔ یہاں تک کہ اُن کی ناراضی سے تنگ آکر استعفا دے دیا دورانِ ملازمت میں تھوڑا سا سرمایہ فراہم کر لیاتھا۔ نوکری چھوڑتے ہی ٹھیکہ داری کی طرف رجوع ہوگئے اور اپنی محنت اور جانفشانی سے تھوڑے ہی عرصہ میں اچھی خاصی حیثیت بنا لی۔ اُس وقت اُن کی آمدنی چار پانچ سو کی اوسط سے کم نہ تھی۔ کچھ ایسی معاملہ فہم طبیعت پائی تھی کہ جس تعمیر میں ہاتھ لگاتے نفع کے سوا نقصان نہ ہوتا۔

منشی سجیون لال کا کنبہ بہت بڑا نہ تھا۔ اولادیں تو ایشور نے کئی دیں مگر وہ سب بچپنے ہی میں داغ مفارقت دےئ گئی تھیں۔ اب اس وقت ماں باپ کے آنکھوں کی پُتلی صرف ایک لڑکی تھی۔ اس کا نام برج رانی تھا۔ وہی والدین کی زندگی کا سہارا تھی۔

پرتاپ چندر اور برج رانی میں پہلے ہی دِن سے دوستی شروع ہوگئی۔ آدھ گھنٹہ میں دونوں چڑیوں کی طرح چہکنے لگے۔ برجن نے اپنی گڑیاں۔ کھلونے۔ باجے دکھائے پرتاپ نے اپنی کتابیں۔ قلم اور تصویریں پیش کیں۔ برجن کی ماں (سوشیلا) نے پرتاپ کو گود میں لے لیا اور خوب پیار کیا۔ اُس دن سے وہ روز شام کو آتا۔ دونوں ہم جولی ساتھ ساتھ کھیلتے ایسا معلوم ہوتا کہ دونوں بھائی بہن ہیں۔ سوشیلا دونوں بچّوں کو گود میں بٹھاتی اور پیار کرتی۔ گھنٹوں ٹکٹکی لگائے دونوں بچّوں کو دیکھا کرتی۔ برجن بھی کبھی کبھی پرتاپ کے گھر جاتی۔ مصیبت کی ماری سُباما اُسے دیکھ کر اپنی مصیبت بھول جاتی۔ چھاتی سے لگا لیتی اور اُس کی بھولی بھالی باتیں سُن کر اپنا غم غلط کرتی۔

ایک روز منشی سجیون لال باہر سے آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ پرتاپ اور برجن دونوں دفتر میں کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ پرتاپ کوئی کتاب پڑھ رہا ہے اور برجن دھیان لگائے سُن رہی ہے۔ دونوں نے جوں ہی منشی جی کو دیکھا اُٹھ کھڑے ہوئے۔ برجن تو دوڑ کر باپ کی گود میں جا بیٹھی اور پرتاپ سر نیچا کرکے ایک طرف کھڑا ہوگیا۔ کیسا ذی شعور لڑکا تھا۔ سِن

ابھی آٹھ سال سے زیادہ نہ تھا۔ مگر بشرے سے آنے والی عظمت جھلک رہی تھی۔ روشن اور مردانہ چہرہ۔ پاک و صاف ہاتھ پاؤں۔ پتلے پتلے سرخ ہونٹھ۔ تیز چلتی ہوئی نگاہیں۔ کالے کالے بھونرے کی طرح بال اُس پر کپڑے صاف سُتھرے۔ منشی جی نے کہا۔"یہاں آؤ پرتاپ۔" پرتاپ آہستہ آہستہ کچھ ہچکچاتا۔ کچھ لجاتا قریب آیا۔ منشی جی نے پدرانہ محبت سے گود میں بٹھا لیا اور پوچھا۔"تم ابھی کون سی کتاب پڑھ رہے تھے؟"

پرتاپ بولنے ہی کو تھا کہ برجن بول اُٹھی"بابا بڑی اچھی اچھی کہانیاں تھیں۔ کیوں بابا کیا پہلے چڑیاں بھی ہماری طرح باتیں کرتی تھیں؟"

منشی جی مسکرا کر بولے۔"ہاں وہ خوب بولتی تھیں۔"

ابھی اُن کے مُنہ سے پوری بات بھی نہ نکلنے پائی تھی کہ پرتاپ جس کا شرمیلاپن اب دُور ہو چلا تھا۔ بول اُٹھا۔"نہیں برجن۔ تمھیں جُھٹلاتے ہیں۔ یہ کہانیاں بنائی ہوئی ہیں۔"

منشی جی اس بیباکانہ تردید پر خوب ہنسے۔

اب تو پرتاپ بلبل کی طرح چہکنے لگا۔ اسکول اتنا بڑا ہے کہ شہر بھر کے لوگ اُس میں بیٹھ جائیں۔ دیواریں اتنی اونچی ہیں جیسے تاڑ۔ بلدیو پرشاد نے جو گیند میں ہٹ لگائی تو وہ آسمان میں چلا گیا۔ بڑے ماسٹر صاحب کی میز پر ہری ہری بانات بچھی ہوئی ہے۔ اُس پر پھولوں سے بھرے گلاس رکھے رہتے ہیں۔ گنگا جی کا پانی سفید ہے۔ ایسی زور سے بہتا ہے کہ پہاڑ بھی ہو تو بہہ جائے۔ وہاں ایک سادھو بابا ہیں۔ ریل دوڑتی ہے سَن سَن۔ اُس کا انجن بولتا ہے بھک بھک۔ انجن میں بھاپ ہوتی ہے۔ اُسی کے زور سے سے گاڑی چلتی ہے۔ گاڑی کے ساتھ ساتھ درخت بھی دوڑتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح کی کتنی باتیں پرتاپ نے اپنی بھولی زبان میں بیان کیں۔ برجن تصویر کی طرح خاموش بیٹھی ہوئی سُن رہی تھی۔ ریل پر وہ بھی دو تین بار سوار ہوئی تھی۔ مگر اُسے آج تک یہ نہ معلوم ہوا کہ اُسے کِس نے بنایا۔ اور وہ کیونکر چلتی ہے۔ دو تین بار اُس نے اپنے گوروجی سے یہ سوال کیا تھا۔ مگر انھوں نے یہی کہہ کر ٹال دیا کہ بچّہ ایشور کی مہما اپرم پار ہے۔ برجن نے بھی سمجھ رکھا تھا کہ ایشور کی مہما کوئی بڑا بھاری اور طاقتور گھوڑا ہوگا۔ جو اتنی گاڑیوں کو سَن سَن کھینچے لیے جاتا ہوگا۔ جب پرتاپ خاموش ہوا تو برجن نے باپ کے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہا:۔

"بابا ہم بھی پرتاپ کی کتاب پڑھیں گے۔"

منشی۔ بیٹی تم تو سنسکرت پڑھتی ہو۔ یہ تو بھاشا ہے۔

برجن۔ تو میں بھی بھاشا ہی پڑھوں گی۔ اس میں کیسی اچھی اچھی کہانیاں ہیں۔ میری کتاب میں تو ایک کہانی بھی نہیں۔ کیوں بابا پڑھنا کسے کہتے ہیں؟

منشی جی بغلیں جھانکنے لگے۔ اُنھوں نے آج تک خود کبھی غور نہیں کیا تھا کہ پڑھنا کیا چیز ہے۔ ابھی وہ سر ہی کھجلا رہے تھے کہ پرتاپ بول اُٹھا۔"مجھے تم نے پڑھتے دیکھا۔ اسی کو پڑھنا کہتے ہیں۔"

برجن۔کیا میں نہیں پڑھتی۔ میرے پڑھنے کو پڑھنا نہیں کہتے؟

برجن سِدّھانت کومدی پڑھ رہی تھی۔ پرتاپ نے کہا۔"تم طوطے کی طرح رٹتی ہو۔"

رشتۂ اتحاد مضبوط ہوتا ہے

کچھ عرصہ سے سُباما نے گنجائش نہ دیکھ کر مہر جن، کہار اور دو مہریوں کو جواب دے دیا تھا۔ کیونکہ اب نہ تو اُن کی کوئی ضرورت تھی اور نہ اُن کا خرچ سنبھالے سنبھلتا تھا۔ صرف ایک بُڑھیا مہری باقی رہ گئی تھی۔ اوپر کا کام کاج وہ کرتی اور کھانا سُباما اپنے ہاتھ سے پکالیتی۔ مگر بے چاری ایسی سخت محنت کی عادی تو تھی نہیں۔ چند ہی دنوں میں اسے تھکن کے سبب سے رات کو حرارت رہنے لگی۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچی کہ جب دیکھیے حرارت موجود۔ جسم پُھنکا جاتا ہے۔ نہ کھانے کی طرف رغبت ہے نہ پینے کی طرف۔ کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ مگر وہ ہے کہ روز معمول کے موافق کام کیے جاتی ہے۔ دوا دارو کی بھی کوئی فکر نہیں اور نہ کسی سے اُس کا ذکر کرتی ہے۔ جب تک پرتاپ گھر پر رہتا ہے۔ تب تک وہ چہرے کو ذرا بھی مدھم نہیں ہونے دیتی۔ مگر جوں ہی وہ مدرسہ چلا جاتا ہے۔ لحاف اوڑھ کر پڑ رہتی ہے اور دن بھر پڑے پڑے کراہا کرتی ہے۔

پرتاپ سمجھدار لڑکا تھا۔ ماں کی حالت روز بروز خراب ہوتے دیکھ کر تاڑ گیا کہ یہ بیمار ہے۔ ایک دن اسکول سے لوٹا تو سیدھا اپنے گھر گیا۔ بیٹے کو دیکھتے ہی سُباما نے اُٹھ بیٹھنے کی کوشش کی۔ مگر مارے ضعف کے چکّر آگیا۔ اور ہاتھ پاؤں اکڑ گئے۔ پرتاپ نے اُسے سنبھالا اور اُس کی طرف ملائمیت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر بولا۔"اماں تم آج کل بیمار ہو گیا۔ اتنی دُبلی کیوں ہوگئی ہو۔ دیکھو تمھارا جسم کتنا گرم ہے۔ ہاتھ نہیں رکھا جاتا۔"

سُباما نے ہنسنے کی کوشش کی۔ اپنی بیماری کا اظہار کرکے بیٹے کو کیسے تکلیف دے۔ مامتا پاک اور بے غرض محبت کا انتہائی درجہ ہے۔ آواز کو ہلکا بنا کر بولی۔"نہیں بیٹا بیمار تو نہیں ہوں۔ آج ذرا حرارت ہو آئی تھی۔ شام تک بالکل اچھی ہوجاؤں گی۔ الماری میں حلوا رکھا ہوا ہے نکال لو۔ نہیں تم آؤ بیٹھو۔ میں ہی نکالے دیتی ہوں۔"

پرتاپ۔ اماں تم مجھ سے بہانہ کرتی ہو۔ تم ضرور بیمار ہو۔ ایک دن میں کوئی اتنا دُبلا نہیں ہوجاتا۔

سُباما۔ (ہنس کر) کیا تمھارے دیکھنے میں میں دُبلی ہوگئی ہوں۔ مجھے تو نہیں معلوم ہوتا۔

پرتاپ۔ میں ڈاکٹر صاحب کے یہاں جاتا ہوں۔

سُباما۔ (پرتاپ کا ہاتھ پکڑکر) تم کیا جانو وہ کہاں رہتے ہیں؟

پرتاپ۔ پُوچھتے پُوچھتے چلا جاؤں گا۔

سُباما کچھ اور کہا چاہتی تھی۔ کہ اُسے پھر چکر آیا۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ پرتاپ اُس کی یہ حالت دیکھتے ہی سہم گیا۔ اور کچھ تو نہ ہوسکا۔ دوڑا ہوا برجن کے دروازہ پر آیا اور کھڑا ہوکر رونے لگا۔

ہرروز وہ اس وقت تک برجن کے گھر پہنچ جاتا تھا۔ آج جو دیر ہوئی تو وہ گھبرائی ہوئی اِدھراُدھر پھر رہی تھی۔ یکایک جو دروازہ پر جھانکنے آئی تو پرتاپ کو دونوں ہاتھوں سے مُنہ چھپائے دیکھا۔ پہلے تو سمجھی کہ اُس نے دل لگی سے مُنہ چھپالیا ہے۔ مگر جب اُس کے ہاتھ ہٹائے تو آنسو نظر آئے۔ چونک کر بولی۔ "للّو کیوں روتے ہو؟ بتا دو۔"

پرتاپ نے کچھ جواب نہ دیا۔ بلکہ اور سسکنے لگا۔

برجن۔ نہ بتاؤگے۔ کیا چچّی نے کچھ کہا ہے۔ جاؤ تم چُپ نہیں ہوتے۔

پرتاپ نے کہا۔ "نہیں برجن۔ اماں بہت بیمار ہیں۔"

یہ سنتے ہی برج رانی دوڑی اور دم زدن میں سُباما کے سرہانے آکھڑی ہوئی دیکھا تو وہ بے حس و حرکت پڑی ہے۔ آنکھیں بند ہیں اور سانس زور زور سے چل رہی ہے ہاتھ پکڑکر جھنجھوڑنے لگی۔ "چچی کیسا جی ہے۔ آنکھیں کھولو۔ کیسا جی ہے؟"

مگر چچی نے آنکھیں نہ کھولیں۔ تب اُس نے طاق پر سے تیل اُتار لیا اور سُباما کے سر میں ڈال کر آہستہ آہستہ ملنے لگی۔اُس غریب کے سر میں مہینوں سے تیل پڑنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ ٹھنڈک پہنچی تو آنکھیں کُھل گئیں۔

برجن۔ چچی۔ کیسا جی ہے؟ کہیں درد تو نہیں؟

سُباما۔ نہیں بیٹی درد کہیں نہیں ہے۔ اب میں بالکل اچھی ہوں۔ بھیّا کہاں ہے؟

برجن۔ وہ تو میرے گھر ہیں۔ بہت رو رہے تھے۔

سُباما۔ تم جاؤ اُس کے ساتھ کھیلو۔ اب میں بالکل اچھی ہوں۔

برجن۔ میں ابھی نہ جاؤں گی۔ جب تم اچھی ہوجاؤگی۔ تب جاؤں گی۔

ابھی یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ سوشیلا بھی داخل ہوئی۔ اُسے سُباما سے ملنے کا تو بہت دنوں سے اشتیاق تھا۔ مگر کوئی موقع نہ ملتا تھا۔ اس وقت عیادت کے بہانے سے آپہنچی۔ برجن نے اپنی ماں کو دیکھا تو اُچھل پڑی اور تالی بجابجا کر کہنے لگی۔ اماں آئیں۔ اماں آئیں۔

دونوں عورتوں میں شکوہ شکایت ہونے لگی۔ باتوں باتوں میں چراغ جل گیا۔ کسی کو خیال بھی نہ گزرا کہ پرتاپ کہاں ہے۔ ذرا دیر تک تو وہ دروازے پر کھڑا روتا رہا پھر یکایک آنکھیں پونچھ کر ڈاکٹر کے مکان کی طرف لپکتا ہوا چلا۔ ڈاکٹر صاحب منشی سالگ رام کے دوستوں میں تھے اور جب کبھی ضرورت ہوتی وہ بلائے جاتے۔ پرتاپ کو صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ برنا ندی کے کنارے لال بنگلے میں رہتے ہیں۔ اُسے اب تک اپنے محلّہ سے باہر نکلنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ مگر اس وقت فرزندانہ جوش کی بے قراری میں اُسے اِن رکاوٹوں کا مطلق دھیان نہ آیا۔ گھر سے نکل کر بازار میں آیا اور ایک یکہ والے سے بولا۔ لال بنگلے چلو گے؟ لال بنگلہ مشہور جگہ تھی۔ یکہ والا تیار ہوگیا۔ اور آٹھ بجتے بجتے ڈاکٹر صاحب کی فٹن سُباما کے دروازے پر آپہنچی۔ یہاں اس وقت چاروں طرف اُس کی تلاش ہورہی تھی کہ دفعتاً وہ متانت کے ساتھ قدم بڑھاتا اندر آگیا۔ اور بولا۔"پردہ کرو ڈاکٹر صاحب آتے ہیں۔"

سُباما اور سوشیلا دونوں چونک پڑیں۔ سمجھ گئیں کہ یہ ڈاکٹر صاحب کو بلانے چلا گیا تھا۔ سُباما نے فرطِ محبت سے اُسے گود میں بٹھالیا اور آنکھوں میں آنسوں بھر کر پوچھنے لگی۔ کیا اکیلے چلے گئے تھے۔ تمھیں راستہ کیسے معلوم ہوا۔ ڈر نہیں لگا؟ ہم سے بتلایا بھی نہیں۔ یوں ہی چلے۔ تم کھو جاتے تو میں کیا کرتی۔ ایسا لال کہاں پاتی۔ یہ کہہ کہہ کر اس نے بیٹے کو باربار چُوما۔ پرتاپ ایسا خوش تھا گویا امتحان میں پاس ہوگیا۔ ذرا دیر میں پردہ ہوا اور ڈاکٹر صاحب آئے۔ سُباما کی نبض دیکھی۔ تشفی دی۔ پرتاپ کو گود میں بٹھا کر باتیں کرتے رہے۔ دوا ساتھ لیتے آئے تھے۔ اُسے پلانے کی تاکید کرکے نو بجے اپنے بنگلے کو واپس گئے۔ مگر چونکہ بُخار پُرانا تھا۔ پورے مہینہ بھر سُباما کو کڑوی کڑوی دوائیں پینی پڑیں۔ ڈاکٹر صاحب دونوں وقت آتے اور ایسی توجہ اور شفقت سے پیش آتے۔ گویا سُباما اُن کی بہن ہے۔ ایک

دفعہ سُبالا نے ڈرتے ڈرتے فیس کے روپے ایک طشتری میں رکھ کر پیش کیے مگر ڈاکٹر صاحب نے اُنھیں ہاتھ تک نہ لگایا۔ صرف اتنا کہا۔ "اسے میری طرف سے پرتاپ کو دے دیجیے گا۔ وہ پاؤں پاؤں مدرسے جاتا ہے۔ پیر گاڑی مول لے لے گا۔"

برجن اور اس کی ماں دونوں آٹھوں پہر اُس کی تیمارداری کے لیے حاضر رہتیں۔ ماں چاہے تساہلی بھی کرجائے مگر برجن وہاں سے ایک دم کو بھی نہ ہٹتی۔ دوا پلاتی۔ پانی دیتی۔ جب سُبالا کی طبیعت ہلکی ہوتی تو اُس سے بھولی بھولی باتیں کرکے اُس کا دل بہلاتی۔ کھیلنا کودنا سب چھوٹ گیا۔ جب سُبالا بہت اصرار کرتی تو ذرا دیر کے لیے پرتاپ کے ساتھ باغیچہ میں کھیلنے چلی جاتی چراغ جلتے ہی پھر آ بیٹھتی اور جب تک مارے نیند کے جُھک جُھک نہ پڑتی وہاں سے اُٹھنے کا نام نہ لیتی۔ بلکہ اکثر وہیں سوجاتی۔ رات کو آدمی گود میں اُٹھا کر گھر لے جاتا۔ نہیں معلوم اُسے ایسی کیا دُھن سوار ہوگئی تھی۔

ایک دن برج رانی سُبالا کے سرہانے بیٹھی پنکھا جھل رہی تھی۔ نہ جانے کس خیال میں غرق تھی۔ آنکھیں دیوار کی طرف لگی ہوئی تھیں اور جس طرح درختوں پر چاندنی لہراتی ہے اُسی طرح ہلکی ہلکی مُسکراہٹ اُس کے لبوں پر لہرا رہی تھی۔ اُسے مطلق خبر نہ تھی کہ چچی میری طرف تاک رہی ہیں۔ دفعتاً اُس کے ہاتھ سے پنکھیا چھوٹ پڑی۔ جوں ہی وہ اسے اُٹھانے کے لیے جھکی کہ سُبالا نے اُسے گلے سے لگا لیا۔ اور چمکار کر پوچھا۔ "برجن سچ بتلاؤ۔ تم اب کیا سوچ رہی تھیں؟"

برجن نے سر جھکا لیا اور کچھ شرما کر بولی۔ "کچھ نہیں تم سے نہ بتلاؤں گی۔"

سُبالا۔ (چمکار کر) میری اچھی برجن۔ بتا دے کیا سوچتی تھی۔

برجن۔ (لجاتے ہوئے) سوچتی تھی کہ ...... جاؤ ہنسو مت ...... نہ بتلاؤں گی۔

سُبالا۔ اچھا نہ ہنسوں گی۔ بتاؤ۔ لے یہی تو اب اچھا نہیں لگتا۔ پھر میں آنکھ بند کرلوں گی۔

برجن۔ کسی سے کہوگی تو نہیں؟

سُبالا۔ نہیں کسی سے نہ کہوں گی۔

برجن۔ سوچتی تھی کہ جب پرتاپ سے میرا بیاہ ہوجائے گا تو خوب مزے سے رہوں گی۔

سُبالا نے اُسے سینے سے چمٹا لیا اور بولی "پیاری وہ تو تیرا بھائی ہے۔"

برجن۔ ہاں بھائی ہے۔ میں جان گئی تم مجھے بہو نہ بناؤ گی۔

سُباما۔ آج للو کو آنے دو۔ اس سے پُوچھوں گی دیکھوں کیا کہتا ہے۔

برجن۔ نہیں نہیں اُن سے نہ کہنا۔ میں تمھارے پیروں پڑوں۔

سُباما۔ میں تو کہہ دوں گی۔

برجن۔ تمھیں ہماری قسم ان سے نہ کہنا۔

شریفانہ زندگی کے نظارے

دن جاتے دیر نہیں لگتی۔ دو سال گزرے گئے۔ پنڈت موٹے رام روز علی الصباح آتے اور سِدھانت کومدی پڑھاتے۔ حالانکہ اب اُن کا آنا محض رسماً تھا۔ کیونکہ اس کتاب کے پڑھنے میں برجن کا دل مطلق نہ لگتا۔ ایک روز انجینئر کے دفتر سے آئے۔ کمرہ میں بیٹھے تھے۔ نوکر جُوتے کا فیتہ کھول رہا تھا کہ ردھیا مہری مُسکراتی ہوئی گھر میں سے نکلی اور اُن کے ہاتھ میں ایک سر بہ مہر لفافہ رکھ دیا اور مُنہ پھیر کر ہنسنے لگی۔ سرنامہ پر لکھا ہوا تھا"بخدمت جناب بابا صاحب برسد۔"

منشی۔ ارے تو کس کا لفافہ لے آئی۔ یہ میرا نہیں ہے۔

مہری۔ سرکار ہی کا تو ہے۔ کھولیں تو آپ۔

منشی۔ کس نے دیا کوئی آدمی باہر سے آیا تھا؟

مہری۔ (مسکراتی ہوئی) آپ کھولیں گے تو پتہ لگ جائے گا۔

منشی جی نے حیرت میں آکر لفافہ کھولا تو یہ عبارت لکھی ہوئی تھی۔

بابا کو برجن کا پرنام اور پالاگن پہنچے۔ یہاں آپ کی کرپا سے کُشل منگل ہے۔ آپ کا کُشل منگل شری وشوناتھ جی سے سدا منایا کرتی ہوں۔ میں نے پرتاپ سے بھاشا سیکھ لی وہ اسکول سے شام کو آکر مجھے روز پڑھاتے ہیں اور اب آپ ہمارے لیے اچھی اچھی کتابیں لائیے۔ کیونکہ پڑھنا ہی زندگی کا سُکھ ہے اور وِدّیا انمول چیز ہے۔ ویدپران میں اُس کا مہاتم لکھا ہوا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وِدّیا دھن دل و جان سے جمع کرے۔ وِدّیا سے سب دُکھ دُور ہوجاتے ہیں۔ میں نے کل شام کو بیتال پچیسی کی کہانی چچی کو سُنائی تھی اُنھوں نے مجھے ایک خوبصورت گڑیا انام دی ہے۔ بہت اچھی ہے۔ میں اُس کا بیاہ کروں گی۔ تب آپ سے روپے لوں گی۔ میں اب پنڈت جی سے نہ پڑھوں گی۔ امّاں نہیں جانتیں کہ میں بھاشا پڑھتی ہوں۔

آپ کی پیاری "برجن"

القاب دیکھتے ہی منشی جی کے کلیجے میں گدگدی محسوس ہونے لگی۔ پھر تو ایک ہی نظر میں سارا خط پڑھ ڈالا۔ مارے خوشی کے ننگے پاؤں ہنستے ہوئے اندر دوڑے۔ پرتاپ کو گود میں اُٹھا لیا۔ اور دونوں بچّوں کا ہاتھ پکڑے ہوئے سوشیلا کے پاس گئے اور خط دکھا کر کہا۔ ''بُوجھو کِس کا خط ہے؟''

سوشیلا۔ لاؤ ہاتھ میں دو۔ دیکھوں۔

منشی جی۔ نہیں وہیں سے بیٹھے بیٹھے بتاؤ۔ جلدی۔

سوشیلا۔ بُوجھ جاؤں تو کیا دوگے۔

منشی جی۔ پچاس روپے دودھ کے دھوئے ہوئے۔

سوشیلا۔ پہلے روپے نکال کر رکھ دو۔ نہیں تو مکر جاؤگے۔

منشی جی۔ مکر نے والے کو کچھ کہتا ہوں۔ ابھی روپے لو۔ ایسا کوئی ٹٹ پونجیا سمجھ لیا ہے؟

یہ کہہ کر دس روپے کا ایک نوٹ جیب سے نکال کر دکھایا۔

سوشیلا۔ کتنے کا نوٹ ہے؟

منشی جی۔ پچاس روپے کا۔ ہاتھ میں لے کر دیکھ لو۔

سوشیلا۔ لے لوں گی۔ کہے دیتی ہوں۔

منشی جی۔ ہاں ہاں۔ لے لینا۔ پہلے بتاؤ تو سہی۔

سوشیلا۔ للّو کا ہے۔ لائیے نوٹ۔ اب میں نہ مانوں گی۔

یہ کہہ کر وہ اُٹھی اور منشی جی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

منشی جی۔ ایسی کیا رہزنی ہے۔ نوٹ چھینے لیتی ہو۔

سوشیلا۔ زبان نہیں دی تھی۔ ابھی سے مکرنے لگے۔

منشی جی۔ تم نے بُوجھا بھی؟ صاف دھوکا کھا گئیں۔

سوشیلا۔ چلو چلو۔ بہانہ کرتے ہو۔ نوٹ ہضم کرنے کی نیت ہے۔ کیوں للّو یہ تمھارا ہی خط ہے نہ؟

پرتاپ نے نیچی نگاہوں سے منشی جی کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا ''میں نے کہاں لکھا؟''

منشی جی۔ شرماؤ شرماؤ۔

سوشیلا۔ وہ جھوٹ بولتا ہے۔ اُسی کا خط ہے۔ تم لوگ آپس میں گٹھ کر آئے ہو۔
پرتاپ۔ میرا خط نہیں ہے۔ سچ۔ برجن نے لکھا ہے۔

سوشیلا کے مُنہ سے بے اختیار نکلا۔''برجن کا۔'' اور اُس نے دوڑکر شوہر کے ہاتھ سے خط چھین لیا اور بھوچک ہوکر اُسے دیکھنے لگی۔ مگر اب بھی یقین نہ آیا۔ برجن سے پوچھا۔''کیوں بیٹی یہ تمھارا لکھا ہے۔'' برجن نے سر جُھکاکر کہا۔''ہاں۔'' یہ سُنتے ہی ماں نے اُسے گلے لگا لیا۔ اب آج سے برجن کا یہ حال ہوگیا کہ جب دیکھیے قلمدان لیے بیٹھی ہے اور کاغذ سیاہ کر رہی ہے۔ گھر کے کام دھندے سے تو اسے پہلے ہی سے کچھ سروکار نہ تھا۔ لکھنے کا آنا سونے پر سہاگہ ہوگیا۔ ماں اس کی مصروفیت دیکھ کر خوش ہوتی۔ باپ پھُولا نہ سماتا۔ نِت نئی کتابیں لاتا کہ برجن ہوشیار ہوجائے گی تو پڑھے گی۔ اگر وہ کبھی اپنا پیر آپ دھولیتی یا کھانا کھاکر آپ ہی ہاتھ دھونے لگتی تو ماں مہریوں پر برس پڑتی۔ آنکھیں پھوٹ گئی ہیں۔ چربی چھا گئی ہے۔ وہ اپنے ہاتھ سے پانی اُنڈیل رہی ہے اور تم کھڑی مُنہ تاکتی ہو۔

اسی طرح دن گزرتے چلے گئے۔ برجن کا بارھواں سال پورا ہوا مگر ابھی تک اُسے چاول اُبالنے کا شعور نہ تھا۔ چولھے کے سامنے بیٹھنے کا کبھی اتفاق ہی نہیں ہوا۔ سُباما نے ایک دن اُس کی ماں سے کہا۔''بہن برجن سیانی ہوئی۔ کیا کچھ گُن ڈھنگ نہ سکھاؤ گی؟''

سوشیلا۔ کیا کہوں۔ جی تو چاہتا ہے کہ لگا لگاؤں مگر کچھ سوچ کر رہ جاتی ہوں۔
سُباما۔ کیا سوچ کر رہ جاتی ہو؟
سوشیلا۔ کچھ نہیں۔ آلکس آجاتا ہے۔
سُباما۔ تو یہ کام میرے سپرد کردو۔ کھانا پکانا عورتوں کے لیے سب سے ضروری بات ہے۔
سوشیلا۔ ابھی چولھے کے سامنے اُس سے بیٹھا نہ جائے گا۔
سُباما۔ کام کرنے ہی سے آتا ہے۔
سوشیلا۔ (جھینپتے ہوئے) پھُول سے گال کُمھلا جائیں گے۔
سُباما۔ (ہنس کر) بلا پھول کے مُرجھائے کہیں پھل لگا ہے؟

دوسرے دن سے برجن کھانا پکانے لگی پہلے دس پانچ دن اُسے چولھے کے سامنے بیٹھنے میں سخت تکلیف ہوئی۔ آگ نہ جلتی۔ پھُونکنے لگتی تو آنکھوں سے پانی

بہتا۔ وہ بوٹی کی طرح لال ہوجاتیں۔ چنگاریوں سے کئی ریشمی ساڑیاں ستیاناس ہوگئیں۔ ہاتھوں میں چھالے پڑگئے مگر رفتہ رفتہ یہ سب مصیبتیں رفع ہوگئیں۔ سُباما ایسی نیک مزاج عورت تھی کہ کبھی ناراض نہ ہوتی۔ ہمیشہ چمکار کر اُسے کام میں لگائے رہتی۔

ابھی برجن کو کھانا پکاتے دو ماہ سے زیادہ نہ گزرے ہوں گے کہ ایک دن اُس نے پرتاپ سے کہا۔"للو مجھے کھانا پکانا آگیا۔"

پرتاپ۔ سچ!

برجن۔ کل چچی نے میرا پکایا کھانا کھایا تھا۔ بہت خوش ہوئیں۔

پرتاپ۔ تو بھئی ایک دن میری بھی دعوت کرو۔

برجن۔ (خوش ہوکر) اچھا کل۔

دوسرے دن نو بجے برجن نے پرتاپ کو کھانے کے لیے بُلایا۔ اُس نے جاکر دیکھا تو چوکا لگا ہوا ہے۔ تازی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو آرہی ہے۔ آسن صفائی سے بچھا ہوا ہے۔ ایک تھالی میں چاول اور چپاتیاں ہیں دال اور ترکاریاں الگ الگ کٹوروں میں رکھی ہوئی ہیں۔ لوٹا اور گلاس پانی سے بھرا ہوا موجود ہے۔ یہ صفائی اور سلیقہ دیکھ کر پرتاپ سیدھا دوڑا ہوا منشی سجیون لال کے پاس گیا اور انھیں لاکر چوکے کے سامنے کھڑا کردیا۔ منشی جی فرطِ مسرت سے اُچھل پڑے چپ کپڑے اُتار ہاتھ پَیر دھو پرتاپ کے ساتھ چوکے میں جا بیٹھے۔ بے چاری برجن کو کیا معلوم تھا کہ یہ حضرت بھی بن بلائے مہمان ہوجائیں گے۔ اُس نے صرف پرتاپ کے لیے کھانا بنایا تھا۔ اس وقت بہت شرمائی اور نیچی نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھنے لگی۔ سوشیلا تاڑ گئی۔ مسکراکر منشی جی سے بولی۔"تمھارے لیے کھانا تیار ہے۔ لڑکوں کے بیچ میں کیا آکے کود پڑے۔"

برج رانی نے شرماتے ہوئے دو تھالیوں میں تھوڑا تھوڑا کھانا پرسا۔

منشی جی۔ برجن نے چپاتیاں خوب بنائی ہیں۔ نرم۔ سفید اور میٹھی۔

پرتاپ۔ چاول دیکھیے۔ بکھرا دو اور چُن لو۔

منشی جی۔ میں نے ایسی چپاتیاں کبھی نہیں کھائیں۔ سالن بہت لذیذ ہے۔

پرتاپ۔ برجن! چچا کو شوربے دار آلو دو۔

یہ کہہ کر ہنسنے لگا۔ برجن نے لجاکر سر نیچا کرلیا۔ بتلی خشک ہو رہی تھی۔

سوشیلا۔ (شوہر سے) اب اُٹھوگے بھی؟ ساری رسوئیں چٹ کرگئے اور ابھی اڑے بیٹھے ہو۔

آخر دونوں آدمی رسوئیں کا صفایا کرکے اُٹھے۔ منشی جی نے اُسی وقت ایک اشرفی نکال کر برجن کو انعام دی۔

ڈپٹی شیاما چرن

ڈپٹی شیاما چرن کا رعب سارے شہر پر طاری تھا۔ شہر میں کوئی ایسا حاکم نہ تھا۔ جس کی لوگ اتنی عزت کرتے ہوں۔ اس کا باعث کچھ تو یہ تھا کہ وہ مزاج کے بہت خلیق اور حلیم تھے اور کچھ یہ کہ رشوت سے اُنھیں قطعی احتراز تھا۔ منصفانہ نگاہ ایسی باریک تھی کہ دس بارہ برس کے عرصہ میں مشکل سے اُن کے دوچار فیصلوں کی اپیل ہوئی ہوگی۔ انگریزی کا ایک حرف نہ جانتے تھے مگر اچھے اچھے بیرسٹروں اور وکیلوں کو بھی ان کی قانونی دستگاہ اور نکتہ رسی پر حیرت ہوتی تھی۔ مزاج میں آزاد پسندی کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ مکان اور کچہری کے سوا کسی نے اُنھیں اور کہیں آتے جاتے نہیں دیکھا۔ منشی سالگ رام جب تک زندہ یا یوں کہو کہ موجود تھے تو کبھی کبھی اُن کے یہاں تفریحاً چلے جاتے تھے۔ جب سے وہ لاپتہ ہوئے ڈپٹی صاحب نے گھر چھوڑکر ملنے کی قسم کھا لی۔ کئی برس ہوئے ایک بار کلکٹر صاحب کے سلام کو حاضر ہوئے تھے۔ خانساماں نے کہا صاحب غسل کر رہے ہیں دو گھنٹہ تک برآمدے میں ایک مونڈھے پر بیٹھے انتظار کرتے رہے۔ اس کے بعد صاحب بہادر ہاتھ میں ایک ٹینس بیٹ لیے ہوئے نکلے اور معذرت کے طور پر کہا۔ "بابو صاحب ہم کو بہت افسوس ہے کہ آپ کو ہمارا راہ دیکھنا پڑا۔ ہم کو آج فرصت نہیں ہے کلب گھر جانا ہے۔ آپ پھر کبھی آویں۔" یہ سُن کر انھوں نے صاحب بہادر کو فرشی سلام کیا اور اتنی سی بات پر پھر کسی انگریز کی ملاقات کو نہ گئے۔

بابو شیاما چرن اگرچہ کسی معنی میں حریص شہرت نہ تھے مگر اپنے نامِ نیک کو بدنامی کی ہوا سے بچاتے رہتے تھے۔ خاندانی اعزاز اور وجاہت پر بھی اُنھیں کسی قدر فخر تھا۔ اپنی وضع کے وہ بڑے رنگین مزاج آدمی تھے اُن کی باتیں ظرافت سے بھری ہوتی تھیں۔ شام کے وقت جب وہ چند منتخب احباب کے ساتھ صحن میں بیٹھتے تو اُن کے قہقہہ کی گونجتی ہوئی آواز باغیچہ سے سنائی دیتی تھی۔ نوکروں چاکروں سے وہ بہت بے تکلفی کا برتاؤ رکھتے۔ یہاں تک کہ اُن کے ساتھ الاؤ کے گرد بیٹھنے سے بھی عار نہ تھا۔ مگر ان کا رعب کچھ ایسا چھایا ہوا تھا کہ کسی کو اُن کی اِن کمزوریوں سے بے جا فائدہ اُٹھانے کی جرأت نہ ہوسکتی

تھی۔ وضع قطع سادہ رکھتے کوٹ پتلون سے اُنھیں نفرت تھی۔ بٹن دار اُونچی اچکن۔ اس پر ایک ریشمی کام کی عبا۔ سیاہ شملہ۔ ڈھیلا پاجامہ اور دلّی کی ساخت کا نوکدار جوتا۔ اُن کی خاص وضع تھی اور اُن کے دوہرے بدن۔ سُرخ و سفید چہرہ اور درمیانہ قد پر جس قدر یہ لباس زیب دیتا تھا۔ اُتنا کوٹ پتلون سے ممکن نہ تھا۔

مگر ڈپٹی شیاما چرن کا رعب چاہے سارے شہر میں چھایا ہوا ہو۔ خود اپنے گھر کی چہاردیواری کے اندر اُن کی ایک نہ چلتی تھی۔ یہاں مسز شیاماچرن کی عملداری تھی۔ اور وہ اپنے ممالکِ محروسہ میں مطلق العنانی کے ساتھ راج کرتی تھیں۔ نوکروں کا تقرر۔ اُن کی برخاستگی۔ اُن کی سزا۔ خانگی ضروریات۔ لین دین۔ غرض اُن کُل امور میں اُنھیں سیاہ و سفید کا اختیار تھا۔ کئی برس گزرے ڈپٹی صاحب نے پریم وتی کی مرضی کے خلاف ایک مہراجن نوکر رکھ لی تھی۔ مہراجن ذرا رنگیلی تھی۔ پریم وتی اپنے شوہر کی اس مداخلت بے جا پر ایسی برہم ہوئی کہ ہفتوں تک کوپ بھون میں بیٹھی رہی۔ آخر زچ ہوکر ڈپٹی صاحب نے مہراجن کو رخصت کردیا۔ تب سے اُنھیں پھر خانگی معاملات میں رخنہ ڈالنے کی کبھی ہمّت نہ پڑی۔ حالانکہ بے چارے بہت متقی اور پاک نفس آدمی تھے اور اب سِن بھی چالیس سے متجاوز ہوگیا تھا۔ مگر پریم وتی کے دل میں ابھی تک اُن کی جانب سے بدگمانی بنی ہوئی تھی۔ اُس کا مزاج خلقتاً تحکمانہ واقع ہوا تھا۔ اُس کے ساتھ ہی اُسے جھوٹی شیخی اور بڑے بول سے سخت نفرت تھی۔ جب کبھی وہ شہر میں کسی کے یہاں تقریبوں میں شریک ہونے کے لیے جاتی تو گویا یہ مسلمہ بات تھی کہ وہاں بدمزگی ضرور پیدا ہوگی۔ عورتوں کو بڑھ بڑھ کے باتیں بناتے دیکھ کر اُس سے ضبط نہ ہوتا۔ برس پڑتی۔ امرحق کے اظہار سے وہ کبھی نہ چوکتی۔ چاہے اس کی پاداش میں اُسے تُوتُو مَیں مَیں بھی کیوں نہ کرنا پڑے اور طعنوں کے تیر چبھونے میں تو اُسے خاص ملکہ تھا۔

منشی جی کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بڑا لڑکا رادھاچرن پچھلے سال ڈگری حاصل کرکے اس وقت رُڑکی کالج میں پڑھتا تھا۔ اُس کی شادی فتحپورسیکری کے ایک رئیس کے یہاں ہوئی تھی۔ منجھلی لڑکی کا نام سیوتی تھا۔ اُس کی شادی بھی الہ آباد کے ایک متمول گھرانے میں ہوگئی تھی۔ چھوٹا لڑکا کملا چرن ابھی تک بن بیاہا تھا۔ پریم وتی نے بچپنے ہی سے لاڈ پیار کرکے اُسے ایسا بیباک اور بدشوق بنا دیا تھا کہ اس کی طبیعت پڑھنے لکھنے کی طرف

ذرا بھی نہ مائل ہوتی۔ پندرہ برس کا ہوچکا تھا۔ مگر ابھی تک سیدھا سا خط لکھنے کی بھی تمیز نہ تھی۔ میاں جی کے بیٹھے۔ اُنھیں اُس نے مہینہ بھر کے اندر نکال کر دم لیا۔ تب مدرسے میں نام لکھایا گیا۔ وہاں جاتے ہی اُسے بخار چڑھ آتا۔ دردِ سر شروع ہوجاتا۔ اس لیے وہاں سے بھی اُٹھا لیا۔ تب ایک ماسٹر صاحبؒ اتالیقی پر مامور ہوئے۔ مگر اُن کے تین مہینہ کی دورانِ ملازمت میں کملاچرن نے مشکل سے تین سبق پڑھے ہوں گے۔ آخر ماسٹر صاحب بھی رخصت ہوئے۔ تب ڈپٹی صاحب نے خود پڑھانے کی ٹھانی۔ مگر ایک ہی ہفتہ میں اُنھیں کئی بار کملا کا سر ہلانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ گواہوں کے بیانات اور وکلاء کی جرحوں کی تہ تک پہنچنا اتنا مشکل نہیں جتنا کسی بدشوق لڑکے کے دل میں تعلیم کی رغبت پیدا کرنا۔ پریم وتی نے اس ماردھاڑ پر ایسی دادفریاد مچائی کہ آخر ڈپٹی صاحب نے بھی جھلاکر چھوڑ دیا۔ کملا کچھ ایسا قبولِ صورت۔ ایسا نازک بدن اور شیریں زبان تھا کہ ماں اُسے سب لڑکوں سے زیادہ چاہتی۔ اس کی نازبرداریوں نے کملا کو کنکوے بازی، کبوتر بازی اور اسی قبیل کے دوسرے مشاغل کا دلدادہ بنا دیا تھا۔ صبح ہوئی اور کبوتر اُڑائے جانے لگے۔ بٹیروں کے جوڑ چھوٹنے لگے۔ شام ہوئی اور کنکوے کے لمبے لمبے پیچ ہونے لگے۔ کچھ دنوں سے جوئے کا چسکا بھی پڑ چلا تھا۔ آئینہ، کنگھی اور عطر تیل میں تو گویا اُس کی جان بستی تھی۔ سن ابھی کچھ نہ تھا۔ مگر شہدوں کے فیضِ صحبت سے نظربازی میں بھی شہرۂ آفاق تھے۔

پریم وتی ایک دِن سُباما سے ملنے گئی ہوئی تھی وہاں اُس نے برج رانی کو دیکھا اور اُسی دن سے اُس کا جی للچایا ہوا تھا کہ اگر یہ بہو بن کر میرے گھر میں آئے تو گھر کے بھاگ جاگ اُٹھیں۔ ایک رازداں عورت کے ذریعہ سے سوسیلا پر اپنا عندیہ ظاہر کیا۔ برجن کو تیرھواں سال شروع ہوچکا تھا۔ میاں بیوی میں شادی کے متعلق صلاح و مشورہ ہورہا تھا۔ پریم وتی کا عندیہ پاکر دونوں پھولے نہ سمائے۔ ایک تو جان پہچان کے آدمی۔ پھر عالی خاندان۔ لڑکا ذہین اور تعلیم یافتہ موروثی جائداد کثیر۔ اگر ان سے ناطہ ہوجائے تو کیا پوچھنا۔ چٹ پٹ باقاعدہ طور پر پیغام کہلا بھیجا۔ اس طرح اتفاقات نے آج اس زہریلے درخت کا بیج بو دیا جس نے تین ہی برس میں خاندان کا خاندان تباہ کردیا۔ مستقبل ہماری نگاہوں سے کیسا پوشیدہ رہتا ہے۔

جوں ہی پیغام پہنچا پریم وتی پھولی نہ سمائی۔ ساس، نند اور بہو میں باتیں ہونے لگیں۔

بہو۔ (چندرا) کیوں اماں کیا آپ اسی سال بیاہ کریں گی؟
پریموتی۔ اور کیا۔ تمھارے لالہ جی کے ماننے کی دیر ہے۔
بہو۔ کچھ تلک جہیز بھی ٹھہرا؟
پریموتی۔ تلک جہیز ایسی لڑکیوں کے لیے نہیں ٹھہرایا جاتا۔ جب ترازو میں لڑکی لڑکے کے برابر نہیں ٹھہرتی تب جہیز کا پاسنگ بناکر اُسے برابر کردیتے ہیں۔ ہماری برج رانی کملا سے بہت بھاری ہے۔
سیوتی۔ کچھ دنوں گھر میں خوب چہل پہل رہے گی۔ بھابی گیت گائیں گی۔ میں ڈھولک بجاؤں گی۔ کیوں بھابی؟
چندرا۔ مجھے ناچنا گانا نہیں آتا؟

چندرا کی آواز بھاری تھی۔ جب گاتی تو راگ میں بے سُراپن آجاتا۔ اس لیے اُسے گانے سے چڑ تھی۔

سیوتی۔ یہ تو تم آپ ہی کہو۔ تمھارے گانے کی سنسار میں دھوم ہے۔

چندرا جل گئی۔ تیکھی ہوئی کر بولی۔"جسے ناچ گا کر دوسروں کو لُبھانا ہو وہ ناچنا گانا سیکھے۔"

سیوتی۔ تم ذرا سی دل لگی میں ناراض ہوجاتی ہو۔ ذرا وہی گیت گاؤ"تم تو شیام بڑے بے کھبر ہو۔" اس وقت سننے کو بہت جی چاہتا ہے۔ مہینوں سے تمھارا گانا نہیں سُنا۔
چندرا۔ تمھیں گاؤ۔ تمھارا گلا کوئلوں کا سا ہے۔
سیوتی۔ لے اب تمھاری یہی شرارت اچھی نہیں لگتی۔ میری بھابی ذرا گاؤ۔
چندرا۔ میں اس وقت ہرگز نہ گاؤں گی۔ کیا مجھے کوئی ڈومنی مقرر کیا ہے؟
سیوتی۔ میں بلا گیت سُنے آج تمھارا پیچھا نہ چھوڑوں گی۔

سیوتی کی آواز نہایت دلکش اور سُریلی تھی۔ خدوخال بھی دلفریب۔ چمپئی رنگ۔ رسیلی آنکھیں۔ پیازی رنگ کی ساڑی اس پر خوب کھل رہی تھی۔ آپ ہی آپ گانے لگی۔

تم تو سیام بڑے کھبر ہو تم تو شیام ....
آپ تو شیام پیئو دودھ کے کلہڑ میری تو پانی پر گجر۔ پانی پر گجر ہو
تم تو شیام ....

دودھ کے گلھڑ پر بے اختیار ہنس پڑی۔ پریموتی بھی مسکرائی۔ مگر چندرا رُہانسی ہوگئی۔ بولی۔ ”بلا ہنسی کی ہنسی مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اِس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟“

سیوتی۔ آؤ ہم تم مل کر گائیں۔

چندرا۔ کوئل اور چیل کا کیا ساتھ۔

سیوتی۔ غصّہ تمھاری ناک پر رہتا ہے۔

چندرا۔ تو ہمیں کیوں چھیڑتی ہو؟ ہمیں گانا نہیں آتا۔ تو کوئی تم سے شکایت کرنے تو نہیں جاتا۔

”کوئی“ کا اشارہ رادھا چرن کی طرف تھا۔ چندرا میں چاہے اور کوئی گن نہ ہو مگر شوہر کی خدمت دل و جان سے کرتی تھی۔ اُن کا ذرا سر دھمکا اور اُس کی جان نکلی۔ اُن کو گھر آنے میں ذرا دیر ہوئی اور یہ بے قرار ہونے لگی۔ جب سے وہ روڑکی چلے گئے۔ تب سے چندرا کا ہنسنا بولنا سب چھوٹ گیا۔ اُس کی خوشی اُن کے ساتھ چلی گئی تھی۔ انھیں باتوں نے رادھا چرن کو بیوی کا شیدا بنا دیا تھا۔ حُسن اور سلیقہ اور گُن یہ سب محبت کے مقابلے میں بہت ارزاں چیزیں ہیں۔ محبت حُسن اور سلیقہ اور گُن کی سب خامیاں پوری کردیتی ہے۔

سیوتی۔ شکایت کیوں کرے گا کوئی تو تم پر دل و جان سے ریجھا ہوا ہے۔

چندرا۔ ادھر کئی دن سے خط نہیں آیا۔

سیوتی۔ تین چار دن ہوئے ہوں گے۔

چندرا۔ تم سے ہاتھ پَیر جوڑ کے ہار گئی۔ تم لکھتی ہی نہیں۔

سیوتی۔ اب وہی باتیں روز روز کون لکھے۔ کوئی نئی بات ہوتو لکھنے کا جی چاہے۔

چندرا۔ آج شادی کا حال لکھ دینا۔ لاؤ قلم دوات۔

سیوتی۔ مگر ایک شرط پر لکھوں گی۔

چندرا۔ بتاؤ۔

سیوتی۔ تمھیں شام والا گیت گانا پڑے گا۔

چندرا۔ اچھا گا دُوں گی۔ ہنسنے ہی کا جی چاہتا ہے نا؟ ہنس لینے۔

سیوتی۔ پہلے گا دو تو لکھوں۔

چندرا۔ نہ لکھو گی۔ پھر باتیں بنانے لگوگی۔

سیوتی۔ تمھاری قسم لکھ دوں گی۔ گاؤ۔

چندرا گانے لگی۔

تم تو شیام پیئو دُودھ کے کُلہڑ میری تو پانی پے گُجر۔ پانی پے گُجر ہو

تم تو شیام بڑے بے کھبر ہو

آخری الفاظ کچھ اس بے سُرے پن سے نکلتے تھے کہ ہنسی کا ضبط کرنا محال تھا۔ سیوتی نے بہت روکا مگر ہنسی نہ رُک سکی۔ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ پڑگئے۔

چندرا نے دوسرا بند گایا۔

آپ تو شیام رکھو دو دو لُغیّاں (لُگائیاں) میری تو آپی پے نجر۔ آپی پے نجر ہو

تم تو شیام ....

لُغیّاں پر سیوتی ہنستے ہنستے لوٹ گئی۔ چندرا نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ اب تو خوب ہنس چکیں۔ لاؤں قلم دوات؟

سیوتی۔ نہیں نہیں۔ ابھی ذرا ہنس لینے دو۔

سیوتی ہنس ہی رہی تھی کہ بابو کملاچرن باہر سے تشریف لائے۔ پندرہ سولہ برس کا سن تھا۔ گورا رنگ۔ چھریرا بدن۔ خوش رو۔ چہرہ زرد۔ پُرتکلف پوشاک زیب تن کیے۔ عطر میں بسے۔ آنکھوں میں سُرمہ۔ لبوں پر مسکراہٹ اور ہاتھ میں بلبل۔ آکر چارپائی پر بیٹھ گئے۔ سیوتی بولی۔ کملو منہ میٹھا کراؤ تو تمھیں خوش خبری سُنائیں۔ سُنتے ہی پھڑک اُٹھو۔

کملا۔ مُنہ تو تمھارا آج ضروری ہی میٹھا ہوگا۔ چاہے خوش خبری سُناؤ یا نہ سُناؤ۔ آج اس شیر نے وہ میدان مارا ہے کہ باید و شاید۔

یہ کہہ کر کملاچرن نے بلبل کو انگوٹھے پر بٹھا لیا۔

سیوتی۔ میری خبر سُنتے ہی ناچنے لگو گے۔

کملا۔ تو بہتر ہے آپ نہ سُنایئے۔ میں تو آج یوں ہی ناچ رہا ہوں۔ اس شیر نے آج ناک رکھ لی۔ سارا شہر دنگ رہ گیا۔۔ نواب مُنّے خاں بہت دِنوں سے ایں جانب کی

آنکھوں پر چڑھے ہوئے تھے۔ ایک مہینہ ہوتا ہے میں اُدھر سے نکلا تو آپ فرمانے لگے میاں کوئی پٹھا تیار ہو تو لاؤ۔ دو دو چونچیں ہو جائیں۔ یہ کہہ کر آپ نے اپنا پُرانا بُلبل دکھایا۔ میں نے عرض کیا۔ بندہ نواز۔ ابھی تو نہیں مگر ایک مہینہ میں انشاء اللہ آپ سے ضرور ایک جوڑ ہوگی اور بدبد کر۔ آج آغا شیر علی کے اکھاڑے میں بد ان کی ٹھہری۔ پچاس پچاس روپے کی بازی تھی۔ لاکھوں آدمی جمع تھے۔ نواب صاحب کا بُلبل جہاندیدہ یقین مانو سیوتی کمبخت کبوتر کے برابر تھا۔ مگر جس وقت یہ پٹھا چلا ہے تو اس کی اُٹھی ہوئی گردن۔ مستانہ چال اور گٹھیلے پن پر لوگ واہ واہ کرنے لگے۔ جاتے ہی جاتے اس نے اس کا ٹیٹوا لیا۔ مگر وہ بھی محض پھولا نہ تھا۔ سارے شہر کے بلبلوں کو سر کیے ہوئے۔ زور سے لات چلائی اس نے خالی دی اور پھی جھپٹ کر اُس کی چوٹی دبائی۔ اُس نے پھر چوٹ کی۔ یہ نیچے آیا۔ چوطرفہ غُل مچ گیا۔ مارا مارا مار لیا۔ تب تو ایں جانب کو بھی غصہ آیا۔ ڈپٹ کر جو للکارتا ہوں تو یہ اوپر اور وہ نیچے دبا ہوا۔ پھر تو اس نے ہزار ہزار سر پٹکا کہ اُوپر آجائے مگر اِس شیر نے ایسا دابا کہ سر نہ اُٹھانے دیا۔ نواب صاحب خود موجود تھے۔ بہت چیخے چلائے مگر کیا ہو سکتا ہے۔ اس نے اُسے ایسا دبوچا تھا جیسے باز پدّی کو۔ آخر کمبخت بگٹٹ بھاگا۔ اُس نے پالی کے اُس سرے تک پیچھا کیا۔ مگر نہ پاسکا۔ لوگ حیرت سے دنگ رہ گئے۔ نواب صاحب کا تو چہرہ فق ہوگیا۔ ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ روپے ہارنے کی تو انھیں کچھ پروا نہیں لاکھوں کی آمدنی ہے مگر شہر میں جو اُن کی دھاک بندھی ہوئی تھی وہ جاتی رہی روتے ہوئے گھر کو سدھارے۔ سُنتا ہوں یہاں سے جاتے ہی اپنے بلبل کو زندہ دفن کردیا۔

یہ کہہ کر کملاچرن نے جیب کھنکھنائی۔

سیوتی۔ تو پھر کھڑے کیا کر رہے ہو۔ آگرہ والے کی دُکان پر آدمی بھیجو۔

کملا۔ تمھارے لیے کیا لاؤں بھابی؟

سیوتی۔ دُودھ کے کاہڑ۔

کملا۔ اور بھیّا کے لیے؟

سیوتی۔ دو دو لُغتیاں۔

یہ کہہ کر دونوں قہقہے لگانے لگے۔

سرد مہری محبت کو بھلا نہیں سکتی

سُباما دل و جان سے شادی کی تیاریوں میں مصروف ہوگئی۔ صبح سے شام تک شادی ہی کے دھندوں میں اُلجھی رہتی۔ سوشیلا لونڈیوں کی طرح اُس کے حکم کی تعمیل کیا کرتی۔ منشی سجیون لال صبح سے شام تک بازار کی خاک چھانتے رہتے اور برجن جس کے لیے یہ سب تیاریاں ہو رہی تھیں اپنے کمرہ میں بیٹھی ہوئی رات دن رویا کرتی تھی۔ کسی کو اتنی فرصت بھی نہ تھی کہ دم بھر کو اس کا دل بہلائے۔ یہاں تک کہ پرتاپ بھی اب اُس کی صورت سے بیزار نظر آتا۔ وہ بہت اُداس رہتا تھا۔ سویرے کا نکلا ہوا شام کو گھر آتا اور اپنی منڈیر پر چپ چاپ جا بیٹھتا۔ برجن کے گھر جانے کی تو اُس نے قسم ہی کھا لی تھی۔ بلکہ جب کبھی وہ آتی ہوئی دکھائی دیتی تو چپکے سے سرک جاتا۔ یا اگر کہنے سُننے سے بیٹھتا بھی تو کچھ اس طرح مُنہ پھیر لیتا اور ایسی خشکی سے پیش آتا کہ برجن رونے لگتی اور سُباما سے جاکر کہتی۔ ''چچی للّو مجھ سے ناراض ہیں۔ میں بُلاتی ہوں نہیں بولتے تم چل کر منا دو۔ یہ کہہ کر وہ مچل جاتی اور سُباما کا آنچل پکڑ کر کھینچتی ہوئی پرتاب کے گھر لاتی۔ جیسے کوئی فریادی اپنے حمایتی کو ساتھ لائے مگر پرتاپ دونوں کو دیکھتے ہی نکل بھاگتا۔ برجن رانی دروازہ تک اس کے پیچھے پیچھے یہ کہتی ہوئی آتی کہ للّو ذرا سُن لو۔ ذرا سُن لو۔ تمھیں ہماری قسم ذرا سُن لو۔ مگر وہ نہ سُنتا اور نہ مُنہ پھیر کر دیکھتا تو بے چاری لڑکی زمین پر بیٹھ جاتی اور خوب پھوٹ کے روتی اور کہتی۔ یہ مجھ سے کیوں روٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے تو انھیں کبھی کچھ نہیں کیا۔ سُباما اسے سینہ سے لگا لیتی اور سمجھاتی بیٹی جانے دو۔ للّو پاگل ہوگیا ہے۔ اُسے بیٹے کی اس سرد مہری کا راز معلوم ہو چلا تھا۔

آخر شادی کی صرف پانچ دن رہ گئے۔ عزیز و اقارب دور و نزدیک سے آنے لگے۔ برجن کو باہر نکلنے کی ممانعت ہوگئی۔ کنگن بندھ گیا۔ آنگن میں خوبصورت منڈوا چھا گیا۔ یہ کچے دھاگے کا کنگن پاگ فرائض کی ہتکڑی ہے جو کبھی ہاتھ سے نہ نکلے گی۔ اور یہ منڈوا اس محبت و شفقت کے سایہ کی یادگار ہے جو مرتے دم تک سر سے نہ اُٹھے گا۔ آج شام کو سُباما سوشیلا۔ مہراجنیں سب کی سب مل کر دیوی جی کی پوجا کرنے گئیں۔ مہریاں اپنے

دھندوں میں لگی ہوئی تھیں۔ برجن گھبرا کر اپنے کمرہ سے نکلی اور پرتاپ کے گھر آ پہنچی۔ چوطرفہ سناٹا چھایا ہوا تھا۔ صرف پرتاپ کے کمرے میں دُھندلی روشنی کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ برجن کمرہ میں داخل ہوئی۔ تو کیا دیکھتی ہے کہ میز پر لیمپ روشن ہے اور پرتاپ ایک کھری چارپائی پر پڑا سو رہا ہے۔ دُھندلی روشنی میں اُس کا چہرہ بہت پژمردہ اور مغموم نظر آتا تھا۔ چیزیں سب اِدھراُدھر بے قرینہ پڑی ہوئی ہیں۔ فرش پر منوں گرد جمع ہوگئی ہے۔ کتابیں بکھری ہوئی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کمرہ کو کسی نے مہینوں سے نہیں کھولا۔ یہ وہی پرتاپ ہے جو صفائی پر جان دیتا تھا۔ برجن نے چاہا اُسے جگا دوں۔ مگر پھر کچھ سوچ کر زمین سے کتابیں اُٹھا اُٹھا الماریوں میں رکھنے لگی۔ میز پر سے گرد جھاڑی۔ تصویروں کے مُنہ پر سے گرد کی نقاب اُٹھائی۔ دفعتاً پرتاپ نے کروٹ بدلی۔ اور اُس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے۔''برجن میں تمھیں نہیں بُھول سکتا۔'' پھر ذرا دیر کے بعد''برجن! برجن'' کہاں جاتی ہو یہیں بیٹھو''۔ پھر کروٹ بدل کر۔ ''نہ بیٹھوگی۔ اچھا جاؤ۔ میں تم سے نہ بولوں گا۔'' پھر ذرا ٹھہر کر۔''اچھا جاؤ دیکھیں کہاں جاتی ہو۔'' یہ کہہ کر وہ لپکا جیسے کسی بھاگتے ہوئے آدمی کو پکڑ رہا ہو۔ برجن کا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں آگیا۔ اس کے ساتھ ہی آنکھیں کُھل گئیں۔ ایک منٹ تک اُس کی بے معنی نگاہیں برجن کے چہرہ پر گڑی رہیں۔ پھر چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ اور برجن کا ہاتھ چھوڑ کر بولا۔''تم کب آئیں برجن؟ میں ابھی تمھارا خواب دیکھ رہا تھا۔''

برجن نے بولنا چاہا مگر گلا روندھ گیا۔ اور آنکھیں بھر آئیں۔ پرتاپ نے اِدھر اُدھر نظر دوڑا کر پھر کہا۔''کیا یہ سب تم نے صاف کیا۔ تمھیں بڑی تکلیف ہوئی۔''

برجن نے اس کا بھی کچھ جواب نہ دیا۔

پرتاپ۔برجن۔ تم مجھے بُھول کیوں نہیں جاتیں؟

برجن نے پُرنم آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔''کیا تم مجھے بھول گئے؟''

پرتاپ نے نادم ہوکر سر جُھکا لیا۔

تھوڑی دیر تک دونوں خیالات سے بھرے زمین کی طرف تکتے رہے۔ پھر برجن نے پوچھا۔''تم مجھ سے کیوں ناراض ہو۔ میں نے کوئی خطا کی ہے؟''

پرتاپ۔ نہ جانے کیوں اب تمھیں دیکھتا ہوں۔ تو جی چاہتا ہے کہ کہیں چلا جاؤں۔
برجن۔ کیا تم کو میری ذرا بھی محبت نہیں معلوم ہوتی۔ میں دن بھر رویا کرتی ہوں۔ تمھیں مجھ پر ترس نہیں آتا۔ تم مجھ سے بولتے تک نہیں۔ بتلاؤ میں نے تمھیں کیا کہا کہ تم اتنا رُوٹھ گئے۔
پرتاپ۔ میں تم سے روٹھا تھوڑے ہی ہوں۔
برجن۔ تو مجھ سے بولتے کیوں نہیں؟
پرتاپ۔ میں چاہتا ہوں کہ تمھیں بُھول جاؤں۔ تم امیر ہو۔ تمھارے ماں باپ امیر ہیں۔ میں یتیم ہوں۔ میرا تمھارا کیا ساتھ؟
برجن۔ اب تک تو تم نے کبھی یہ حیلہ نہیں نکالا تھا۔ کیا اب میں زیادہ امیر ہوگئی؟

یہ کہہ کر برجن رونے لگی۔ پرتاپ بھی پسیجا۔ بولا۔"برجن ہمارا تمھارا بہت دنوں تک ساتھ رہا۔ اب بچھڑنے کے دن آگئے۔ چند دن میں تم یہاں والوں کو چھوڑ کر اپنے سُسرال چلی جاؤ گی۔ اس وقت مجھے ضرور ہی بُھول جاؤ گی۔ اس لیے میں بھی چاہتا ہوں تمھیں بھول جاؤں۔ مگر کتنا ہی چاہتا ہوں کہ تمھاری باتیں یاد نہ آئیں۔ وہ نہیں مانتیں۔ ابھی سوتے سوتے تمھارا ہی سپنا دیکھ رہا تھا۔

ڈپٹی شیاما چرن کا مکان آج حسینوں کے جمگھٹ سے اِندر کا اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔ سیوتی کی چار سہیلیاں رُکمنی۔ سیتا۔ رام دیئی۔ چندر کنور سولہوں سنگار کیے اٹھلاتی پھر تی تھیں۔ڈپٹی صاحب کی بہن جانکی کنور بھی اپنی دو لڑکیوں کے ساتھ اٹاوہ سے آگئی تھیں۔ ان دونوں کا نام کملا اور اما دیئی تھا۔ کملا کا بیاہ ہوچکا تھا۔ امادیئی ابھی کنواری تھی۔ دونوں آفتاب و مہتاب منڈپ کے تلے ڈومنیاں اور گائنیں سہاگ اور سہرا اَلاپ رہی تھیں۔ گلبیا نائن اور جمنی بارن دونوں شوخ رنگ کی ساڑیاں پہنے۔ مانگ سیندور سے بھروائے۔ گِلٹ کے کڑے پہنے چھم چھم کرتی پھرتی تھیں۔ گلبیا شوخ و شنگ اور نوجوان تھی۔ جمنی کا سن ڈھل چکا تھا۔ سیوتی کا کیا پُوچھنا آج اس پر غضب کا نکھار تھا۔ رسیلی آنکھیں فرطِ مسرت سے متوالی ہو رہی تھیں اور گلابی ساڑی کی جھلک سے چمپئی رنگ گلابی نظر آتا تھا دھانی مخمل کی کُرتی اس پر خوب کھلتی تھی۔ ابھی نہا کر آئی تھی اس لیے ناگن کی سی لٹیں شانوں پر لہرا رہی تھیں۔ چھیڑ چھاڑ اور چہل سے اتنی فرصت بھی نہ ملتی تھی کہ ذرا بال گوندھا لے۔ گہنے باہر سنار صاف کر رہا تھا۔ ہاتھوں میں صرف کڑے تھے۔ یہ سادگی اُس پر ہزار زیوروں سے زیادہ زیب دیتی تھی۔ مہراجن کی بیٹی مادھوری چھینٹ کا لچکے دار لہنگا پہنے۔ آنکھوں میں کاجل لگائے اندر باہر ایک کیے ہوئے تھی۔

رُکمنی نے سیوتی سے کہا۔"ستو تمھاری بھاوج کہاں ہیں دِکھائی نہیں دیتیں کیا ہم لوگوں سے بھی پردہ ہے؟"

رام دیئی۔ (مسکرا کر) پردہ کیوں نہیں ہماری نظر نہ لگ جائے گی۔

سیوتی۔ کمرہ میں پڑی سو رہی ہوں گی۔ دیکھو ابھی کھینچے لاتی ہوں۔

یہ کہہ کر وہ چندرا کے کمرہ میں پہنچی۔ وہ ایک معمولی سی ساڑی پہنے۔ چارپائی پر پڑی دروازہ کی طرف ٹکٹکی لگائے ہوئے تھی۔ اسے دیکھتے ہی اُٹھ بیٹھی۔ سیوتی نے کہا۔"یہاں کیا پڑی ہو۔ اکیلے تمھارا جی نہیں گھبراتا؟"

چندرا۔ اونھ۔ کون جائے۔ ابھی کپڑے نہیں بدلے۔

سیوتی۔ تو بدلتی کیوں نہیں۔ سکھیاں تمھاری راہ دیکھ رہی ہیں۔

چندرا۔ ابھی میں نہ بدلوں گی۔
سیوتی۔ یہ ضد اچھی نہیں لگتی۔ سب اپنے دل میں کیا کہتی ہوں گی؟
چندرا۔ تم نے تو چِٹھی پڑھی تھی۔ آج ہی آنے کو لکھا تھا؟
سیوتی۔ اچھا تو یہ اُن کا انتظار ہو رہا ہے۔ یہ کہیے۔ جبھی یہ جوگ سادھا ہے۔
چندرا۔ دوپہر تو ہوئی شاید اب نہ آئیں گے۔

اتنے میں کملا اور اُما دیئی دونوں طرارے بھرتی آپہنچیں۔ چندرا نے گھونگھٹ نکال لیا۔ اور فرش پر آبیٹھی۔ کملا اُس کی بڑی نند ہوتی تھی۔

کملا۔ ارے۔ ابھی تو انھوں نے کپڑے بھی نہیں بدلے۔
سیوتی۔ بھیّا کی باٹ جوہ رہی ہیں۔ اسی لیے یہ بھیس رچا ہے۔
کملا۔ پاگل ہیں۔ انھیں غرض ہوگی آپ آئیں گے۔
سیوتی۔ ان کی دُنیا نرالی ہے۔
کملا۔ مردوں کی محبت چاہے کتنی ہی کرے مگر زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکالے نہیں تو وہ شیر ہوجاتے ہیں۔ خواہ مخواہ ستانے اور جلانے لگتے ہیں۔ اگر تم ان کی کچھ پروا نہ کرو۔ اُن سے سیدھے مُنہ بات نہ کرو تو تمھاری ہر طرح خاطر کریں گے۔ تم پر جان واریں گے۔ مگر جوں ہی انھیں معلوم ہوا کہ اب اس کے دل میں میری جگہ ہوگئی ہے بس اُسی دن سے اُن کی نگاہ پلٹ جائے گی۔ سیر کو جائیں گے تو خواہ مخواہ دیر کرکے آئیں گے۔ کھانے بیٹھیں گے تو مُنہ جُوٹھا کرکے اُٹھ جائیں گے۔ بات بات پر روٹھیں گے۔ تم روؤگی تو منائیں گے۔ اور دل میں خوش ہوں گے کہ کیسا شکار پھانسا ہے۔ تمھارے سامنے دوسری عورتوں کی تعریف کریں گے۔ غرض تمھیں جلانے میں انھیں مزا آنے لگے گا۔ اب میرے ہی گھر میں دیکھو پہلے اتنی خاطر کرتے تھے کہ کیا بتاؤں۔ ہر دم نوکروں کی طرح ہاتھ باندھے حاضر۔ پنکھا جھلنے کو موجود۔ ہاتھ سے لقمہ کھلانے کو موجود۔ یہاں تک کہ (مسکرا کر) پیر دبانے سے بھی عار نہ تھا۔ بات مُنہ سے نکلی نہیں اور پُوری ہوئی۔ میں اس وقت انیلی تھی۔ مردوں کے داؤں پیچ کیا جانوں۔ دم میں آگئی۔ سیوتی جُھوٹ نہ ماننا اُسی دن سے اُن کی آنکھ بدل گئی لگے سیر سپاٹا کرنے۔ ایک روز روٹھ کر چل دیے۔ آدھی رات کو

گجرا گلے میں ڈالے۔ عطر میں بسے ہوئے گھر آئے۔ بچّہ سمجھتے تھے کہ آج ہاتھ باندھ کر کھڑی ہوگی۔ میں نے لمبی تانی تو رات بھر کروٹ نہ بدلی۔ دوسرے دن بھی نہ بولی۔ آخر لالہ جی آئے۔ پیروں پر گرے۔ گڑگڑائے۔ تب سے میں نے یہ بات گرہ باندھ لی ہے کہ مردوں سے کبھی محبت نہ جتاؤ۔

سیوتی۔ جیجا کو میں نے دیکھا ہے۔ بھیّا کی شادی میں آئے تھے۔ بڑے ہنس مکھ آدمی ہیں۔

کملا۔ پاربتی ان دِنوں پیٹ میں تھی۔ اسی سے میں نہ آسکی تھی۔ یہاں سے گئے تو لگے تمھاری تعریف کرنے۔ تم کبھی پان دینے گئی تھیں۔ کہتے تھے کہ میں نے ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔ اور خوب خوب باتیں ہوئیں۔

سیوتی۔ (ہنس کر) جُھوٹے ہیں زمانے کی لباڑیے۔ بات یہ ہوئی کہ گُلبیا اور جمنی دونوں کسی کام سے باہر گئی ہوئی تھیں۔ امّاں نے کہا وہ کھاکے گئے ہیں۔ پان بناکے دے آ۔ میں پان لے کر گئی۔ چارپائی پر لیٹے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اُٹھ بیٹھے۔ میں نے پان دینے کو ہاتھ بڑھایا۔ تو آپ نے کلائی پکڑ لی اور کہنے لگے کہ ایک بات سُن لو۔ ایک بات سُن لو مگر میں ہاتھ چھڑا بھاگی۔

کملا۔ نکلی نہ جُھوٹی بات۔وہی تو میں بھی کہوں کہ ابھی گیارہ بارہ برس کی چھوکری۔ اُس نے اُن سے کیا باتیں کی ہوں گی مگر نہیں اپنی ہی ضد کیے جائیں۔ مرد بڑے ڈینگیے ہوتے ہیں۔ میں نے یہ کہا۔ میں نے وہ کہا۔ میرا تو ان باتوں سے جی جلتا ہے۔ نہیں معلوم انھیں اپنے اوپر جھوٹی تہمت لگانے میں کیا مزا آتا ہے۔ آدمی جو بُرا بھلا کرتا ہے اس پر پردہ ڈالتا ہے۔ مگر یہ لوگ کریں گے تو تھوڑا اور ڈینگ مارنے کو ہر دم تیار۔ میں تو جب سے اُن کی ایک بات بھی سچ نہیں مانتی۔

اتنے میں گلبیا نے آکر کہا۔"تم تو یہاں ٹھاڑھی بتلات ہو اور تمھار سکھی تمکا آنگن میں بلوتی ہیں۔

سیوتی۔ دیکھو بھابی اب دیر نہ کرو۔ گلباز! ان کے صندوق سے کپڑے تو نکال لے۔

کملا چندرا کا سنگار کرنے لگی۔ سیوتی سہیلیوں کے پاس آئی۔ رُکمنی بولی۔"واہ بہن خوب! وہاں جاکر بیٹھ رہیں۔ تمھاری دیواروں سے ہنسیں بولیں کیا؟"

سیوتی۔کملا بہن چلی گئیں اُن سے بات چیت ہونے لگی۔ دونوں آرہی ہیں۔

رُکمنی۔ لڑکوری ہیں نہ۔
سیوتی۔ تین ہوئے تھے۔ ایک پارسال مر گیا۔ دو موجود ہیں۔
رام دیئی۔ مگر کاٹھی بہت اچھی ہے۔
چندا کنور۔ مجھے اُن کا بانک بہت پسند آیا۔ جی چاہتا ہے چھین لوں۔
سیتا۔ بانک واقعی بہت اچھی ہے۔ دونوں بہن ایک سے ایک بڑھ کر ہیں۔
رُکمنی۔ آگئی طبیعت۔ اُمادیئی مرد نہ ہوئیں۔ نہیں تو تم جان دینے لگتیں۔
سیتا۔ دوسروں پر تو وہ جان دے جس کا دولھا کم مرد ہو۔ یہاں تو لاکھ دولاکھ میں ایک ہے۔

رُکمنی کے شوہر ذرا رنگ کے گہرے تھے اور نقشہ بھی سڈول نہ تھا۔

رُکمنی۔ صورت لے کر چاٹی نہیں جاتی۔
سیتا۔ وہ تو دل ہی جانتا ہوگا۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ چاہے روکھی روٹی کھانے کو ملے۔ جھونپڑے میں رہنا پڑے مگر صورت دیکھتے ہی سب دُکھ دُور ہوجاتا ہے۔ یہ نہیں کہ بھجنگی صورت دیکھ کر بخار چڑھ آئے۔ جی متلانے لگے۔
سیوتی۔ سیتا کو ایشور نے بر اچھا دیا ہے۔ اُس نے سونے کی گوپُوجی تھی۔
رُکمنی۔ (جل کر) گورے چمڑے سے کچھ نہیں ہوتا۔
سیتا۔ تمھیں کالا ہی پسند ہوگا۔
سیوتی۔ مجھے کالا بَر ملتا تو زہر کھالیتی۔
رُکمنی۔ یوں کہنے کو جو چاہے کہہ لو مگر سچ پُوچھو تو آرام کالے ہی دولھا سے ملتا ہے۔
سیوتی۔ آرام نہیں خاک مِلتا ہے۔ گھن سا آکے لپٹ جاتا ہوگا۔
رُکمنی۔ یہی تو تمھاری لڑکپن کی باتیں ہیں۔ تم جانتی نہیں خوبصورت مرد ہمیشہ اپنے ہی بناؤ سنگار میں لگا رہتا ہے۔ اُسے اپنے آگے بیوی کا کچھ خیال نہیں رہتا۔ اگر عورت بے حد خوبصورت ہے تو خیر ورنہ تھوڑے ہی دنوں میں وہ اس سے بھاگنے لگتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں ایسی دوسری عورتوں کے دل پر آسانی سے قابو پاسکتا ہوں۔ بے چارہ کالا کم مرد آدمی خوبصورت بیوی پاجاتا ہے تو سمجھتا ہے مجھے ہیرے کی کھان مل گئی۔ صورت کی کسر وہ پیار اور خاطر داری سے پُوری کرتا ہے۔ اُس کے

دل کو ہمیشہ یہ دغدغہ لگا ہے کہ میں ذرا بھی اس سے تُرش ہوا تو وہ مجھ سے نفرت کرنے لگے گی۔ میں اگر آدھی رات کو کہوں کہ گرم گرم حلوہ کھلاؤ تو ممکن نہیں کہ اسی وقت حکم کی تعمیل نہ کریں۔ آج کسی گہنے کی فرمائش کردوں تو گھر بیچ کر حاضر کریں۔

چنداکنور۔ دولھا سب سے اچھا وہ جو مُنہ سے بات نکلتے ہی پُوری کرے۔

رام دیئی۔ تم اپنی بات نہ چلاؤ۔ تمھیں تو اچھے اچھے گہنوں سے سروکار ہے۔ دولھا کیسا ہی ہو۔

سیتا۔ نہیں معلوم کوئی اپنے مرد سے کسی چیز کی فرمائش کیونکر کرتا ہے کیا لحاظ نہیں معلوم ہوتا۔

رُکمنی۔ تم بے چاری کیا فرمائش کروگی۔ کوئی بات تو پوچھے۔

سیتا۔ میرا تو انھیں دیکھ ہی کے جی بھر جاتا ہے۔ گہنے کپڑے کی طرف طبیعت نہیں جاتی۔

سیوتی۔ سیتا کا خوب جوڑ ہے۔

رام دیئی۔ جوڑ جو سچ پوچھو تو چندا کنور اور کلونت رائے کا خوب ہے۔

سیوتی۔ یہ انھیں دباتی ہوں گی تو بے چارے کھگھیانے لگتے ہوں گے۔

چندا کنور بھاری بھرکم گداز جسم کی نازنین تھی۔ کلونت رائے منحنی اور ضعیف القامت تھے۔

رام دیئی۔ اپنی قسمت کو کوستے ہوں گے کہ ایسی دیونی کہاں سے پائی۔

چندا کنور۔ جب دیکھو بدہضمی کی شکایت۔ دو چپاتیاں کھائیں جب بھی بدہضمی ذرا سا دُودھ پئیں جب بھی بدہضمی۔ ناک میں دم ہے۔

سیوتی۔ بے چارے تم سے ڈرتے ہوں گے۔

سیتا۔ اُن کے سامنے بچّے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ چاہیں تو انھیں گود میں کھلائیں۔

رُکمنی۔ (جل کر) بس سارے زمانے میں ایک تم اچھی اور ایک تمھارا دولھا۔ باقی سب بے جوڑ۔ اِنمل۔

سیتا۔ تمھیں کاہے کو کڑوا لگتا ہے۔

اتنے میں ایک اور نازنین جلوہ افروز ہوئی۔ گہنے سے گوندنی کی طرح لدی

ہوئی پُر تکلف جوڑا پہنے۔ عطر میں بسی۔ سُرمہ مسی سے لیس۔ آنکھوں سے شوخی و شرارت برس رہی تھی۔

رام دیئی۔ آؤ رانی آؤ۔ تمھاری ہی کسر تھی۔

رانی۔ کیا کروں نگوڑی نائن سے کسی طرح پیچھا ہی نہ چھوٹتا تھا۔ کلثوم کی ماں آئی تب جا کے جوڑا بندھا۔

سیتا۔ تمھاری جاکٹ پر نچھاور ہونے کو جی چاہتا ہے۔

رانی۔ اِس کا قصہ کچھ نہ پوچھو۔ کپڑا دیے مہینہ بھر ہوا۔ دس بارہ مرتبہ درزی سی کر لایا۔ مگر کبھی آستین ڈھیلی کردی۔ کبھی بخیہ بگاڑ دیا۔ کبھی چنت خراب کردی۔ بارے ابھی چلتے چلتے دے گیا ہے۔

سیوتی۔ البیلے بالم ہیں۔ یہیں۔ یا کہیں گئے ہوئے ہیں؟

رانی۔ میری بلا جانے۔ جیسے کتنا گھر رہے ویسے رہے بدیس۔

یہی باتیں ہو رہی تھیں۔ کہ مادھوی غل مچاتی ہوئی آئی۔ بھیّا آئے۔ اُن کے ساتھ جیجا بھی ہیں۔ اوہو ہو۔

رانی۔ کیا رادھا چرن آئے ہیں کیا؟

سیوتی۔ ہاں چلو ذرا بھابی کو سندیسا دے آؤں۔ کیوں رے کہاں بیٹھے ہیں۔

مادھوی۔ اُسی بڑے کمرے میں جیجا پگڑی باندھے ہیں۔ بھیّا کوٹ پہنے ہیں۔ مجھے بھیّا نے روپے دیا۔ یہ کہہ کر اُس نے مُٹھی کھول کر دکھائی۔

رانی۔ سِتو اب مُنہ میٹھا کراؤ۔

سیوتی۔ کیا میں نے کوئی منّت مانی تھی؟

سیتا۔ باچھیں کِھلی جا رہی ہیں۔ آنکھوں میں نشہ آگیا ہے۔

رانی۔ یہ سادگی تم پر خوب پھبتی ہے خاصی پری معلوم ہوتی ہو۔

سیوتی۔ (چندا کے کمرے میں آکر بولی) لو بھابی تمھارا شگون ٹھیک اُترا۔

چندا۔ کیا آگئے۔ ذرا جاکے اندر بلا لو۔

سیوتی۔ ہاں مردانے میں چلی جاؤں۔ تمھارے بہنوئی صاحب بھی تو پدھارے ہیں۔

چندا۔ باہر بیٹھے کیا کر رہے ہیں۔ کسی کو بھیج کر بلا لیتیں۔ نہیں تو دوسروں سے باتیں

کرنے لگیں گے۔

یکایک کھڑاؤں کی آواز آئی۔ اور رادھا چرن آتے دکھائی دیے۔ سن چوبیس پچیس سال سے زائد نہ تھا۔ بہت ہی خوش رو۔ سرخ و سفید۔ انگریزی تراش کے بال۔ فرنچ تراش کی ڈاڑھی۔ کھڑی مونچھیں۔ لیونڈر کی لپٹیں آرہی تھیں۔ بدن پر صرف ایک ریشمی مہین کرتا تھا۔ آکر چارپائی پر بیٹھ گئے اور سیوتی سے بولے۔"کیوں ستو ہفتہ بھر سے خط نہیں بھیجا۔"

سیوتی۔ میں نے سوچا اب تو آہی رہے ہو۔ کیا خط بھیجوں۔

یہ کہہ کر سیوتی وہاں سے کھسک گئی۔ چندرا نے گھونگھٹ اُٹھا کر کہا۔وہاں جاکر بھول جاتے ہو۔

رادھا چرن۔ (گلے سے لگاکر) جب ہی سینکڑوں کوس سے دوڑا چلا آتا ہوں۔

بارات کی رخصتی

بارات دُھوم دھام سے گئی اور تین دن مقیم رہی۔ شب و روز عیش و مسرت کے جلسے ہوتے رہے۔ پہلے دن آدھی رات کے وقت منڈپ کے نیچے شادی کے مراسم ادا کیے گئے۔ تمام باراتی فرش پر بیٹھے۔ برجن ایک شنگرفی رنگ کی ساڑی پہنے، لمبا سا گھونگھٹ نکالے آئی اور کملا چرن کے بغل میں بٹھائی گئی۔ ہَون ہوا۔ سنسکرت کے شلوک پڑھے گئے۔ جو دولھا دلہن کے سمجھ میں بالکل نہ آئے۔ عورتوں نے سہاگ کے گیت گائے۔ پھر دولھا دُلہن نے ہَون کنڈ کا سات بار طواف کیا۔ اس کے بعد دولھا کھبیر میں گیا جہاں عورتوں نے اُسے برجن کا جُوٹھا پان کھِلایا تاکہ وہ ہمیشہ بیوی کا غُلام بنا رہے۔اُس سے غزل پڑھنے کی فرمائش کی جس کی تعمیل وہ نہ کرسکا۔ پھر اُس کی وضع قطع اور حسب و نسب کی ہنسی اُڑائی۔ اُس کی ماں اور باپ کو اور بہنوں کو خدا معلوم کیسی فحش گالیاں دیں جو دولھا کو ذرا بھی ناگوار نہ معلوم ہوئیں بلکہ وہ خوش ہو ہوکر سُنتا رہا۔ دوسرے دن دس بجے کلیوا کا رسم ہوا۔ نوشہ مع خاص خاص رشتہ داروں کے آنگن میں بیٹھا۔ باسی پوریاں اُس کے سامنے ایک طشت میں لائی گئیں۔ منشی سجیون لال نے پانچ اشرفیاں تھالی کے پاس رکھ دیں اور چمکار کر کہا بیٹا کھاؤ نوشہ نے ہاتھ نہ بڑھایا۔ تب ایک سونے کی انگوٹھی ایک دوشالہ جس پر زریں کام بنا ہوا تھا۔ ایک چاندی کا گلاس دو چاندی کے کٹورے اور کچھ برتن لاکر رکھے گئے۔ اس پر بھی نوشہ نے پوریوں کی طرف نظر اُٹھا کر نہ دیکھا۔ سجیون لال نے رادھا چرن کی طرف دیکھ کر کہا۔ بابو صاحب۔ اب آپ کھانے کی اجازت دیجیے۔ بابو صاحب نے ہنس کر کہا۔ میں نے منع تھوڑا ہی کیا ہے۔ کھاتے کیوں نہیں۔ کملو کھا لو۔ کملو نے بھائی کی طرف دیکھا مگر بجائے اجازت کے ممانعت پائی۔ سجیون لال گھر میں گئے۔ ایک موہن مالا اور دو انگوٹھیاں اور لائے اور پھر نوشہ سے ماحضر تناول فرمانے کی التجا کی۔ رادھا چرن نے کملا سے کہا۔ خاموش کیوں بیٹھے جو کچھ عرض کرنا ہو تو صاف صاف دیوان صاحب سے کرو۔ کملا کے بہنوئی پران ناتھ نے کہا نوشہ کی طرف سے میں ایک گھوڑے کی درخواست کرتا ہوں۔ منشی جی پھر گھر میں گئے۔ سُباما سے کہا یہ لوگ پورے ڈاکو ہیں۔ دو ڈھائی سو ڈکار گئے۔ اب سواری کے لیے گھوڑا مانگتے ہیں۔ سُباما نے جواب دیا گھوڑا مانگتے ہیں گھوڑا دیجیے۔

اُن کی خواہش پوری ہو۔ منشی جی نے مجبور ہوکر اپنے ٹمٹم کا گھوڑا دے دیا۔ تب کملا چرن نے نوالہ اُٹھایا اور گِن کر پانچ بار لقمہ مُنہ تک لے گئے۔ شام کے وقت باراتیوں کی ضیافت ہوئی تکلف سے کھانا رکھا گیا۔ لوگ کھانے بیٹھے۔ ڈومنیاں اندر گانے لگیں۔

آپ تو لالہ نیوتے میں آئے۔ میّا کیسے دے آئے۔ ارے بہنا کیسے دے آئے

پھوپھی تمھاری مد کی ماتی۔ اُس کو نہ کیوں لے آئے۔ کیسے سونپ آئے

منشی پیارے لال نے فرمایا پران ناتھ گالیوں کے ازحد مشتاق ہیں۔ ڈومنیوں نے دوسرے گیت میں اُن کی خبر لی۔

پران ناتھ بابو تم ہو ابھی نادان

بہن تمھاری بہت سیانی۔ گھر گھر ہوت بکھان۔ تم ہو ابھی نادان

سیج پہ اُس کے نِس دِن آتے۔ دس دس سجن سُجان۔ تم ہو ابھی نادان

ڈپٹی شیاما چرن نے فرمایا پیارے لال کو کیوں چھوڑتی ہو۔ اِن کی بہن کا نام چمپا ہے۔ ڈومینوں نے گایا۔

چمپا تیری کلیاں بہت سُہانی۔ رنگ تیرا مجھے بھایا۔ رنگ تیرا مجھے بھایا

تیری صورتیا چِت سے نہ اُترے۔ تو نے مجھے اپنایا۔ رنگ تیرا مجھے بھایا

اسی طرح فرمائشیں کر کرکے لوگ گالیاں سُنا کیے۔ کوئی باقی نہ بچا۔ یہاں تک کہ گاتے گاتے ڈومنیوں کا جی اُکتا گیا۔ مگر سُننے والوں کو سیری نہ ہوئی۔ منشی پیارے لال نے پھر تازہ فرمائش کی۔ ڈومنیوں نے فحش گالیاں دینی شروع کیں۔ آخر آٹھ بجتے بجتے کھانا ختم ہوا۔ تیسرے دن رخصتی کا وقت تھا علی الصباح باراتی اصحاب منڈپ کے نیچے جمع ہوئے۔ منشی سجیون لال اور اُن کے رشتہ دار باراتیوں سے بغل گیر ہوئے۔ نو بجتے بجتے بارات رخصت ہوگئی۔ آئی تھی کِس شان سے گئی بالکل اس طرح جیسے کوئی شکست خوردہ فوج۔ گائینوں نے رخصتانے کے گیت گائے۔ منشی شیام چرن نے گالی گانے کے لیے ایک اشرفی انعام دی۔ کملا چرن اندر گئے۔ ساس نے چھاتی سے لگایا۔ چلتے وقت پانچ اشرفیاں نذر کیں۔ شادی بڑی خوبی سے انجام کو پہنچی۔ شہر میں چاروں طرف واہ واہ کی دُھوم مچ گئی۔

حسد

پرتاپ چند نے برجن کے گھر آنا جانا شادی کے کچھ دن پہلے ہی سے ترک کردیا تھا۔ شادی کے کسی کام میں نہ شریک ہوا۔ حتی کہ محفل میں نہ گیا۔ مغموم صورت بنائے مُنہ لٹکائے اپنے کمرہ میں بیٹھا رہا۔ منشی سجیون لال ۔ سوشیلا۔ سُباما سب خوشامدیں کرکے ہار گئے۔ اور پھر اس نے کچھ نہ کہا۔ یہ کیفیت شادی کے ہونے تک تھی۔ شادی کے بعد سے تو اس نے اُدھر کا راستہ ہی ترک کردیا۔ مدرسہ جاتا تو اس طرح کترا کر نکل بھاگتا گویا سامنے کوئی شیر بیٹھا ہوا ہے یا جیسے تقاضا کرنے والے مہاجن کے سامنے سے مقروض آدمی نظریں بچا کر نکل جاتا ہے۔ برجن کی تو پرچھائیں سے بھاگتا۔ اگر کبھی اُسے اپنے گھر میں دیکھ پاتا۔ تو اندر قدم نہ رکھتا۔ ماں سمجھاتی۔ بیٹا تم برجن سے بولتے چالتے کیوں نہیں۔ کیوں اس سے منہ موٹا کیے ہوئے ہو۔ وہ آآکر گھنٹوں روتی ہے کہ میں نے کیا کیا کہ جس سے یہ ناراض ہوگئے۔ دیکھو تم اور وہ کتنے دنوں تک ایک ساتھ رہے۔ تم اُسے کتنا پیار کرتے تھے۔ یکایک تم کو کیا ہوگیا۔ اگر تم اسی طرح روٹھے رہے تو غریب لڑکی کی جان پر بن جائے گی۔ سُوکھ کر کانٹا ہوگئی ہے۔ ایشور جانتا ہے مجھے اُسے دیکھ کر ترس آتا ہے۔ سوائے تمھارے ذکر کے اُسے جیسے کوئی دوسری بات ہی نہیں معلوم۔ پرتاپ آنکھیں نیچی کیے ہوئے یہ سب سُنتا اور چُپ چاپ سرک جاتا۔

پرتاپ اب کمسن بچّہ نہ تھا۔ اُس کی زندگی کے پودے میں شباب کی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ اُس نے بہت دنوں سے۔ اُسی وقت سے جب کہ اُس نے ہوش سنبھالا اپنے طفلانہ خوابوں میں برجن کی زندگی کو اپنی زندگی سے شیروشکر کی طرح ملا لیا تھا۔ اُن دلفریب اور سُہانے خوابوں کا اس بے دردی اور بے رحمی سے خاک میں ملایا جانا اس کے نازک دل کو پارہ پارہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ وہ جو اپنے خیال میں برجن کا سب کچھ تھا کہیں کا نہ رہا۔ اور وہ جس نے برجن کو ایک لمحہ کے لیے بھی خیال میں جگہ نہ دی سب کچھ ہوگیا۔اس خیال سے اس کے دل میں جھنجلاہٹ پیدا ہوتی۔ اور جی چاہتا کہ جن لوگوں نے میرا طلسم خواب یوں توڑا ہے۔ اور میری زندگی کی آرزوئیں یوں مٹی میں ملائی ہیں

انھیں میں بھی جلاؤں اور سلگاؤں۔ سب سے زیادہ غصہ اُسے جس پر آتا وہ غریب سوشیلا تھی۔ رفتہ رفتہ اُس کی یہ حالت ہوگئی کہ جب مدرسے سے آتا تو کملا چرن کے متعلق کوئی نہ کوئی روایت ضرور بیان کرتا۔ خصوصاً اس وقت جب کہ سوشیلا بیٹھی ہوتی۔ اس غریب کا دل دُکھانے میں اُسے خاص مزہ آتا اگرچہ جھوٹ بولنے کی اُسے عادت نہ تھی۔ جو کچھ وہ کہتا وہ حقیقت ہوتی تھی۔ مگر نادانستہ طور پر اُس کا طرزِ بیان اور انداز تقریر کچھ ایسا دلخراش ہوجاتا کہ سوشیلا کے جگر میں تیر کی طرح چُبھ جاتا۔ آج میاں کملا چرن تپائی کے اوپر کھڑے تھے۔ سر آسمان سے باتیں کرتا تھا۔ مگر بے چارے اتنے بڑے کہ جب میں نے اُن کی طرف اشارہ کیا تو کھڑے کھڑے ہنسنے لگے۔ آج بڑا مزہ آیا۔ کملو نے ایک لڑکے کی گھڑی اُڑا دی۔ اس نے ماسٹر صاحب سے شکایت کی۔ اُس کے قریب ہی یہی حضرت بیٹھے ہوئے تھے۔ ماسٹر نے تلاشی لی تو آپ کے آزاربند میں گھڑی ملی۔ پھر کیا تھا بڑے ماسٹر کے یہاں نالش ہوئی۔ وہ سنتے ہی جھلا گئے اور کوئی تین درجن قمچیاں رسید کیں۔ سڑاسڑ۔ سڑاسڑ! تمام اسکول تماشا دیکھتا تھا۔ جب تک قمچیاں پڑا کیں۔ حضرت داد فریاد مچایا کیے۔ مگر باہر نکلتے ہی کھِل کھلانے لگے۔ اور موچھوں پر تاؤ دیا۔ چچی نہیں سُنا آج لڑکوں نے عین مدرسے کے دروازے پر کملاچرن کو پیٹا۔ مارتے مارتے بے دم کردیا۔ علیٰ ہذا۔ آئے دن اس قسم کی وارداتیں بیان کرنے کو مل جاتیں۔ سوشیلا سُنتی اور سُن سُن کر کڑھتی۔ ہاں پرتاپ اس قسم کی کوئی بات برجن کے سامنے نہ کرتا۔ اگر وہ گھر میں بیٹھی بھی ہوتی تو جب تک چلی نہ جائے یہ تذکرہ نہ چھیڑتا۔ اسے منظور نہ تھا کہ میری کسی بات سے اُسے صدمہ پہنچے۔

پرتاپ کے کئی روایتوں کی تائید اتفاقیہ طور پر منشی بجیون لال نے بھی بارہا کی۔ کبھی کملا بازار میں بلبل لڑاتے مل جاتا۔ کبھی شہدوں کے ساتھ سگریٹ پیتے۔ پان چباتے بدوضعی سے گھومتا ہوا نظر آجاتا۔ منشی جی جب داماد کی یہ کیفیت دیکھتے تو گھر آتے ہی بیوی پر غصہ اُتارتے۔ یہ سب تمھارا ہی کرتوت ہے۔ تمھیں ریجھی ہوئی تھیں کہ گھر بَر دونوں اچھے ہیں۔ انھیں اس وقت یہ خیال نہ رہتا کہ جتنا الزام سوشیلا پر ہے کم از کم اتنا ہی مجھ پر بھی ہے۔ وہ بے چاری تو چاردیواری میں بند تھی۔ اُسے کیا خبر کہ لڑکا کس قماش کا ہے۔ شاید رُک وِدّیا تھوڑی ہی پڑھی تھی۔ اس کے ماں باپ کو شریف دیکھا اُس پر عالی خاندان۔

ذی رتبہ۔ راضی ہوگئی۔ مگر منشی جی نے تو محض کاہلی اور سہل انگاری کی وجہ سے چھان بنان نہیں کی۔ حالانکہ اُنھیں اس کے بہت سے موقع حاصل تھے اور منشی جی کے بیشمار بھائی اب بھی ہندوستان میں موجود ہیں جو اپنی پیاری لڑکیوں کو اسی طرح آنکھ بند کر کے کنوئیں میں ڈھکیل دیا کرتے ہیں۔

سوشیلا کو دُنیا میں برجن سے زیادہ عزیز کوئی چیز نہ تھی۔ برجن اُس کی جان تھی۔ اُس کا دین تھی۔ اُس کا ایمان تھی۔ اُس میں اُس کی جان بستی تھی۔ وہ اُس کی آنکھوں کا نور اور اس کے دل کا سرور تھی۔ اُس کا سب سے بڑا دُنیاوی ارمان یہ تھا کہ میری پیاری برجن اچھے گھر جائے۔ اس کے ساس سسر دیوی دیوتا ہوں۔ اُس کا شوہر شرافت کا پُتلا اور سری رام چندر جی کی طرح سوشیل ہو۔ اس پر کسی آزار کی پرچھائیں بھی نہ آنے پائے۔ اُس نے مرمر کر بڑی منّتوں سے یہ لڑکی پائی تھی اور اُس کی آرزو تھی کہ اس رسیلی آنکھوں والی اپنی بھولی بھالی لڑکی کو مرتے دم تک آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دوں گی۔ اپنے داماد کو بُلاؤں گی۔ اپنے گھر رکھوں گی۔ برجن کے بچّے ہوں گے اُن کی پرورش کروں گی۔ داماد مجھے امّاں کہے گا۔ میں اُسے لڑکا سمجھوں گی۔ جس دل میں یہ ارمان ہوں اُس پر ایسی ایسی دل آزار اور دل خراش باتوں کا جو کچھ اثر ہوگا ظاہر ہے۔

افسوس! غریب سوشیلا کے سارے ارمان خاک میں مِل گئے اس کی ساری آرزوؤں پر اوس پڑگئی۔ کیا سوچتی تھی اور کیا ہوگیا۔ اپنے دل کو بار بار سمجھاتی کہ ابھی کیا ہے سمجھ آجائے گی تو یہ سب باتیں آپ ہی چھوڑ دے گا۔ مگر ایک شکایت کا زخم بھرنے نہ پاتا کہ پھر کوئی تازہ واردات سُننے میں آجاتی۔ اسی طرح زخم پر زخم پڑتے گئے۔ ہائے نہیں معلوم برجن کے بھاگ میں کیا بدا ہے۔ کیا یہ حسن و شعور کی پُتلی۔ میرے گھر کا اُجالا۔ میرے جسم کی جان اسی بدقماش آوارہ شخص کے ساتھ زندگی کاٹے گی۔ کیا میری شیاما اسی گدھ کے پالے پڑے گی! یہ سوچ کر سوشیلا رونے لگتی۔ اور گھنٹوں روتی۔ پہلے برجن کو کبھی کبھی ڈانٹ ڈپٹ بھی دیا کرتی تھی۔ اب بُھول کر کوئی بات نہ کہتی۔ اُس کی صورت دیکھتے ہی اُسے رحم آجاتا ایک لمحہ کے لیے بھی نظروں سے دُور نہ ہونے دیتی۔ اگر ذرا دیر کے لیے وہ سُباما کے گھر چلی جاتی۔ تو اُس کے پیچھے لگی خود بھی جا پہنچتی۔ ایسا معلوم ہوتا گویا کوئی اُسے چھینے لیے جاتا ہے۔ جس طرح اپنے بچّے کو قصائی کے بغدے کے نیچے دیکھ کر گائے کا

رویاں رویاں کانپنے لگتا ہے۔ اُسی طرح برجن کی مصیبت کا خیال کرکے سوشیلا کی آنکھوں میں دُنیا تاریک ہوجاتی تھی۔ ان دنوں برجن کو دم بھر کے لیے نگاہوں سے دُور کرتے اُسے وہ قلق اور گھبراہٹ ہوتی تھی جو چڑیا کو گھونسلے سے بچّوں کے کھوجانے پر ہوتی ہے۔

سوشیلا ایک تو یوں ہی دائم المریض تھی۔ اُس پر آئے دن کی کوفت اور جلن نے اُسے اور بھی گھلا ڈالا۔ بیٹی کی فکر سوہانِ روح ہوگئی۔ شکایتوں نے کلیجہ چھلنی کردیا۔ چھ مہینہ بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ تپِ دق کے آثار نمودار ہوگئے۔ پہلے تو ہفتہ عشرہ تک طبیعت پر زور ڈال کر اپنا آزارِ دل چھپاتی رہی۔ مگر آخر کب تک؟ مرض بڑھنے لگا اور طاقت نے جواب دے دیا۔ قیدیٔ بستر ہوگئی۔ حکیم اور ڈاکٹر علاج کرنے لگے۔ تین چار مہینہ میں حالت ایسی نازک ہوگئی کہ معالجوں نے بھی علاج سے ہاتھ اُٹھا لیا۔ برجن اور سُباما دونوں شب و روز اُس کے پاس بیٹھی رہتیں۔ برجن ایک لمحہ کے لیے بھی اُس کی نظروں سے اوجھل نہ ہونے پاتی۔ اُسے اپنے پاس نہ دیکھ کر سوشیلا بدحواس سی ہوجاتی۔ اور چیخ چیخ کر رونے لگتی۔ منشی سجیون لال پہلے تو سرگرمی سے علاج کرتے رہے۔ مگر جب دیکھا کہ کسی دوا سے فائدہ نہیں ہوتا اور مریضہ کی حالت روز بروز ابتر ہوتی جاتی ہے تو آخر اُنھوں نے بھی مایوس ہوکر ہمّت چھوڑ دی۔ آج سے کئی سال پہلے جب سُباما بیمار پڑی تھی۔ اُس وقت سوشیلا نے اُس کی تیمارداری میں بڑی جانفشانی کی تھی۔ اب سُباما کی باری آئی اور اُس نے ہمسایگی اور بہناپے کا حق پوری طرح ادا کردیا۔ تیمارداری میں اپنے گھر کا کام کاج بُھول گئی۔ دو دو تین تین دن تک پرتاپ سے بولنے کی نوبت نہ آتی۔ اکثر وہ بے کھانا کھائے ہی مدرسے چلا جاتا تھا۔ مگر کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتا۔ سوشیلا کی حالت نے اب اُس کی آتشِ حسد کو بہت مدھم کردیا تھا۔ حسد کی آگ محسود کی ترقی اور بہتری کے ساتھ تیز اور مشتعل ہوتی جاتی ہے اور اُسی وقت بُجھتی ہے جب محسود کی زندگی کا چراغ بُجھ جاتا ہے۔

جس دن برج رانی کو معلوم ہوجاتا کہ آج پرتاپ بلا کھانا کھائے مدرسے جارہا ہے اُس دن وہ سب کام چھوڑ کر اس کے گھر دوڑی جاتی اور کھانے کے لیے ضِد کرتی۔ مگر پرتاپ اس سے بات تک نہ کرتا۔ اُسے روتے چھوڑکر باہر چلا جاتا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ برجن کو بالکل بے خطا سمجھتا تھا۔ مگر ایک ایسے رشتے کو جو برس چھ مہینہ میں منقطع ہونے والا ہو وہ پہلے ہی سے توڑ دینا چاہتا تھا۔ تنہائی میں بیٹھ کر وہ آپ ہی آپ گھنٹوں

پھوٹ پھوٹ روتا۔ مگر ضبط کا مادہ اس کے دل میں کچھ ایسا مضبوط تھا کہ وہ اپنے جوشِ محبت کو قابو سے باہر نہ ہونے دیتا۔

ایک روز وہ مدرسے سے آکر اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ برجن آئی۔ اُس کے رخسار آنسوؤں سے تر تھے اور لمبی لمبی سسکیاں لے رہی تھی۔ اُس کے چہرہ پر اس وقت کچھ ایسی حسرت اور بے بسی چھائی ہوئی تھی اور نگاہیں کچھ ایسی التجا آمیز تھیں کہ پرتاپ سے ضبط نہ ہوسکا۔ آبدیدہ ہوکر بولا:۔"کیوں برجن؟ رو کیوں رہی ہو؟"

برجن نے کچھ جواب نہ دیا بلکہ اور بِلک بِلک کر رونے لگی۔ پرتاپ کا ضبط رخصت ہوگیا۔ وہ بیتاب ہوکر اُٹھا اور برجن کی آنکھوں سے آنسو پونچھنے لگا۔ برجن نے آواز سنبھال کر کہا۔"للّو اب امّاں نہ جئیں گی۔ میں کیا کروں؟" یہ کہتے کہتے وہ پھر سسکیاں بھرنے لگی۔

پرتاپ یہ خبر سُن کر سناٹے میں آگیا۔ بدحواس دوڑا ہوا برجن کے گھر گیا اور سوشیلا کی چارپائی کے پاس کھڑا ہوکر رونے لگا۔ ہمارا آخری وقت کیسا مُبارک ہوتا ہے۔ وہ ہمارے پاس ایسے ایسے بے رُخوں کو کھینچ لاتا ہے جو چند دن پہلے ہماری صورت سے بیزار تھے اور جنھیں سوائے اُس طاقت کے دنیا کی کوئی دوسری طاقت زیر نہ کرسکتی تھی۔ ہاں یہ وقت ایسا ہی طاقتور ہے۔ وہ بڑے بڑے سرکش دشمنوں کو ہمارا مطیع کر دیتا ہے۔ جن پر ہم کبھی فتح نہ پاسکتے تھے۔ اُن پر یہ وقت ہم کو فتح مند بنا دیتا ہے۔ جن پر ہم کسی ہتھیار سے غالب نہ آسکتے تھے اُن پر یہ وقت باوجود قویٰ کے مضمحل ہوجانے کے ہم کو غالب کر دیتا ہے۔

آج پورے سال بھر کے بعد پرتاپ نے اس گھر میں قدم رکھا۔ سوشیلا کی آنکھیں بند تھیں۔ مگر چہرہ ایسا شگفتہ تھا جیسے صبح کے وقت کا کنول۔ آج صبح ہی سے وہ رٹ لگائے ہوئے تھی کہ للّو کو دکھا دو۔ سُباما نے اسی لیے برجن کو بھیجا تھا۔

سُباما نے کہا۔ بہن آنکھیں کھولو۔ للّو کھڑا ہے۔

سوشیلا نے آنکھیں کھول دیں اور اپنے دونوں بازو فرطِ محبت سے پھیلا دیے۔ پرتاپ کے دل سے کینہ کا آخری نشان بھی محو ہوگیا۔ اگر ایسے وقت میں بھی کوئی انسان دل میں کینہ کا غبار رہنے دے تو وہ انسان کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ پرتاپ سچّے فرزندانہ جوش

سے آگے بڑھا اور سوشیلا کے آغوشِ محبت مین جا لپٹا اور دونوں آدھ گھنٹہ تک روتے رہے۔ سوشیلا اسے دونوں بازوؤں سے ایسا دبائے ہوئے تھی گویا وہ کہیں بھاگا جارہا ہے۔ وہ اس وقت اپنے تئیں صدہا ملامتیں کر رہا تھا۔ میں ہی اِس دُکھیا کا جان لیوا ہوں۔ میں نے ہی حسد کے کمینہ جذبے سے مغلوب ہوکر اسے اس نوبت کو پہنچایا ہے۔ میں ہی اس پریم کی موت کا قاتل ہوں۔ جوں جوں یہ خیالات اُس کے دل میں آتے اُس کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔ آخر سوشیلا بولی۔"للّو! میں دو ایک دن کی اور مہمان ہوں میرا جو کچھ کہا سُنا ہو وہ معاف کرو۔" پرتاپ کی آواز قابو میں نہ تھی۔ کچھ جواب نہ دے سکا۔

سوشیلا پھر بولی۔"نہ جانے کیوں تم مجھ سے ناراض ہو۔ تم ہمارے گھر نہیں آتے۔ ہم سے باتیں نہیں کرتے۔ جی تمھیں پیار کرنے کو ترس ترس کے رہ جاتا ہے۔ مگر تم میری ذرا بھی خبر نہیں لیتے۔ بتاؤ اپنی غریب چچی سے کیوں روٹھے ہو۔ ایشور جانتا ہے میں تمھیں ہمیشہ اپنا لڑکا سمجھتی رہی ہوں۔ دیکھ کر میری چھاتی پھول اُٹھتی تھی......"

یہ کہتے کہتے نقاہت کے باعث اُس کی آواز بہت دھیمی ہوگئی۔ جیسے اُفق کی اتھاہ وسعت میں اُڑنے والی مرغابی کی آواز ہر لمحہ مدھّم ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اُس کی آواز کا صرف خیال باقی رہ جاتا ہے۔ اُسی طرح سوشیلا کی آواز دھیمی ہوتے ہوتے صرف سائیں سائیں رہ گئی۔

سوشیلا کی وفات

تین دن اور گزرے۔ سوشیلا کے جینے کی اب کوئی آس باقی نہ رہی۔ تینوں دن منشی سجیون لال اُس کے پاس بیٹھے اُس کی تشفی کرتے رہے۔ وہ ذرا دیر کے لیے بھی کسی کام سے چلے جاتے تو وہ بے قرار ہونے لگتی اور رو روکر کہتی کہ وہ مجھے چھوڑ کر کہیں چلے گئے۔ اُن کو آنکھوں کے سامنے دیکھ کر بھی اُسے تسکین نہ ہوتی۔ رہ رہ کر ایک مجنونانہ جوش سے اُن کا ہاتھ پکڑ لیتی اور مایوسانہ لہجہ میں کہتی مجھے چھوڑ کر کہیں چلے تو نہ جاؤ گے؟ منشی جی گو استقلال کے آدمی تھے مگر ایسی باتیں سُن کر آبدیدہ ہوجاتے۔ ذرا ذرا دیر میں سوشیلا پر ایک غشی کی سی کیفیت طاری ہوجاتی پھر چونکتی تو اِدھر اُدھر وحشت آمیز نگاہیں ڈال کر پُوچھنے لگتی۔ وہ کہاں گئے؟ کیا چھوڑ کر چلے گئے؟ بعض اوقات نسیان کا اتنا غلبہ ہوجاتا کہ منشی جی بار بار کہتے کہ میں بیٹھا ہوا ہوں۔ گھبراؤ نہیں۔ مگر اُسے یقین نہ آتا۔ اُنھیں کی طرف تکتی اور پُوچھتی کہاں ہیں؟ یہاں تو نہیں ہیں۔ کہاں چلے گئے؟ ذرا دیر میں جب ہوش آجاتا۔ تو خاموش ہوجاتی اور رونے لگتی۔ تینوں دن اُس نے برجن۔ سُباما۔ پرتاپ۔ ان تینوں میں سے ایک کی بھی یاد نہ کی۔ وہ سب کے سب ہر دم اُس کے پاس کھڑے رہتے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا کہ وہ بجز منشی جی کے اور کسی کو پہنچانتی ہی نہیں۔ جب برجن بہت بے قرار ہوجاتی اور اُس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر رونے لگتی تو وہ ذرا آنکھیں کھول دیتی اور پوچھتی کون ہے؟ برجن؟ ہوں بس اور کچھ نہ پُوچھتی۔ جیسے بخیل کے دل میں مرنے کے وقت سوائے اپنے دفینہ کے اور کسی بات کا دھیان نہیں رہتا۔ اُسی طرح ہندو عورت اپنے آخری لمحوں میں سوائے اپنے پتی کے اور کسی کا دھیان نہیں کرسکتی۔ کیونکہ بخیل کو اپنی دولت سے جتنی محبت ہے اُس سے بہت زیادہ بدرجہا محبت پتی برتا عورت کو اپنے شوہر سے ہوتی ہے۔

کبھی کبھی سوشیلا یکایک چونک پڑتی اور ہک بکا کر پوچھتی۔ ارے یہ کون کھڑا ہے۔ یہ کون بھاگا جارہا ہے۔ اُنھیں کیوں لیے جاتا ہے۔ نہ۔ میں نہ جانے دوں گی۔ یہ کہہ کر منشی جی کے دونوں ہاتھ زور سے پکڑ لیتی۔ ایک لمحہ میں جب ذرا بے خودی دور ہوتی۔ تب

شرما کر کہتی میں سپنا دیکھ رہی تھی۔ جیسے کوئی تمھیں لیے جاتا تھا۔ دیکھو تمھیں ہماری قسم جانا نہیں۔ نہیں معلوم کہاں ملے جائے گا۔ پھر تمھیں کیسے دیکھوں گی۔ ایں۔ منشی جی کا کلیجہ مسوسنے لگتا۔ اُس کی طرف نہایت محبت آمیز۔ شفقت اور درد سے بھری ہوئی نگاہ ڈال کر بولتے۔ نہیں۔ میں نہ جاؤں گا۔ تمھیں چھوڑ کر کہاں جاؤں گا۔ سُباما اُس کی حالت دیکھتی اور روتی کہ اب یہ کچھ دیر کی اور مہمان ہیں ضرورت نے اُس کی شرم و حیا سب دُور کردی تھی۔ منشی جی کے سامنے گھنٹوں بے حجاب کھڑی رہتی۔

چوتھے دن سوشیلا کی حالت سنبھل گئی۔ منشی جی کو یقین ہوگیا کہ بس یہ آخری فیصلہ ہے۔ چراغ گُل ہونے سے پہلے بھبک اُٹھتا ہے۔ سویرے ہی جب ہاتھ مُنہ دھوکر گھر میں آئے تو سوشیلا نے انھیں اشارے سے اپنے قریب بلایا اور بولی کہ مجھے اپنے ہاتھ سے تھوڑا سا پانی پلا دو۔ آج اُس پر نسیان کا غلبہ بہت کم معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے برجن۔ سُباما۔ پرتاپ سب کو بخوبی پہچانا اور برجن کو بڑی دیر تک چھاتی سے لگائے روتی رہی۔ جب پانی پی چکی تو سُباما سے کہا۔ بہن ذرا ہم کو اُٹھا کر بیٹھا دو۔ سوامی جی کے پیر چھو لوں۔ پھر نہ جانے کب ان چرنوں کے درشن ہوں گے۔ سُباما نے روتے ہوئے اُسے ہاتھوں کے سہارے ذرا سا اُٹھا دیا۔ پرتاپ اور برجن سامنے کھڑے تھے۔ سوشیلا نے منشی جی سے کہا ذرا نزدیک آجاؤ۔ منشی جی اس وقت فرطِ محبت و درد سے بے خود ہوکر اُس کے سینہ سے لپٹ گئے اور روتے ہوئے بولے تم گھبراؤ نہیں۔ ایشور چاہے گا تو تم اچھی ہوجاؤ گی۔ سوشیلا نے مایوسانہ انداز سے مسکراکر کہا ہاں آج اچھی ہوجاؤں گی۔ ذرا اپنا پیر بڑھا دو۔ میں چوم لُوں۔ منشی جی ہچکچاتے رہے۔ اُس وقت سُباما پہلی بار روتے ہوئے بولی۔ پیر بڑھا دیجیے۔ اِن کے دل کی آرزو بھی نکل جائے۔ تب منشی جی نے پیر بڑھا دیا۔ سوشیلا نے اُسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کئی بار چوما اور تب اُن پر ہاتھ رکھ کر رونے لگی اور دم کی دم میں دونوں پیر گرم قطروں سے تر ہوگئے۔ پتی برتا عورت نے پریم کے موتی شوہر کے قدموں پر نثار کردیے۔

جب ذرا آواز قابو میں ہوئی۔ تو اس نے برجن کا ایک ہاتھ پکڑ کر منشی جی کے ہاتھ میں دیا اور نہایت دھیمی آواز میں بولی۔ ”سوامی جی۔ آپ کے ساتھ بہت دن رہی اور زندگی کا بہت سکھ اُٹھایا۔ اب پریم کا ناطہ ٹوٹتا ہے۔ اب میں دم بھر کی مہمان ہوں۔ پیاری برجن کو تمھیں سونپے جاتی ہوں۔ میری یہی نشانی ہے۔ اس پر ہمیشہ مہربانی کی نگاہ رکھنا۔

میری قسمت میں اپنی پیاری بچّی کا سُکھ دیکھنا نہ لکھا تھا۔ اسے میں نے کبھی کوئی کڑی بات نہیں کہی۔ کبھی کڑی نگاہوں سے نہیں دیکھا۔ یہ میری زندگی کا پھل ہے۔ ایشور کے لیے تم اس کی طرف سے بے سُدھ نہ ہوجانا۔" یہ کہتے کہتے ہچکیاں بندھ گئیں اور غشی سی آگئی۔

جب ذرا پھر افاقہ ہوا تو اُس نے سُباما کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑے اور روکر بولی۔ بہن! برجن تمھارے سپرد ہے۔ تم اُس کی ماں کی جگہ ہو۔ للو! پیارے ایشور کرے تم جُگ جُگ جیو اپنی برجن کو بھولنا مت۔ وہ تمھاری غریب بے ماں کی بہن ہے۔ تم میں اُس کی جان بستی ہے۔ اسے رُلانا مت۔ کُڑھانا مت۔ اسے کبھی کڑی بات مت کہنا۔ اس سے کبھی نہ روٹھنا۔ اُس کی طرف سے بے خبر نہ ہونا نہیں تو وہ رو روکر جان دے دگی۔ اُس کے بھاگ میں نہ جانے کیا بدا ہے مگر تم اسے اپنی سگی بہن سمجھ کر سدا اُس کی دل جوئی کرتے رہنا۔ میں ذرا دیر میں تم لوگوں کو چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ مگر تمھیں میری قسم اُس کی طرف سے من موٹا نہ کرنا۔ تم نے اور تمھاری ماں نے اُسے آدمی بنایا ہے اور تمھیں اُس کا بیڑہ پار لگاؤ گے۔ میرے دل میں بڑے بڑے ارمان تھے۔ میری لالسا تھی کہ تمھارا بیاہ کروں گی۔ تمھارے بچّے کھِلاؤں گی۔ مگر بھاگ میں کچھ اور ہی بدا تھا۔

یہ کہتے کہتے پھر بے ہوشی اور نقاہت نے اس پر غلبہ کیا۔ سارا گھر رو رہا تھا۔ مہریاں۔ مہراجنیں۔ نوکر چاکر سب اس کا جُس گا رہے تھے۔ عورت نہیں دیوی تھی۔

ردھیا۔ اتنے دن ٹہل کرتے ہوئے مگر کبھی کڑی بات نہیں کہی۔

مہراجن۔ ہم کو بیٹی کی طرح مانتی تھیں۔ کھانا کیسا ہی پکا کے رکھ دوں مگر کبھی نراج نہیں ہوئیں۔ جب بات کرتیں مُسکرا کے۔ مہراج جب آتے تو انھیں جرور سیدھا دلواتی تھیں۔

اسی طرح کی باتیں سب کر رہے تھے۔ دوپہر کا وقت آیا۔ مہراجن نے کھانا بنایا۔ مگر کھاتا کون۔ منشی جی بڑے اصرار سے گئے اور مُنہ جُوٹھا کرکے چلے آئے۔ پرتاپ نے وہاں سے ٹلنے کی قسم کھالی تھی۔ برجن اور سُباما کو بُھوک کہاں۔ سوشیلا کبھی برجن کو پیار کرتی۔ کبھی سُباما کو گلے لگاتی۔ کبھی پرتاپ کو چومتی اور کبھی اپنی

بیتی کہہ، کہہ کے روتی۔ سہ پہر کے وقت اُس نے سب نوکروں کو بُلوایا اور اُن سے خطا معاف کروائی۔ جب یہ سب چلے گئے تو سوشیلا سُباما سے بولی۔ بہن پیاس بہت لگتی ہے۔ اُن سے کہہ دو ذرا اپنے ہاتھ سے پھر پانی پلادیں۔ منشی جی پانی لائے اور سوشیلا نے ایک گھونٹ بہ مشکل تمام حلق کے نیچے اُتارا۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ گویا اسے کسی نے امرت پلا دیا۔ اُس کا چہرہ روشن ہوگیا۔ آنکھوں میں رس بھر آیا شوہر کے گلے میں ہاتھ ڈال کر بولی۔"میں کیسی بھاگوان ہوں کہ تمھاری گود میں مرتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ چُپ ہوگئی۔ جیسے کوئی بات کہنا چاہتی ہے اور لحاظ سے نہیں کہتی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے پھر منشی جی کا ہاتھ پکڑلیا اور بولی۔"اگر تم سے کچھ مانگوں تو دوگے؟"

منشی جی نے متعجب ہوکر کہا۔"تمھارے لیے مانگنے کی ضرورت ہے؟ شوق سے کہو۔"

سوشیلا۔ تم میری بات کبھی نہیں ٹالتے تھے۔

منشی جی۔ مرتے دم تک کبھی نہ ٹالوں گا۔

سوشیلا۔ ڈر لگتا ہے۔ کہیں نہ مانو تو ......

منشی جی۔ تمھاری بات اور میں نہ مانوں۔

سوشیلا۔ میں تم کو نہ چھوڑوں گی۔ ایک بات بتلا دو۔ سِلّی مرجائے گی تو اُسے بھول جاؤ گے؟

منشی جی۔ ایسی باتیں نہ کرو۔ دیکھو برجن روتی ہے۔

سوشیلا۔ بتلا دو۔ مجھے بُھولوگے تو نہیں؟

منشی جی۔ تمھاری یاد مرتے دم تک تازہ رہے گی۔

سوشیلا نے اپنے مُرجھائے رخسار منشی جی کے ہونٹوں پر رکھ دیے اور دونوں باہیں اُن کے گلے میں ڈال دیں۔ پھر برجن کو قریب بُلا کر آہستہ آہستہ سمجھانے لگی۔ دیکھو بیٹی۔ لالہ جی کا کہنا ہر دم ماننا۔ ان کی سیوا خوب من لگا کر کرنا۔ گھر کا سارا بوجھ اب تمھارے ہی اُوپر ہے۔ اب تمھارے سوا کون سنبھالے گا۔

یہ کہہ کر اُس نے شوہر کی طرف درد آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔"میں اپنے من کی بات نہیں کہنے پائی۔ جی ڈوبا جا رہا ہے۔"

منشی جی۔ تم ناحق پس و پیش کرتی ہو۔
سوشیلا۔ تم میرے ہو کہ نہیں؟
منشی جی۔ تمھارا اور مرتے دم تک تمھارا۔
سوشیلا۔ ایسا نہ ہو کہ مجھے بھول جاؤ اور جو چیز میری تھی وہ کسی دوسرے کے ہاتھ میں چلی جائے۔
منشی جی۔ (اشارہ سمجھ کر) اس کا ذکر ہی کیوں کرتی ہو۔ جب تک جیوں گا تمھارا ہی رہوں گا۔

سوشیلا نے برجن کو پھر بُلایا اور باپ کے قدموں پر گرا دیا اور مارے ضعف کے بے دم ہوگئی۔ برجن اور پرتاپ رونے لگے۔ سُباما نے سمجھا کہ ٹمٹماتا ہوا چراغ بُجھ گیا۔ منشی جی نے کانپتے ہوئے سوشیلا کے سینہ پر ہاتھ رکھا۔ سانس دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ مہراجن کو بلاکر کہا اب انھیں زمین پر لِٹا دو۔ یہ کہتے ہوئے بے اختیار رونے لگے۔ مہراجن اور سُباما نے مل کر سوشیلا کو زمین پر لِٹا دیا۔ تپِ دق نے ہڈیاں تک سکھا ڈالی تھیں۔

اندھیرا ہو چلا تھا۔ سارے کمرے میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ حسرتناک سنّاٹا۔ وحشت ناک سنّاٹا۔ وہ سنّاٹا جو دِلوں کو ملول اور متفکر بنا دیتا ہے۔ رونے والے روتے تھے۔ مگر گلا دبا دباکر۔ باتیں ہوتیں تھیں مگر دبی آوازوں میں۔ سوشیلا زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ وہ تنِ نازک جو کبھی ماں کی گود میں پلا۔ کبھی محبت کے آغوش میں لیٹا۔ کبھی پھولوں کی سیج پر سویا۔ اس وقت زمین پر پڑا ہوا تھا۔ ابھی تک نبض آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ منشی جی فرطِ الم و یاس سے خاموش اس کے سرہانے بیٹھے ہوئے تھے۔ دفعتاً سوشیلا کے اعضا میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے سر اُٹھا دیا اور دونوں ہاتھوں سے منشی جی کا پیر پکڑ لیا۔ اور روح پرواز کر گئی۔ دونوں ہاتھ ان کے پیروں کا حلقہ کیے ہی رہ گئے۔ یہ زندگی کا آخری کام تھا۔

رونے والو! روؤ۔ کیونکہ سوائے رونے کے اور تم کرہی کیا سکتے ہو۔ تمھیں اس وقت کوئی کتنا ہی سمجھائے۔ مگر تمھاری آنکھیں آنسوؤں کی باڑھ کو نہ روک سکیں گی۔ رونا تمھارا فرض ہے۔ زندگی میں رونے کے موقعے شاذ ہی ملتے ہیں۔ کیا

اس موقع پر ہی تمھاری آنکھیں بجل کرجائیں گی۔ آنسوؤں کے تار بندھے ہوئے تھے۔ سسکیوں کی آوازیں آرہی تھیں کہ مہراجن چراغ جلاکر کمرہ میں لائی۔ ذرا دیر پہلے سوشیلا کی زندگی کا چراغ بُجھ چکا تھا۔

برجن کی رُخصتی

رادھا چرن رڑکی کالج سے نکلتے ہی مُرادآباد کے انجینئر مقرر ہوگئے۔ اور چندرا اُن کے ساتھ مُرادآباد کو چلی۔ پریموتی نے بہت روکنا چاہا۔ مگر جانے والے کو کون روک سکتا ہے۔ سیوتی کب کی سُسرال جا چکی تھی۔ یہاں گھر میں اکیلی پریموتی رہ گئی۔ اُسی کے سر گھر کا کام کاج۔ آخر یہ رائے ہوئی کہ برجن کی رخصتی کا پیغام دیا جائے۔ ڈپٹی صاحب رخصتی کے سخت خلاف تھے۔ مگر گھر کے معاملات میں پریموتی کا حکم قطعی ہوتا تھا۔

سجیون لال نے پیغام منظور کرلیا۔ کچھ دنوں سے وہ تیرتھ جاترا کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ سوشیلا کے مرنے کے بعد رفتہ رفتہ اُنھوں نے تمام دنیاوی تعلقات ترک کردیے تھے۔ دن بھر کمرہ میں آسن مارے بھگوت گیتا اور یوگ بششٹ اور دوسری معرفت کی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے۔ شام ہوتے ہی گنگا اشنان کو چلے جاتے۔ وہاں سے رات گئے لوٹتے اور دو چار لقمے کھا کر سوجاتے۔ اکثر پرتاپ چند بھی اُن کے ساتھ گنگا اشنان کو جاتا اور اگرچہ پورے سولہ سال کا بھی نہ ہوا تھا مگر مناسبت فطری کہو یا ورثہ پدری یا فیض صحبت کہ ابھی سے اُسے اسرارِ معرفت پر غور و خوض کرنے میں بے حد لُطف حاصل ہوتا۔ گیان اور حقیقت کے تذکرے سُنتے سُنتے اس کا رجحان بھی بھگتی کی جانب ہوچلا تھا۔ اور بعض اوقات منشی جی سے ایسے دقیق مسائل پر بحث کرتا کہ وہ حیرت میں آجاتے۔

برج رانی پر سُباما کی تعلیم کا اُس سے بھی گہرا اثر پڑا تھا جتنا پرتاپ چند پر منشی جی کی صحبت اور تعلیم کا۔ اُس کا پندرھواں سال تھا۔ جو ہمارے یہاں شباب کی پہلی منزل سمجھی جاتی ہے۔ اس سن میں لڑکیوں پر شوقِ شنگار کا جنون سوار ہوتا ہے۔ ان کے انداز اور طریق میں بجائے طِفلانہ شوخی کے ایک متانت آمیز چلبلاپن پیدا ہوجاتا ہے۔ دلوں میں شباب کی اُمنگیں لہرے مارنے لگتی ہیں اور نگاہوں سے بجائے سادگی اور شوخی کے ایک جذبہ آمیز رسیلاپن برسنے لگتا ہے۔ مگر برج رانی ابھی تک وہی بھولی بھالی لڑکی تھی۔ اس کا چہرہ معصومیت کی تصویر تھا۔ ایک ایک انداز سے سادگی ٹپکتی تھی۔ ہاں رفتار میں ایک دلآویز دھیراپن اور طرزِ کلام میں لبھانے والی شیرینی پیدا ہوگئی تھی۔ اُس کی باتیں سُننے والے پر

موہنی منتر پڑھ دیتی تھیں۔ مُنہ اندھیرے اُٹھتی اور سب سے پہلے منشی جی کا کمرہ صاف کر کے اُن کے پوجا پاٹ کا سامان قرینہ سے رکھ دیتی۔ پھر رسوئی کے دھندے میں لگ جاتی۔ دوپہر کا وقت اس کے لکھنے پڑھنے کا تھا۔ سُباما سے اُسے جتنی محبت اور عقیدت تھی اتنی شاید اپنی ماں سے بھی نہ رہی ہو۔ اُس کی مرضی برجن کے لیے قانون تھی۔

سُباما کی تو صلاح تھی کہ ابھی رخصتی نہ کی جائے مگر منشی جی مُصر ہوئے اور بِدائی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ جوں جوں وہ مصیبت کی گھڑی سر پر آتی جاتی برجن کی بے قراری بڑھتی جاتی۔ رات دن رویا کرتی۔ کبھی باپ کے پیروں پڑتی۔ کبھی سُباما کے پیروں سے لِپٹ جاتی۔ مگر بیاہی لڑکی پرائے گھر کی ہوجاتی ہے۔ اس پر کسی کا کیا اختیار۔

پرتاپ چند اور برجن کتنے ہی دنوں تک بھائی بہنوں کی طرح ایک ساتھ رہے تھے۔ مگر اب برجن کی آنکھیں اُسے دیکھتے ہی نیچے کو جُھک جاتیں۔ پرتاپ کی بھی یہی کیفیت تھی۔ گھر میں بہت کم آتا۔ کسی ضرورت سے آتا تو کچھ اس طرح نگاہیں نیچی کیے اور سمٹا ہوا گویا دُلہن ہے۔ اُس کی اِن نگاہوں میں وہ رازِ محبت چھپا ہوا تھا جسے وہ کسی متنفس حتیٰ کہ برجن پر بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ایک روز شام کا وقت تھا۔ رخصتی کو صرف تین دن رہ گئے تھے۔ پرتاپ کسی ضرورت سے اندر گیا اور اپنے کمرہ میں لیمپ جلانے لگا کہ برجن آئی۔ اُس کا آنچل آنسوؤں سے تر تھا۔ اُس نے آج دو برس کے بعد پرتاپ کی طرف پُرآب آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔"للّو مجھ سے کیسے صبر ہوگا!"

پرتاپ نے مردانہ ضبط سے کام لیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو نہ آئے اُس کی آواز بھاری نہ ہوئی۔ واعظانہ لہجے میں بولا۔"ایشور تمھیں صبر کی طاقت دے گا۔"

برجن کی گردن جُھک گئی۔ آنکھیں زمین میں گڑ گئیں اور ایک دبی ہوئی سسکی نے حسرت و درد کا وہ دفتر بیان کردیا۔ جو زبان سے ناممکن تھا۔

رُخصتی کا دن لڑکیوں کے لیے عجیب حسرت کا دن ہوتا ہے۔ بچپن کی سکھیاں۔ سہیلیاں۔ ماں باپ۔ بھائی بند و گھر کے مانوس در و دیوار اِن سب سے ناطہ ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ خیال کہ میں پھر اس گھر میں آؤں گی اُسے مطلق تسکین نہیں دیتا۔ کیونکہ اب وہ آئے گی تو مہمان کی حیثیت سے آئے گی۔ اُن لوگوں سے جُدا ہونا جن کے درمیان زندگی کے

گہوارے میں کھیلنا اور بے فکریوں کے چمن میں سیر کرنا نصیب ہوا ہو۔ اُس کے جگر کے ٹکڑے ٹکڑے کردیتا ہے۔ اب تک وہ دُنیا کے فرائض اور پابندیوں سے آزاد رہتی تھی۔ مگر آج سے اس کے سر پر ایسا بوجھ لدتا ہے جو مرتے دم تک اُٹھانا پڑے گا۔

برجن کا سِنگار کیا جارہا تھا۔ نائن اُس کے پیروں میں مہاور رچا رہی تھی کوئی اُس کے سر کے بالوں کو گوندھ رہی تھی۔ کوئی جوڑے میں عطر بسا رہی تھی۔ مگر جس کے لیے یہ سب تیاریاں ہو رہی تھیں وہ زمین پر موتی کے دانے یوں بکھیر رہی تھی گویا ان کا کچھ مول ہی نہیں ہے اتنے میں باہر سے پیغام آیا۔ ساعت ٹلی جارہی ہے جلدی کرو۔ سُباما پاس کھڑی تھی۔ برجن اس کے گلے لپٹ گئی۔ اور وہ جوشِ گریہ جو اب تک دبی ہوئی آگ کی طرح سُلگ رہا تھا یک بارگی یوں اُبل پڑا جیسے کوئی آنچ میں تیل ڈال دے۔

ذرا دیر میں پالکی دروازہ پر آئی۔ برجن پاس پڑوس کی عورتوں سے گلے ملی۔ سُباما کے پَیر چُھوئے اور تب دو تین عورتوں نے اُسے پالکی کے اندر بٹھا دیا۔ اُدھر پالکی اُٹھی اِدھر سُباما غش کھاکر زمین پر گر پڑی۔ گویا اُس کے جیتے جی کوئی اُس کی جان نکال کر لیے جاتا تھا۔ گھر سونا ہوگیا۔ سینکڑوں عورتوں کا جمگھٹ تھا۔ مگر ایک برجن کے نہ ہونے سے مکان پھاڑے کھاتا تھا۔

کملا چرن کے دوست

جیسے سیندور کی سرخی سے مانگ رچ جاتی ہے اُسی طرح برج رانی کے آنے سے پریموتی کے گھر کی رونق دوبالا ہوگئی۔ سُبابا نے اُسے ایسے گُن سِکھائے تھے کہ جس نے اُسے دیکھا موہ گیا۔ یہاں تک کہ سیوتی کی سہیلی رآنی کو بھی پریموتی کے سامنے اقرار کرنا پڑا کہ تمھاری چھوٹی بہو نے تو ہم سبھوں کا رنگ پھیکا کردیا۔ سیوتی اُس سے دن دن بھر باتیں کرتی۔ اور اُس کا جی نہ بھرتا۔ اُسے اپنے گانے پر ناز تھا۔ مگر اس میدان میں بھی برجن بازی لے گئی۔

اب کملا چرن کے دوستوں نے تقاضا کرنا شروع کیا کہ بھئی نئی دُلہن گھر میں لائے ہو کچھ دعوت جلسہ کی بھی فکر ہے۔ سُنتے ہیں نہایت حسین بیوی پائی ہے۔ کملاچرن کو روپے تو سُسرال میں ملا ہی تھا۔ جیب کھنکھاکر بولے۔"اجی دعوت لو۔ شرابیں اڑاؤ۔ آنکھیں سینکو۔ہاں بہت ہُوحق نہ مچانا ورنہ کہیں اندر خبر ہوتو سمجھیں یہ شہدا ہے۔ جب سے وہ گھر میں آئی ہیں ایں جانب کا قافیہ تنگ ہے۔ سُنتا ہوں انگریزی۔ فارسی۔ سنسکرت الّم غلّم سب گھوٹے بیٹھی ہے۔ڈرتا ہوں کہیں انگریزی میں پوچھ بیٹھی یا فارسی میں بات چیت شروع کردی تو سوائے بغلیں جھانکنے کے اور کیا کروں گا۔ اس لیے ابھی کنّی کاٹتا پھرتا ہوں۔"

یوں تو کملاچرن کے دوستوں کی تعداد لامحدود تھی۔ شہر کے جتنے کبوتر باز۔ کنکوے باز۔ شہدے تھے سب اُن کے دوست۔ مگر دِلی دوستوں میں صرف پانچ آدمی تھے اور سب کے سب فاقہ مست۔ آوارہ ان میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ میاں مجید تھے۔ کچہری میں عرائض نویسی کیا کرتے تھے۔ جو کچھ ملتا وہ سب شراب کی نذر کرتے۔ دوسرا نمبر حمید خاں کا تھا۔ ان ذات شریف نے ورثہ میں بڑی دولت پائی تھی۔ مگر تین سالوں میں سب کچھ اربابِ نشاط کی نذر کردیا۔ اب یہ وطیرہ تھا کہ شام کو سج دھج بناکر گلیوں کی خاک چھانتے پھرتے اور وقتِ ضرورت پر بازارِ حُسن کی دلالی بھی کیا کرتے تھے۔ اس بازار کے خریداروں اور بیوپاریوں میں اُن کی بڑی رسائی تھی۔ تیسرے حضرت سعید حسین تھے۔ ایک ہی شاطر قمار باز۔ سینکڑوں کے داؤ لگانے والے۔ بیوی کے زیوروں پر ہاتھ صاف کرنا روز مرّہ کا

مشغلہ تھا۔ باقی دو صاحب رام سیوک اور چندولال کچہری میں ملازم تھے۔ تنخواہیں تھوڑی مگر بالائی رقم وافر۔ نصف شراب کو نذر کرتے اور نصف شاہدانِ حُسن فروش کی خاطر و مدارات میں صرف ہوتی۔ گھر کے لوگ فاقے کرتے یا بھیک مانگتے۔ انھیں صرف اپنے عیش سے کام تھا۔

مشورہ تو ہو ہی چکا تھا۔ آٹھ بجے جب ڈپٹی صاحب لیٹے تو یہ پانچوں حضرات جمع ہوئے اور دور چلنے لگا۔ پانچوں پینے میں حاتم تھے۔ دائم الخمر۔ جب ذرا سرور گٹھا تو بہکی بہکی باتیں ہونے لگیں۔

مجید۔ کیوں بھئی کملا چرن! سچ کہنا دیکھ کر جی خوش ہو گیا یا نہیں؟

کملا۔ اب آپ بہکنے لگے کیوں؟

رام سیوک۔ بتلا کیوں نہیں دیتے۔ اس میں جھینپنے کی کیا بات ہے؟

کملا۔ بتلا کیا اپنا سر دُوں۔ کبھی سامنے جانے کا اتفاق بھی تو ہوا ہو۔ کل کواڑ کی دراڑ سے ایک نظر دیکھ لیا تھا۔ ابھی تک تصویر نگاہوں میں پھر رہی ہے۔

چندولال۔ میرے یار تو بڑا بلند اقبال ہے۔

کملا۔ ایسا بے قرار ہوا کہ گرتے گرتے بچا۔ بس پری سمجھ لو۔

مجید۔ تو بھئی یہ دوستی کس دن کام آئے گی۔ ایک نظر ہمیں بھی دکھاؤ۔

سعید۔ بیشک دوستی کے یہی معنی ہیں کہ آپس میں کوئی پردہ نہ رہے۔ دوئی کا مسئلہ ہی القط ہو جائے۔

چندولال۔ دوستی میں کیا پردہ۔ انگریزوں کو دیکھو۔ بیوی ڈولی سے اُتری نہیں کہ یار دوست ہاتھ ملانے لگے۔

رام سیوک۔ مجھے تو بن دیکھے چین نہ آئے گا۔ ہیں تو پختہ؟

کملا۔ (ایک دھول لگاکر) زبان کاٹ لی جائے گی۔ سمجھے۔

رام سیوک۔ کچھ پروا نہیں۔ آنکھیں تو دیکھنے کو رہیں گی۔

مجید۔ بھئی کملاچرن بُرا ماننے کی کوئی بات نہیں۔ اب اس وقت تمھارا فرض ہے کہ دوستوں کی فرمائش پوری کرو۔

کملا۔ ارے تو میں انکار کب کرتا ہوں۔

چندولال۔ واہ میرے شیر۔ یہ مردوں کی سی باتیں ہیں۔ تو ہم لوگ بن ٹھن کر آجائیں۔ کیوں؟

کملا۔ جی ذرا منہ میں کالکھ لگا لیجیے گا۔ بس اتنا کافی ہے۔

سعید۔ تو کارِ خیر میں تاخیر کیوں ہو۔ آج ہی کی ٹھہری نا؟

کملا۔ آج ہی سہی مگر یاد رہے کل آپ سب اصحاب کی بیویوں کے درشن کروں گا۔ اس وقت اگر کسی نے چیں چپڑ کیا تو بندہ کا پاپوشِ مبارک ہوگا اور اُس کا فرقِ نامبارک۔

سب کے سب۔ منظور۔ بہ دل و جان منظور۔

رام سیوک۔ یہاں کیا دھرا ہے۔ پانچ بچّوں کی ماں۔ اس پر پھٹے حال۔ خاصی چڑیل ہو رہی ہے۔

چندولال۔ یہاں اس سے بھی بدتر حال ہے۔ تین مہینہ سے چوتھیا آرہا ہے مگر کس مردود نے ایک کوڑی کی بھی دوا لی ہو۔ صورت دیکھتے ہی بخار چڑھ آتا ہے۔

سعید۔ ایں جانب یہ روگ ہی نہیں پالتے ہیں۔ چند روزہ انتظام مستقل انتظام سے بہتر ہوتا ہے۔

ادھر تو مئے ناب کے دور چل رہے تھے۔ اُدھر برجن پلنگ پر لیٹی ہوئی خیالوں میں غرق تھی۔ بچپن کے دن کیسے اچھے ہوتے ہیں۔ کاش وہ دن پھر آجاتے۔ آہ! کیسی دلچسپ زندگی تھی۔ دُنیا ناز۔ پیار اور محبت کا گہوارہ تھی۔ کیا وہ کوئی دوسری دُنیا تھی۔ کیا اُن دنوں دُنیا کی چیزیں بہت خوبصورت ہوتی تھیں۔ انھیں خیالوں میں آنکھ ذرا جھپک گئی اور بچپن کا ایک واقعہ پیشِ نظر ہوگیا۔ للّو نے اُس کی گڑیا مروڑ دی اس نے اُس کی کتاب کے دو ورق پھاڑ ڈالے۔ تب للّو نے اُس کی پیٹھ میں زور سے چٹکی لی اور باہر بھاگا۔ وہ رونے لگی۔ اور للّو کو کوس رہی تھی کہ سُباما اُس کا ہاتھ پکڑے ہوئے آئی اور بولی۔ "کیوں بیٹی اُس نے تمھیں مارا ہے نا؟ یہ بہت مارمار کر بھاگتے ہیں۔ آج ان کی مرمّت کرتی ہوں۔ دیکھوں کہاں مارا ہے۔" للّو نے ڈبڈبائی آنکھوں سے برجن کی طرف دیکھا اور برجن نے مُسکراکر کہا۔ "مجھے اُنھوں نے کہاں مارا۔ یہ مجھے کبھی نہیں مارتے۔" یہ کہہ کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اپنے حصّہ کی مٹھائی کھلائی۔ اور پھر دونوں مل کر کھیلنے لگے۔ وہ زمانہ اب کہاں؟ اُس

زمانہ کی یاد ایک خوابِ حسرت کی یاد ہے۔

رات زیادہ گزر گئی تھی۔ یکایک برجن کو ایسا معلوم ہوا کہ سامنے والی دیوار کوئی دھم دھما رہا ہے۔ اُس نے کان لگا کر سُنا۔ برابر آوازیں آرہی تھیں۔ کبھی رُک جاتیں۔ پھر آنے لگتیں۔ ذرا دیر میں مٹی گرنے لگی۔ خوف کے مارے برجن کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ جی کڑا کر کے اُٹھی اور مہراجن کو جھنجھوڑنے لگی۔ گھگھی بندھی ہوئی تھی۔ اتنے میں مٹی کا ایک بڑا سا ڈھیلا سامنے گرا اور مہراجن چونک کر اُٹھ بیٹھی۔ دونوں کو یقین ہوگیا کہ چور آئے ہیں۔ مہراجن ایک ہی چالاک عورت تھی سمجھی کہ چلاؤں گی تو جاگ ہوجائی گی۔ اُس نے سُن رکھا تھا کہ چور پہلے سیند میں پَیر ڈال کر دیکھتے ہیں تب خود گھستے ہیں۔ اُس نے ایک ڈنڈا اُٹھا لیا کہ جب پَیر ڈالے گا تو ایسا تاک کر ماروں گی کہ ٹانگ ٹوٹ جائے گی۔ مگر چور نے پَیر کے بجائے سیند میں سے سر باہر نکالا۔ مہراجن تاک میں تو تھی ہی ڈنڈا چلا دیا اور کھٹ کی آواز آئی۔ چور نے فوراً سر کھینچ لیا۔ اور یہ کہتا ہوا سنائی دیا ”اُف! مار ڈالا۔ کھوپڑی بھنا گئی۔“ پھر کئی آدمیوں کے ہنسنے کی آواز آئی اور اس کے بعد سناٹا ہوگیا۔ اتنے میں اور لوگ جاگ پڑے اور باقی رات گپ شپ میں کٹی۔

سویرے جب کملاچرن گھر میں آئے تو آنکھیں سُرخ تھیں اور سر میں آماس تھا۔ مہراجن نے نزدیک جاکر دیکھا اور آکر برجن سے بولی۔”بہو ایک بات کہوں۔ بُرا تو نہ مانو گی۔“

برجن۔ بُرا کیوں مانوں گی۔ کہو۔ کیا کہتی ہو؟

مہراجن۔ رات جو سیند پڑی تھی وہ چوروں نے نہیں لگائی تھی۔

برجن۔ پھر کون تھا؟

مہراجن۔ گھر ہی کے بھیدی تھے۔ باہری کوئی نہیں تھا۔

برجن۔ کیا کسی کہار کی شرارت تھی۔

مہراجن۔ نہیں۔ کہاروں میں ایسا کوئی نہیں ہے۔

برجن۔ پھر کون تھا۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتیں۔

مہراجن۔ میری جان میں تو چھوٹے بابو تھے۔ میں نے وہ لکڑی نہیں پھینکی تھی وہ اُن کے سر میں لگی۔ سر پھُولا ہوا ہے۔

اتنا سنتے ہی برجن کے تیور بدل گئے اور چہرہ تمتما گیا۔ غضب ناک ہو کر بولی۔ ”مہراجن! ہوش سنبھال کر باتیں کرو۔ تمھیں یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ تمھیں میرے سے ایسی بات کہنے کا حوصلہ ہوا؟ خود میرے سر پر الزام تھوپ رہی ہو۔ تمھارے بڑھاپے پر ترس آتا ہے۔ ورنہ اسی وقت تمھیں یہاں سے کھڑے کھڑے نکلوا دیتی۔ تب تمھیں معلوم ہوتا کہ زبان کو قابو میں نہ رکھنے کا یہ پھل ہوتا ہے یہاں سے اُٹھ جاؤ۔ مجھے تمھاری صورت دیکھ کر بخار سا چڑھ رہا ہے۔ تمھیں اتنا نہ سمجھ پڑا کہ میں کیسی بات زبان سے نکال رہی ہوں۔ اُنھیں ایشور نے کیا نہیں دیا ہے۔ سارا گھر اُن کا ہے۔ میرا جو کچھ ہے۔ اُن کا ہے۔ میں خود اُن کی چیری ہوں۔ اور ان کی نسبت تم ایسی بات کہہ بیٹھیں۔

مگر جس بات پر برجن ایسی برہم ہوئی اسی بات پر گھر کے دوسرے آدمیوں کو آسانی سے یقین آ گیا۔ ڈپٹی صاحب کے کان میں بات پہنچی، وہ کملاچرن کو اس سے زیادہ شریرالنفس سمجھتے تھے۔ جتنا وہ فی الواقع تھا۔ خوف ہوا کہ کہیں یہ حضرت بہو کے زیوروں پر نہ ہاتھ صاف کریں۔ بہتر ہے کہ انھیں بورڈنگ ہاؤس بھیج دُوں۔

کملا چرن نے یہ تجویز سُنی تو بہت چیخے چلائے۔ مگر کچھ سوچ کر دوسرے دن بورڈنگ ہاؤس چلے گئے۔ برجن کے آنے سے پہلے کئی بار یہ تجویز ہوئی تھی مگر کملا کی ضد کے سامنے ایک بھی پیش نہ گئی۔ یہ بیوی کی نگاہوں میں ذلیل ہوجانے کا خوف تھا۔ جو اب کی بار اُسے بورڈنگ ہاؤس لے گیا۔

کایا پلٹ

پہلا دن تو کملاچرن نے کسی طرح بورڈنگ ہاؤس میں کاٹا۔ صبح سے شام تک پڑے سویا کیے۔ دوسرے دن خیال آیا کہ آج تو نواب صاحب اور تیکھے مرزا کے بٹیروں میں بدا ہوا جوڑ ہے۔ کیسے کیسے مست پٹھے ہیں کہ دیکھ کر روح وجد کرنے لگے۔ آج اُن کی پکڑ دیکھنے کے قابل ہوگی۔ شہر کا شہر پھٹ پڑے تو عجب نہیں۔ چہ خوش۔ شہر کے لوگ تو بہار اُڑائیں اور میں یہاں کتابوں سے سر لڑاؤں۔ یہ سوچتے سوچتے اُٹھا اور دم کی دم میں بدان کے موقع پر تھا۔

یہاں آج خلقت کی خلقت جمع تھی۔ خاصہ میلہ لگا ہوا تھا۔ سقّے چھڑکاؤ کر رہے تھے۔ سگرٹ والے۔ کباب والے۔ تمبولی سب اپنی اپنی دُکانیں لگائے بیٹھے تھے اور شہر کے رنگین مزاج نوجوان ہاتھوں میں بٹیر لیے یا مخملی اڈّوں پر بلبلوں کو بٹھائے مٹرگشت کر رہے تھے۔ کملاچرن کے دوستوں کی اس جگہ کیا کمی۔ لوگ اُنھیں خالی ہاتھ دیکھتے تو حیرت سے پُوچھتے۔ ارے راجا صاحب! آج خالی ہاتھ کیسے۔ اتنے میں میاں سعید۔ مجید۔ حمید وغیرہ نشہ میں چُور سگرٹ کے دُھوئیں بھکا بھک اُڑاتے نظر آئے۔ کملاچرن کو دیکھتے ہی سب کے سب سرپٹ دوڑے اور پانچوں کے پانچ عیوب شرعی کی طرح اُن سے لپٹ گئے۔

مجید۔ آج تم کہاں غائب ہوگئے تھے میاں؟ قرآن کی قسم مکان کے سینکڑوں چکر لگائے ہوں گے۔

رام سیوک۔ آج کل عید کی راتیں ہیں بھئی آنکھیں نہیں دیکھتے نشہ سا چڑھا ہوا ہے۔

چندولال۔ چین کر رہا ہے پٹھّا۔ جب سے نازنین گھر میں آئی ہے۔ اس مرد خدا نے بازار کی صورت تک نہیں دیکھی۔ جب دیکھیے گھر میں گھسا رہتا ہے۔ خوب چین کرلے یار۔ دوستوں کی طرف سے بھی بوسے لے لیا کر۔

کملا۔ چین کیا خاک کروں۔ یہاں تو قید میں پھنس گیا۔ تین دن سے بورڈنگ میں پڑا ہوں۔

مجید۔ ”ارے! خدا کی قسم!“

کملا۔ تیری جان کی قسم۔ پرسوں سے مٹی پلید ہورہی ہے۔ آج سبھوں کی آنکھیں بچاکر نکل بھاگا۔

رام سیوک۔ اُف! مصیبت سی مصیبت ہے۔ مگر یار خوب اُڑے۔ وہ مچھندر سپرنٹنڈنٹ جھلا رہا ہوگا۔

کملا۔ اس معرکہ کے جوڑ چھوڑکر کتابوں میں سر کون مارتا۔ اس کی مدتوں سے آرزو تھی۔

سعید۔یار آج اُڑ آئے تو کیا۔ حق یہ ہے کہ تمھارا وہاں رہنا ستم ہے۔ روز تو نہ آسکو گے۔ اور یہاں آئے دن نئی نئی سیریں۔ نئی نئی دلچسپیاں۔ کل لال ڈگی پر۔ پرسوں پریٹ پر۔ ترسوں بٹیرے کا میلہ کہاں تک گِناؤں۔

کملا۔ کل کی کٹاؤ تو بندہ ضرور دیکھے گا۔ چاہے اِدھر کی دُنیا اُدھر ہوجائے۔

سعید۔ اور بٹیروں کا میلہ نہ دیکھا تو حسرت رہ جائے گی۔

سہ پہر کے وقت کملاچرن یارانِ شاطر سے رخصت ہوکر بادل ناخواستہ بورڈنگ ہاؤس کی طرف چلا۔ دل میں ایک چور سا بیٹھا ہوا تھا۔ دروازہ پر پہنچ کر جھانکنے لگا کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب نہ ہوں تو لپک کر کمرہ میں چلا جاؤں۔ مگر دیکھتا ہے۔ تو وہ بھی باہر ہی کی طرف آرہے ہیں۔ دل کو خوب مضبوط کرکے اندر داخل ہوا سپرنٹنڈنٹ صاحب بولے۔''اب تک کہاں تھے؟''

لہجہ ایسا درشت تھا کہ کملاچرن بہ مشکل ترکی بہ ترکی جواب دینے سے باز رہا۔ مغرورانہ انداز سے بولا۔''ایک ضرورت سے بازار چلا گیا تھا۔''

سپرنٹنڈنٹ۔ یہ بازار جانے کا وقت نہیں ہے۔

کملا۔ مجھے معلوم نہیں تھا۔ آئندہ سے احتیاط رکھوں گا۔

رات کو جب کملا چارپائی پر لیٹا تو سوچنے لگا۔ یار آج تو بچ گیا مگر مزا تو جب ہو کہ کل بھی بچوں اور پرسوں بھی حضرت کی آنکھوں میں خاک ڈالوں۔ کل کا نظارہ واقعی قابلِ دید ہوگا۔ کنکوّے آسمان سے باتیں کریں گے۔ اور لمبے لمبے پیچ ہوں گے۔ نوشاد مرزا بلا کی بازی لگاتا ہے۔ یہ خیال کرتے کرتے سوگیا۔ دوسرے دن پھر علی الصباح بورڈنگ ہاؤس سے نکل بھاگا۔ یارانِ دلنواز لال ڈگی پر اُس کے منتظر تھے۔ دیکھتے ہی باغ باغ ہوگئے۔ اور پیٹھ ٹھوکی۔

کملا چرن کچھ دیر تک تو کٹاؤ دیکھتا رہا۔ پھر شوق چرّایا کہ کیوں نہ میں بھی اپنے کنکوے منگاؤں اور اپنی تیز دستی کے کرتب دکھاؤں۔ سعید نے بھڑکایا۔ بد بد کر لڑاؤ۔ روپیہ ہم دیں گے۔ چٹ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ مکان پر آدمی دوڑا دیا کامل یقین تھا کہ اپنے مانجھے سے یہاں ستھراؤ کر دوں گا۔ مگر آدمی گھر سے خالی ہاتھ لوٹا تب تو حضرت کو تاب نہ رہی۔ بدن میں آگ سی لگ گئی۔ ہنٹر لے کر دوڑے اور مکان پر آتے ہی کہاروں کو ایک سرے سے سڑ سڑ پیٹنا شروع کیا۔ غریب بیٹھے حقہ تمباکو کر رہے تھے۔ ہنٹر پڑے اور بے خطا بے قصور تو چیخیں مارمار کر رونے لگے۔ سارے محلّہ میں ایک شور سا برپا ہوگیا۔ کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔ کہ ہماری کیا خطا ہے۔ یہاں کہاروں کی خاطر خواہ مرمّت کرکے کملا چرن اپنے کمرہ میں پہنچے۔ مگر وہاں کی کیفیت دیکھ کر غصہّ بُخار کے درجہ تک پہنچ گیا۔ پتنگ پھٹے ہوئے تھے۔ چرخیاں ٹوٹی ہوئی اور مانجھے کی لچھیاں اُلجھی ہوئیں۔ گویا کسی وبا نے ان ہوائی جنگ آوروں کا ستیاناس کردیا۔ سمجھ گئے کہ ضرور امّاں نے یہ حرکت کی ہے۔ غصہّ سے لال اماں کے پاس آئے اور زورزور سے کہنے لگے۔ ''کیوں اماں! کیا تم سچ مچ میری جان ہی لینے پر آگئی ہو۔ تین دن ہوئے قیدخانہ میں بھیجوا دیا۔ مگر اتنے پر بھی کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ میری دلچسپی کے جو سامان تھے وہ سب برباد کرڈالے۔ کیوں؟''

پریموتی۔ (حیرت سے) میں نے تو تمھاری کوئی چیز نہیں چھوئی۔ کیا ہوا؟

کملا۔ (بگڑ کر) جُھوٹوں کے منہ میں کیڑے پڑتے ہیں۔ اگر تم نے میری چیزیں نہیں چُھوئیں تو کِس کی مجال ہے جو میرے کمرہ میں جاکر میرے کنکوّے اور چرخیاں سب توڑ پھوڑ ڈالے۔ کیا اتنا بھی نہیں دیکھا جاتا۔

پریموتی۔ تمھارے سر کی قسم میں نے اس کمرہ میں قدم نہیں رکھا۔ چلو دیکھوں کون کون چیزیں ٹوٹی ہیں۔

یہ کہہ کر پریموتی تو اس کمرہ کی طرف چلی اور کملا غصہّ میں بھرے آنگن میں کھڑے رہے کہ اتنے میں مادھوی برجن کے کمرہ سے نکلی اور اُن کے ہاتھ میں ایک رقعہ دے کر چلی گئی۔ لکھا ہوا تھا۔

خطا میں نے کی ہے خطاوار ہوں　　سزا دیجیے جو سزاوار ہوں

یہ پُرزہ دیکھتے ہی کملا بھیگی بلّی بن گیا۔ دبے پاؤں مردانے کی طرف چلا۔ پریموتی نے پردہ کی آڑ سے سسکتے ہوئے نوکروں کو ڈانٹنا ڈپٹنا شروع کیا تھا۔ اسے منع کیا۔ اور اسی وقت چند اور کنکوے جو بچے ہوئے تھے پھاڑ ڈالے۔ چرخیاں ریزہ ریزہ کر ڈالیں اور ڈور میں دیاسلائی لگادی۔ ماں اُس کی یہ مجنونانہ حرکت دیکھ رہی تھی۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا ماجرا ہے۔ کہاں تو ابھی ابھی اِنھیں چیزوں کے لیے دنیا سر پر اُٹھالی اور کہاں خود ہی ان کے پیچھے پڑگئے۔ سمجھی شاید مارے غصّہ کے یہ حرکت کر رہا ہے۔ منانے لگی۔ مگر کملا کے چہرے سے غصّہ مطلق ظاہر نہ ہوتا تھا۔ سنجیدگی سے بولا۔"میں غصّہ میں نہیں ہوں۔ آج سے پکّا ارادہ کرتا ہوں کہ پتنگ کبھی نہ لڑاؤں گا۔ میری حماقت تھی کہ ان چیزوں کے لیے آپ سے جھگڑ بیٹھا۔"

جب کملا چرن کمرہ میں اکیلا رہ گیا تو سوچنے لگا۔ بیشک میرے کنکوے اُڑانا اُنھیں ناپسند ہے۔ دل سے نفرت کرتی ہیں۔ ورنہ مجھ پر یہ ظلم ہرگز نہ کرتیں کاش ایک بار اُن سے ملاقات ہوجاتی تو پوچھتا کہ تمھاری کیا مرضی ہے۔ مگر کون منہ دکھاؤں گا۔ ایک تو کوڑھ مغز اس پر اپنی حماقت کے کئی بار ثبوت دے چکا۔ سینڈ والے معاملہ کی خبر اُنھیں ضرور ہی ہوئی ہوگی۔ انھیں صورت دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ اب تو یہی علاج ہے کہ یا تو اُن کی صورت دیکھوں اور نہ اپنی دکھاؤں یا کسی طرح کچھ علم حاصل کروں۔ ہائے! ظالم نے کیسی صورت پائی ہے۔ عورت نہیں حور معلوم ہوتی ہے۔ کیا کبھی وہ دن بھی ہوں گے کہ میں اسے پیار کروں گا اور میرے پیار کے بدلے وہ بھی مجھے پیار کرے گی۔ اس وقت تو شاید میں شادیٔ مرگ ہوجاؤں۔ کیا سُرخ سُرخ رسیلے ہونٹھ ہیں۔ مگر ظالم ہے۔ رحم تو اُسے چُھو نہیں گیا۔ کہتی ہے سزا دیجیے جو سزاوار ہوں۔ کیا سزا دوں۔ اگر آجاؤ تو گلے سے لگا لوں اور انگنت بوسے لوں۔ یہی تمھاری سزا ہے۔ اور بشرط زندگی کبھی نہ کبھی یہ سزا دوں گا ضرور۔ اچھا تو اب آج سے پڑھنا چاہیے۔ یہ سوچتے سوچتے اُٹھا اور ڈربہ کھول کر کبوتروں کو اُڑانے لگا۔ سینکڑوں ہی جوڑے تھے۔ ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر۔ آسمان میں تارے بن جائیں۔ اُڑیں تو دن بھر اُترنے کا نام نہ لیں۔ شہر کے کبوترباز ایک ایک جوڑے کے بدلے غلامی لکھانے کو تیار تھے۔ مگر دم زدن میں سب کے سب اُڑا دیے۔ جب ڈربہ صاف ہوگیا تو کہاروں کو یہ حکم دیا کہ اسے اُٹھا لے جاؤ اور آگ میں جلا دو۔ ورنہ سب

کبوتر اُس پر آکر بیٹھیں گے۔ کبوتر کا قصہ پاک کرکے بٹیروں اور بُلبلوں کی طرف مخاطب ہوئے اور اُنھیں بھی بند قفس سے آزاد کردیا۔

باہر تو یہ گُل ہوا تھا۔ اندر پریموتی چھاتی پیٹ رہی تھی کہ نہیں معلوم لڑکا کیا کرنے پر آیا ہے۔ برجن کو بُلاکر کہا۔"بیٹی بچہ کو کسی طرح روکو۔ نہیں معلوم اُس نے دل میں کیا ٹھانی ہے۔" یہ کہہ کر رونے لگی۔ برجن کو بھی شک ہو رہا تھا کہ ضرور اُنھوں نے کچھ اور نیت کی ہے ورنہ اس جھلاہٹ کے کیا معنی گو کملا بدشوق تھا۔ بداخلاق تھا۔ آوارہ تھا۔ مگر ان سب عیبوں کے ساتھ اس میں ایک بڑا وصف بھی تھا جس کی کوئی عورت ناقدری نہیں کرسکتی۔ اسے برج رانی سے سچّی محبت تھی اور اس کا نادانستہ طور پر کئی بار اظہار ہوچکا تھا۔ یہی سبب تھا جس نے برجن کو اتنا دلیر بنادیا تھا۔ اُس نے کاغذ نکالا اور یہ پُرزہ لکھ کر باہر بھیجا۔

> پیارے! یہ خفگی کس پر ہے۔ کیا مجھ پر اور محض اس لیے کہ میں نے عجلت کرکے دو تین کنکوے پھاڑ ڈالے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ اتنی سی بات پر ایسے برگشتہ ہوجائیں گے تو ہرگز اُنھیں ہاتھ نہ لگاتی۔ مگر اب خطا ہوگئی۔ معاف فرمایئے۔ یہ پہلی خطا ہے۔
>
> آپ کی برج رانی

کملا چرن یہ خط پاکر ایسا خوش ہوا گویا ساری دنیا کی دولت ہاتھ لگ گئی۔ جواب دینے کا شوق چرّایا مگر قلم ہی نہیں اُٹھتا۔ نہ القاب ملتا ہے۔ نہ آداب۔ نہ اُٹھان کا خیال ہوتا ہے۔ نہ خاتمہ کا۔ ہرچند چاہتا ہے کوئی عاشقانہ رنگ کا پھڑکتا ہوا خط لکھوں۔ مگر عقل ذرا بھی نہیں دوڑتی۔ آج پہلی بار کملا چرن کو اپنی بے علمی اور جہالت پر رونا آیا۔ افسوس! میں ایک سیدھا سا خط بھی نہیں لکھ سکتا۔ اس خیال سے وہ رونے لگا۔ اور کمرہ کے دروازے بند کرلیے کہ کوئی دیکھ نہ لے۔

سہ پہر کے وقت منشی شیاما چرن گھر پر آئے تو سب سے پہلی چیز جو نظر پڑی وہ آگ کا الاؤ تھا۔ نوکروں سے متعجب ہوکر پوچھا۔"یہ کیسا الاؤ ہے؟" نوکروں نے جواب دیا۔"حضور ڈربہ جل رہا ہے۔"

منشی جی۔ (گھڑک کر) اسے کیوں جلاتے ہو۔ کبوتر کہاں رہیں گے؟

کہار۔ چھوٹے بابو کا حکم ہے کہ سب ڈربہ جلادو۔
منشی جی۔ کبوتر کہاں گئے؟
کہار۔ سب اُڑا دیے۔ ایک بھی نہیں رکھا۔ کنکوے سب پھاڑ ڈالے۔ ڈور جلا دی۔ بڑا نکسان کیا۔ کہار نے اپنی دانست میں مارپیٹ کا بدلہ لیا۔ غریب سمجھا کہ منشی جی اس نقصان کے لیے کملا چرن کو سخت سُست کہیں گے۔ مگر منشی جی نے یہ ماجرا سُنا تو سکتے میں آگئے۔ انھیں جانوروں پر کملا چرن جان دیتا تھا۔ آج یکایک کیا کایا پلٹ ہوگئی۔ ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔ کہار سے کہا بچّہ کو بھیج دو۔ ایک منٹ میں کہار نے آکر کہا۔ ''ہجور دروَجا بند ہے اندر سے۔ بہت کھٹکھٹایا کھولتے ہی نہیں۔''

اتنا سُننا تھا کہ منشی جی کا خون خشک ہوگیا۔ فوراً شبہ ہوا کہ بچّا نے زہر کھا لیا۔ آج ایک زہرخورانی کا مقدمہ فیصل کرکے آئے تھے۔ ننگے پاؤں دوڑے اور بند کمرہ کے دروازہ پر زور سے لات مار کر کہا۔ ''بچّہ! بچّہ!'' یہ کہتے کہتے گلا پھنس گیا۔ کملا نے باپ کی آواز سُنی تو فوراً آنسو پونچھ ڈالے اور اُٹھ کر دروازہ کھول دیا مگر اُسے کتنا تعجب ہوا جب منشی جی نے بجائے لعن طعن کرنے کے اُسے سینہ سے لپٹا لیا اور گھبرا کر پوچھا۔ ''بچّہ! تمھیں میرے سر کی قسم بتادو تم نے کچھ کھا تو نہیں لیا؟''

کملا چرن نے اس سوال کا مطلب سمجھنے کے لیے منشی جی کی طرف آنکھیں اُٹھائیں تو اُن میں آنسو تھے۔ منشی جی کو اب یقین کامل ہوگیا کہ ضرور آفت آگئی۔ ایک کہار سے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب کو بلا لا۔ کہنا ابھی چلیے۔'' اب جاکے کُند ذہن کملا باپ کی اس گھبراہٹ کا مطلب سمجھا۔ دوڑ کر انُ سے لپٹ گیا۔ اور بولا۔ ''آپ کا شبہ بالکل بے جا ہے۔ آپ کے سر کی قسم میں بالکل اچھا ہوں۔''

مگر ڈپٹی صاحب کے ہوش اُڑے ہوئے تھے۔ سمجھے یہ مجھے روک کر دیر کیا چاہتا ہے۔ تاکہ اپنا کام تمام کرلے۔ منّت کرکے بولے۔ ''بچّہ ایشور کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ میں صندوق سے ایک دوا لیتا آؤں۔ میں کیا جانتا تھا کہ تم اس نیت سے بورڈنگ ہاؤس جارہے ہو۔''

کملا۔ بخدا میں بالکل اچھّا ہوں۔ آپ کا شبہ بالکل غلط ہے۔ میں ایسا غیرت مند ہوتا تو آج

ایسا جاہل تھوڑے ہی بنا رہتا۔ آپ خواہ مخواہ ڈاکٹر صاحب کو بُلا رہے ہیں۔

منشی جی۔ (کچھ کچھ یقین کرکے) کواڑ بند کرکے کیا کر رہے تھے۔

کملا۔ جی اندر سے ایک خط آگیا تھا۔ اُس کا جواب لکھ رہا تھا۔

منشی جی۔ اور یہ کبوتر وغیرہ کیوں اُڑا دیے۔

کملا۔ اسی لیے کہ خوب اطمینان سے پڑھوں۔ انھیں خرافاتوں میں میرا وقت ضائع ہوجاتا تھا۔ آج میں نے اُن کا خاتمہ کردیا۔ اب آپ دیکھیں گے کہ میں کیسا جی لگاتا ہوں۔

بارے ڈپٹی صاحب کے ہوش بجا ہوئے۔ اندر آکر پریموتی سے حال پوچھا تو اُس نے ساری رامائن کہہ سُنائی۔ اُنھوں نے جب سُنا کہ برجن نے غصّہ میں آکر کملا کے کنکوے پھاڑ ڈالے اور چرخیاں توڑ ڈالیں تو بے اختیار ہنس پڑے اور کملا کی دلچسپیوں کی خانہ بربادی کا راز سمجھ میں آگیا۔ بولے۔ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہو اِن لالہ کو درست کرکے چھوڑے گی۔ آج کل دفتر سے آتا ہوں تو اکثر گھر ہی پر بیٹھے پاتا ہوں۔ کبھی کبھی کتاب بھی کھلی ہوئی نظر آتی ہے۔ آگئے حضرت بیوی کے پنجہ میں۔ دیکھ لینا اب سنبھل جائیں گے۔

بدگمانی

برج رانی کی رخصتی کے بعد سُباما کا گھر ایسا سُونا ہوگیا۔ گویا قفس سے چڑیا اُڑ گئی وہ اُس گھر کا اُجالا اور اس جسم کی جان تھی۔ مکان وہی ہے مگر در و دیوار پر حسرت چھائی ہوئی ہے۔ مکین وہی ہیں مگر سب کے چہرے افسردہ اور آنکھیں غمناک ہو رہی ہیں۔ گلشن وہی ہے مگر خزاں رسیدہ۔ رخصتی کے بعد مہینہ بھر کے اندر منشی سجیون لال بھی تیرتھ جاترا کو سدھارے مال دولت جو کچھ تھا پرتاپ کو سونپ دیا۔ اپنے ساتھ مرگ چھالا۔ بھگوت گیتا اور چند کتابوں کے سوا اور کچھ نہ لے گئے۔

پرتاپ چند پُرزور محسوسات کا نوجوان تھا مگر اس کے ساتھ ہی ضبط کی انتہائی قوت بھی اُسے حاصل تھی۔ مکان کی ایک ایک چیز اُسے برجن کی یاد دلاتی رہتی۔ یہ خیال دل سے ایک لمحہ کے لیے بھی دُور نہ ہوتا کہ کاش برجن میری ہوتی تو کیسے لطف سے زندگی بسر ہوتی۔ مگر اس خیال کو وہ دُور کرتا رہتا تھا۔ پڑھنے بیٹھتا تو کتاب کھلی رہتی اور خیال کہیں اور جا پہنچتا۔ کھانا کھانے بیٹھتا تو برجن کی صورت آنکھوں میں پھرنے لگتی۔ جذبۂ محبت کو ضبط کی طاقت سے دباتے دباتے یہ حال ہوگیا گویا برسوں کا مریض ہے۔ عشاق کو اپنی تمنّاؤں کے پوری ہونے کی امید ہو یا نہ ہو مگر وہ دل ہی دل میں اپنے معشوق کے دیدار کا لطف اُٹھاتے رہتے ہیں۔ وہ عالمِ خیال میں معشوق سے باتیں کرتے ہیں۔ چھیڑتے ہیں۔ روٹھتے ہیں۔ مناتے ہیں۔ ان تصورات سے انھیں تسکین ہوتی ہے۔ اور دل کو ایک پُرمزہ اور خوشگوار شغل ہاتھ آجاتا ہے۔ مگر کاش کوئی طاقت نہیں اس گلشن خیال کی سیر کرنے سے روکے۔ کاش کوئی طاقت اُنھیں خیال میں بھی تصویر یار کا دیدار نہ کرنے دے تو اُن بدقسمت بندگانِ محبت کی کیا گت ہوگی۔ پرتاپ انھیں بدقسمت شخصوں میں تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ چاہتا تو مسرت بخش خیالات کا لطف اُٹھا سکتا تھا۔ عالمِ خیال کی سیر ظاہری دلچسپیوں سے کم لطف انگیز نہیں ہوتی مگر مشکل تو یہ تھی کہ وہ برجن کے خیال کو بھی عاشقانہ جذبات کی آلائش سے پاک رکھنا چاہتا تھا۔ اس کی تربیت ایسے پاکیزہ اُصولوں پر ہوئی تھی اور اُسے ایک نیک منش پاک باطن بزرگ کی صحبت سے فیض اُٹھانے کے ایسے

اچھے موقعے ملے تھے کہ اُس کی نگاہوں میں خیالات کی پاکیزگی کی اُتنی ہی وقعت تھی جتنی فعلوں کی پاکیزگی کی۔ یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ برجن کو جسے بارہا بہن کہہ چکا تھا۔ جسے اب بھی بہن سمجھنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ عالمِ خیال میں بھی ایسے تصورات اور جذبات کا مرکز بناتا جو خباثت سے کیسے ہی پاک ہوں مگر نفس سرکش کی حوصلہ افزائیوں سے آزاد نہیں ہوسکتے تھے۔ جب تک منشی سجیون لال موجود تھے اس کا کچھ نہ کچھ وقت ان کے ساتھ گیان اور معرفت کے چرچوں میں کٹ جاتا تھا۔ جس سے روح کو گونہ تشفی ہوتی تھی۔ مگر ان کے چلے جانے کے بعد تربیت نفس کے یہ موقعے بھی جاتے رہے۔

سُباما اسے ہر دم دل گرفتہ پاتی تو اسے بہت صدمہ ہوتا۔ ایک روز اُس نے کہا کہ تمھاری طبیعت یہاں نہ لگتی ہو تو کچھ دنوں کے لیے الہ آباد چلے جاؤ۔ وہاں شاید تمھاری طبیعت بحال ہوجائے۔ یہ خیال پرتاپ کے دل میں کئی بار پیدا ہوا تھا مگر اس خوف سے کہ اماں کو تنہائی بہت شاق گزرے گی اس نے کبھی تجویز پر غور نہیں کیا تھا۔ ماں کی طرف سے اشارہ پایا تو ارادہ پختہ ہوگیا۔ سفر کی تیاریاں کرنے لگا۔ روانگی کا دن مقرر ہوگیا۔ اب سُباما کا یہ حال ہے کہ جب دیکھیے پرتاپ کو پردیس میں رہنے سہنے کے متعلق ہدایتیں کر رہی ہے۔ بیٹا دیکھو کسی سے راڑ مت مول لینا جھگڑنے کی تو تمھاری ویسے بھی عادت نہیں ہے۔ مگر سمجھائے دیتی ہوں۔ پردیس کا واسطہ ہے۔ پھونک پھونک کر قدم رکھنا۔ کھانے پینے میں بے احتیاطی نہ کرنا۔ تمھاری یہ بڑی بُری عادت ہے کہ جاڑوں میں سرشام سے سوجاتے ہو۔ پھر کوئی کھانے کے لیے کتنا ہی جگائے منکتے تک نہیں۔ آپ بھی اُپاس کرتے ہو دوسروں کو بھی اُپاس کراتے ہو۔ یہ عادت پردیس میں بنی رہی تو تمھیں رات کا کھانا کاہیکو میسر ہوگا۔ دن کو ذرا دیر کے لیے آرام کرلیا کرنا۔ تمھاری آنکھوں میں تو دن کو جیسے نیند ہی نہیں رہتی۔ اسے جب موقع ملتا بیٹے کو ایسی ہی مادرانہ نصیحتیں کیا کرتی۔

آخر روانگی کا دن آپہنچا۔ گاڑی دس بجے دن کو چھوٹتی تھی۔ پرتاپ نے سوچا برجن سے ملاقات کرلوں۔ پردیس جارہا ہوں۔ پھر نہ جانے کب ملاقات ہو۔ دل نے گدگدایا۔ ماں سے کہہ بیٹھا۔ سُباما بہت خوش ہوئی۔ ایک طشت میں حلوا اور سموسے اور دو تین قسم کے مربّے رکھ کر ردھیا کو دیے کہ للّو کے ساتھ جا۔ پرتاپ نے خط صاف کیا۔ کپڑے بدلے اور بن سنور کر چلے مگر چلنے کو تو چلے۔ اب جوں جوں قدم آگے اُٹھتا ہے دل بیٹھا جاتا

ہے۔ طرح طرح کے خیالات آرہے ہیں۔ نہ جانے من میں کیا سمجھے کیا نہ سمجھے چار مہینے گزر گئے۔ اُس نے مجھے ایک خط بھی تو الگ نہیں لکھا۔ پھر کیونکر کہوں کہ میرے ملنے سے اسے خوشی ہوگی۔ اجی اب اُسے تمھاری فکر ہی کیا ہے۔ تم مر بھی جاؤ تو وہ آنسو نہ بہائے۔ یہاں کی بات اور تھی وہاں کی بات اور ہے۔ اور مجھے یہ کیا حماقت سُوجھی کہ نیا سُوٹ پہن کر آیا۔ یہ ضرور اس کی نگاہوں میں کھٹکے گا۔ کہیں یہ نہ سمجھے کہ لالہ جی بن ٹھن کے مجھے...... رِجھانے آئے ہیں۔ اسی حیص بیص میں بڑھتا چلا آتا تھا۔ یہاں تک کہ شیاما چرن کا مکان نظر آنے لگا۔ اور کملا صحن میں چہل قدمی کرتا دکھائی دیا۔ اسے دیکھتے ہی پرتاپ کی وہ کیفیت ہوگئی جو کسی چور کی سپاہی کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ فوراً اس مکان کی آڑ میں چھپ گیا۔ اور ردھیا سے بولا۔ ”تو جا۔ یہ چیزیں دیتی آ۔ میں ذرا ایک ضرورت سے بازار جا رہا ہوں۔ لوٹتا ہوا آؤں گا۔“ یہ کہہ کر بازار کی طرف چلا۔ مگر دس ہی قدم گیا کہ پھر مہری کو بلایا اور بولا۔ ”مجھے شاید دیر ہوجائے۔ اس لیے اِدھر نہ آسکوں گا۔ کچھ پوچھیں تو یہ پُرزہ دے دینا۔“ یہ کہہ کر جیب سے پنسل نکالی اور چند سطریں لکھ کر دے دیں۔ جس سے اس کی قلب کی کیفیت کا بخوبی اظہار ہوتا ہے۔

> میں آج الہ آباد جارہا ہوں۔ اب وہیں پڑھوں گا۔ تم سے عجلت کے باعث نہ مِل سکا۔ زندہ رہوں گا تو پھر آؤں گا۔ کبھی کبھی اپنی خیروعافیت سے اطلاع دیتی رہنا۔
>
> تمھارا پرتاپ

پرتاپ تو یہ پُرزہ دے کر رخصت ہوا اور ردھیا آہستہ آہستہ برجن کے گھر پہنچی۔ وہ اسے دیکھتے ہی دوڑی اور خیروعافیت پوچھنے لگی۔ ”للو کی کوئی چھٹی آئی تھی؟“

ردھیا۔ جب سے گئے۔ چٹھی پتر کچھ نہیں آوا۔

برجن۔ چچی تو آرام سے ہیں؟

ردھیا۔ للو بابو پراگ راج جات ہیں تون تنک اُداس رہت ہیں۔

برجن۔ (چونک کر) للو پراگ جا رہے ہیں۔

ردھیا۔ ہاں ہم سب بہت سمجھاوا کہ پردیس میں کہاں جیہو۔ مدا کوؤ کی سنت ہین؟

برجن۔ کب جائیں گے؟

ردھیا۔ آج دس بجے کے ٹیم سے جو یاہیں۔ تم سے بھینٹ کرن آوت رہے تون دوار پر آئے کے لوٹ گئے۔

برجن۔ یہاں تک آکے لوٹ گئے۔ دروازہ پر کوئی تھا یا نہیں؟

ردھیا۔ دوار پر کہاں آئے۔ سڑک پر سے چلے گئے۔

برجن۔ کچھ کہا نہیں کیوں لوٹا جاتا ہوں۔

ردھیا۔ کچھ نہیں اتنا بولے کہ ہمار ٹیم چھوٹ جیہے تون ہم جانت ہے۔

برج رانی نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ آٹھ بجنے والے تھے۔ پریموتی کے پاس جاکر بولی۔ امّاں! للّو آج الہ آباد جا رہے ہیں۔ اگر آپ کہیں تو ذرا ان سے ملتی آؤں پھر نہ جانے کب ملنا ہو کب نہ ہو۔ مہری کہتی ہے کہ وہ مجھ سے ملنے آئے تھے۔ مگر وہ سڑک کے اُسی پار سے لوٹ گئے۔

پریموتی۔ ابھی نہ بال گندھوائے نہ مانگ بھروائی نہ کپڑے بدلے اور جانے کو تیار ہو گئیں۔

برجن۔ میری امّاں جی آج جانے دیجیے۔ بال وال گندھوانے بیٹھوں تو دس یہیں بج جائیں گے۔

پریموتی۔ اچھا تو جاؤ۔ مگر شام تک لوٹ آنا۔ گاڑی تیار کرا لو۔ میری طرف سے سُباما کو پالاگن کہہ دینا۔ برجن لپکی ہوئی کمرہ میں آئی۔ کپڑے بدلے۔ مادھوی کو باہر دوڑایا کہ گاڑی تیار کرنے کے لیے کہہ آ۔ تب تک کچھ خیال آیا۔ ردھیا سے پوچھا۔ ''کچھ چٹھی پتر نہیں دیا۔''

ردھیا نے پرزہ نکال کر دے دیا۔ برجن نے اسے بڑے شوق سے لیا مگر اُسے پڑھتے ہی اُس کا چہرہ کملا گیا۔ سوچنے لگی کہ وہ دروازہ تک آکر کیوں لوٹ گئے اور خط بھی لکھا تو ایسا اکھڑا۔ مہمل۔ چہ خوش! ہم سے عجلت کے باعث نہ مل سکے۔ ایسی کیا عجلت تھی۔ کیا گاڑی کے نوکر تھے۔ دن بھر میں کچھ نہیں تو پانچ چھ گاڑیاں جاتی ہوں گی کیا مجھ سے ملنے کے لیے اُن سے دو گھنٹہ کی دیر بھی برداشت نہ ہو سکی۔ ضرور اس میں کچھ نہ کچھ راز ہے۔ مجھ سے کون سی خطا ہوئی۔ یکایک اُسے اس وقت کی یاد آئی۔ جب وہ عالمِ بے قراری میں پرتاپ کے پاس گئی تھی اور

اُس کی زبان سے نکلا تھا۔"للّو مجھ سے صبر کیسے ہوگا۔" برجن کو اب سے پہلے کئی بار خیال آچکا تھا کہ میرا اس وقت کا اور اس حالت میں جانا بہت نامناسب تھا۔ اُس وقت یقین ہوگیا کہ میں ضرور للّو کی نگاہوں میں گرگئی۔ میری محبت اور عزت اب اُن کے دل میں نہیں ہے۔ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بیٹھ گئی۔ اور مادھوی سے بولی۔"کوچبان سے کہہ دے گاڑی نہ تیار کرے میں نہ جاؤں گی۔"

فرض اور محبت کی کشمکش

جس وقت تک برج رانی سُسرال نہ آئی تھی۔ اس کی نگاہوں میں ہندو پتی برتا عورت کے فرائض اور ذمہ داریوں کا کوئی اعلیٰ معیار نہ قائم ہوا تھا۔ گھر میں کبھی اُس کے شوہر کا ذکر نہ آتا یا اگر آتا تو ناخوشگوار طریقے۔ پر۔ اُس نے اِستری دھرم کی کتابیں بھی پڑھی تھیں۔ مگر ان کا کوئی دیرپا اور متحرک اثر اُس پر نہ ہوا تھا غالبًا اُسے یہ خیال ہی نہ آتا کہ یہ گھر میرا نہیں ہے اور مجھے بہت جلد یہاں سے جانا پڑے گا۔

مگر جب وہ سُسرال میں آئی اور اپنے دل و جان کے مالک۔ اپنے آقا۔ اپنے شوہر کو ہر دم آنکھوں کے سامنے دیکھنے لگی تو رفتہ رفتہ اُس کے دل کی کیفیت متغیر ہونا شروع ہوی۔ روشن ہوا کہ میں کون ہوں اور مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میرا کیا دھرم ہے اور مجھے کس طرح اپنا دھرم نباہنا چاہیے۔ اگلی باتیں خواب سی معلوم ہونے لگیں۔ ہاں جس وقت یاد آجاتا کہ کم از کم ایک خطا مجھ سے ایسی ہوئی ہے جس کی میں تلافی نہیں کرسکتی تو وہ خود بخود شرم سے سر جُھکا لیتی اور اپنے تئیں کوستی۔ اسے تعجب ہوتا کہ للّو کے سامنے جانے کو مجھے کیونکر جرأت ہوئی۔ شاید اس واقعہ کو خواب سمجھنے کی کوشش کرتی۔ تب للّو کی شریفانہ صورت اُس کے پیشِ نظر ہوجاتی۔ اور وہ صدقِ دل سے اُسے دعا دیتی۔ روز بروز اُس کی محبت اور عزت دل میں زیادہ ہوتی جاتی تھی۔

لیکن آج جب پرتاپ چند کی تلون مزاجی سے اُسے یہ خیال کرنے کا موقع ملا کہ للّو اس واقعہ کو ابھی بھولا نہیں ہے اور اس کی نگاہوں میں میری وقعت نہیں رہی۔ یہاں تک کہ وہ میری صورت دیکھنے کا بھی روادار نہیں ہے تو اسے حسرتناک غصہ پیدا ہوا۔ پرتاپ کی طرف سے طبیعت مکدّر ہوگئی اور اُس کی جو محبت اور عزت دل میں تھی وہ دم زدن میں پانی کے ابخرات کی طرح غائب ہونے لگی۔ عورتیں انتہا درجہ کی ذکی الحس ہوتی ہیں۔ وہ جتنی پُردلی اور یکسوئی سے محبت کرسکتی ہیں اتنی ہی سرگرمی سے نفرت بھی کرسکتی ہیں۔ جس پرتاپ کے لیے وہ اپنی ہستی خاک میں ملا دینے کو تیار تھی ...... وہ اُس کے ایک طفلانہ فعل کو بھی درگذر نہیں کرسکتا۔ کیا اس کا دل ایسا تنگ ہے! یہ خیال برجن کے

پہلوئے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا۔

آج سے برجن کی زندہ دلی رخصت ہوگئی۔ دل پر ایک بوجھ سا رہنے لگا۔ سوچتی کہ جب تک پرتاپ مجھے بھول گئے اور میری رتّی بھر بھی عزت نہیں کرتے تو اس صدمہ سے میں کیوں اپنی جان کھپاؤں۔ جیسے رام تلسی سے ویسے تلسی رام سے۔ اگر انھیں مجھ سے نفرت ہے۔ اگر وہ میری صورت سے بیزار ہیں تو میں بھی اُن کی صورت سے متنفر ہوں اور مجھے بھی اُن سے ملنے کی خواہش نہیں۔ تب وہ اپنے ہی اُوپر جھنجھلا اُٹھتی کہ میں ہر دم انھیں کی باتیں کیوں سوچا کرتی ہوں اور ارادہ کرتی کہ اب اُن کا خیال بھی دل میں نہ آنے دوں گی۔ مگر ذرا دیر میں خیال پھر اسی طرف جا پہنچتا اور وہی خیالات بے چین کرنے لگتے۔ قلبی اور خیالی انتقام کے جوش میں وہ کملا چرن سے خلوص محبت کا اظہار کرنے لگی۔ وہ ذرا دیر کے لیے کہیں چلا جاتا تو اُس سے شکایت کرتی جتنے نقد روپے جمع کر رکھے تھے وہ سب اسے دے دیے کہ اپنے لیے سونے کی گھڑی اور طلائی چین خریدے۔ کملا نے ذرا انکار کیا تو آبدیدہ ہوگئی۔ وہ یوں ہی اس کا غلام بنا ہوا تھا۔ اُس کی محبت کا یہ رنگ دیکھ کر اور بھی جان دینے لگا۔ دوستوں نے سُنا تو مبارکبادیں دینے لگے۔ میاں حمید اور سعید اپنی اپنی قسمتوں کو کوسنے لگے کہ ایسی محبتی بیوی ہم کو نہ ملی۔ تمھیں وہ بِنا مانگے ہی یوں سرفراز کرتی ہیں اور یہاں بیویوں کی فرمائشوں کے مارے ناک میں دم ہے۔ چاہے اپنے پاس کانی کوڑی نہ ہو مگر ان کی فرمائشوں ضرور پوری ہونی چاہئیں ورنہ طوفانِ نوح برپا ہوجائے گا اجی اور کیا کہیں کبھی گھر میں ایک بیڑے پان کے لیے چلے جاتے ہیں تو وہ بھی بے دس پانچ الٹی سیدھی سُنے نصیب نہیں ہوتا۔ خدا ہم کو بھی تمھاری سی بیوی عطا کرے۔

یہ سبب تھا۔ کملا چرن بھی محبت کرتا تھا اور برج رانی بھی محبت کرتی تھی مگر دونوں کے ملنے سے جو مسرت حاصل ہوتی ہے برجن کے چہرہ پر اس کا مطلق نشان نہ تھا۔ روز بروز زرد اور نحیف ہوتی جاتی تھی۔ کملاچرن قسمیں دے دے کر پوچھتا کہ تم دُبلی کیوں ہوئی جاتی ہو۔ اُسے خوش رکھنے کی جو تدبیر بن پڑتیں کرتا یار دوستوں سے بھی اس اہم معاملہ میں مشورہ لیتا مگر کچھ کارگر نہ ہوتا تھا۔ برج رانی ہنس کر کہہ دیا کرتی کہ تم کچھ فکر مت کرو۔ میں بالکل اچھی ہوں۔ یہ کہتے کہتے اُٹھ کر اُس کے بالوں میں کنگھی کرنے لگتی یا پنکھا جھلنے لگتی۔ ان خاطرداریوں سے کملا چرن پر خموں کا سُرور ہوجاتا۔ مگر لکڑی کے اُوپر

رنگ و روغن لگانے سے وہ کیڑا نہیں مرتا۔ جو اندر بیٹھا ہوا اُس کا کلیجہ کھائے جاتا ہے۔ یہ خیال کی پرتاپ چند مجھے بُھول گئے اور میں اُن کی نظروں میں گرگئی۔ ناسور کی طرح اُس کے کلیجہ میں چھید کیا کرتا تھا۔ اُس کی حالت روزبروز خراب ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ بسترے پر سے اُٹھنا مشکل ہوگیا۔ ڈاکٹروں کا علاج ہونے لگا۔

اُدھر پرتاپ چند کی طبیعت الہ آباد میں سنبھل چلی تھی۔ ورزش کا تو اُسے شوق تھا ہی وہاں اس کا خوب چرچا تھا۔ غم غلط کرنے کا اچھا مشغلہ ہاتھ آیا دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے جسمانی محنت سے بڑھ کر اور کوئی علاج نہیں ہے۔ صبح کو جمناسٹک اور کشتی شام کو کرکٹ اور فُٹ بال۔ آٹھ نو بجے رات تک باغیچوں کی سیر اتنی محنت کے بعد چارپائی پر گرتا تو سویرے آنکھ کھلتی چھ ہی مہینوں میں کرکٹ اور فٹ بال کا کپتان بن بیٹھا اور دو تین میچ ایسے معرکے کے کھیلے کہ سارے شہر میں دُھوم مچ گئی۔

آج علی گڑھ کی ایک زبردست ٹیم سے اُن کا کرکٹ میں مقابلہ تھا۔ یہ ٹیم ہندوستان کی مشہور ٹیموں کو شکست دیتی۔ فتح کا ڈنکا بجاتی ہوئی یہاں پہنچی تھی۔ انھیں غالبًا اپنی فتح کی جانب سے بہت اندیشہ نہ تھا۔ وہ کئی مضبوط ٹیموں سے پالا مار چکے تھے مگر اس کے ساتھ ہی الہ آباد والے مایوس نہ نظر آتے تھے۔ اُن کی امیدیں پرتاپ چند سے وابستہ تھیں اگر وہ آدھ گھنٹہ بھی جم گیا تو رنوں کے انبار لگا دے گا اور اگر اتنی ہی دیر تک گیند چل گیا تو پھر اُدھر کا وارا نیارا ہے۔ پرتاپ کو کبھی اتنا بڑا میچ کھیلنے کا اتفاق نہ تھا۔ کلیجہ بانسوں اُچھل رہا تھا کہ جانے کیا نتیجہ ہو۔ دس بجے کھیل شروع ہوا۔ پہلے علی گڑھ والوں کے کھیلنے کی باری تھی اور دو ڈھائی گھنٹہ تک انھوں نے خوب جوہر دکھائے۔ ایک بجتے بجتے کھیل کا پہلا حصہ ختم ہوا۔ علی گڑھ نے ۴۰۰ رن کیے۔ اب الہ آباد والوں کی باری آئی۔ مگر کھلاڑیوں کے ہاتھ پاؤں پھُولے ہوئے تھے۔ یقین ہوگیا کہ بے طرح ہار ہے۔ اب عہدہ برآ ہونا محال ہے۔ اتنے رن کون کرے گا اکیلے پرتاپ کیا بنا لے گا۔ پہلا کھلاڑی آیا۔ اور تیسرے گیند میں رخصت۔ دوسرا آیا اور مشکل سے پانچ گیند کھیل سکا۔ تیسرا آیا اور پہلے ہی گیند میں کیچ ہوگیا۔ چوتھے نے آکر دو تین معرکے کے ہِٹ لگائے مگر جم نہ سکا۔ پانچویں صاحب بلاک کرنے میں شہر کا کالج تھے مگر یہاں اُن کی بھی کچھ نہ چلی۔ تھاپی رکھتے ہی غائب ہوگئے۔ اب پرتاپ چند متانت سے قدم اُٹھایا۔ بیٹ گھماتا میدان میں آیا۔ طرفین

نے تالیاں بجائیں۔ الہ آبادیوں کی کیفیت بیان میں نہیں آسکتی۔ ہر شخص کی نگاہیں پرتاپ چند کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ سب کے دل دھڑدھڑ کر رہے تھے۔ چوطرفہ سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کچھ لوگ دُور بیٹھے ہوئے خدا سے دعا کر رہے تھے کہ پرتاپ سُرخرو لوٹے۔ دیوی اور دیوتا یاد کیے جارہے تھے۔ پہلا گیند آیا۔ پرتاپ نے خالی دیا۔ الہ آبادیوں کے دل انچ بھر بیٹھ گئے۔ دوسرا گیند آیا وہ بھی خالی گیا۔ الہ آبادیوں کے دل ناف تک پہنچ گئے۔ بہت سے آدمی چھتری سنبھال گھر کی طرف چلے۔ تیسرا گیند آیا۔ ایک پٹاخے کی آواز ہوئی اور گیند شہاب ثاقب کی طرح آسمان کو چیرتا ہوا ہٹ پر کھڑے ہونے والے فیلڈر سے سو گز کے فاصلے پر گرا۔ الہ آبادیوں نے تالیاں بجائیں۔ سوکھے دھان میں پانی پڑا۔ جانے والے ٹھٹک گئے مایوسوں نے پیٹھ سیدھی کی۔ دوسرا گیند آیا اور پہلے والے گیند سے دس گز آگے گرا۔ فیلڈر چونکے ہٹ پر کمک پہنچائی۔ پانچواں گیند آیا اور کٹ پر گیا۔ اتنے میں اوور ہوا۔ بولر بدلے۔ یہ نئے بولر پورے قاتل تھے۔ مہلک گیند پھینکتے تھے۔ مگر اُن کے پہلے ہی گیند کو پرتاپ نے سورج سے بات کرنے کے لیے آسمان کی طرف بھیج دیا۔ پھر تو گیند اور اُس کی تھاپی میں سازش سی ہوگئی۔ گیند آتا اور تھاپی سے بغل گیر ہوکر کبھی پورب کی راہ لیتا۔ کبھی پچھم کی۔ کبھی اُتر کی۔ کبھی دکھن کی۔ فیلڈروں کا دوڑتے دوڑتے ناک میں دم تھا۔ الہ آباد والے اُچھلتے تھے۔ بغلیں بجاتے تھے۔ ٹوپیاں ہوا میں اُچھل رہی تھیں۔ ایک صاحب نے روپے نکال کر اُلٹا دیے۔ دوسرے صاحب نے اپنی سنہری زنجیر لُٹا دی۔ حریف دل میں جلتے۔ جھنجھلاتے۔ کبھی میدان کی ترتیب بدلتے۔ کبھی بولر تبدیل کرتے۔ مگر سب تدبیریں اور چالیں بے اثر ہو رہی تھیں۔ گیند کا تھاپی سے یارانہ ہوگیا تھا۔

کامل دو گھنٹوں تک پرتاپ پٹاخے اور بم گولے اور ہوائیاں چھوڑتا رہا اور فیلڈر گیند کی طرف یوں لپکتے جیسے بچّے چاند کی طرف لپکتے ہیں۔ رَنوں کی تعداد تین سو تک پہنچ گئی۔ حریفوں کے چھکّے چھوٹے۔ ایسے حواس باختہ ہو رہے تھے کہ ایک گیند بھی سیدھا نہ آتا تھا۔ فیلڈ میں بے ترتیبی پھیلی ہوئی تھی یہاں تک کہ پرتاپ نے پچاس رن اور کیے اور اب اُس نے امپائر سے ذرا دم لینے کی مہلت مانگی۔ اُسے آتے دیکھ کر ہزاروں آدمی اُس کی طرف لپکے اور اسے باری باری سے گود میں اُٹھانے لگے۔ چاروں طرف بھگدڑ مچ گئی۔ سینکڑوں چھاتے۔ چھتریاں۔ ٹوپیاں اور جوتے عالمِ بالا کی سیر کرنے لگے۔ گویا وہ بھی فرطِ مسرّت سے

اُچھلے پڑتے تھے۔ عین اسی وقت تار گھر کا چپراسی بائیسکل پر آتا ہوا دکھائی دیا۔ قریب آکر بولا۔ ”پرتاپ چند کس کا نام ہے؟“ پرتاپ نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا اور چپراسی نے تار کا لفافہ اُس کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ پڑھتے ہی پرتاپ کا چہرہ زرد ہوگیا۔ ٹھنڈی سانس لے کر کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا۔ ”یارو اب میچ کا فیصلہ تمھارے ہاتھ ہے۔ میں نے اپنا فرض ادا کردیا۔ اسی ڈاک سے مکان چلا جاؤں گا۔“

یہ کہہ کر وہ بورڈنگ ہاؤس کی طرف چلا سینکڑوں آدمی پوچھنے لگے کیا ہے کیا ہے؟ لوگوں کے چہروں پر مُردنی چھا گئی مگر اُسے بات کرنے کی کہاں فرصت۔ اُسی وقت ٹرین پر بیٹھا اور بنارس کی طرف روانہ ہوگیا۔

راستہ بھر اس کا دل تشویشوں کی جولان گاہ بنا رہا۔ بار بار اپنے کو نفرین کرتا کہ میں نے چلتے وقت کیوں نہ اُس سے مل لیا۔ اب نہ جانے ملاقات ہو یا نہ ہو۔ اگر خدا نخواستہ اُس کی صورت دیکھنی نصیب نہ ہوئی تو میں بھی مُنہ میں کالکھ لگا کر کہیں مر رہوں گا۔ یہی باتیں سوچ کر کئی بار رویا۔نو بجے شب کو گاڑی بنارس پہنچی اُس پر سے اُترتے ہی سیدھا شیاما چرن کے مکان کی طرف چلا۔ فرطِ ملال سے آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں اور کلیجہ دھڑک رہا تھا۔ ڈپٹی صاحب کرسی پر سر جھکائے بیٹھے ہوئے تھے اور کملا ڈاکٹر صاحب کے یہاں جانے کو تیار کھڑا تھا۔ پرتاپ چند کو دیکھتے ہی دوڑ کر لپٹ گیا۔ شیاما چرن نے بھی گلے لگایا اور بولے۔ ”کیا ابھی سیدھے الہ آباد سے چلے آرہے ہو؟“

پرتاپ۔جی ہاں۔ آج اماں کا تار پہنچا کہ برجن کی حالت بہت خراب ہے کیا ابھی وہی حالت ہے؟

شیاما چرن۔کیا کہوں۔ ادھر دو تین مہینہ سے روز بروز کمزوری ہوتی جاتی ہے۔ دواؤں کا مطلق اثر نہیں ہوتا۔ دیکھیں ایشور کو کیا منظور ہے۔ ڈاکٹر صاحب تو کہتے تھے تپِ دق ہے مگر حکیم صاحب ضعفِ جگر بتلاتے ہیں۔

برجن کو جب سے خبر ملی کہ پرتاپ چند آئے ہوئے ہیں تب سے اس کے دل میں اُمید اور بیم کی گھڑدوڑ مچی ہوئی تھی۔ کبھی سوچتی کہ گھر آئے ہوں گے۔ چچی نے زبردستی ٹھیل ٹھال کر یہاں بھیج دیا ہوگا۔ پھر خیال ہوا شاید میری بیماری کی خبر پائی ہو۔ گھبرا کر

چلے آئے ہوں۔ مگر نہیں انھیں میری ایسی کیا فکر پڑی ہے۔ سوچا ہوگا کہیں مر نہ جائے۔ لاؤ چلو دینا کا برتاؤ تو کرتا آؤں۔ انھیں میرے مرنے جینے کا کیا غم۔ آج میں بھی حضرت سے جی کھول کر باتیں کروں گی۔ لیکن نہیں۔ باتوں کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اُنھوں نے چپ سادھی ہے تو میں کیوں بولوں۔ بس اتنا کہہ دوں گی کہ بہت اچھی طرح ہوں اور تمھاری خیریت کی دعا کرتی رہتی ہوں۔ پھر زبان نہ کھولوں گی۔ اور میں یہ میلی کچیلی ساڑی پہنے کیوں بیٹھی ہوں۔ جو اپنا ہمدرد نہ ہو اُس کے آگے یہ صورت بنائے رکھنے سے فائدہ۔ وہ مہمان کی طرح آئے ہیں۔ میں بھی مہمان کی طرح اُن سے پیش آؤں گی۔ انسان کا دل کیسا پیچیدہ ہے! جس شخص کی سرد مہری کے خیال نے برجن کی یہ گت بنا رکھی تھی اُسی شخص کو جلانے کے ایسے ایسے منصوبے باندھ رہی ہے۔

دس بجے کا وقت تھا۔ مادھوی بیٹھی پنکھا جھل رہی تھی۔ دواؤں کی شیشیاں اِدھر اُدھر پڑی ہوئی تھیں اور برجن چارپائی پر پڑی یہی سب باتیں سوچ رہی تھی کہ پرتاپ کمرہ میں داخل ہوا مادھوی چونک کر بولی۔"بہن اُٹھو۔ آگئے۔" برجن ہک بکا کر اُٹھی۔ اور چارپائی سے اُترنا چاہتی تھی کہ ضعف کے مارے زمین پر گرپڑی۔ پرتاپ نے اُسے سنبھالا اور چارپائی پر لِٹا دیا۔ آہ! یہ وہی برجن ہے جو آج سے چند ماہ قبل حسن اور شباب کی مُورت تھی۔ جس کے مکھڑے پر چمک اور آنکھوں میں ہنسی کا بسیرا رہتا تھا۔ جس کا بولنا شیاما کا گانا اور ہنسنا من کا لبھانا تھا۔ وہی رسیلی آنکھوں والی میٹھی باتوں والی برجن اب ایک تودۂ استخواں ہوگئی ہے۔ پہچانی نہیں جاتی۔ پرتاپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مزاج کی کیفیت پُوچھنا چاہتا تھا۔ مگر مُنہ سے صرف اتنا نکلا۔"برجن" اور آنکھوں سے اشک کے قطرے ٹپکنے لگے۔

محبت کی آنکھیں جذبات کے پرکھنے کی کسوٹی ہیں۔ برجن نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا اور اُن چند قطرہائے اشک نے اُس کے دل کا سب غبار دھو دیا۔

جیسے کسی فوج کا سپہ سالار جو آنے والی لڑائی کا نقشہ دل میں سوچ رہا ہو۔ غنیم کو اپنی پُشت پر دیکھ کر بدحواس ہوجاتا ہے اور مجوّزہ نقشہ کا خیال بھی اُسے نہیں رہتا۔ اُسی طرح برجن پرتاپ چند کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ سب باتیں بھول گئی جو وہ ابھی پڑی پڑی سوچ رہی تھی وہ پرتاپ کو روتے دیکھ کر اپنا سب دُکھ بُھول گئی اور چارپائی سے اُٹھ کر آنچل سے اُس کے آنسو پونچھنے لگی۔ پرتاپ جسے خطاوار کہہ سکتے ہیں اس وقت مظلوم کی

حیثیت میں تھا اور برجن جس نے اپنے تئیں گُھلا گُھلا کر اس حالت کو پہنچا دیا تھا رو رو کر اس سے کہہ رہی تھی۔ للّو چپ رہو۔ ایشور جانتا ہے میں بالکل اچھی ہوں گویا اچھا نہ ہونا اُس کی خطا تھی۔ عورتوں کے احساسات کیسے نازک ہوتے ہیں۔ پرتاپ کی ایک ذرا سی سہل انگاری نے برجن کو اس زندگی سے لاپروا بنا دیا تھا۔ اور آج آنسو کی چند بوندوں نے اس کے دل کی وہ جلن وہ سوز وہ آگ بُجھا دی جو کئی مہینوں سے اُس کے خون اور جگر کو جلا رہی تھی۔

جو مرض بڑے بڑے حکیموں اور ڈاکٹروں کے علاج سے دُور نہ ہوا اُسے آنسو کے چند قطروں نے دم زدن میں دُور کر دیا۔ کیا یہ پانی کے قطرے امرت کی بوندیں تھیں؟

پرتاپ نے ضبط کر کے پوچھا۔ "برجن! یہ تم نے اپنی کیا گت بنا رکھی ہے؟"

برجن۔ (مسکرا کر) یہ گت میں نے نہیں بنائی۔ تم نے بنائی ہے۔

پرتاپ۔ اماں کا تار نہ پہنچتا تو مجھے اطلاع بھی نہ ہوتی۔

برجن۔ ضرورت کیا تھی۔ جسے بُھلانے کے لیے الہ آباد چلے گئے۔ اس کے مرنے جینے کی تمھیں کیا پروا؟

پرتاپ۔ باتیں بنا رہی ہو۔ غیروں کو کیوں خط لکھتیں۔

برجن۔ کسے اُمید تھی کہ تم اتنی دُور سے آنے کی یا خط لکھنے کی زحمت اُٹھاؤ گے جو دروازہ سے آ کر پھر جائے اور صورت دیکھنے تک کا روادار نہ ہو اُسے خط بھیج کر کیا کرتی۔

پرتاپ۔ اُس وقت لوٹ جانے کا جتنا صدمہ مجھے ہوا میرا دل ہی جانتا ہے۔ تم نے اس وقت تک میرے پاس کوئی خط نہیں لکھا تھا۔ میں نے سمجھا اب یاد دل سے جاتی رہی۔

برجن۔ اگر میں تمھاری باتوں پر اعتبار کرنے کی عادی نہ ہوتی تو اس وقت کہہ دیتی۔ یہ سب سوچی ہوئی باتیں ہیں۔

پرتاپ۔ خیر جیسا سمجھو۔ اب یہ بتاؤ کہ طبیعت کی کیا کیفیت ہے۔ میں نے تمھیں پہچانا نہیں۔ کیسا چہرہ اُتر گیا ہے۔

برجن۔ اب اچھی ہو جاؤں گی۔ دوا مل گئی۔

پرتاپ کنایہ سمجھ گیا۔ افسوس! میری ذرا سی غلطی نے یہ قیامت ڈھا دی۔ دیر تک اُسے سمجھاتا رہا اور علی الصباح جب وہ اپنے گھر چلا تو برجن کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ اُسے یقین ہوگیا کہ للّو مجھے بھولے نہیں ہیں اور میری یاد اور عزت اُن کے دل میں قائم ہے۔ پرتاپ نے اُس کی یہ حالت کردی تھی۔ ایک ہی ہفتہ میں اُس کا مُکھڑا کندن کی طرح دمکنے لگا۔ گویا کبھی بیمار ہی نہ تھی۔

فرض کی جیت اور محبّت کی ہار

مریض جب تک بیمار رہتا ہے اُسے خبر نہیں ہوتی کہ کون میری تیمارداری کر رہا ہے۔ کون میری عیادت کے لیے آتا ہے وہ اپنی ہی تکلیفوں میں اس قدر محو رہتا ہے کہ کسی دوسری بات کا خیال ہی اس کے دل میں پیدا نہیں ہوتا مگر جب اُسے صحت ہوجاتی ہے تو اپنے تیمارداروں کی توجہ اور پریشانی۔ سرگرمی اور جانفشانی کا اندازہ ہونے لگتا ہے۔ اور اُس کے دل میں ان کی محبت اور عزت زیادہ ہوجاتی ہے۔ بعینہ یہی حال برج رانی کا تھا۔ جب تک وہ خود آزارِ دل میں مبتلا تھی کملا چرن کی حیرانیوں اور پریشانیوں کا اندازہ لگاسکتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اُس کی خاطرداری میں کوئی بات اُٹھا نہ رکھتی مگر یہ خاطرداریاں ایک فرضی انتقام کے خیال سے ہوتی تھیں نہ کہ سچّی محبت سے لیکن جب اُس کے جگر سے غم کا کانٹا نکل گیا تو کملا کی دوادوش اور سرگردانیاں یاد آئیں اور فکر پیدا ہوئی کہ ان عنایاتِ بیکراں کا جواب کیوں کر دوں۔ میرا دھرم تھا کہ اپنی ذات سے اُنھیں آرام پہنچاتی مگر آرام کا تو کیا ذکر میں تو اُلٹے اُن کی جان کی گاہک ہوئی ہوں۔ وہ تو ایسے سچّے دل سے میری محبت کریں اور میں اپنے فرائض بھی نہ ادا کرسکوں۔ ایشور کو کیا مُنہ دِکھاؤں گی۔ سچّی محبت کا کنول بسا اوقات احسان کے اثر سے کھِل جایا کرتا ہے۔ جہاں حسن و شباب دولت و جاہ اور محاسنِ ذاتی محبت کا بیج بونے میں ناکام رہتے ہیں وہاں اکثر احسان کا جادو چل جاتا ہے۔ کوئی دل ایسا سخت اور سرد نہیں ہوسکتا جو سچّی خدمت کے احسان سے پگھل نہ جائے۔

کملا اور برج رانی میں روزبروز اخلاص اور پیار بڑھنے لگا۔ ایک بندۂ محبت تھا اور دوسری کنیز۔ فرض ممکن نہ تھا کہ برج رانی کی زبان سے کوئی بات نکلے اور کملا چرن اُس کے پورے کرنے کی دل و جان سے کوشش نہ کرے۔ اب اس کی محنت اور لیاقت انھیں کوششوں میں صرف ہوتی تھی۔ پڑھنا صرف والدین کو دھوکہ دینے کا ایک وسیلہ تھا۔ وہ ہمیشہ اُس کی طبیعت کا رنگ پرکھتا رہتا اور اس امید پر کہ یہ کام اُس کی خوشی کا باعث ہوگا وہ سب کچھ کرنے کو تیار تھا۔ ایک روز اُس نے مادھوی کو پھلواڑی میں پھول چنتے دیکھا یہ

چھوٹا سا باغیچہ مکان کے پُشت پر واقع تھا۔ مگر چونکہ کنبہ کے کسی فرد کو اُس سے دلی ہمدردی نہ تھی۔ اس لیے بارھوں مہینے اُس پر خزاں کا دور رہتا تھا۔ برج رانی کو پھولوں سے خلقی محبت تھی پھلواڑی کی یہ دُرگت دیکھی تو مادھوی کو تاکید کی کہ کبھی کبھی اس میں پانی دے دیا کرو۔ رفتہ رفتہ باغیچہ کی حالت کچھ کچھ سنبھل چلی اور بعض بعض پودوں میں پھول نظر آنے لگے۔ کملا چرن کے لیے اتنا اشارہ کافی تھا۔ دل و جان سے باغیچہ کے سنوارنے پر تُل گیا۔ دو ہوشیار مالی نوکر رکھ لیے۔ قسم قسم کے خوش رنگ پھُول اور پودے لگائے جانے لگے۔ انواع و اقسام کی گھاسیں اور پتیاں گملوں میں سجائی جانے لگیں۔ چمن اور روشیں درست ہونے لگیں۔ جابجا لتائیں چڑھادی گئیں۔ کملا چرن دن کے دن کتاب ہاتھ میں لیے باغیچہ میں ٹہلتا رہتا۔ اور مالیوں سے باغیچہ کی بناوٹ اور سجاوٹ کی تاکید کرتا رہتا اور صرف اس لیے کہ برجن خوش ہوگی۔ ایسے بندۂ رضا کا جادو کس پر نہ چل جائے گا۔ ایک روز کملا نے کہا آؤ تمھیں باغیچہ کی سیر کراؤں۔ برج رانی تیار ہوگئی۔

چاند نکل آیا تھا اور اُس کی زرد روشنی میں پھُول اور پودے بہت سہانے معلوم ہوتے تھے۔ دھیمی دھیمی ہوا چل رہی تھی اور موتیے اور بیلے کی لپٹیں دماغ کو معطر کیے دیتی تھی۔ ایسے وقت میں برجن ایک ملگجی ریشمی ساڑی اور ایک نفیس مخملی سلیپر پہنے روشوں میں ٹہلتی نظر آئی۔ اُس کے چہرہ کی ملاحت پھُولوں کو شرمندہ کر رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ پھُول کی دیوی ہے۔ کملا چرن بولے۔ ”آج محنت سپھل ہوگئی۔“

جیسے قمقمے میں گلال بھرا ہوتا ہے اُسی طرح برج رانی کی آنکھوں میں محبت کا رس بھرا ہوا تھا۔ وہ مسکرائی مگر زبان سے کچھ نہ بولی۔

کملا۔ مجھ جیسا خوش نصیب آدمی دُنیا میں نہ ہوگا۔

برجن۔ کیا مجھ سے بھی زیادہ؟

کملا متوالا ہورہا تھا۔ برجن کو پیار سے گلے لگا لیا۔

کچھ دنوں تک روزانہ یہی معمول رہا۔ اسی اثنا میں تازہ دلچسپیوں کے سامان پیدا ہوگئے۔ رادھا چرن نے تصویروں کا ایک خوبصورت البم برجن کے پاس بھیجا اس میں کئی تصویریں چندرا کی موجود تھیں۔ کہیں وہ بیٹھی شیاما کو پڑھا رہی ہے۔ کہیں بیٹھی ہوئی خط لکھ رہی ہے۔ اس کی ایک تصویر مردانہ لباس میں بھی تھی۔ رادھا چرن فوٹوگرافی کے فن سے

بھی واقف تھے۔ برجن نے یہ البم بہت پسند کیا۔ پھر کیا تھا۔ کملا کو دُھن سوار ہوئی کہ میں بھی تصویر کشی میں مہارت حاصل کروں اور برجن کی تصویر کھینچوں۔ بھائی کے پاس لکھ بھیجا کہ کیمرا اور دوسرے ضروری سامان میرے پاس بھیج دیجیے اور مشق شرع کردی۔ گھر سے چلتے کہ مدرسے جارہا ہوں اور بیچ میں ایک پارسی فوٹوگرافر کی دُکان پر آ بیٹھتے۔ تین چار مہینے کی محنت اور کوشش میں اس فن سے پوری واقفیت ہوگئی۔ مگر ابھی تک گھر پر کسی کو یہ راز معلوم نہ تھا۔ کئی بار برجن نے پوچھا بھی کہ آج کل دن بھر کہاں غائب رہتے ہو۔ تعطیل کے دن بھی نہیں نظر آتے ہو مگر کملا چرن نے ہوں ہاں کرکے ٹال دیا۔

ایک روز کملا چرن کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ برجن کے جی میں آئی لاؤ پرتاپ چند کو ایک خط لکھ ڈالوں مگر صندوق کھولا تو چٹھی کا کاغذ ندارد۔ مادھوی سے کہا جاکر اپنے بھیّا کے ڈسک میں سے تھوڑا سا کاغذ نکال لا۔ مادھوی دوڑی ہوئی گئی تو اُس ڈسک پر تصویروں کا البم کھُلا ہوا ملا۔ اس نے البم اُٹھا لیا اور اندر آکر برجن سے بولی۔ ''بہن دیکھو یہ تصویر ملی۔''

برجن نے اُسے شوق سے ہاتھ میں لے لیا اور پہلا ہی ورق اُلٹا تھا کہ اچنبھا سا ہوگیا۔ وہ اسی کی تصویر تھی۔ وہ اپنے پلنگ پر چادر اوڑھے نیند میں مست پڑی تھی۔ بال پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے اور ایک ایک عضو سے بے تکلفی ٹپکتی تھی ہونٹوں پر ایک دل پذیر مسکراہٹ کا جلوہ تھا۔ گویا کوئی دل پسند خواب دیکھ رہی ہے۔ تصویر کے نیچے جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا۔ ''خوابِ ناز'' برجن حیرت میں تھی کہ میری ایسی تصویر اُنھوں نے کیسے کھینچوائی اور کس سے کھنچوائی کیا کسی فوٹوگرافر کو اندر لائے ہوں گے نہیں ایسی شرارت بھلا کیا کریں گے۔ کیا تعجب ہے خود ہی سیکھ لیا ہو۔ ادھر مہینوں سے بہت مشغول بھی تو ہیں۔ اگر خود ایسی عمدہ تصویر کھینچی ہے تو واقعی قابلِ تعریف کام کیا ہے دوسرا ورق اُلٹا تو وہ بھی اپنی ہی تصویر۔ وہ ایک ساڑی پہنے بے تکلفی سے آدھے سر تک آنچل ڈالے سیر چمن میں مصروف تھی۔ اس تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا ''سیر باغ''۔ تیسرا ورق اُلٹا تو وہ بھی اپنی ہی تصویر تھی۔ وہ باغیچہ میں زمین پر بیٹھی ہار گوند رہی ہے۔ ڈھیروں پھُول اِدھر اُدھر بکھرے پڑے ہیں اور مادھوی دوڑ دوڑ پھول چُن رہی ہے۔ یہ تصویر تینوں سے زیادہ خوبصورت تھی کیونکہ مصوّر نے اس میں بڑی صفائی سے قدرتی رنگ بھرے تھے۔ اس تصویر

کے نیچے لکھا ہوا تھا۔ ''للیلی مالن۔'' اب برجن کو خیال آیا کہ ایک روز جب میں ہار گوندھ رہی تھی تو کملا چرن نیل کانٹے کی جھاڑی سے مُسکراتے ہوئے نکلے تھے۔ ضرور اسی دن یہ تصویر کھینچی ہوگی۔ چوتھا ورق اُلٹا تو ایک نہایت لطیف اور دلکش منظر دکھائی دیا۔ ایک شفاف پانی کا چشمہ تھا اور اُس کے دونوں کناروں پر جہاں تک نگاہ پہنچتی تھی۔ گلاب کے تختے نظر آتے تھے۔ اُن کے نازک پھُول ہوا کے جھونکوں سے لچکے جاتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا گویا قدرت نے سبز آسمان میں سرخ تارے ٹانک دیے ہیں۔ یہ کسی انگریزی تصویر کی نقل معلوم ہوتی تھی۔ البم کے اور صفحے ابھی سادہ تھے۔

برجن نے اپنی تصویریں دوبارہ دیکھیں اور اس نخوت آمیز مسرت کے ساتھ جو ہر پری پیکر کو اپنے حُسن پر ہوتی ہے البم کو چھپا کر رکھ دیا۔ شام کو کملا چرن نے آکر دیکھا تو تصویریں غائب تھیں۔ ہوش اُڑ گئے۔وہ اس کے کئی مہینہ کی جگر کاوی کا ثمرہ تھیں اور اسے اُمید تھی کہ البم تحفہ میں دے کر برجن کے دیدہ دل میں اور بھی گھر کر لوں گا۔ بہت پریشان ہوا۔ اندر جاکر برجن سے دریافت کیا تو اس نے صاف انکار کردیا۔ بے چارہ گھبرایا ہوا اپنے دوستوں کے گھر گیا کہ شاید اُن میں سے کوئی اُٹھا لے گیا ہو۔ مگر وہاں بھی بجز پھبتیوں کے اور کچھ ہاتھ نہ لگا۔ آخر جب حضرت بہت زچ ہوگئے تو شام کے وقت برجن نے البم کا پتہ بتلایا۔

اسی طرح دن لُطف سے گزر رہے تھے۔ آپس میں چھیڑ چھاڑ اور مزے مزے کی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ دونوں کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ میدانِ اُلفت میں میں آگے نِکل جاؤں مگر دونوں کی محبتوں میں فرق تھا۔ کملا چرن غلبہ محبت میں اپنے کو بالکل بُھول گیا تھا۔ برعکس اس کے برجن کی محبت فرض کی بنیاد پر قائم تھی۔ ہاں یہ خوشگوار فرض تھا جسے محبت کی چاشنی نے بہت پُر لذت بنا دیا تھا۔

تین سال اور گزر گئے۔ یہ اُن کی زندگی کے تین مبارک سال تھے۔ چوتھے سال کا آغاز ایامِ مصیبت کی ابتدا تھی۔ بعض ہستیوں کو قدرت کی جانب سے دُنیا کی نعمتیں اور کامرانیاں اس بہتات سے ملتی ہیں کہ اُن کے لیے دن سدا ہولی اور رات سدا دیوالی رہتی ہے۔ مگر کتنی ہی ایسی بدقسمت ہستیاں بھی ہیں جن کا پیمانۂ مسرت چھوٹا اور چھچھلا ہوتا ہے ایسا چھوٹا کہ آنکھوں میں نشہ کی سُرخی آنے سے پہلے ہی جام خالی ہوجاتا ہے اور مسرّت

کے چند لمحے زندگی کی سیاہ گھٹا میں ایک بار بجلی کی طرح کوند کر ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ جاتے ہیں۔ برج رانی انھیں بد قسمتوں میں تھی۔

بسنت کی رُت تھی۔ سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ سردی اس غضب کی پڑتی تھی کہ کنوؤں کا پانی جم جاتا تھا۔ اس وقت شہر میں طاعون کا دورہ ہوا ہزاروں آدمی اُس کی نذر ہونے لگے۔ ایک روز شدّت کا بخار آیا۔ ایک گِلٹی نکلی اور مریض راہیٔ عدم ہوگیا۔ گِلٹی کا نکلنا گویا موت کا پروانہ تھا۔ کیا حکیم کیا ڈاکٹر کسی کا علاج کارگر نہیں ہوتا تھا۔ سینکڑوں گھر بے چراغ ہوگئے۔ ہزاروں بچے یتیم اور ہزاروں عورتیں بیوہ ہوگئیں جس کے جدھر سینگ سمائے اُدھر بھاگ نکلا۔ ہر شخص کو اپنی اپنی پڑی ہوئی تھی۔ کوئی کسی کا ہمدرد اور غم خوار نہ تھا۔ والدین بچّوں کو چھوڑ بھاگے عورتیں مردوں سے کنارہ کش ہوگئیں۔ گلیوں میں۔ سڑکوں پر مکانوں میں جدھر دیکھیے لاشوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ دُکانیں بند ہوگئیں۔ دروازوں میں قفل پڑگئے۔ چوطرفہ خاک اڑتی تھی۔ مشکل سے کوئی جاندار چلتا پھرتا دکھائی دیتا تھا اور اگر کوئی ضرورت سے مجبور ہوکر گھر سے نکل پڑا تو وہ ایسی تیزی سے قدم اُٹھاتا تھا۔ گویا موت کا سپاہی اس کے تعاقب میں ہے۔ ساری بستی ویران ہوگئی۔ اگر آباد تھا تو قبرستان یا شمشان۔ چوروں اور رہزنوں کی بن آئی۔ دن دہاڑے قفل ٹوٹتے تھے اور آفتاب کی روشنی میں سیندیں پڑتی تھیں۔ جو لوگ طاعون سے بچے انھیں فاقوں نے آدبوچا۔ غرض عجیب مصیبت کا سامنا تھا۔

بابو شیاما چرن بہت مضبوط دل کے آدمی تھے۔ مکان کے چاروں طرف محلے کے محلے خالی ہوگئے تھے مگر وہ ابھی تک اپنے مکان میں بے خوف و خطر آباد تھے مگر جب ان کا ایک سائیس مرگیا تو سارے کنبے میں کھلبلی مچ گئی۔ اور دیہات چلنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ منشی جی نے اسی ضلع میں چند گاؤں خرید لیے تھے اور مجگاؤں نامی ایک موضع میں ایک وسیع مکان بنوا رکھا تھا۔ ان کا ارادہ تھا کہ پنشن پانے پر یہیں بود و باش اختیار کروں گا۔ کاشی چھوڑ کر آگرہ میں کون مرنے جائے برجن نے یہ تجویز سنی تو بہت خوش ہوئی۔ دیہاتی زندگی کے روشن پہلو اس کی آنکھوں میں پھر رہے تھے۔ ہرے بھرے درخت اور سرسبز لہلہاتے ہوئے کھیت ہرنوں کے جھنڈ اور چڑیوں کا چہچہانا یہ بہاریں لوٹنے کے لیے اس کا دل بے قرار ہو رہا تھا۔ کملا چرن بھی شکار کھیلنے کے لیے بندوق صاف کرنے لگے مگر

یکایک منشی جی نے اسے بلا کر کہا کہ تم الہ آباد جانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ پرتاپ چند وہاں تمھارا نگراں رہے گا۔ دیہات میں اوقات ضائع کرنے سے کیا حاصل۔ اتنا سننا تھا کہ کملاچرن کی نانی مر گئی۔ الہ آباد جانے سے صاف صاف انکار کر بیٹھا۔ بہت دیر تک منشی جی اُسے سمجھاتے رہے۔ مگر وہ جانے کے لیے تیار نہ ہوا۔ آخر ان کے اِن آخری الفاظ نے فیصلہ کر دیا۔ ''تمھارے مقسوم میں علم لکھا ہی نہیں ہے۔ میری حماقت ہے کہ اِس سے لڑتا ہوں۔''

برج رانی نے جب یہ تازہ تجویز سُنی تو اسے بھی بہت رنج ہوا۔ عورت کے مزاج میں خودبینی کا مادہ بہت ہوتا ہے۔ اور زعفران کے دل میں بھی اپنی خوبصورتی کی تعریف سن کر گدگدی پیدا ہونے لگتی ہے۔ برج رانی اب بھی سمجھتی تھی کہ کملا کا دھیان پڑھنے میں نہیں لگتا۔ مگر یہ تغافل اب اُسے ناگوار نہ معلوم ہوتا بلکہ بعض اوقات اس کا جی چاہتا تھا کہ آج یہ مدرسے نہ جاتے تو اچھا ہوتا۔ کملا کی محبت آمیز آواز اس کے کانوں کو بہت پیاری معلوم ہوتی مگر جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ کملا نے الہ آباد جانے سے صاف انکار کیا اور لالہ جی بہت سمجھا رہے ہیں تو اُسے کچھ دنوں تک تنہا رہنا گوارا تھا۔ بجائے اس کے کہ کملا اپنے والد کی نافرمانی کرتے دیکھے۔ مادھوی کو بھیجا کہ اپنے بھیّا کو بلا لا۔ مگر کملا نے جگہ سے ہلنے کی قسم کھا لی تھی۔ سوچتا کہ اندر جاؤں گا تو وہ ضرور الہ آباد جانے کے لیے زور دے گی۔ اُسے کیا خبر کہ یہاں دل پر کیا بیت رہی ہے۔ کاش اس کا دل مجھے مل جاتا۔ یوں بات چیت میں تو قند و شکر گھول دیتی ہے مگر جب کبھی محبت کے امتحان کا موقع آجاتا ہے تو فرض اور مصلحت کے پردہ میں مُنہ چھپانے لگتی ہے۔ حق یہ ہے کہ عورتوں میں وفا کی بُو ہی نہیں ہوتی۔

جب رات زیادہ گزر گئی اور کملا جگہ سے نہ ہلا تو برج رانی خود آئی اور بولی۔ ''کیا آج گھر میں جانے کی قسم کھا لی ہے۔ راستہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئیں۔''

کملا۔ اندر جاتے ڈر معلوم ہوتا ہے۔

برجن۔ اچھا چلو میں ساتھ ساتھ چلتی ہوں۔ اب تو نہ ڈروگے؟

کملا۔ مجھے الہ آباد جانے کے لیے حکم ہوا ہے۔

برجن۔ میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گی۔

یہ کہہ کر برجن نے کملا کی طرف آنکھیں اُٹھائیں۔ اُن میں انگور کے خوشے لگے ہوئے تھے۔ کملا ہار گیا۔ ان موہنی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر کس کا جگر تھا جو اپنی ضِد پر قائم رہے۔ کملا نے اسے گلے لگا لیا اور بولے۔"میں جانتا تھا کہ تم جیت جاؤگی۔ اسی لیے اندر نہ جاتا تھا۔"

ساری رات محبت کی الوداعی باتیں ہوتی رہیں۔ بار بار محبت کی نگاہیں ہم آغوش ہوتیں گویا وہ پھر کبھی نہ ملیں گی۔ افسوس! یہ جُدائی آخری ملاقات تھی برجن نے پھر کملا کی صورت نہ دیکھی۔ وہ کیا جانتی تھی کہ قسمت ہمیں ہمیشہ کے لیے جُدا کر رہی ہے۔

برجن کے خطوط کملا کے نام

(۱)

پیارے محبت نامہ آیا۔ سر اور آنکھوں سے لگایا۔ ایسے خط تم نہ لکھا کرو۔ کلیجہ پاش پاش ہوجاتا ہے۔ میں لکھوں تو مضائقہ نہیں۔ یہاں طبیعت سخت گھبرا رہی ہے۔ کیا سُنتی تھی اور کیا دیکھتی ہوں۔ ٹوٹے پھُوٹے پھوس کے جھونپڑے۔ ایک ایک بالشت کی بوسیدہ دیواریں۔ گھروں کے سامنے کوڑے کرکٹ کے بڑے بڑے ڈھیر۔ کیچڑ میں لپٹی ہوئی سُوریں۔ دُبلی پتلی مریل گائیں۔ یہ سب نظارہ دیکھ کر جی چاہتا ہے کہیں چلی جاؤں۔ آدمیوں کو دیکھو تو خستہ حال۔ ہڈیاں نکلی ہوئیں۔ پریشانی کی مورت۔ افلاس کی زندہ تصویر کسی کے بدن پر ثابت کپڑا نہیں۔ کیسے قسمت کے کھوٹے کہ رات دن پسینہ بہانے پر بھی کبھی بھر پیٹ روٹیاں نصیب نہ ہوں۔ خیر ہمارے مکان کے پچھواڑے ایک چھوٹی سی گڑھیا ہے۔ مادھوی کھیلتی تھی۔ پیر پھسلا تو پانی میں گر پڑی۔ یہاں مشہور ہے کہ اس گڑھیا میں چڑیلیں نہانے آیا کرتی ہیں اور وہ خواہ مخواہ راہ چلتوں کو چھیڑتی ہیں۔ اسی طرح دروازہ پر ایک پیپل کا تناور درخت ہے وہ بھوتوں کا بسیرا ہے۔ پیپل کے بھوتوں اور گڑھیا کی چڑیلوں میں بہت راہ و رسم ہے۔ گڑھیا کا تو خیر بہت خوف نہیں۔ مگر ان کمبخت پیپل کے بُھوتوں کا خوف سارے گاؤں کے دِلوں پر ایسا چھایا ہوا ہے کہ سرِشام ہی راستہ بند ہوجاتا ہے۔ لڑکے اور عورتیں تو ادھر قدم ہی نہیں رکھتیں۔ ہاں اِکّا دُکّا مرد کبھی کبھی گزرجاتا ہے۔ مگر وہ بھی گھبرایا ہوا۔ یہ دو مقام تو گویا ان پلید روحوں کے مرکز ہیں۔ ان کے علاوہ صدہا بُھوت چڑیل مختلف مقامات میں آباد پائے جاتے ہیں۔ معتبر روائتیں ہیں کہ چڑیلیں نظر آتی ہیں۔ گاؤں والوں نے ان کے مزاج پہچان رکھے ہیں۔ کسی بُھوت کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ سَر چڑھتا ہے تو مہینوں تک پیچھا نہیں چھوڑتا اور کوئی دو ایک دن میں پُوجا لے کر الگ ہوجاتا ہے۔ گاؤں والوں میں ان امور پر اس طرح باتیں ہوتی ہیں گویا یہ بدیہی واقعات ہیں یہاں تک سُنا گیا ہے کہ چڑیلیں کھانا مانگنے اور پانی لینے آیا کرتی ہیں۔ اُن کی ساڑیاں عموماً بگلے کی پَر کی طرح صاف ہوتی ہیں۔ اور باتیں کسی قدر ناک میں کرتی ہیں۔ ہاں گہنے کا استعمال اُن

کی قوم میں رائج نہیں۔ اُن کی زد میں آجانے کا خطرہ اُن جوان عورتوں کو ہوتا ہے جو بناؤ سنگار کیے، رنگین کپڑے پہنے اکیلی نظر آجائیں۔ پھولوں کی باس ان کو بہت پسند ہے۔ مجال نہیں کہ کوئی عورت یا لڑکا دوپہر کو یا رات کو اپنے پاس پھول رکھ کر سوئے!

بھوتوں کے رتبہ اور اعزاز کا امتیاز دانائی سے کیا گیا ہے۔ جوگی بابا آدھی رات کالی کمریا اوڑھے۔ کھڑاؤں پر سوار گاؤں کے چاروں طرف گھومتے ہیں اور بھولے بھٹکے مسافروں کو راستہ بتاتے ہیں۔ سال بھر میں ایک بار اُن کی پُوجا ہوتی ہے۔ وہ اب بجائے بھوتوں کے دیوتاؤں کے زمرہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ وہ کسی آفت کو حتی الوسع گاؤں کے اندر قدم نہیں رکھنے دیتے۔ اس کے برعکس دھوبی بابا سے بچّہ بچّہ تھرتھراتا ہے۔ جس درخت پر اُن کی بود و باش ہے اُدھر سے اگر کوئی چراغ جلنے کے بعد نکل جائے تو اس کے جان کی خیر نہیں۔ اُنھیں بھگانے کے لیے دو بوتل شراب کافی ہے۔ اُن کا پوجاری منگل کے دن اس درخت کے تلے گانجہ اور چرس رکھ آتا ہے۔ ایک لالہ صاحب بھی بُھوت بن بیٹھے ہیں۔ یہ ذات شریف پٹواری تھے۔ اُنھیں چند ستم زدہ اسامیوں نے قتل کرڈالا تھا۔ اُن کی پکڑ وہ بلا کی پکڑ ہے کہ بلا جان لیے پیچھا نہیں چھوڑتی۔ کوئی پٹواری یہاں سال بھر سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ تم کہو گے کہ یہ کہاں سے بُھوت چڑیل کا پچڑا لے بیٹھی۔ میں کیا کروں۔ گاؤں سے ذرا فاصلہ پر ایک درخت ہے اُس پر مولوی صاحب قیام فرماتے ہیں وہ بے چارے کسی کو نہیں چھیڑتے۔ ہاں جمعرات کے روز جمعراتی نہ پہنچ جائے تو بچّوں کو ستاتے ہیں۔

کیسی جہالت ہے! کیسی وہم پرستی! یہ خیالات ان لوگوں کے خمیر ہوگئے ہیں۔ بچّہ بیمار ہوا اور بُھوت کی پُوجا ہونے لگی۔ کھیت کھلیان میں بھوت کا حصہ شادی بیاہ میں بُھوت کا حصہ۔ جہاں دیکھیے بُھوت ہی بُھوت نظر آتے ہیں۔ یہاں نہ دیوی ہیں نہ دیوتا۔ بھوتوں کا راج ہے۔ جمراج یہاں قدم نہیں رکھ سکتے۔ روحیں بُھوت ہی قبض کرتے ہیں۔ ان خیالات کی کیوں اصلاح ہوگی اور کیا لکھوں۔

تمھاری برجن

(۲)

مجگاؤ

پیارے شکر ہے بعد مدت کے تمھارا پریم پتر ملا۔ کیا سچ مچ خط لکھنے کی بھی فرصت نہیں۔ خط کیا لکھا ہے گویا بیگار ٹالی ہے۔ تم میں تو یہ عادت نہ تھی۔ کیا وہاں جاکر کچھ اور ہوگئے۔ تمھیں یہاں سے گئے دوماہ سے زائد ہوتے ہیں۔ اس درمیان میں کئی چھوٹی بڑی تعطیلیں پڑیں مگر تم نہ آئے۔ تم سے ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں ہولی کی تعطیل میں ضرور آنا۔ اگر اب کی ترسایا تو مجھے ہمیشہ شکایت رہے گی۔

یہاں آکر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی دوسری دُنیا میں آگئی ہوں۔ رات کو سوئی تھی کہ یکایک ہاہا ہوہو کا غل سنائی دیا۔ چونک کر اُٹھ بیٹھی۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ لڑکے گھر گھر سے لکڑی اور اُپلے وصول کرتے پھرتے ہیں۔ ہولی ماتا کی یہی خوراک ہے۔ یہ طوفان بدتمیزی جہاں پہنچ گیا ایندھن کا سُتھراؤ ہوگیا۔ کسی کی مجال نہیں ہے جو اس فوج کو روک سکے۔ ایک نمبردار کی منڈیا غائب ہوگئی اس میں دس بارہ بیل آسانی سے بندھ جاتے تھے۔ ہولی والے کئی دن سے تاک میں تھے۔ موقع پاکر اُڑا لے گئے۔ ایک کُرمی کا جھونپڑا اُڑگیا۔ کتنے ہی اُپلوں لاپتہ ہوگئے۔ لوگ اپنی لکڑیاں گھروں میں بھرے لیتے ہیں۔ لالہ جی نے ایک پیڑ ایندھن کے لیے مول لیا تھا۔ آج رات کو وہ بھی ہولی ماتا کے منہ میں چلا گیا۔ دو تین گھروں کے کواڑ اُتر گئے۔ پٹواری صاحب دروازہ پر سو رہے تھے۔ انھیں زمین پر دھکیل کر لوگ چارپائی لے بھاگے۔ چوطرفہ ایندھن کی لُوٹ مچی ہوئی ہے جو چیز ایک بار ہولی ماتا کے منہ میں چلی گئی اُسے پھیر لانا بڑا بھاری گناہ ہے۔ پٹواری صاحب نے بڑی دھمکیاں دیں۔ میں جمع بندی بگاڑ دوں گا۔ خسرہ غلط لکھ دوں گا مگر کچھ اثر نہ ہوا۔ یہاں کا قانون رسمی ہے کہ ان دنوں ہولی والے جو چیز پا جائیں بلا مزاحمت لے جائیں۔ کون کس کی فریاد کرے۔ نوجوان بیٹا اپنے باپ کی آنکھ بچا کر اپنی ہی چیز اُٹھوا دیتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اپنی جماعت میں ذلیل سمجھا جاتا ہے۔

فصل تیار ہوگئی ہے مگر کاٹنے میں دو ہفتہ کی کسر ہے۔ میرے دروازہ پر سے میلوں کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ گیہوں اور جو کے سُنہرے کھیتوں کے کنارے کُسم کے سرخ اور زعفرانی پھولوں کا حاشیہ نہایت خوش نما معلوم ہوتا ہے۔ چوطرفہ طوطے منڈلایا کرتے ہیں۔

مادھوی نے یہاں کئی سکھیاں بنا رکھی ہیں۔ پڑوس میں ایک اہیر رہتا ہے رادھا نام ہے۔ پارسال ماں باپ طاعون کا شکار ہوگئے۔ گرہستی کے کل کار اُسی کے سر پر ہیں۔ اُس کی بیوی تلسا ہمارے یہاں اکثر آتی ہے۔ خوبصورت نک سک سے درست ہے۔ بات چیت کرنے میں شرمائی جاتی ہے۔ بھولی اتنی کہ جی چاہتا ہے گھنٹوں اُس کی باتیں سُنا کروں۔ مادھوی نے اُس سے بہناپا کر رکھا ہے۔ کل اُن کی گڑیوں کا بیاہ ہے۔ تلسی کی گڑیا ہے اور مادھوی کا گڈا۔ سُنتی ہوں بے چاری بہت غریب ہے مگر میں نے اُس کے چہرے پر کبھی میل نہیں دیکھی۔ کہتی تھی کہ اُپلے بیچ کر دو روپیہ جمع کرلیا ہے۔ ایک روپیہ جہیز دے گی اور ایک روپیہ میں براتیوں کا کھانا پینا ہوگا۔ گڑیا کے گہنے کپڑے کا بوجھ رادھا کے سر ہے۔ کیسی سادہ قناعت سے بھری ہوئی معاشرت ہے۔

لو اب رخصت ہوتی ہوں۔ تمھارا وقت بکواس سننے میں ضائع ہوا۔ معاف کرنا۔ تمھیں خط لکھنے بیٹھتی ہوں تو قلم رُکتا ہی نہیں۔ ابھی بہیتری باتیں لکھنے کو پڑی ہیں۔ پرتاپ چند سے میرا پالاگن کہہ دینا۔

تمھاری برجن

(۳)

مجگاؤں

پیارے تمھارا محبت نامہ ملا۔ سینہ سے لگایا۔ خوب! چوری اور سینہ زوری اپنے نہ آنے کا الزام میرے سر رکھتے ہو۔ میرے دل سے کوئی پُوچھے کہ اسے تمھارے دیدار کی کتنی آرزو ہے۔ اب یہ تمنا روز بروز اضطراب کی صورت پکڑتی جاتی ہے۔ کبھی کبھی بے چین ہوجاتی ہوں۔ میری یہ حالت تھوڑے ہی دنوں سے ہونے لگی ہے۔ جس وقت یہاں سے گئے ہو مجھے معلوم نہ تھا کہ وہاں جاکر میری دلیل کروگے۔ خیر تمھیں سچ اور میں ہی جھوٹ۔ مجھے بہت خوشی ہوئی کہ تم نے میرے دونوں خط پسند کیے۔ مگر پرتاپ چند کو ناحق دکھائے وہ حالات بالکل قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ غلطیاں رہ گئیں ہوں مجھے یقین نہیں آتا کہ پرتاپ نے انھیں بہت قیمتی سمجھا۔ اگر وہ میرے خطوط کی اتنی وقعت سمجھتے ہیں کہ اُن کے سہارے سے ہماری دیہاتی معاشرت پر کوئی دلچسپ مضمون لکھ سکیں تو میں اپنے تئیں بہت خوش قسمت سمجھتی ہوں۔

کل یہاں دیوی جی کی پوجا تھی۔ ہل۔ چکّی۔ پُر۔ چولھے سب بند تھے۔ دیوی جی کا ایسا ہی حکم ہے۔ ان کے حکم کی نافرمانی کون کرے۔ حقہّ پانی بند ہوجائے۔ سال بھر میں یہی ایک دن ہے جسے گاؤں والے بھی تعطیل سمجھتے ہیں۔ ورنہ ہولی۔ دیوالی بھی روزمرہ کے ضروری کام نہیں بند کرسکتیں۔ بکرا چڑھا۔ ہون ہوا۔ ستو کھلایا گیا۔ اب گاؤں کے بچّہ بچّہ کو یقین کامل ہے کہ طاعون کا دورہ یہاں نہ ہوسکے گا۔ یہ سب تماشہ دیکھ کر سوئی تھی۔ قریب بارہ بجے ہوں گے کہ سینکڑوں آدمی ہاتھوں میں مشعلیں لیے۔ غل مچاتے نکلے اور سارے گاؤں کا پھیرا کیا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ بیماری اس حد کے اندر قائم نہ رہ سکے گی۔ طواف کے ختم ہونے پر چند آدمی دوسرے گاؤں کی حدود میں گھُس گئے اور تھوڑا سا پان چاول لونگ وغیرہ چیزیں زمین پر رکھ دیں یعنی اپنے گاؤں کی بلا دوسرے گاؤں میں ٹال دی۔ جب یہ لوگ اپنا کام پورا کرکے چلنے لگے تو اُس گاؤں والوں کو سُن گُن مل گئی۔ سینکڑوں آدمی لاٹھی لے کر چڑھ دوڑے اور دونوں فریق میں خوب مار پیٹ ہوئی۔ اس وقت گاؤں کے کئی آدمی ہلدی پی رہے ہیں۔

آج سویرے کل کے بچے کھچے رسوم ادا کیے گئے جسے یہاں کی اصطلاح میں کڑھائی دینا کہتے ہیں۔ میرے دروازہ پر ایک بھٹہ کھودا گیا اور اُس پر ایک کڑاہ دُودھ سے لبریز رکھا گیا کاشی نام کا ایک بھر ہے وہ بدن میں بھبھوت رمائے آیا۔ گاؤں کے آدمی ٹاٹ پر بیٹھے۔ سنکھ بجنے لگا۔ کڑاہ کے چاروں طرف مالا پھول بکھیر دیا گیا۔ جب کڑاہ میں خوب اُبال آیا تو کاشی یکایک اُٹھا اور جے کالی جی کی! کہہ کر کڑاہ میں کُود پڑا۔ میں تو سمجھی اب یہ زندہ نہ نکلے گا مگر پانچ منٹ کے بعد کاشی نے پھر جست ماری اور کڑاہ کے باہر تھا۔ اُس کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔ لوگوں نے اُسے مالا پہنائی اور ہاتھ جوڑکر پُوچھنے لگے۔ مہراج اب کی فصل کیسی ہوگی۔ پانی کیسا برسے گا۔ بیماری آئے گی یا نہیں۔ گاؤں کے لوگ خیریت سے رہیں گے؟ گڑ کا بھاؤ کیسا رہے گا؟ کاشی نے ان سب سوالوں کے جواب صاف صاف مگر ذرا مجذوبانہ الفاظ میں دیے۔ اس کے بعد مجلس برخاست ہوئی۔ سُنتی ہوں یہ جلسے ہرسال ہوا کرتے ہیں۔ کاشی کی پیشن گوئیاں سب سچّی ثابت ہوتی ہیں اور کبھی ایک آدھ غلط بھی نکل آئیں تو کاشی ان کی تاویل بڑی خوبی سے کر دیتا ہے۔ کاشی کو ضمیر شناسی میں بڑا ملکہ ہے۔ گاؤں میں کہیں چوری ہو کاشی اس کا پورا پتہ لگا دے گا۔ جو کام پولیس کے بھیدوں سے پورا نہ

ہو۔ اسے وہ پورا کردیتا ہے۔ اور گو وہ ذات کا بھر ہے مگر گاؤں میں اس کی بڑی عزت ہے ان سب خدمات کا معاوضہ وہ بجز شراب کے اور کچھ نہیں لیتا۔ نام نکلوایئے مگر ایک بوتل اس کے نذر کیجیے۔ آپ کا مقدمہ کچہری میں ہے کاشی اس کی فتح کی کوشش میں سرگرم ہے۔ بس اُسے ایک بوتل آبِ سُرخ دیجیے۔

ہولی کا زمانہ بہت قریب ہے ایک ہفتہ سے زائد نہیں۔ اہا! میرا دل اس وقت کیسا باغ باغ ہو رہا ہے۔ دل میں مسرت آمیز گُدگُدی محسوس ہو رہی ہے۔ آنکھیں تمھیں دیکھنے کے لیے بے قرار ہو رہی ہیں۔ یہ ہفتہ بڑی مشکلوں سے کٹے گا اور تب میں اپنے پیا کا درشن پاؤں گی۔

تمھاری پیاری برجن

(۴)

مجگاؤ

پیارے! تم ظالم ہو۔ سنگ دل ہو۔ بے وفا ہو۔ بے رحم ہو۔ بے درد ہو۔ جھوٹے ہو اور میں تمھیں کیا گالیاں دُوں اور کیا کوسوں۔ کاش تم اس وقت میرے سامنے ہوتے تو اس سنگ دلی کا جواب دیتی۔ میں کہہ رہی ہوں۔ تم دغا باز ہو۔ میرا کیا کر لوگے۔ نہیں آتے ہو مت آؤ۔ اگر میری صورت سے بیزار ہو بہتر۔ اگر میری جان لینے پر آئے ہو شوق سے لے لو۔ رُلانا منظور ہے رُلاؤ مگر میں روؤں کیوں۔ میری بلا روئے۔ جب آپ کو اتنا خیال نہیں کہ دو گھنٹہ کا سفر ہے ذرا اُس کی خبر لیتا آؤں تو مجھے کیا غرض پڑی ہے کہ روؤں اور جان کھوؤں۔

ایسا غصہ آرہا ہے کہ خط چاک کرکے پھینک دوں اور تم سے پھر بات نہ کروں ہائے! تم نے میرے ارمان کیسے خاک میں مِلا دیے ہیں۔ ہولی! ہولی! اس ایک لفظ میں میرے لیے جادو کا اثر تھا۔ کسی کی زبان سے نکلا اور میرے دل نے گُدگُدانا شروع کردیا۔ مگر افسوس! ہولی گزر گئی۔ اور میں ناکام اور نامراد رہ گئی۔ پہلے یہ لفظ سُن کر دل میں گُدگُدی ہوتی تھی۔ اب کلیجہ مسوستا ہے۔ اپنی اپنی قسمت ہے گاؤں کے بھوکے ننگے لنگوٹی میں پھاگ کھیلیں۔ خوشیاں منائیں۔ رنگ اُڑائیں اور میں بیوگنی اپنی چارپائی پر سفید ساڑی پہنے پڑی ہوں۔ قسم لے لو جو اُس پر ایک سرخ دھبہ بھی پڑا ہو۔ قسم لے لو جو میں نے

عبیر یا گلال ہاتھ سے چھوا ہو۔ میری عطر میں بسی ہوئی عبیر۔ کیوڑے میں گھولی ہوئی گلال۔ تکلف سے بنائے ہوئے پان سب تمھارے بے مہری کا رونا رو رہے ہیں۔ مادھوی نے جب بہت ہٹ کی تو میں نے ایک سُرخ ٹیکہ لگوا لیا مگر آج سے ان شکایتوں کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اگر پھر کوئی کلمۂ شکایت زبان سے نکلے تو زبان کاٹ لینا۔

پرسوں سرِ شام ہی سے گاؤں میں چہل پہل مچنے لگی۔ نوجوانوں کی ایک جماعت ہاتھ میں ڈف لیے گالی مغلظات بکتی دروازے دروازے پھیرے لگانے لگی مجھے نہ معلوم تھا کہ آج یہاں اتنی گالیاں کھانی پڑیں گی۔ شرمناک الفاظ ان کے مُنہ سے ایسے بے تکلف نکلتے ہیں جیسے پھول جھڑتے ہوں۔ شرم و لحاظ کا نام نہ تھا۔ باپ بیٹے کے مُنہ پر۔ بیٹا باپ کے سامنے گالیاں بک رہا ہے۔ باپ للکار کر بہُو سے کہتا ہے۔"آج ہولی ہے" بہو گھر میں سر نیچا کیے سنتی ہے اور مسکرا دیتی ہے۔ ہمارے پٹواری صاحب تو ایک ہی حضرت نکلے۔ آپ شراب میں مخمور نشہ میں چور ایک میلی سی ٹوپی سر پر رکھے اس جماعت کے پیشرو تھے۔ اُن کی بہو بیٹیاں بھی اُن کے مغلظات کی طغیانی سے بچ نہ سکیں۔ گالیاں کھاؤ اور ہنسو اگر چہرے پر ذرا بھی ملال آئے تو لوگ سمجھیں اس کی محرم کی پیدائش ہے خوب رواج ہے۔

تین بجے شب کے قریب یہ جماعت ہولی ماتا کے پاس پہنچی۔ لڑکے آتش بازیاں چھوڑ رہے ہیں میں بھی کئی عورتوں کے ساتھ گئی۔ وہاں عورتیں ایک طرف ہولیاں گارہی تھیں آخر ہولی میں آگ لگانے کا وقت آیا۔ آگ لگتے ہی دم کی دم میں شعلے بلند ہوئے۔ اور سارا آسمان سنہرے رنگ میں رنگ گیا۔ دُور دُور تک کے پیڑ پتے منور ہوگئے اب اس آتش کدہ کے چاروں طرف لوگ ہولی ماتا کی جے چلا چلا کر دوڑنے لگے۔ سبھوں کے ہاتھوں میں گیہوں اور جو کی بالیاں تھیں جو وہ اس الاؤ میں پھینکتے جاتے تھے۔ جب شعلے بہت بلند ہوگئے تو لوگ ایک کنارے کھڑے ہوکر پھر کبیر کہنے لگے۔ دو گھنٹہ تک یہی کیفیت رہی لکڑی کے کندوں سے چٹاخ چٹاخ کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ مویشی اپنے اپنے کھونٹوں پر مارے ڈر کے چیخ رہے تھے۔ تلسا نے مجھ سے کہا۔"اب کی ہولی کی لو ٹیڑھی جارہی ہے کُشل نہیں۔ جب لو سیدھی اُٹھتی ہے تو گاؤں میں سال بھر خوشی کا دور رہتا ہے۔ لیکن لو کا ٹیڑھا ہوجانا منحوس ہے۔ آخر شعلے تھمنے لگے۔ آنچ کی تیزی کم ہوئی۔ تب کچھ لوگ الاؤ کے نزدیک آکر غور سے دیکھنے لگے۔ جیسے کوئی چیز تلاش کر رہے ہوں۔ تلسا نے بتلایا کہ

جب بسنت کے دن ہولی کی بنیاد پڑتی ہے تو پہلے ایک ارنڈ گاڑ دیتے ہیں۔ اُس پر لکڑی اور اُپلے کا ڈھیر لگایا جاتا ہے۔ اس وقت یہ لوگ اُسی ارنڈ کے پودے کی تلاش کر رہے تھے۔ اُس شخص کا بہادروں میں شمار ہوتا ہے جو سب سے پہلے اس پودے پر ایسا نشانہ لگائے کہ وہ ٹوٹ کر دُور جا گرے۔ پہلے پٹواری صاحب پینترا بدلتے آئے مگر دس گز کی دُوری سے جھانک کر لوٹ گئے۔ تب رادھا ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سونٹا لیے دلیرانہ مستقل مزاجی سے آگے بڑھا اور آگ میں گھس کر وہ بھر پور ہاتھ لگایا کہ پودا الگ جاگرا لوگ اُن ٹکڑوں کو لوٹنے لگے۔ ماتھے پر اُس کا ٹیکا لگایا کرتے ہیں۔ اور اُسے متبرک سمجھتے ہیں۔

یہاں سے فرصت پاکر یہ مردانہ جماعت دیوی جی کے استھان کی طرف بڑھی مگر یہ نہ سمجھنا کہ وہاں دیوی جی کا ادب کیا گیا ہوگا۔ آج وہ بھی گالیاں سننا پسند کرتی ہیں۔ چھوٹے بڑے سب انھیں مغلظات سُنا رہے تھے۔ چند دن پہلے انھیں دیوی جی کی پُوجا ہوئی تھی۔ حق یہ ہے کہ دیہات میں اس وقت ایشور کو گالی دینا بھی معاف ہے۔ ماں بہن کا تو کہیں شمار ہی نہیں۔

سویرا ہوتے ہی لالہ جی نے مہراج سے کہا۔"آج کوئی دو سیر بھنگ پسوا لو۔ اُس کی دو قسمیں الگ الگ بنوالو۔ نمکین اور شیریں۔" مہراج نکلے اور کئی آدمیوں کو پکڑ لائے۔ بھنگ پیسی جانے لگی۔ بہت سے گلہڑ منگا کر صفائی سے رکھے گئے۔ دو مٹکوں میں دونوں قسموں کی بھنگ بنائی گئی۔ پھر کیا تھا۔ تین چار گھنٹہ تک شائقین کا تانتا لگا رہا۔ لوگ خوب تعریفیں کرتے اور سر ہلاہلا کر مہراج کی کارگزاریوں کی داد دیتے۔ جہاں کسی نے قدردانی کی اور مہراج نے دوسرا کلہڑ بھرا۔ اور بولے یہ نمکین ہے اس کا بھی سواد چکھ لو۔ اجی پی بھی لو۔ کیا روج روج ہولی آئے گی کہ روج روج ہمارے ہاتھ کی بنی ہوئی بُوٹی ملے گی۔ اس کے جواب میں کسان ایسی نگاہوں سے تاکتا ہے گویا کسی نے اُسے نعمت دے دی۔ اور ایک کے بدلے تین گلہڑ چٹ کرجاتا ہے۔ پٹواری کے داماد منشی جگدمبا پرشاد صاحب تشریف لائے ہیں۔ آپ کچہری میں عرائض نویس ہیں۔ اُنھیں مہراج نے اِس قدر پلا دی کہ آپے سے باہر ہوگئے اور ناچنے کُودنے لگے۔ گاؤں کا گاؤں اُنھیں آماجگاہِ ظرافت بنائے ہوئے تھا۔ ایک کسان آتا ہے اور اُن کی طرف مسکرا کر کہتا ہے۔"تم یہاں ٹھاڑھی ہو۔ گھر جاکے کھانا پکاؤ ہم آوت ہیں۔" اس پر ایک فرمایشی قہقہہ پڑتا ہے۔ کاشی بھر دوہرا نشہ جمائے۔ لٹھ کندھے

پر رکھے ہوئے آتا ہے اور حاضرین کی طرف نقلی غصّہ سے دیکھ کر گرجتا ہے۔ ''مہراج! یہ بات اچھی نہیں ہے کہ تم ہمرے نئی مہریا سے مجا لوٹت ہو۔'' یہ کہہ کر وہ منشی جی کو سینہ سے چمٹا لیتا ہے۔ منشی جی بے چارے مختصر آدمی اِدھر اُدھر پھڑپھڑاتے ہیں مگر نقارے کی آواز میں طوطی کی کون سنتا ہے۔ کوئی اُن کو چومتا ہے کوئی پیار کرتا ہے۔ کوئی گلے لگاتا ہے۔ دوپہر تک یہی چھیڑ چھاڑ ہوا کی۔ اُن کی دل لگی ایسی بھدّی اور غلیظ ہوتی ہے کہ کئی بار میرا جی بدمزہ ہوگیا۔ دوپہر ہوگیا لیکن تلسا ابھی تک بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اُس سے کہا۔ آج ہمارے یہاں تمھارا نیوتہ ہے ہم تم ساتھ ساتھ کھائیں گی۔ یہ سُنتے ہی مہراجن دو تھالیوں میں کھانا تکلف سے پروس کر لائیں۔ تلسا اس وقت کھڑکی کی طرف مُنہ کیے کھڑی تھی۔ میں نے جو اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تو اُسے اپنی پیاری پیاری آنکھوں سے موتی کے دانے بکھیرتے ہوئے پایا۔ گلے لگاکر بولی۔ ''سکھی سچ سچ بتلا دو کیوں رو رہی ہو۔ ہم سے کوئی پردہ مت رکھو۔'' اس پر وہ اور بھی سِسکنے لگی۔ جب میں بہت بضد ہوئی تو اس نے سر نیچا کرکے کہا۔ ''بہن آج سویرے اُن پر نشان پڑگیا۔ نہیں معلوم اُن پر کیا بیت رہی ہوگی۔'' یہ کہہ کر وہ زاروقطار رونے لگی۔ معلوم ہوا کہ رادھا کے باپ نے کچھ قرض لیا تھا وہ ابھی تک ادا نہ ہوسکا۔ مہاجن نے سمجھا اسے حوالات لے چلوں تو روپیہ وصول ہوجائے۔ رادھا کنی کاٹتا پھرتا تھا۔ آج حریفوں کو موقع مل گیا اور وہ اپنا کام کر گئے۔ افسوس! مواخذہ بیس روپے سے زائد نہ تھا۔ پہلے مجھے معلوم ہوتا تو غریب پر برس برس کے دن یہ مصیبت نہ آنے پاتی۔ میں نے چپکے سے مہراج کو بُلایا اور انھیں بیس روپے دے کر رادھا کو رہا کرانے کے لیے روانہ کیا۔

اس وقت میرے دروازہ پر ایک ٹاٹ بچھا دیا گیا تھا۔ لالہ جی بیچ میں قالین پر بیٹھے تھے۔ کسان لوگ گھٹنے تک دھوتیاں باندھے۔ کوئی کُرتہ پہنے۔ کوئی ننگے بدن۔ کوئی سر پر پگڑی باندھے۔ کوئی ننگے سر منہ پر عبیر ملے (جو اُن کی کالی صورت پر خاص کیفیت پیدا کر رہی تھی) آنے لگے۔ جو آتا لالہ جی کے پیروں پر تھوڑی سی عبیر رکھ دیتا۔ لالہ جی بھی اپنی طشتری میں سے ذرا سی عبیر نکال کر اس کے ماتھے پر لگا دیتے اور مُسکراکر کوئی دل لگی کی بات کہہ دیتے۔ وہ نہال ہوجاتا۔ زمین دوز ہوکر سلام کرتا اور ایسا خوش خوش آکر بیٹھ جاتا گویا اُسے کوئی دولت ملی ہے۔ مجھے خواب میں بھی گمان نہ تھا کہ لالہ جی ان اُجڈ

دیہاتیوں کے ساتھ بیٹھ کر ایسے مزے سے باتیں کرسکتے ہیں۔ اسی اثنا میں کاشی بھر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی پیالی تھی۔ اُس میں عبیر لیے ہوئے تھا مگر اُس نے اوروں کی طرح عبیر لالہ جی کے پیروں پر نہیں رکھی بلکہ بڑی دلیری سے مُٹھی بھر لے کر اُن کے چہرے پر اچھی طرح مل دی۔ میں تو ڈری کہیں لالہ جی بدمزہ نہ ہوجائیں مگر وہ بہت خوش ہوئے اور خود بھی بجائے ایک ٹیکہ لگانے کے دونوں ہاتھوں سے اُس کے منہ پر عبیر ملی۔ بعد ازاں مُسکرا کر کہا۔ ''آج اپنے گھر میں کہہ دینا ہمارے لیے بچھاون تیار رہے۔'' کاشی نے بھی اُسی طرح مُسکرا کر کہا۔ ''سرکار ہم برس برس کے دن کہاں جائیں گے۔'' اس وقت کاشی کا چہرہ دیکھنے کے قابل تھا۔ وہ اپنی نگاہ میں اپنے تمام ساتھیوں کا راجا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے ساتھی بھی اُس کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے کہ بیشک تو شیر ہے۔ اور تو اس قابل ہے کہ ہمارا سردار بنے۔ اسی طرح ایک ایک کرکے دو ڈھائی سو آدمی جمع ہوگئے۔ یکایک اُنھوں نے کہا۔ ''آج کہیں رادھا نہیں نظر آتا۔ کیا بات ہے کوئی اُس کے گھر جاکے دیکھے تو منشی جگدمبا پرشاد اظہارِ لیاقت کا اچھا موقع دیکھ کر بول اُٹھے۔ ''حضور وہ تو بعلت قرضہ زیر دفعہ ۱۳ نمبر الف ایکٹ (ج) گرفتار ہو گیا۔ رامدین پانڈے نے وارنٹ کا خرچہ داخل کردیا تھا۔ حُسن اتفاق سے رامدین پانڈے بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ لالہ نے اُن کی طرف نہایت حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا ''کیوں پانڈے جی! اس غریب کو حوالات میں بند کرانے سے تمھارا گھر بھر جائے گا۔ یہی انسانیت اور شرافت اب رہ گئی ہے۔ تمھیں ذرا بھی رحم نہ آیا کہ ہولی کے دن اسے بیوی بچّوں سے الگ کردیا۔ میں تو بہ ایمان کہتا ہوں کہ اگر میں رادھا ہوتا تو جیل خانہ سے واپس آنے کے بعد میری پہلی کوشش ہوتی کہ جس نے مجھے یہ دن دکھایا ہے اُسے میں بھی کچھ دِنوں ہلدی پلوادوں۔ تمھیں شرم نہیں آتی کہ اتنے معتبر مہاجن ہوکر تم نے بیس روپے کے لیے ایک غریب آدمی کو یوں مصیبت میں ڈالا۔ ڈوب مرنا چاہیے۔ ایسی لالچ پر لالہ جی کی واقعی غصہ آگیا تھا۔ رامدین ایسا خفیف ہوا کہ سب سٹی پٹی بھول گئی۔ منہ سے بات نہ نکلی۔ چپکے سے کچہری کی طرف چلے۔ سب کے سب کسان اُس کی طرف غضب ناک نگاہوں سے تاک رہے تھے۔ اگر لالہ جی کا خوف نہ ہوتا تو پانڈے جی کی ہڈی پسلی وہیں چور ہوجاتی۔

اس کے بعد لالہ جی گھر میں آئے اور اپنے کمرہ میں بیٹھ کر بنتِ عنب سے کچھ شوق

کرنے لگے۔ باہر حاضرین محفل نے گانا شروع کیا۔ نشہ میں تو سب کے سب چور ہو ہی رہے تھے۔ اس پر لالہ جی کے ان برادرانہ خاطر و مدارات نے اُن کے دلوں کو اور بھی اُبھار دیا تھا۔ خوب ہی جی توڑ کر گایا۔ ڈفلی تو ایسی زور سے بجتی تھی کہ اب پھٹی اور اب پھٹی۔ جگدمبا برشاد نے دوسرا نشہ جمایا تھا۔ کچھ تو اُن کے دل میں خود بخود اُمنگ پیدا ہوتی۔ کچھ دوسروں نے استعالک دیا۔ آپ بیچ مجلس میں کھڑے ہوکر ناچنے لگے۔ یقین مانو ناچنے لگے میں نے اچکن ٹوپی دھوتی اور موچھوں والے آدمی کو ناچتے نہ دیکھا تھا۔ آدھ گھنٹے تک وہ بندروں کی طرح اُچھلتے کودتے رہے۔ آخر نشہ نے اُنھیں زمین پر سُلا دیا۔ اُن کے بعد ایک اور اہیر اُٹھا ایک اہیرن بھی زنانہ جماعت سے نکلی اور دونوں میدان میں جاکر ناچنے لگے۔ دونوں نوجوان تھے اور پُھرتیلے اُن کی کمر اور پُشت کی لچک واقعی حیرت انگیز تھی۔ ڈف تال دے رہا تھا۔ اُن کے رمزو کنائے عشوے و غمزے۔ کمر کا لچکنا اور بوٹی بوٹی کا پھڑکنا۔ گردن کا موڑ اور اعضا کا مروڑ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ بہت مشق اور محنت کا کام ہے مگر اکثر ادائیں اور کنائے بے حیائی اور بے شرمی کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔ تُلسا بھی ناچتی ہے۔ مگر رادھا کے سوا اور کسی کے ساتھ نہیں اور یہی چاہیے بھی۔

ابھی یہاں ناچ ہی ہورہا تھا کہ سامنے بہت سے آدمی لمبی لمبی لاٹھیاں کندھوں پر رکھے آتے دکھائی دیے اُن کے ساتھ ایک ڈف بھی تھا اور کئی آدمی ہاتھوں میں جھانجھ اور مجھیرے لیے ہوئے تھے وہ گاتے بجاتے آئے اور ہمارے دروازے پر رُکے۔ یکایک تین چار آدمیوں نے مل کر ایسی زور سے آر۔ر۔ر۔ر کبیر کا نعرہ لگایا کہ مکان ہل گیا۔ لالہ جی نکلے۔ یہ لوگ اسی موضع کے تھے جہاں نکاسی کے دن لاٹھیاں چلی تھیں۔ لالہ جی کو دیکھتے ہی کئی آدمیوں نے اُن کے منہ پر عبیر ملی۔ لالہ جی نے بھی جواب دیا۔ پھر لوگ فرش پر بیٹھے۔ الایچی اور پان سے خاطر کی گئی۔ اس گاؤں والوں نے بھی عبیریں ملیں اور ملوائیں۔ جب یہ لوگ رخصت ہونے لگے تو یہ ہولی گائی۔

سدا آنند رہے اس دوارے موہن کھیلیں ہوری

کتنا خوبصورت گیت ہے۔ مجھے تو اس میں جذبہ اور اثر کوٹ کوٹ کر بھرا معلوم ہوتا ہے۔ ہولی کی غرض اور غایت کیسے سادے اور مختصر الفاظ میں بیان کر دی گئی ہے۔ سدا آنند رہے اس دوارے موہن کھیلیں ہوری۔ میں بار بار یہ پیارا گیت گاتی ہوں اور مزہ لیتی

ہوں۔ ہولی کا تہوار آپس میں اخلاص و پیار محبت و اتحاد بڑھانے کے لیے ہے۔ ممکن نہ تھا کہ وہی لوگ جن سے چند روز قبل ماتھا پھٹول کی نوبت آچکی تھی۔ اس گاؤں میں یوں بے محابا چلے آتے مگر یہ ہولی کا دن ہے۔ آج کسی کو کسی سے دُشمنی نہیں ہے۔ آج امن کی بادشاہت ہے۔ آج محبت اور مسرّت کا راج ہے۔ آج خوشی کا دور ہے۔ آج کے دن اگر رنج کرے تو پردیسی بالم کی ابلا۔ روئے تو نوجوان بیوہ۔ اِن کے سوا اور سب کے لیے خوشی کا صلائے عام ہے کہ خوب مزے کرو اور خوب گلچھرے اُڑاؤ۔

آنے جانے والوں کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ یکایک لالہ جی کی متین آواز آر۔ر کبیر کہتی ہوئی سنائی دی۔ مجھے حیرت ہوئی۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو واقعی وہی کانوں پر ہاتھ دھرے آر۔ر۔ر۔ر کی ہانک لگا رہے ہیں۔ کبیر یہ ہے۔

ہولی کے دن آئے پیارے کہ گھر گھر ڈھنڈھورا دیو پھرائے

جو نر اَب مدرا نہ پیئے واکو ساتوں جنم نسائے

خوب! لالہ جی کی زبان سے اور یہ ہولی! شام کے وقت گاؤں کے سب عورتیں ہمارے یہاں ہولی کھیلنے آئیں ہر ایک اپنے اپنے لوٹے میں گھولی ہوئی عبیر لیے ہوئے تھی۔ امّاں نے اُنھیں بڑی عزت سے بٹھایا۔ رنگ کھیلا۔ پان تقسیم کیا۔ میں مارے خوف کے باہر نہ نکلی۔ اس طرح نجات ملی۔ اب مجھے خیال آیا کہ مادھوی دوپہر سے غائب ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ شاید گاؤں میں ہولی کھیلنے گئی ہو مگر ان عورتوں کے ساتھ تلسا نہ تھی۔ وہ ابھی تک چپ چاپ من مارے کھڑکی کی طرف مُنہ کیے بیٹھی تھی۔ چراغ میں بتّی پڑ رہی تھی کہ وہ یکایک اُٹھی اور میرے پیروں پر گر کر رونے لگی۔ میں نے کھڑکی کی طرف جھانکا تو دیکھتی ہوں کہ آگے آگے مہراج۔ اُن کے پیچھے رادھا اور سب سے پیچھے رامدین پانڈے چلے آرہے ہیں۔ گاؤں کے بہت سے آدمی اُن کے ساتھ ہیں۔ رادھا کا چہرہ مرجھایا ہوا ہے۔ لالہ جی نے جوں ہی سُنا کہ رادھا آگیا۔ چٹ باہر نکل آئے اور بڑی محبت سے اُسے گلے لگا لیا۔ جیسے کوئی اپنے بیٹے کو گلے لگاتا ہے۔ رادھا چیخیں مار مار رونے لگا۔ تُلسا سے بھی ضبط نہ ہوسکا۔ وہ زینہ سے اُتری اور لالہ جی کے پیروں پر گر پڑی۔ لالہ جی نے اُسے بھی بڑی محبت سے اُٹھایا۔ میری آنکھوں سے بھی اُس وقت ضبط نہ ہوسکا۔ گاؤں کے بہت سے آدمی رو رہے تھے۔ نہایت دردناک سین تھا۔ لالہ جی کی آنکھوں میں مَیں نے کبھی آنسو

نہیں دیکھے تھے وہ اس وقت دیکھے۔ رامدین پانڈے سر نیچا کیے ایسا کھڑا تھا جیسے گئو ہتیا کی ہو۔ میرے روپے مِل گئے مگر نیت ہے اُسے تُلسا کے لیے ایک گائے لینے میں خرچ کردوں۔

رادھا اور تُلسا دونوں اپنے گھر گئے مگر ذرا دیر میں تلسا مادھوی کا ہاتھ پکڑے ہنستی ہوئی میرے کمرہ میں آئی اور بولی۔"اِن سے پوچھو یہ اب تک کہاں تھیں؟"

میں۔ کہاں تھیں؟ تم دوپہر سے غائب ہو۔

مادھوی۔ یہیں تو تھی۔

میں۔ یہاں کہاں تھیں۔ میں نے دوپہر سے نہیں دیکھا۔ سچ سچ بتا دو میں ناراض نہ ہوں گی۔

مادھوی۔ تُلسا کے گھر تو چلی گئی تھی۔

میں۔ تُلسا تو یہاں بیٹھی ہے۔ وہاں اکیلے کیا سوتی رہی؟

تُلسا۔ (ہنس کر) سوتی کاہیکو رہیں جاگتی رہیں۔ کھانا پکاتی رہیں۔ چوکا برتن کرتی رہیں۔

مادھوی۔ ہاں چوکا برتن کرتی رہیں۔ کوئی تمھارا نوکر لگا ہوا ہے۔

معلوم ہوا کہ جب سے میں نے مہراج کو رادھا کو چُھڑانے کے لیے روانہ کیا تھا تب سے مادھوی تُلسا کے گھر کھانا بنانے میں مصروف تھی۔ اُس کے کواڑ کھولے یہاں سے آٹا۔ گھی شکر سب لے گئی۔ آگ جلائی اور پُوریاں کچوریاں۔ گلگلے۔ میٹھے سموسے سب بڑی نفاست سے بنائے۔ اُس نے سوچا تھا کہ میں یہ سب بناکر چپکے سے چلی جاؤں گی۔ جب رادھا اور تُلسا آئیں گے تو تعجب کریں گے کہ کون بنا گیا۔ مگر غالبًا دیر ہوگئی اور مجرم پکڑا گیا دیکھو کیسی نیک بخت لڑکی ہے۔

اتنی سمع خراشی کے بعد رخصت ہوتی ہوں۔ شکایتیں معاف کرنا۔ تمھاری چیری ہوں جیسے رکھوگے ویسے رہوں گی۔ عبیر اور گلال بھیجتی ہوں۔ یہ تمھاری کنیز کا تحفہ ہے۔ تمھیں ہماری قسم جھوٹی تہذیب کے جوش میں آکر اسے پھینک نہ دینا ورنہ میرا دل دُکھے گا۔

تمھاری برجن

(۵)

مجگاؤں

پیارے! تمھارے خط نے بہت رُلایا۔ اب نہیں رہا جاتا۔ مجھے بُلا لو۔ ایک نظر دیکھ کر چلی آؤں گی۔ سچ بتاؤ۔ اگر میں تمھارے یہاں آجاؤں تو مسخرے پن کی تو نہ لوگے۔ نہیں معلوم دل میں کیا سمجھو گے۔ مگر کیسے آؤں۔ تم لالہ جی کو لکھو۔ خوب! وہ کہیں گے۔ یہ نئ دُھن سمائی ہے۔ کل چارپائی پر پڑی تھی۔ سویرا ہوگیا تھا۔ خوب ٹھنڈی ٹھنڈی۔ دھیمی دھیمی ہوا چل رہی تھی کہ عورتوں کے گانے کی آواز کانوں میں آئی۔ عورتیں اناج کاٹنے جارہی تھیں جھانک کر دیکھا تو دس دس بارہ بارہ عورتوں کی ایک ایک جماعت تھی۔ سبھوں کے ہاتھوں میں ہنسیا کندھے پر گٹھیا باندھنے کی رسّی اور سر پر بُھنے ہوئے مٹر کی چھری تھی۔ یہ اس وقت جاتی ہیں کہیں بارہ بجے لوٹیں گی۔ آپس میں گاتیں۔ چہلیں کرتیں چلی جاتی تھیں اور گیت بھی کیسا سُہانا تھا۔

موراسیاں گھر آئے۔ رتیاں

چُن چُن کلیاں میں سیج بچھایوں　　　سیج نہ سوئے دھرے موری بہیاں

مورے سیاں گھر آئے۔ رتیا

صبح کا وقت۔ مستانہ آوازیں۔ مسرت سے بھرے ہوئے دل یہ گیت بہت مزے دار معلوم ہوتا تھا۔ اُن کے سیّاں گھر آئے۔ کیا میرے گھر بھی کبھی سیاں آئیں گے؟

دوپہر تک بڑی خیریت سے گزری۔ یکایک آسمان پر بادل چھا گیا۔ آندھی آگئی۔ اور اولے گرنے لگے۔ میں نے اتنے بڑے اولے گرتے نہ دیکھے تھے۔ آلو سے بڑے اور ایسی تیزی سے گرے جیسے بندوق کی گولی۔ دم کی دم میں زمین پر ایک فُٹ اونچا اولے کا سفید فرش بچھ گیا۔ چوطرفہ سے کسان بھاگنے لگے۔ گائیں۔ بیل۔ بکریاں سب چلاتی ہوئیں پیڑوں کا سایہ ڈھونڈتی پھرتی تھیں۔ میں ڈری کہ نہیں معلوم تُلسا پر کیا بیتی۔ نظر دوڑا کر دیکھا تو ایک کُھلے میدان میں جو اناج کے کٹ جانے سے کفِ دست ہو رہا تھا۔ تُلسا۔ رادھا اور موہنی گائے نظر آئیں۔ تینوں گھمسان اولے کی زد میں پڑے ہوئے تھے۔ تُلسا کے سر پر ایک چھوٹی سے ٹوکری تھی اور رادھا کے سر پر ایک بڑا سا گٹھا۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے کہ نہیں معلوم ان بے چاروں کا کیا حشر ہوگا۔ دفعتاً ایک سخت جھونکے نے

رادھا کے سر سے گٹھا گرا دیا۔ گٹھا کا گرنا تھا کہ دم زدن میں تُلسا نے اپنی ٹوکری اس کے سر پر اوندھا دی۔ نہیں معلوم اُس پھُول سے جسم پر کتنے اولے پڑے۔ اُس کے ہاتھ کبھی پیٹھ پر جاتے۔ کبھی سر سہلاتے۔ ایک سیکنڈ سے زیادہ یہ حالت رہی ہو گی۔ کہ رادھا نے بجلی کی طرح جھپٹ کر گٹھا اُٹھا لیا۔ اور ٹوکری تُلسا کو دے دی۔ کیسی زبردست محبت ہے!

ظالم آسمان نے سارے سامان بگاڑ دیے۔ سویرے عورتیں گاتے ہوئے جا رہی تھیں۔ شام کو گھر گھر ماتم بپا تھا۔ کتنوں کے سر لہُولہان ہوگئے۔ کتنے ہلدی پی رہے ہیں فصل ستیاناس ہوگئی۔ اناج برف کے تلے دب گیا۔ بُخار کا زور ہے۔ سارا گاؤں اسپتال بنا ہوا ہے۔ کاشی بھر کی پیشگوئی صادق آئی۔ ہولی کے شعلوں کا راز ظاہر ہوگیا۔ فصل کا یہ حال اور مالگذاری وصول کی جا رہی ہے۔ بڑی بدعت ہو رہی ہے۔ مار دھاڑ۔ گالی گفتہ غرض سبھی ہتھیاروں سے کام لیا جارہا ہے۔ غریبوں پر یہ قہر خدا۔

تمھاری برجن

(۶)

مجگاؤں

میرے جان سے پیارے بالم۔ پُورے پندرہ دن کے بعد تم نے برجن کو یاد کیا۔ خط کو باربار پڑھا۔ چُوما۔ آنکھوں سے لگایا اور ایک ایک حرف کا مزہ لیا۔ تمھارا خط بِلا رُلائے نہیں مانتا۔ میں یُوں بھی بہت رویا کرتی ہوں۔ تم کو کِن کِن باتوں کی یاد دِلاؤں۔ میرا دل ایسا کمزور ہے کہ جب کبھی ان باتوں کی طرف خیال جاتا ہے تو عجب بے چینی سی ہوجاتی ہے۔ گرمی سی معلوم ہونے لگتی ہے۔ ایک بڑا بے چین کرنے والا۔ بڑا بامزہ۔ بہت رُلانے ولا۔ بہت پُرحسرت درد محسوس ہونے لگتا ہے۔ جانتی ہوں کہ تم نہیں آرہے ہو اور نہ آؤگے مگر باربار دروازہ پر جاکر کھڑی ہوجاتی ہوں کہ تم آتو نہیں گئے۔ آج کل تمھارے لیے ایک ریشمی بُوٹے دار قمیض تیار کر رہی ہوں۔ جی چاہتا ہے تم یہاں آتے۔ میں کہتی ذرا ٹھہرو۔ دیکھو ٹھیک کٹی ہے یا نہیں۔ تب سِلائی طے کرنے لگتی۔ تم کچھ دیتے اور میں کچھ اور مانگتی۔ مگر لو۔ ایسی باتیں نہ کروں گی۔ تمھارا ہرج ہوگا۔

کل شام کو یہاں ایک بڑا دل فریب تماشہ دیکھنے میں آیا۔ یہ دھوبیوں کا ناچ تھا۔ پندرہ بیس آدمیوں کی ایک جماعت تھی۔ اُن میں ایک نوجوان شخص سفید پشواز پہنے کمر میں

بے شمار گھنٹیاں باندھے پیر میں گھونگھرو پہنے۔ سر پر ایک لال ٹوپی رکھے ناچ رہا ہے۔ جب یہ شخص ناچتا ہے تو مردنگ بجنے لگتی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ یہ لوگ ہولی کا انعام مانگنے آئے ہیں۔ یہ ذات بھی عجیب انعام لینے والی ذات ہے۔ آپ کے یہاں کوئی کام کاج پڑے تو انھیں انعام دیجیے۔ اور ان کے یہاں کوئی کام کاج ہو تو بھی انعام دیے جائے۔ یہ لوگ ناچتے وقت گیت نہیں گاتے۔ ان کا گانا اُن کی شاعری ہے۔ پشواز والا شخص ڈھول پر ہاتھ رکھ کر ایک برہا کہتا ہے۔ دوسرا آدمی سامنے سے آکر اس برہے کا جواب دیتا ہے۔ اور دونوں فی البدیہہ کہتے ہیں۔ اس ذات میں شاعرانہ قابلیت بہت زیادہ ہے۔ ان برہوں کو غور سے سُنو تو اُن میں بعض نہایت باریک شاعرانہ خیالات ادا کیے جاتے ہیں۔ پشواز والے شخص نے پہلا برہا جو کہا تھا اُس کے یہ معنی تھے۔ اے دھوبی کے بچّو۔ تم کس کے دروازہ پر آکھڑے ہو۔ دوسرے نے جواب دیا تھا۔ اب نہ اکبر شاہ ہے نہ راجہ بھوج اب جو ہمارے مالک ہیں۔ اُنھیں سے مانگو۔ تیسرے برہے کا مطلب تھا کہ منگنوں کی عزت کم ہوجاتی ہے اس لیے تم لوگ کچھ سوال مت کرو۔ گابجا کر چلے چلو۔ دینے والا بن مانگے ہی دے گا۔ گھنٹہ بھر تک یہ لوگ برہے کہتے رہے۔ تمھیں یقین نہ آئے گا۔ اُن کے مُنہ سے برہے اس طرح بے تکلف نکلتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ شاید اتنی آسانی سے وہ بات چیت بھی نہ کرسکیں۔ یہ ذات بڑی بلا نوش ہے۔ انتہا درجے کی پیکڑ۔ شراب پانی کی طرح پیتے ہیں۔ بیاہ میں شراب۔ گونے میں شراب۔ پنچایت میں شراب۔ پُوجا میں شراب۔ انعام مانگیں گے تو پینے کے لیے۔ دُھلائی مانگیں تو یہ کہہ کر کہ آج پینے کو پیسہ نہیں ہے۔ رخصت ہوتے وقت بیچو دھوبی نے جو دعائیہ برہا کہا تھا وہ شاعرانہ استعارات سے بھرا ہوا ہے۔

تمھارا پروار اس طرح بڑھے جیسے گنگا کا پانی۔ لڑکے پھلیں پھُولیں جیسے آم کی بُور۔ مالکن کا سُہاگ سدا بنا رہے جیسے دُوب کی ہریالی۔ کیسی نادر شاعری ہے۔ زیادہ بجز اشتیاقِ دیدار کے اور کیا لکھوں؟

تمھاری برجن

(۷)

مجگاؤں

پیارے۔ ایک ہفتہ تک خاموش رہنے کو معافی چاہتی ہوں۔ خوب! آپ کو شکوہ شکایت کا کیسا نادر موقع ہاتھ آیا ہے۔ واہ رے ہٹ دھرمی۔ مجھ پر یہ الزام کہ ہفتوں سُدھ

نہیں لیتی ہو۔ بجا فرماتے ہو میرے خطوط گِن کر دیکھو تو ابھی کچھ نہیں تو نصف درجن چٹھیوں کے دیدار ہوں گے۔ مجھے اس ہفتہ میں بالکل فرصت نہیں ملی۔ مادھوی بیمار ہوگئی تھی۔ پہلے تو کونین کی چند پُڑیاں کھلائی گئیں۔ مگر جب اس سے افاقہ نہ ہوا اور اُس کی حالت بہت خراب ہوگئی تو دہلو رائے بید بُلائے گئے۔ کوئی پچاس کا سِن ہوگا۔ برہنہ پا سر پر ایک پگڑی باندھے۔ کندھے پر انگوچھا رکھے۔ ہاتھ میں موٹا سونٹا لیے دروازہ پر آکر بیٹھ گئے۔ گھر کے بڑے زمیندار ہیں مگر ان کے بدن پر کسی نے سیدھی مرزائی نہیں دیکھی۔ اُنھیں اتنی فرصت ہی نہیں کہ اپنی تن پروری کی طرف متوجہ ہوں اس نواح میں آٹھ دس کوس تک لوگ اُن کے معتقد ہیں۔ نہ وہ حکیم کو جانیں نہ ڈاکٹر کو۔ اُن کا حکیم ڈاکٹر جو کچھ ہیں وہ دہلو رائے ہیں۔ پیغام سُنتے ہی آکر دروازہ پر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹروں کی طرح نہیں کہ پہلے سواری مانگیں گے وہ بھی چاق چست تاکہ ان کا وقت ضائع نہ ہو۔ آپ کے گھر آکر ایسے خاموش بیٹھے رہیں گے گویا گونگے کا گُڑ کھا گئے ہیں۔ مریض کو دیکھنے جائیں گے تو اس طرح بھاگیں گے گویا کمرہ کی ہوا میں زہر بھری ہوئی ہیں۔ تشخیص مرض تجویز دوا سب کچھ دو منٹ میں ختم! دہلو رائے ڈاکٹر نہ سہی مگر جتنے آدمیوں کو ان کی ذات سے فیض پہنچتا ہے اُن کی تعداد کا اندازہ کرنا محال ہے۔ ہمدردی اُن کا اُصول ہے۔ اُن کی صورت دیکھتے ہی مریض کا آدھا روگ دور ہوجاتا ہے۔ ان کے نسخے ایسے سہل اور عام کہ بلا دام کوڑی خرچ کیے منوں بٹور لایئے۔ تین ہی دن میں مادھوی چلنے پھرنے لگی۔ واقعی اس شخص کی دوا میں اعجاز ہے۔

یہاں ان دنوں مغلیے اُدھم مچائے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ جاڑے میں کپڑا دے جاتے ہیں اور چیت میں دام وصول کرلیتے ہیں۔ اُس وقت کوئی عذر نہیں سنتے۔ گالی گلوج مارپیٹ۔ سبھی باتوں پر اُتر آتے ہیں۔ دو تین آدمیوں کو بہت مارا۔ رادھا نے بھی کچھ کپڑے لیے تھے۔ اُس کے دروازے پر جاکر سب کے سب گالیاں بکنے لگے۔ تُلسا نے اندر سے کواڑ بند کرلیے۔ جب یوں بس نہ چلا تو ایک نے موہنی گائے کھونٹے سے کھول لی اور کشاں کشاں چلا۔ اتنے میں رادھا دور سے آتا دِکھائی دیا۔ آتے ہی آتے اُس نے لاٹھی کا وہ بھرپور ہاتھ دیا کہ مغلیے کی کلائی لٹک پڑی۔ تب تو مغلیے گرم ہوئے۔ پینترے بدلنے لگے۔ رادھا بھی جان پر کھیل گیا اور دو تین بدمعاشوں کو بے کام کردیا۔ اتنے میں کاشی بھر نے آکر ایک

مغلیے کی خبر لی۔ دہلو رائے کو مغلیوں سے چڑ ہے وہ فخریہ کہا کرتے ہیں کہ میں نے ان کا اتنا روپیہ ڈوبا دیا۔ اِتنوں کو پٹوا دیا۔ یہ شور وغل سُنتے ہی پہنچ گئے اور للکارا۔ صدہا آدمی لاٹھیاں لے لے کر دوڑ پڑے اور مغلیوں کی خوب مرمت ہوئی۔ یقین ہے کہ اب ادھر آنے کی جرأت نہ کریں گے۔

اب تو مئی کا مہینہ گزرا۔ کیا ابھی فرصت نہیں ہوئی۔ رات دن تمھارے آنے کا انتظار ہے۔ شہر میں بیماری کم ہوگئی۔ اور ہم لوگ بہت جلد یہاں سے چلے جائیں گے۔ افسوس تم اس پیارے گاؤں کی سیر نہ کرسکو گے۔

تمھاری برجن

(۸)

پیارے۔ تمھاری خموشی مارے ڈالتی ہے۔ کل ہم لوگ شہر آگئے۔ اب تم بھی آؤ وہاں پڑے پڑے کیا کر رہے ہو۔ دو تین خط لکھ چکی۔ مگر نہ آتے ہو نہ جواب دیتے ہو۔ رات دن آنکھیں دروازے پر لگی رہتی ہیں۔ رات کو آنکھیں نہیں جھپکتیں۔ کتا بھونکا اور میرا دل دھڑکنے لگا۔ بگھّی کی آواز آئی اور میں چونک کر اُٹھ بیٹھی۔ شاید مجھ سے ناراض ہو۔ خیر یہاں کسی طرح آتو جاؤ۔ تمھاری ناراضگی کا علاج تو میرے پاس ہے۔ اب رُخصت ہوتی ہوں۔ چراغ کے سامنے نہیں بیٹھا جاتا۔ ایشور کرے سویرے تمھارا درشن ہو اور یہ خط گھومتا ہوا یہیں آوے۔

تمھاری برجن

(۹)

پیارے! لالہ جی کو خط لکھا اور مجھے نہیں۔ میں نے ایسا کیا قصور کیا تھا۔ خیر شکر ہے تم خیریت سے تو ہو۔ میرے لیے یہی بہت ہے۔ اب آنے کے لیے کبھی نہ کہوں گی۔ جو کچھ دل پر بیتے گی سہہ لوں گی۔ کس کے آگے روئے۔ اپنا دیدہ کھوئے۔ لو رُخصت! بہتر ہے مراد آباد آجاؤ۔ یہاں تمھارا کون ہے؟

تمھاری برجن

بالک رام اور کملا چرن

پرتاپ چند کو الہ آباد کالج میں پڑھتے تین سال ہوچکے تھے اور اس مدّت میں اُس نے اپنے ہم چشموں اور اتالیقوں کی نگاہوں میں بہت ممتاز درجہ حاصل کر لیا تھا۔ کالج کی زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہ تھا جہاں اُس کے کمالات نے قدردانی کا سہرا نہ پہنا ہو۔ پروفیسر اس پر فخر کرتے اور طلبا اُسے اپنا رہنما سمجھتے۔ جس طرح کھیل کے میدان میں اُس کا دستِ اعجاز نمایاں تھا اسی طرح لیکچر رُوم میں اُس کی قابلیت اور نکتہ رسی مسلمہ تھی۔ کالج کے متعلق ایک عام انجمنِ احباب قائم کی گئی تھی۔ شہر کے علم دوست رؤسا۔ کالج کے پروفیسر اور طلبا سب اُس کے ممبر تھے۔ پرتاپ اس انجمن کا ماہِ درخشاں تھا۔ یہاں ملکی و تمدنی مسائل پر مباحثے ہوا کرتے تھے۔ اور پرتاپ کی تقریر ایسی پُرزور اور مدلّل ہوتیں کہ پروفیسران کو بھی اُس کی وسعتِ تحقیقات اور تلاش پر حیرت ہوتی۔ اُس کی تقریر اور تحریر دونوں ہی میں جادو تھا۔ جس وقت وہ اپنا سادہ لباس پہنے ہوئے پلیٹ فارم پر جاتا تو حاضرین کی آنکھیں اُس کی طرف اُٹھ جاتیں اور دلوں میں گُدگدی ہونے لگتی۔ اُس کا اندازِ تقریر۔ اُس کے اشارے۔ اُس کا لب و لہجہ اُس کے اعضا کی حرکت سبھی ایسے موثر تھے کہ اُس کی تقریر میں گویا قدرت نے اثر بھر دیا ہے۔ جب تک وہ پلیٹ فارم پر رہتا حاضرین پر ایک تسخیر کا عالم ہوتا۔ مرحبا کے نعرے بار بار بلند ہوتے۔ اُس کا ایک ایک فقرہ دِلوں میں چُبھ جاتا اور زبان سے بے اختیار واہ واہ کا شور بلند ہوجاتا۔ اسی خیال سے اُس کی تقریریں عموماً اختتام کے وقت ہوا کرتی تھیں۔ کیونکہ زیادہ تر شرکاء انجمن صرف اُس کی گرم زبانیوں کا لُطف اُٹھانے کے لیے آیا کرتے تھے۔ اُس کے الفاظ اور انداز میں خدا داد اثر تھا جو قوّتِ کسب سے بہت بلند ہے۔ ادب اور تاریخ اُس کے تحقیقات اور مطالعہ کے خاص صیغے تھے۔ قوموں کے عروج اور زوال اور اُس کے اسباب و حالات پر وہ اکثر تقریریں کرتا۔ اس وقت اس کے اِن جگرکاویوں کے محرّک زیادہ تر حاضرین کے نعرہ ہائے تحسین ہوتے تھے۔ اور انھیں کو وہ اپنی محنت کا کافی بدل سمجھتا تھا۔ ہاں اُس کے مذاق کی یہ روش دیکھ کر یہ البتہ قیاس کیا جاسکتا تھا کہ یہ ہونہار بردا آگے چل کر کیسے پھل پھول لائے گا اور کیسے

رنگ رُوپ نکالے گا۔ ابھی تک اُس نے ایک لمحہ بھر بھی غور نہیں کیا تھا کہ میری آئندہ زندگی کی کیا صورت ہوگی۔ کبھی سوچتا پروفیسر بن جاؤں گا اور خوب کتابیں لکھوں گا۔ کبھی وکالت کی طرف خیال دوڑاتا۔ کبھی سوچتا کاش وظیفہ مل جائے تو سول سروس کی تیاری کردوں۔ کسی ایک طرف خیال نہ جمتا تھا۔

مگر پرتاپ چند اُن طلبا میں سے نہ تھا جن کی تمام کوششیں مباحثے اور کتابوں ہی تک محدود رہتی ہو۔ اُس کے وقت اور لیاقت کا ایک قلیل حصّہ رفاہِ عام کے کاموں میں بھی صرف ہوتا تھا۔ اس نے خلقتاً ایک ہمدرد اور غریب پرور دل پایا تھا اور عوام میں ملنے جُلنے اور کام کرنے کی لیاقت اُسے باپ سے وراثت میں ملی تھی۔ انھیں مشاغل میں اُس کی توجہ اور سرگرمی پورے جوش کے ساتھ ظاہر ہوتی۔ اکثر شام کے وقت وہ کیٹ گنج کٹرہ کی متعفن گلیوں کی خاک چھانتا دکھائی دیتا جہاں زیادہ تر نیچی ذاتیں آباد ہیں اُس کی صورت ان حصّوں میں بہت مانوس تھی۔ جن لوگوں کے سایہ سے اُونچی ذات کا ہندو دُور بھاگتا ہے اُن کے ساتھ پرتاپ ٹوٹی کھاٹ پر بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کرتا اور یہی وجہ تھی کہ ان محلوں کے بسنے والے اُس پر فِدا ہونے کو تیار تھے۔ نخوت اور عیش پرستی یہ دو عیوب پرتاپ چند میں نام کو بھی نہ تھے۔ کوئی بیکس آدمی ہو پرتاپ اُس کی دستگیری کے لیے تیار تھا۔ کوئی بیکس مریض ہو پرتاپ اُس کا سچّا غم خوار اور تیماردار تھا۔ کتنی راتیں اُس نے جھونپڑوں میں کراہتے ہوئے مریضوں کے سرہانے کھڑے رہ کر کاٹی تھیں۔ اسی غرض سے اُس نے رفاہِ عام کی ایک سبھا قائم کر رکھی تھی اور ڈھائی سال کے مختصر زمانے میں اس انجمن نے جتنی کارگزاری سے پبلک کی سیوا کی تھی۔ اُس نے الہ آبادیوں کی ہمدردی اس طرف متوجہ کردی تھی۔ پرتاپ اس انجمن کا روحِ رواں تھا۔ پچھلے دو سالوں سے اس نے طاعون کے دنوں میں بھی جب کہ لوگ اپنے پیاروں کو چھوڑ دیا کرتے ہیں جان ہتھیلی پر رکھ کر طاعون زدہ خطّوں میں علاج معالجہ کرنا شروع کردیا تھا۔

کملا چرن جس وقت الہ آباد پہنچا پرتاپ چند نے اُس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ مُرورِ ایّام نے اُس کے دل سے حسد کی آگ بُجھا دی تھی۔ جس وقت وہ برجن کی بیماری کی خبر پاکر بنارس پہنچا تھا اور اُس سے مُلاقات ہوتے ہی برجن کی حالت سنبھل چلی تھی۔ اُسی وقت سے پرتاپ کو یقین ہوگیا تھا کہ کملا چرن نے اُس کے دل میں وہ جگہ نہیں پائی جو میرے

لیے مخصوص تھی یہ خیال حسد کا شعلہ فرو کرنے کے لیے کافی تھا۔ علاوہ اس کے اُسے اکثر یہ خیال بھی بے چین کیا کرتا تھا کہ میں ہی سوشیلا کا قاتل ہوں۔ میری ہی بدزبانیاں اُس غریب کی جان کی گاہک ہوئیں اور اُسی وقت سے جب کہ سوشیلا نے مرتے وقت اُس سے رورو کر اپنے خطاؤں کی معافی مانگی تھی۔ پرتاپ نے دل میں ارادہ کرلیا تھا کہ موقع ملا تو میں اِس گناہ کی تلافی ضرور کروں گا۔ کملا چرن کی خاطر و مدارت اور تعلیم و تربیت میں اُسے کسی حد تک پرائشچت کے پُورے کرنے کا نادر موقع ہاتھ آیا۔ اگرچہ علم و شعور میں وہ کملا چرن سے منزلوں آگے تھا مگر اُس سے یُوں پیش آتا تھا جیسے چھوٹا بھائی بڑے بھائی کے ساتھ۔ اپنے وقت کا کچھ حصّہ اُس کی مدد کرنے میں صرف کرتا اور ایسی سہولت سے اتالیق کا فرض ادا کرتا کہ تعلیم ایک دلچسپ مباحثہ کی صورت اختیار کرلیتی۔

مگر پرتاپ چند کی اِن کوششوں کے باوجود کملا چرن کی طبیعت یہاں بہت گھبراتی سارے بورڈنگ ہاؤس میں اُس کے مذاق کا ایک آدمی بھی نہ تھا۔ جس سے وہ اپنا دردِ دل کہتا اور اپنے زخمِ جگر پر مرہم رکھواتا۔ وہ یارباش۔ بے فکر رنگین مزاج آدمی تھا۔ جس نے آج کے سِوا کل کا کبھی خیال نہیں کیا۔ پرتاپ سے باوجود بے تکلفی کے وہ دل کی بہت سی باتیں نہ کہہ سکتا تھا۔ جب اکیلے پن سے طبیعت بہت اکتاتی تو برجن کو کوسنے لگتا کہ میرے سر پر یہ سب مصیبتیں اسی کی لائی ہوئی ہیں۔ اُسے مجھ سے اُنس نہیں۔ زبان اور قلم کی محبت بھی کوئی محبت ہے۔ وہ محبت ہی کیا جو موقع اور مصلحت کی آڑ ڈھونڈھنے لگے۔ میں چاہے اُن پر جان ہی کیوں نہ دے دوں۔ مگر اُن کی محبت زبان اور قلم کے دائرہ سے باہر نہ نکلے گی۔ ایسے بُت کے رو برو جو پسیجنا جانتا ہی نہ ہو سر پٹکنے سے کیا حاصل۔ اِن خیالات نے یہاں تک زور پکڑا کہ اُس نے برجن کو خط لکھنا چھوڑ دیا۔ وہ بے چاری اپنے خطوط میں کلیجہ نکال کر رکھ دیتی مگر کملا جواب تک نہ دیتا اور دیتا بھی تو خشک اور دل شکن۔ اس وقت اسے برجن کی ایک ایک بات۔ اُس کی ایک ایک حرکت اُس کی سردمہری کا پتہ دیتے ہوئے معلوم ہوتی تھی۔ ہاں اگر یاد نہ آتی تھیں تو برجن کی خاطرداریاں اور دلسوزیاں۔ وہ نشیلی آنکھیں جو اُس سے جُدا ہوتے وقت ڈبڈبا گئیں تھیں اور وہ نازک نازک ہاتھ جنھوں نے باہم مل کر اُس سے ملتجی کی تھیں کہ خط برابر بھیجتے رہنا۔ اُسے یاد آجاتے تو ممکن تھا کہ اُسے کچھ تسکین ہوتی مگر ایسے موقعوں پر انسان کا حافظہ دھوکا دے دیا کرتا ہے۔

آخر کملا چرن نے اپنی تنہائی کا ایک مشغلہ سوچ ہی نکالا۔ جس وقت سے اُس نے ہوش سنبھالا تھا اُسی وقت سے بازارِ حُسن کی سیر شروع کی۔ حُسن پرستی اُس کا خمیر ہوگئی تھی اور اس قسم کا کوئی نہ کوئی مشغلہ اُس کے لیے ایسا ہی ضروری تھا جیسے بدن کے لیے غذا۔ بورڈنگ ہاؤس سے مِلا ہوا ایک سیٹھ کا باغیچہ تھا اور اُس کے رکھ رکھاؤ کے لیے ایک مالی نوکر تھا۔ اس مالی کے ایک دوشیزہ لڑکی سرجو دیئی تھی۔ اگرچہ بہت حسین نہ تھی مگر کملا حُسن کا اِتنا طلبگار نہ تھا۔ جتنا کسی دل بستگی کے مشغلہ کا۔ کوئی عورت جس کے چہرہ پر شباب کی جھلک ہو اُس کا دِل بہلانے کے لیے موزوں تھی۔ کملا اس لڑکی پر ڈورے ڈالنے شام سویر بلا ناغہ چمن کی روشوں میں ٹہلتا نظر آتا اور لڑکے تو میدان میں ورزش کرتے مگر کملا چرن باغیچہ میں آکر تاک جھانک میں مصروف رہتا۔ رفتہ رفتہ اُس نے سرجودیئی سے شناسائی۔ ہمدردی اور پھر محبت پیدا کرلی۔ وہ اُس سے گجرے مول لیتا اور نقد محبت کے علاوہ چوگنے دام دیتا۔ مالی کو تہوار کے موقع پر سب سے زیادہ تہواری کملا چرن ہی سے ملتی یہاں تک کہ سرجو دیئی اُس کے دامِ اُلفت کی اسیر ہوگئی۔ اور دو ایک بار تاریکی کے پردہ میں باہم ملاقاتیں بھی ہوئیں۔

ایک روز شام کا وقت تھا۔ سب طلبا سیر کو گئے ہوئے تھے۔ کملا اکیلا باغیچہ میں ٹہلتا تھا اور رہ رہ کر مالی کے جھونپڑے کی طرف جھانکتا تھا۔ یکایک جھونپڑے میں سے سرجو دیئی نے اُسے اشارہ سے بُلایا اور کملا بڑی تیزی سے اندر گھُس گیا۔ آج سرجو دیئی نے ململ کی ساڑی پہنی تھی جو کملا بابو کا تحفہ تھا۔ سر میں خوشبودار تیل ڈالا تھا جو کملا بابو بازار سے لائے تھے اور ایک چھینٹ کا سلوکا پہنے ہوئے تھی جو اِنھیں بابو صاحب نے بنوا دیا تھا۔ یہ سب کملا بابو کی خاطر تھی۔ اپنی طرف سے سرجودیئی نے صرف آنکھوں میں کاجل لگایا تھا۔ آج وہ اپنی نگاہ میں بہت حسین معلوم ہو رہی تھی۔ ورنہ کملا جیسا امیر اور حسین آدمی کیوں اس پر جان دیتا۔ کملا کھٹولے پر بیٹھا ہوا سرجو دیئی کی اداؤں کو مستانہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اُسے اُس وقت سرجو دیئی برج رانی سے کسی طرح کم حسین نہیں نظر آتی تھی۔ رنگت مین ذرا سا فرق تھا مگر یہ کوئی ایسا بڑا فرق نہیں اُس کی نگاہ میں سرجو دیئی کی محبت سچّی اور زیادہ پُرجوش معلوم ہوتی تھی کیونکہ وہ جب کبھی بنارس جانے کا تذکرہ کرتا تو سرجو دیئی زار زار رونے لگتی اور کہتی کہ مجھے بھی لیتے چلنا میں تمھارا ساتھ نہ چھوڑوں گی۔ کہاں یہ محبت

کی گرمی اور جذبات کی زور اور کہاں برجن کی نیم دلانہ خاطرداریاں اور بے رحمانہ مصلحت آمیزیاں۔

کملا ابھی اچھی طرح آنکھوں کو سینکنے بھی نہ پایا تھا کہ یکایک مالی نے دروازہ آکر کھنکھٹایا۔ اب تو کاٹو بدن میں لہو نہیں۔ چہرہ کا رنگ اُڑ گیا۔ سربجودیئی سے گڑگڑا کر بولا۔"میں کہاں جاؤں" سربجودیئی کے آپ ہی ہوش اُڑے ہوئے تھے۔ گھبراہٹ میں زبان سے کچھ بات نہ نکلی۔ اتنے میں مالی نے پھر زنجیر کھنکھٹائی۔ بے چاری سربجو دیئی بے بس تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ایک کواڑ کھول دیا۔ کملا چرن ایک کونے میں دبک کر کھڑا ہوگیا۔

جس طرح بھینٹ کا بکرا کٹار کے تلے تڑپتا ہے اسی طرح کونے میں کھڑے ہونے والے کملا کا دل اس وقت تڑپ رہا تھا وہ اپنی زندگی سے مایوس تھا اور ایشور کو صدق دل سے یاد کرکے کہہ رہا تھا کہ اگر اب کی اس مصیبت سے رہا ہوجاؤں تو پھر کبھی ایسی حرکت نہ کروں گا۔

اتنے میں مالی کی نگاہ حضرت پر پڑی۔ پہلے تو کچھ گھبرایا پھر نزدیک آکر بولا۔"یہ کون کھڑا ہے۔ یہاں کون ہے؟"

اتنا سننا تھا کہ کملا چرن تیزی سے باہر نکلا اور پھاٹک کی طرف بگٹٹ بھاگا۔ مالی ایک ڈنڈا ہاتھ میں لیے"لینا لینا بھاگنے نہ پاوے" کے نعرے مارتا پیچھے پیچھے دوڑا۔ یہ وہی کملا ہے جو مالی کو انعام و اکرام دیا کرتا تھا اور جس سے مالی سرکار اور حضور کہہ کر باتیں کرتا تھا وہ کملا آج اسی مالی کے سامنے اس طرح جان بچاکر بھاگا جاتا ہے۔ گناہ آگ کا وہ کنڈ ہے جو عزت و حرمت۔ حوصلہ و ہمّت کو دم زدن میں جلاکر راکھ کر دیتا ہے۔

کملا چرن درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ میں دوڑتا ہوا پھاٹک سے باہر نکلا۔ سڑک پر ٹریم جا رہی تھی اس پر جا بیٹھا اور ہانپتے ہانپتے بیدم ہوکر گاڑی کے تختہ پر بدحواس گرپڑا۔ اگرچہ مالی نے پھاٹک تک بھی پیچھا نہ کیا مگر کملا ہر ایک آنے جانے والے پر چونک چونک کر نگاہیں ڈالتا گویا سارا زمانہ اُس کا دشمن ہوگیا ہے۔ کمبختی نے ایک اور گل کھلایا۔ اسٹیشن پر پہنچتے ہی گھبراہٹ کا مارا ریل گاڑی میں جاکر بیٹھ تو گیا مگر ٹکٹ لینے کی سُدھ نہ رہی اور نہ معلوم ہوا کہ میں کدھر جارہا ہوں۔ وہ اس وقت اس شہر سے بھاگنا چاہتا تھا۔ خواہ کہیں ہو۔

کچھ دُور چلا تھا کہ ایک انگریز ریلوے افسر لالٹین لیے آتا دِکھائی دیا۔ اُس کے ساتھ ایک کینسٹبل بھی تھا۔ وہ مسافروں کا ٹکٹ دیکھتا چلا آتا تھا۔ مگر کملا نے سمجھا پولیس کا کوئی افسر ہے۔ خوف کے مارے ہاتھ پاؤں سنسنانے لگے اور کلیجہ میں دھڑکن ہونے لگی۔ جب تک وہ دوسری گاڑیوں میں معائنہ کرتا رہا تب تک تو وہ کلیجہ مضبوط کیے بیٹھا رہا مگر جوں ہی اُس کے کمرہ کا دروازہ کھُلا۔ کملا کے ہاتھ پاؤں پھُول گئے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ ایک وحشت کے عالم میں دوسری طرف کا دروازہ کھول کر چلتی ہوئی ریل پر سے نیچے کود پڑا۔ کنسٹبل اور ٹکٹ والے صاحب نے اُسے یوں کُودتے دیکھا تو سمجھے کوئی مشاق ڈاکو ہے۔ مارے خوشی کے پھُولے نہ سمائے کہ انعام الگ ملے گا اور ترقی اوپر سے ہوگی فوراً سُرخ لالٹین دکھائی۔ ذرا دیر میں گاڑی رُک گئی اب گارڈ اور کنسٹبل اور ٹکٹ والے صاحب مع چند دوسرے آدمیوں کے گاڑی سے اُتر پڑے۔ اور لالٹین لے لے کر اِدھر اُدھر تلاش کرنے لگے۔ کسی نے کہا اب اُس کا گرد بھی نہیں مِلنے کا۔ پکّا ڈکیت تھا۔ کوئی بولا ان لوگوں کو کالی جی کا ایشٹ رہتا ہے جو کچھ نہ کر دِکھائیں تھوڑا ہے۔ مگر گارڈ آگے ہی بڑھتا گیا۔ ترقی کی اُمید اُسے آگے لیے جاتی تھی یہاں تک کہ وہ اس مقام پر آپہنچا جہاں کملا گاڑی سے کُودا تھا۔ اتنے میں کنسٹیبل نے خندق کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ دیکھو وہ سفید سفید چیز کیا ہے۔ مجھے تو کوئی آدمی معلوم ہوتا ہے اور لوگوں نے بھی دیکھا اور یقین ہوگیا کہ ضرور بدمعاش یہاں چھپا ہوا ہے چل کر بچّہ کو گھیر لو کہ کہیں نکلنے نہ پاوے۔ ذرا سنبھلے ہوئے رہنا۔ ڈاکو جان پر کھیل جاتے ہیں۔ گارڈ صاحب نے پستول سنبھالا۔ میاں کنسٹیبل نے لاٹھی تانی۔ چند مسافروں نے جُوتے اُتار اُتار کر ہاتھوں میں لیے کہیں وار کر بیٹھا تو بھاگنے میں آسانی ہوگی۔ دو چار آدمیوں نے ڈھیلے اُٹھا لیے کہ دُور ہی سے نشانہ لگائیں گے۔ ڈاکو کے نزدیک کون جائے۔ کسے جان بھاری پڑی ہے۔ مگر جب لوگوں نے نزدیک جاکر دیکھا تو نہ ڈاکو نہ ڈاکو کا بھائی۔ بلکہ ایک شریف صورت۔ سبزہ آغاز۔ چھریرے بدن کا نوجوان بے حس و حرکت زمین پر اوندھے مُنہ پڑا ہے اور اُس کی ناک اور کان سے آہستہ آہستہ خون بہہ رہا ہے۔ برجن کا لال سربودیئی نے چھین کر زمین پر پٹک دیا۔ کملا نے اِدھر دم توڑا اور برجن ایک بھیانک خواب دیکھ کر چونک پڑی۔ سربودیئی نے برجن کا سُہاگ لُوٹ لیا۔ شرابِ محبت کا دَور ایسا بند ہوا کہ نہ ساقی رہا نہ ساغر۔ سب خاک میں مِل گئے۔

ہجومِ غم

سُہاگن عورت کے لیے اُس کا شوہر دُنیا کی سب سے پیاری چیز ہوتی ہے وہ اُسی کے لے جیتی ہے اور اُسی کے لیے مرتی ہے۔ اُس کا ہنسنا بولنا اُسی کو خوش کرنے کے لیے اور اُس کا بناؤ سنگار اُسی کے لُبھانے کے لیے ہوتا ہے۔ اُس کا سُہاگ اُس کی مسرّت اور زندگی ہے اور سُہاگ کا اُٹھ جانا اُس کی زندگی اور جانداری کا خاتمہ۔

کملاچرن کی بے ہنگام موت برج رانی کے لیے موت سے کم نہ تھی۔ اُس کی زندگی کی آرزوئیں اور ولولے سب مٹی میں مِل گئے۔ کیا کیا ارادے تھے اور کیا ہوگیا۔ ہردم مرنے والے کی صورت اُس کی آنکھوں میں پھرا کرتی تھی۔ اگر ذرا دیر کے لیے آنکھیں جھپک جاتیں تو اُس کی تصویر ہو بہو آنکھوں کے سامنے آجاتی۔

بعض اوقات آفاتِ ارضی و سماوی کو کسی خاص شخص یا خاندان سے اُنس سا ہو جاتا ہے۔ کملا چرن کا داغ مُرجھانے بھی نہ پایا تھا کہ بابو شیاما چرن کی باری آپہنچی۔ شاخوں کے کاٹنے سے درخت کو مُرجھاتے دیکھ کر اب کی آسمان نے جڑ ہی کاٹ دی۔ رامدین پانڈے بڑا کینہ ور شخص تھا۔ جب تک ڈپٹی صاحب مجگاؤں میں تھے دبکا بیٹھا رہا مگر جوں ہی وہ شہر کو لوٹے اسی دن سے اُس نے اودھم مچانا شروع کردیا سارا گاؤں کا گاؤں اُس کا دشمن تھا۔ جن نگاہوں سے مجگاؤں والوں نے ہولی کے دن اس کی طرف دیکھا تھا وہ نگاہیں اور تیور اُس کے کلیجہ میں کانٹے کی طرح کھٹک رہے تھے۔ جس حلقہ میں مجگاؤں واقع تھا اُس کے تھانہ دار صاحب ایک بڑے گھاگ۔ آزمودہ کار راشی تھے۔ ہزاروں کی رقمیں ہضم کرجائیں مگر ڈکار تک نہ لیں۔ مقدمے بنانے اور ثبوت پہنچانے میں ایسے مشاق کہ راہ چلتے آدمی کو پھانس دیں اور پھر کسی کے چھڑائے نہ چھوٹے۔ حکام سب اُن کے ہتھکنڈوں سے واقف تھے مگر اُن کی ہوشیاری اور معاملہ دانی کے مقابلہ میں کسی کا کچھ بس نہ چلتا تھا۔ رامدین ان تھانہ دار صاحب سے ملا اور اپنے زخمِ جگر کی دوا مانگی۔ اس کے ہفتہ بھر مجگاؤں میں ڈاکہ پڑگیا۔ ایک مہاجن شہر سے آرہا تھا۔ رات کو نمبردار کے یہاں ٹھہرا۔ ڈاکوؤں نے اسے لُوٹ کر گھر نہ جانے دیا۔ صبح کو تھانہ دار صاحب تحقیقات کو آئے اور ایک ہی رسّی میں

سارے گاؤں کو باندھ لے گئے۔

حُسنِ اتفاق سے مقدمہ بابو شیاما چرن کے اجلاس میں پیش ہوا۔ انھیں پہلے ہی سے سارا کچّا چٹھا معلوم تھا اور یہ تھانہ دار صاحب بہت دنوں سے اُن کی آنکھوں پر چڑھے ہوئے تھے انھوں نے ایسی ایسی موشگافیاں کیں اور ایسے ایسے نکتے نکالے کہ تھانہ دار صاحب کی قلعی کُھل ہی گئی۔ چھ مہینے تک مقدمہ چلا اور دُھوم سے چلا۔ سرکاری وکیلوں نے بڑے بڑے زور لگائے۔ مگر گھر کے بھیدی سے کیا چھپ سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈپٹی صاحب نے سب ملزموں کو بے داغ رہا کردیا اور اسی دن شام کو تھانہ دار صاحب معطل کر دیے گئے۔

جب ڈپٹی صاحب فیصلہ سُناکر لوٹے تو ایک ہمدرد اہلکار نے کہا۔ حضور تھانہ دار صاحب سے ذرا ہوشیار رہیے گا آج بہت جھلّایا ہوا تھا۔ پہلے بھی دو تین افسروں کو زک دے چکا ہے آپ پر بھی ضرور وار کرے گا۔ ڈپٹی صاحب نے سنا اور مُسکراکر اس آدمی کا شکریہ ادا کیا مگر اپنی حفاظت کے لیے مزید انتظام نہ کرسکے۔ اُنھیں یہ بُزدلانہ خیال معلوم ہوتا تھا۔ رادھا اہیر بہت ضِد کرتا رہا کہ میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔ کاشی بھر بھی بہت پیچھے پڑا رہا مگر اُنھوں نے کسی کو ساتھ نہ رکھا اور حسبِ معمول اپنا فرض انجام دیتے رہے۔

ظالم خاں بات کا دھنی تھا وہ زندگی سے ہاتھ دھوکر بابوشیاما چرن کے پیچھے پڑگیا۔ ایک روز وہ سیر کرکے شیوپور سے کچھ رات گئے واپس آرہے تھے کہ پاگل خانہ کے قریب کچھ دیکھ کر فٹن کا گھوڑا بِدکا۔ گاڑی رُک گئی اور دم زدن میں ظالم خاں نے ایک درخت کی آڑ سے نکل کر پستول کا نشانہ لگایا پٹاخے کی آواز ہوئی اور بابو شیاما چرن کے سینے سے گولی پار ہوگئی۔ پاگل خانہ کے گارد کے سپاہی دوڑے اور ظالم خاں کو گرفتار کرلیا سائیس نے اُسے بھاگنے نہ دیا تھا۔

اس حادثے نے خاندان کی تباہی کا سامان پُورا کردیا۔ پریموتی یوں تو بہت نیک مزاج اور محبتی عورت تھی مگر ان حادثات نے اُس کے مزاج اور برتاؤ میں یکایک بڑی تبدیلی پیدا کردی۔ اس کے حواس میں فرق آگیا۔ بات بات پر برجن سے چڑھ جاتی اور طعنے مارنے لگتی۔ اُسے خُدا جانے کیوں کر وہم ہوگیا تھا کہ یہ سب آفت اسی بہُو کی لائی ہوئی ہے۔ یہی سبز قدم جب سے گھر میں آئی گھر ستیاناس ہوگیا۔ اس کا پُووا خراب ہے۔ کئی دفعہ اس نے

کھول کر برجن سے کہہ بھی دیا تھا کہ تمھاری چکنی صورت نے مجھے موہ لیا۔ میں کیا جانتی تھی کہ تمھارے چرن ایسے منحوس ہیں۔ برجن یہ باتیں سُنتی اور کلیجہ مسل کر رہ جاتی۔ جب دن ہی بُرے آگئے تو بھلی باتیں کیونکر سُننے میں آئیں۔ یہ آٹھوں پہر کی کوفت اُسے حسرت کے آنسو بھی نہ بہانے دیتی۔ آنسو نکلتے ہیں جب کوئی ہمدرد ہو اور دلسوزی کرے۔ کوفت اور لعن طعن کی آگ سے آنسو خشک ہوجاتا ہے۔

ایک روز برجن کا جی گھر میں بیٹھے بیٹھے ایسا گھبرایا کہ وہ ذرا دیر کے لیے باغیچہ میں چلی آئی۔ آہ! اس باغیچہ میں کیسے کیسے لُطف کے دن گُزرے تھے۔ اس کا ایک ایک پودا مرنے والے کی محبتِ بیکراں کا یادگار تھا۔ کبھی وہ دن بھی تھے کہ ان پھُولوں اور پتّیوں کو دیکھ کر دل باغ باغ ہوجاتا تھا اور نسیم دل پر خموں کا نشہ پیدا کردیا کرتی تھی یہی وہ مقام ہے جہاں بہت سی شامیں آغوشِ اُلفت میں گزری تھیں اور جہاں شرابِ محبت کے دور چلے تھے۔ اس وقت پھُولوں کی پنکھڑیاں اپنے نازک نازک ہونٹوں سے اُس کا خیرمقدم کرتی تھیں۔ مگر افسوس! آج ان کے سر جُھکے ہوئے تھے اور زبانیں بند تھیں۔ کیا یہ وہ جگہ نہ تھی جہاں ''البیلی مالن'' پھُولوں کا ہار گوندھتی تھی۔ مگر بھولی مالن کو کیا معلوم تھا کہ اسی جگہ اُسے اپنی آنکھوں سے نکلے ہوئے موتیوں کے ہار گوندھنے پڑیں گے۔ انھیں خیالوں میں برجن کی نگاہیں اس کُنج کی طرف اُٹھ گئیں جہاں سے ایک بار کملا چرن مُسکراتا ہوا نکلا ہوا تھا۔ گویا وہ پتیوں کی جنبش اور اُس کے کپڑوں کی جھلک دیکھ رہی ہے۔ اس کے چہرے پر اس وقت ہلکی سی مسکراہٹ نمودار تھی جیسے گنگا میں ڈوبتے ہوئے آفتاب کی زرد اور ملین کرنوں کا عکس پڑتا ہے۔ یکایک پریموتی نے آکر کرخت آواز میں کہا۔''اب آپ کو سیر کرنے کا شوق چرآیا ہے؟''

برجن کھڑی ہوگئی اور روتے ہوئے بولی۔''اماں جسے نارائن نے کچلا اُسے آپ کیا کچلتی ہیں؟''

آخر پریموتی شہر سے ایسی بیزار ہوئی کہ ایک مہینہ کے اندر سب سامان اونے پونے بیچ کر مجگاؤ چلی گئی۔ برج رانی کو ساتھ نہ لیا۔ اُس کی صورت سے اُسے نفرت ہوگئی تھی۔ برجن اس وسیع مکان میں اکیلی رہ گئی مادھوی کے سِوا اب اس کا کوئی غم خوار نہ تھا۔ سُباما کو اپنی مُنہ بولی بیٹی کی مصیبتوں کا اتنا ہی صدمہ ہوا جتنا اپنی بیٹی کا ہوتا۔ کئی دن تک روتی

رہی۔ اور کئی دن برابر اُسے سمجھانے کے لیے آتی رہی۔ جب برجن اکیلی رہ گئی تو سُباما نے چاہا کہ یہ میرے یہاں اُٹھ آئے اور آرام سے رہے۔ خود کئی بار بلانے گئی مستری جی کو بھیجا مگر برجن کسی طرح آنے پر آمادہ نہ ہوئی اُسے خیال ہوتا تھا کہ سسر کو دُنیا سے سدھارے ابھی تین مہینے بھی نہ ہوا اتنی جلدی یہ مکان خالی ہوجائے گا تو لوگ کہیں گے کہ اُن کے مرتے ہی ساس اور بہو لڑ مریں۔ یہاں تک کہ اُس کی اس ضِد سے سُباما کا من موٹا ہوگیا۔

مجگاؤں میں پریموتی نے ایک اندھیر مچا رکھا تھا۔ اسامیوں کو سخت سُست کہتی۔ کارندہ کے سر پر جُوتی پٹک دی۔ پٹواری کو کوسا۔ رادھا اہیر کی گائے زبردستی لے لی یہاں تک کہ گاؤں والے گھبرا گئے اور بابو رادھا چرن سے شکایت کی۔ رادھا چرن نے یہ کیفیت سُنی تو یقین ہوگیا کہ ضرور اِن صدمات نے اس کے حواس زائل کردیے ہیں۔ اس وقت کسی طرح ان کا دل بہلانا چاہیے۔ سیوتی کو لکھا کہ تم امّاں کے پاس چلی آؤ اور اس کے ساتھ کچھ دنوں رہو۔ سیوتی کی گود میں اس وقت ایک چاند سا بچہ کھیل رہا تھا اور پران ناتھ دو مہینہ کی رخصت لے کر دربھنگہ سے لوٹے تھے۔ راجہ صاحب کے پرائیوٹ سیکریٹری ہو گئے تھے۔ ایسے موقعے پر سیوتی کیونکر آسکتی۔ تیاریاں کرتے کرتے مہینوں گزر گئے۔ کبھی لڑکا بیمار پڑگیا۔ کبھی ساس روٹھ گئی۔ کبھی ساعت نہ بنی۔ آخر چھٹویں مہینے جاکے اُسے فرصت ملی اور وہ بھی بڑی منّتوں کے ساتھ۔

مگر پریموتی پر اُس کے آنے کا مطلق اثر نہ ہوا۔ وہ اُس کے گلے مل کر بھی نہ روئی اُس کے بچّے کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اس کے دل میں اب محبت اور انسانیت نام کو بھی باقی نہ رہی تھی۔ جیسے گنّے سے رس نکال لو تو صرف فضلہ رہ جاتا ہے۔ اُسی طرح جس انسان کے دل سے محبت نکل گئی وہ گوشت و پوست کا ایک تودہ رہ گیا۔ دیوی دیوتا کا نام زبان پر آتے ہی اُس کے تیور بدل جاتے تھے۔ مجگاؤں میں جنم اشٹمی ہوئی۔ لوگ ٹھاکر جی کا برت رکھے ہوئے تھے اور چندہ سے ناچ کرانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مگر پریموتی نے عین جنم کے موقع پر اپنے گھر کی مورتی کھیت میں پھنکوا دی۔ ایکادشی برت چھوٹا دیوتاوں کی پُوجا چُھوٹی۔ وہ پریموتی اب پریموتی نہ تھی۔

سیوتی نے جوں توں کرکے یہاں دو مہینے کاٹا۔ اُس کی طبیعت بہت گھبراتی۔ کوئی

سکھی سہیلی بھی نہ تھی جس کے ساتھ بیٹھ کر دن کاٹتی۔ برجن نے تُلسا کو اپنی سکھی بنالیا تھا۔ مگر سیوتی کا مزاج امیرانہ واقع ہوا تھا۔ ایسی عورتوں سے میل جول وہ اپنے لیے باعث ننگ سمجھتی تھی۔ تلسا بے چاری کئی بار آئی۔ مگر جب دیکھا کہ یہ دل کھول کر نہیں ملتی تو آنا جانا چھوڑ دیا۔

تین مہینے گزر چکے تھے۔ ایک روز سیوتی دن چڑھے تک سوتی رہی۔ پران ناتھ نے رات کو بہت رُلایا تھا۔ جب نیند کُھلی تو کیا دیکھتی ہے کہ پریموتی اس کے بچّے کو گود میں لیے چُوم رہی ہے۔ کبھی آنکھوں سے لگاتی ہے اور کبھی چھاتی سے چمٹاتی ہے۔ سامنے انگیٹھی پر ہنڈیا پک رہا ہے بچّہ اس کی طرف انگلیوں سے اشارا کرکے اُچکتا ہے کہ کٹورے میں جا بیٹھوں اور گرم گرم حلوا چکھوں۔ آج اس کا چہرہ کنول کی طرح کِھلا ہوا ہے شاید اُس کی تیز نگاہوں نے تاڑ لیا ہے کہ پریموتی کے اُجڑے ہوئے دل میں پریم نے آج پھر باس کیا ہے۔ سیوتی کو یقین نہ آیا۔ چارپائی پر پڑے پڑے نیم باز آنکھوں سے تاک رہی تھی گویا خواب دیکھ رہی ہے۔ اتنے میں پریموتی پیار سے بولی:۔''بیٹی اُٹھو دِن چڑھ آیا۔''

سیوتی کے رونگٹے کھڑے ہوگئے اور آنکھیں بھر آئیں۔ آج بہت دنوں کے بعد ماں کے مُنہ سے محبت کی باتیں سُنیں۔ جھٹ اُٹھ بیٹھی اور ماں کے گلے لپٹ کر رونے لگی۔ پریموتی کی آنکھوں سے بھی آنسو کی جھڑی لگ گئی۔ سُوکھا پیڑ ہرا ہوا۔ جب دونوں کے آنسو تھمے تو پریموتی بولی۔''سُنو۔ تمھیں آج یہ سب باتیں اچرج معلوم ہوتی ہیں۔ ہاں بیٹی اب اچرج ہی ہیں۔ میں کیسے روؤں جب آنکھوں میں آنسو ہی نہیں رہے پیار کہاں سے لاؤں۔ جب کلیجہ سوکھ کے پتھر ہوگیا۔ یہ سب دِنوں کے پھیر ہیں۔ آنسو اُن کے ساتھ گئے اور پیار کملا کے ساتھ۔ آج نہ جانے یہ دو بوند کہاں سے نکل آئے۔ بیٹی میری خطائیں سب معاف کرنا۔''

یہ کہتے کہتے اُس کی آنکھیں جھپکنے لگیں۔ سیوتی زرد ہوگئی۔ ماں کو فرش پر لِٹا دیا اُس دن سے پریموتی کا یہ حال ہوگیا۔ جب دیکھو رو رہی ہے۔ باتیں کرتی تو شکروقند گھول دیتی۔ بچّے کو گود سے ایک دم کے لیے الگ نہ کرتی۔ مہریوں سے بولتی تو منہ سے پھُول جھڑتے۔ پھر پہلے کی پریموتی ہوگئی۔ شریں زبان۔ رحم دل اور نیک۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دل پر سے ایک پردہ سا اُٹھ گیا۔ جب شدّت کی برف پڑتی ہے تو بعض

ندیاں یخ بستہ ہوجاتی ہیں۔ تب اُن میں بسنے والی مچھلیاں اور دریائی جانور چادرِ برف میں چھپ جاتے ہیں۔ کشتیاں پھنس جاتی ہیں اور اس خوش خرام سمیتن جاں نواز چشمۂ آب کی صورت بالکل نظر نہیں آتی۔ حالانکہ برف کی چادر کے نیچے وہ خوابِ ناز میں مست پڑا رہتا ہے۔ مگر جب گرمی کا راج ہوتا ہے تو برف پگھل جاتی ہے اور دریائے سمیتن برف کے چادر اُٹھا دیتا ہے پھر مچھلیاں اور جانور آبستے ہیں۔ کشتیوں کے بادبان لہرانے لگتے ہیں اور اس کے ساحل پر مردم و مرغ و مور کا جمگھٹ ہوجاتا ہے۔

مگر یہ کیفیت زیادہ دنوں تک قائم نہ رہی۔ ایک ہی ہفتہ میں پریموتی کی حالت نازک ہوگئی۔ مزاج کا صحیح ہونا گویا موت کا پروانہ تھا۔ اسی مدہوشی نے اسے اب تک قیدِ حیات میں رکھا تھا۔ ورنہ پریموتی جیسی نرم دل عورت بادِ حوادث کے ایسے جھونکے نہ برداشت کرسکتی۔

سیوتی نے چاروں طرف تار دلوائے کہ آکر اماں کو دیکھ جاؤ۔ مگر کہیں سے کوئی نہ آیا۔ پران ناتھ کو رخصت نہ ملی۔ برجن بیمار تھی۔ رہے رادھا چرن وہ نینی تال سیر کرنے گئے ہوئے تھے۔ پریموتی کو بیٹے ہی کے دیدار کا اشتیاق تھا۔ مگر جب اُن کا خط آگیا۔ کہ میں اس وقت نہیں آسکتا۔ تو اس نے ایک لمبی سانس لی اور آنکھیں موند لیں اور ایسی سوئی کہ پھر اُٹھنا نصیب نہ ہوا۔

نفس کی سرکشیاں

انسان کا دل ایک رازِ سربستہ ہے کبھی تو وہ لاکھوں کی طرف آنکھ اُٹھاکر نہیں دیکھتا اور کبھی چند پیسوں پر پھسل جاتا ہے۔ کبھی صدہا بے گناہوں کے خُون پر اُف تک نہیں کرتا اور کبھی ایک بچّے کو روتا دیکھ کر رو دیتا ہے۔ پرتاپ چند اور کملا چرن میں اگرچہ برادرانہ محبت تھی۔ مگر کملا کی موت بے ہنگام کا جو صدمہ پرتاپ کو ہونا چاہیے وہ نہ ہوا۔ سُن کر وہ چونک ضرور پڑا اور ذرا دیر کے لیے مغموم بھی نظر آیا۔ مگر وہ ملال جو کسی شخص کو اپنے سچّے دوست کی وفات پر ہوتا ہے اُسے نہ ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ شادی سے پہلے ہی سے اس نے برجن کو اپنی بہن سمجھنا شروع کیا تھا۔ تاہم اس خیال میں اسے پُوری کامیابی کبھی نہ حاصل ہوئی۔ وقتاً فوقتاً اُس کا وہم اس پاک رشتہ کے حدود سے بہت آگے بڑھ جاتا تھا۔ کملا چرن سے اُسے بذاتِ خود خاص کوئی ایسی محبت نہ تھی۔ اُس کی جو کچھ خاطر و مدارت اور محبت وہ کرتا تھا وہ کچھ تو اس خیال سے کہ برجن سُن کر خوش ہوگی اور کچھ اس خیال سے کہ سوشیلا کی موت کا کفارہ اسی طرح ادا ہوسکتا ہے۔ جب برجن سسرال چلی آئی۔ تو البتہ کچھ دنوں تک پرتاپ نے اُسے اپنے خیالات میں نہ آنے دیا۔ مگر جس وقت سے کہ وہ اس کی بیماری کی خبر پاکر بنارس گیا تھا اور اس کی ملاقات نے برجن پر داروئے شفا کا کام کیا تھا۔ اُسی وقت سے پرتاپ کو یقین ہوگیا تھا کہ برجن کے دل میں کملا نے وہ جگہ نہیں پائی جو میرے لیے مخصوص تھی۔

پرتاپ نے برجن کو نہایت پُردرد ماتم نامہ لکھا مگر خط لکھتا جاتا تھا۔ اور سوچتا جاتا تھا کہ اس کا اس پر کیا اثر ہوگا۔ بالعموم ہمدردی محبت کو مضبوط کرتی ہے کیا عجب ہے کہ یہ خط ہی اپنا کام کرجائے۔ علاوہ اس کے چونکہ وہ ذرا مذہبیت کی طرف زیادہ مائل تھا۔ کملا کی موت نے یہ خیال پیدا کیا کہ ایشور نے میری محبت کی قدر کی اور کملا چرن کو میرے راستہ سے ہٹا دیا۔ گویا یہ غیب سے پروانہ ملا ہے کہ اب میں برجن سے اپنی محبت کی داد لوں۔ پرتاپ یہ تو جانتا تھا کہ برجن سے کسی ایسی بات کی امید کرنا جو اخلاق اور صداقت کے راستہ سے جَو بھر بھی ہٹی ہوئی ہو حماقت ہے۔ مگر اخلاق و صداقت کے دائرہ میں رہتے

ہوئے میری خاطرداری اور دل دہی اگر ممکن ہے تو برجن زیادہ عرصہ تک میرے ساتھ بے رحمی نہیں کرسکتی۔ جب میں آنکھوں میں آنسو بھرکر اور عاجزی سے منّت کروں گا تو وہ ضرور میری طرف مخاطب ہوجائے گی اور وقت محبت اور عاشقانہ خاطرداریاں اپنا اپنا کام پُورا کرکے رہیں گی۔

ایک مہینہ تک یہ خیالات اُسے بے چین کرتے رہے یہاں تک کہ برجن سے ایکبار پوشیدہ ملاقات کرنے کا بیتابانہ اشتیاق اُسے پیدا ہوا۔ یہ وہ جانتا تھا کہ ابھی برجن کے دل پر تازہ صدمہ ہے اور میری بات یا انداز سے اگر میرے نفس کی سرکشیوں کی بُو نکلی تو پھر برجن کی نگاہوں سے ہمیشہ کے لیے گر جاؤں گا۔ مگر جیسے کوئی چور روپیہ کا ڈھیر دیکھ کر صبر نہیں کرسکتا۔ اسی طرح پرتاپ اس وقت اپنے تئیں تھام نہ سکا۔ انسان کی قسمت ایک بڑی حد تک موقعوں کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ موقعے اسے نیک بھی بناتے ہیں اور بد بھی جب تک کملا چرن زندہ تھا پرتاپ کے نفس کو کبھی اتنا سراُبھارنے کا موقع نہ ملا۔ اس کی موت نے گویا جگہ خالی کردی۔ یہ خودغرضی کا نشہ یہاں تک بڑھا کہ اُسے ایک روز ایسا محسوس ہونے لگا کہ برجن مجھے یاد کر رہی ہے۔ اپنی بیتابی سے وہ برجن کی بیتابی کا اندازہ لگانے لگا۔ بنارس جانے کا ارادہ مصمم کرلیا۔

دو بجے رات کا وقت تھا۔ چاروں طرف موت کا سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نیند نے سارے شہر پر ایک گھٹا ٹوپ چادر پھیلا دی تھی۔ کبھی کبھی پیڑوں کی سنسناہٹ سُنائی دی جاتی تھی۔ دھواں مکانوں اور درختوں پر ایک سیاہ غلاف کی طرح لپٹا ہوا تھا۔ اور سڑک کی لالٹینیں دُھوئیں کی سیاہی میں ایسی نظر آتی تھیں جیسے بادل میں چھپے ہوئے تارے۔ پرتاپ چند ریل گاڑی سے اُترا تو اُس کا دل بانسوں اُچھل رہا تھا۔ اور ہاتھ پاؤں کانپتے تھے۔ یہ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ گناہ کا اُسے تجربہ ہوا۔ افسوس! کہ دل کی یہ کیفیت عرصے تک قائم نہیں رہتی۔ نفس اس منزل دشوار کو طے کرلیتا ہے۔ جس نے کبھی شراب نہیں پی اُسے اُس کی بُو سے نفرت ہے۔ شاید پہلی بار وہ پیے گا تو گھنٹوں اُس کا مُنہ بدمزہ رہے گا اور وہ تعجب کرے گا کہ کیوں لوگ ایسی زہریلی اور کڑوی چیز کے ایسے گرویدہ ہیں مگر چند ہی دنوں میں اُس کی نفرت غائب ہوجاتی ہے اور وہ بھی آب سُرخ کا غلام ہوجاتا ہے۔ گناہ کا مزا اس شراب سے بہت زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

پرتاپ چند اندھیرے میں آہستہ آہستہ جا رہا تھا اس کے قدم جلد جلد نہیں اُٹھتے تھے کیونکہ گناہ نے اُس کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں۔ اس ولولہ آمیز مسرت کا جو ایسے موقعوں پر قدموں کو تیز کردیتی ہے۔ اس کے چہرہ پر کوئی نشان نہ تھا۔ وہ چلتے چلتے رُک جاتا اور پھر کچھ سوچ کر آگے بڑھتا تھا۔ شیطان اُسے گناہ کے غار میں کیسا کھینچے لیے جاتا ہے۔

پرتاپ کا سر دھم دھم کر رہا تھا اور خوف سے پنڈلیاں کانپ رہی تھیں۔ سوچتا بچارتا گھنٹہ بھر میں وہ منشی شیاما چرن کی عالیشان حویلی کے سامنے جا پہنچا۔ آج تاریکی میں یہ حویلی بہت ہی بھیانک معلوم ہوتی تھی جیسے گناہ کا بھوت سامنے کھڑا ہو۔ پرتاپ دیوار کی آڑ میں کھڑا ہوگیا۔ کسی نے اس کے پَیر باندھ دیے۔ آدھ گھنٹہ تک وہ یہی سوچتا رہا کہ لوٹ چلوں یا اندر جاؤں۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو غضب ہوجائے گا۔ برجن مجھے دیکھ کر دل میں کیا سوچے گی کہیں ایسا نہ ہو کہ میری یہ حرکت مجھے ہمیشہ کے لیے اُس کی نظروں سے گرا دے مگر ان سب اندیشوں پر شیطان کی کشش غالب آئی۔ نفس کے بس میں ہوکر انسان کو نیک و بد کی تمیز نہیں باقی رہ جاتی۔ اُس نے دل کو مضبوط کیا اور اُس بُزدلی پر اپنے تئیں ملامت کرنے لگا۔ بعد ازاں مکان کے عقب کی طرف جاکر باغیچہ کی چہار دیواری سے اندر پھاند پڑا۔ باغیچہ سے مکان کے اندر جانے کے لیے ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ اتفاق سے وہ اس وقت کھلا ہوا تھا۔ پرتاپ کو اس وقت یہ ایک فال نیک سا معلوم ہوا مگر فی الواقع یہ خانۂ معصیت کا دروازہ تھا۔ اندر جاتے ہوئے پرتاپ کے ہاتھ پاؤں تھرتھرانے لگے۔ دل میں ایسی غضب کی دھڑکن تھی کہ معلوم ہوتا تھا وہ سینہ سے باہر نکل پڑے گا۔ اُس کا دم گھٹتا تھا۔ ایمان نے اب کی بہت زور لگایا۔ اپنی ساری قوت صرف کردی۔ مگر نفس کا پُرزور دھاوا نہ رُک سکا۔ پرتاپ دروازہ کے اندر داخل ہوا اور آنگن میں تلسی کے چبوترہ کے پاس چوروں کی طرح کھڑا سوچتا رہا کہ برجن سے کیونکر ملاقات ہو مکان کے سب دروازے بند ہیں۔ کیا برجن بھی یہاں سے چلی گئی۔ یکایک اُسے ایک بند دروازہ کے دراڑوں سے ہلکی روشنی کی شعاع دکھائی دی۔ اسے دیکھتے ہی اُس کے جگر نے ایسی قلانچ بھری گویا ہوا میں اُڑ جائے گا۔ دبے پاؤں اسی طرف چلا۔ اور دراڑ میں آنکھ لگا کر اندر کی کیفیت دیکھنے لگا۔ اُس کی سانس اُس وقت بڑی تیزی سے چل رہی تھی۔

برجن ایک سفید ساڑی پہنے۔ چہرہ زرد۔ بال بکھرے ہوئے۔ فرش پر ہاتھ میں قلم لیے بیٹھی تھی اور دیواروں کی طرف دیکھ دیکھ کر کاغذ پر کچھ لکھتی جاتی تھی جیسے کوئی شاعر بحرِ خیال سے موتی نکال رہا ہو۔ قلم کو دانتوں تلے دبا کر کچھ سوچتی اور لکھتی اور ذرا دیر کے بعد دیوار کی طرف تاکنے لگتی۔ پرتاپ بہت دیر تک سانس روکے ہوئے یہ دلچسپ نظارہ دیکھتا رہا۔ نفس اُسے بار بار ٹھوکے دیتا مگر یہ ایمان کا آخری قلعہ تھا۔ اس وقت ایمان کا شکست کھاجانا گویا پہلوئے دل میں شیطان کا جگہ پانا تھا۔ ایمان اور نتائج کے خوف نے اس وقت پرتاپ کو اُس غار میں گرنے سے بچا لیا جہاں سے مرتے دم تک اُسے نکلنا نصیب نہ ہوتا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ غارِ معصیت سے بچانے والا اس وقت ایمان نہ تھا بلکہ نتائج کا خوف اور پشیمانی کا خیال۔ بسا اوقات جب ہمارا ایمان مغلوب ہوجاتا ہے تو نتائج کا خوف ہم کو بدکرداریوں سے بچا لیتا ہے۔ برجن کے چہرہ پر باوجود زردی کے ایک ایسی رونق تھی جو قلب کی صفائی اور خیال کی بلندی کا پتہ دے رہی تھی۔ اُس کے بشرے کی متانت اور نگاہ کی پاکیزگی میں نفس سرکش کے لیے وہ جانگداز تازیانہ تھا جس سے پرتاپ کے نفس کا جانبر ہونا محال تھا کیونکہ راہِ معصیت میں اُس کا یہ پہلا سفر تھا وہ ایسا مؤثر ہوا کہ رونے لگا۔ نفس نے جتنے خیالاتِ فاسد اُس کے دل میں پیدا کردیے تھے وہ سب اس نظارہ نے یوں غائب کردیے جیسے اُجالا اندھیرے کو دُور کردیتا ہے۔ اس وقت اُسے یہ خواہش ہوئی کہ اس کے پیروں پر گر کر اپنی ان خطاؤں کی معافی مانگ لوں۔ جیسے کسی مہاتما سنیاسی کے روبرو جاکر ہمارے دل کی کیفیت ہوجاتی ہے۔ اسی طرح پرتاپ کے دل میں خود بخود اعزاز و احترام کے خیالات پیدا ہوئے۔ وہ اپنی اخلاقی پستی پر ایسا نادم ہوا کہ برجن کے سامنے جانے کی ہمّت نہ پڑی۔ شیطان یہاں تک لایا مگر آگے نہ لے جاسکا۔ وہ اُلٹے قدم لوٹا اور ایسی تیزی سے باغیچہ میں آیا اور چہاردیواری سے باہر کُودا گویا کوئی اُس کے تعاقب میں ہے۔

صبح کاذب کا وقت ہوگیا۔ پرتاپ کے ایمان کی طرح آسمان میں تارے جھلملا رہے تھے اور چکی کی گھمر گھمر آواز کانوں میں آتی تھی۔ پرتاپ پَیر دباتا۔ آدمیوں کی نظریں بچاتا گنگا جی کی طرف چلا۔ یکایک اُس نے سر پر ہاتھ رکھا تو ٹوپی کا پتہ نہ تھا اور نہ جیب میں گھڑی دکھائی دی۔ اُس کا کلیجہ سَن سے ہوگیا اور دل سے بے اختیار ایک آہ نکل آئی۔

بعض اوقات ہماری زندگی میں ایسے واقعات ہوجاتے ہیں جو دم زدن میں اُس کی صورت پلٹ دیتے ہیں۔ کبھی والدین ایک ترچھی نگاہ بیٹے کو نیک نامی کے ساتویں آسمان پر پہنچا دیتی ہے اور کبھی بیوی کی ایک نصیحت شوہر کو مہاتما رشی بنا دیتی ہے۔ غیرت مند ہستیاں اپنے یگانوں کی نگاہوں میں ذلیل ہوکر دُنیا کا بوجھ بننا نہیں برداشت کرسکتیں۔ انسانی زندگی میں ایسے موقعے خدا داد ہوتے ہیں۔ پرتاپ چند کی زندگی میں بھی وہ مبارک وقت تھا جب وہ پیچدار گلیوں میں ہوتا ہوا گنگا کے کنارے آکر بیٹھا اور افسوس ندامت کے آنسو بہانے لگا۔ نفس کی حوصلہ انگیزیوں نے اُسے ذلیل و خوار کرنے میں کوئی کسر نہ رکھی تھی مگر اس کے لیے یہ تازیانہ اُستاد مہربان کا تازیانہ ثابت ہوا۔ کیا یہ تجربہ نہیں کہ زہر بھی بعض اوقات آبِ حیات کا کام دیتا ہے۔

جس طرح ہوا کا جھونکا سُلگتی ہوئی آگ کو دہکا دیتا ہے اسی طرح اکثر دلوں میں دبے ہوئے جوش کو متحرک کرنے کے لیے کسی ظاہری تحریک کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنی مصیبت کا تجربہ اور دوسروں کی مصیبت کا نظارہ بسا اوقات دل میں وہ ویراگ پیدا کردیتا ہے جو صحبت۔ مطالعہ اور خلقی مناسبت کے اثر سے بھی ممکن نہ تھا۔ اگرچہ پرتاپ چند کے دل میں نیک اور بے غرض زندگی بسر کرنے کا خیال پہلے ہی سے تھا۔ مگر نفس کے اس تازیانہ نے وہ منزل ایک ہی لمحہ میں طے کردی جس کے طے ہونے میں برسوں لگتے۔ اُس کی زندگی کا ارادہ مستقل ہوگیا۔ معمولی صورتوں میں قومی خدمت اُس کی زندگی کا ایک دلچسپ اور غالبًا ضروری مشغلہ ہوتی مگر ان واقعات نے قومی خدمت کو اُس کی زندگی کی غرض اور غایت بنا دیا۔ سُباما کی دلی آرزو پُوری ہونے کے سامان پیدا ہوگئے۔ کیا ان واقعات کی تہ میں کوئی غیبی طاقت متحرک تھی۔ کون کہہ سکتا ہے۔

ہردوار سے بہت دُور شمال طرف پیچ دار پہاڑوں میں ایک چشمہ کے کنارے ایک نوجوان بیٹھا ہوا نظر آتا تھا۔ جگہ بہت خوفناک تھی۔ درندے دن دہاڑے چہل قدمیاں کرتے تھے مگر یہ شخص شب و روز ایک ہی چٹان پر بیٹھا رہتا۔ وہ جگر کا بہت مضبوط تھا اس کے چہرے سے وحشت برستی تھی۔ کپڑے پھٹ پھٹ کر تارتار ہوگئے تھے۔ بال بڑھ آئے تھے مگر ظاہراً ان باتوں کی اُسے مطلق پروا نہ تھی۔ اُس کے پاس نہ اوڑھنا تھا نہ بستر۔ نہ برتن نہ بھاندے۔ کبھی کبھی وہ جنگلی پھل کھا لیا کرتا تھا۔ ایسا بے سروسامان آدمی کس نے دیکھا ہوگا۔ یہ پرتاپ چند تھا۔

پرتاپ چند کو یوں بسر کرتے کئی مہینے گزر گئے ہیں وہ اپنے نفس سے لڑ رہا ہے مگر فتح نہیں ہوتی۔ اُس نے دشمن کو جیسا حقیر سمجھا تھا اُس سے بدرجہا طاقتور پایا جس وقت تک وہ الہ آباد میں تھا ذاتی عیش اور تنعم کے خیالات اُس کے دل میں نام کو بھی نہ آتے تھے مگر اس ویرانے میں اس کا خیال بار بار انھیں باتوں کی طرف جُھکتا۔ وہ خیالات کے مجتمع کرنے میں کامیاب نہ ہوتا۔ اکثر ایک نازنین کی تصویر اُس کی نگاہوں کے سامنے آکر کھڑی ہوجاتی جو برجن سے، بہت مشابہ تھی۔ تخیل ایک عالیشان مکان بنواتا۔ اُسے شیشے آلات و نوادر سے سجاتا۔ جان بخش نغموں کی میٹھی الاپ کانوں میں آنے لگتی۔ عاشقانہ چھیڑ چھاڑ اور معشوقانہ شیریں ادائیوں کے دور چلنے لگتے گھنٹوں اسی پُرسرور خواب کے مزے لُوٹتا۔ پھر یکایک وہ چونک پڑتا کہ میں کیا بیہودہ باتیں سوچ رہا ہوں اور خیالات کو اِدھر سے ہٹا کر مسئلہ پیشِ نظر پر جماتا مگر جھرنوں کی شیریں نوائیاں اور غزالوں کی کلیلیں خیالات کے قدم میں زنجیر گرانبار کا کام کرتیں یہاں تک کہ وہ مایوس ہوکر اُٹھ کھڑا ہوتا اور دل میں کہتا کہ میری زندگی یوں ہی خواب دیکھنے میں گزرے گی۔

رفتہ رفتہ اُس کی یہ حالت ہوگئی کہ کھانے پینے کی مطلق سُدھ نہ رہتی۔ سویرے سے شام تک دیوانہ وار بیٹھا ہوا درختوں کی شاخوں اور پتھر کی چٹانوں سے نظریں ملایا کرتا۔ خیال کی طاقت بڑی زبردست ہے۔ قومی خدمت کے خیال میں غرق رہتے رہتے اُس کے دل میں درد کا سچّا جذبہ پیدا ہوا جس کے بغیر بے غرض خدمت محال ہے۔ کسی بوڑھے ضعیف کو لکڑیاں توڑتے دیکھتا تو خود اُس کی لکڑیاں توڑکر اُس کے گھر تک پہنچا آتا۔ بُھولے بھٹکے مسافروں کو ساتھ لے کر آبادی تک جاتا۔ ان کاموں میں اُسے روحانی مسرّت حاصل ہوتی یہاں تک کہ آس پاس کی آبادیوں میں ان نیک کاموں کا شہرہ ہوگیا۔ لوگ سمجھنے لگے کہ کوئی مہاتما رشی ہیں۔ عورتیں آتیں کہ مجھے سال بھر سے لڑکا نہیں ہوا۔ کوئی دعا تعویذ دیجیے۔ مرد آتے کہ میرے روزگار کی فکر کر دیجیے۔ آخر پرتاپ چند یہاں سے گھبرا کر

بھاگا اور دشوار گزار گھاٹیوں کو چیرتا ہوا بہت دُور نکل گیا۔ یہاں ایک اُونچی چوٹی پر ایک چھوٹی سی منڈھیا تھی۔ اُسی کے قریب ایک چٹان پر اُس نے بھی اپنا آسن جمایا۔

یہاں رہتے اُسے چھ مہینے گزر گئے اور اب اُسے اپنے دل میں ایک باطنی طاقت محسوس ہونے لگی۔ جذب خیال کی قوت پیدا ہوگئی مگر اُس کی آتما ابھی تک کمزور تھی اس کا ثبوت بھی اُسے جلد مل گیا۔ ایک روز شام کے وقت وہ بیٹھا ہوا تھا کہ یکایک شیر کی ہولناک گرج اُس کے کانوں میں آئی۔ آواز سُنتے ہی اُس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے اور دل دھڑکنے لگا۔ مگر وہ سنبھل بیٹھا اور اِدھر اُدھر چوکنی نگاہوں سے تاکنے لگا کہ آواز کدھر سے آئی ہے۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک خونخوار شیر چشمہ کے کنارے ایک بے بس ہرن پر ٹوٹ پڑا ہے اور اپنے آہنی جبڑے اُس کے گردن میں چُبھا رہا ہے۔ اُس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں۔ یہ ہیبت ناک نظارہ دیکھتے ہی پرتاپ چند کا ہیاؤ چُھوٹ گیا وہ بے اختیاری طور پر اُٹھا کہ مندر میں جا چھپوں مگر اسی اثنا میں ایک لاغر اندام شخص جس کی ریش دراز ناف تک آئی ہوئی تھی اور چہرہ بدرِ کامل کی طرح منور تھا۔ ہاتھ میں ایک گنڈا سا لیے ہوئے نکلا اور دلیرانہ قدم بڑھاتا ہوا شیر کے سر پر جا پہنچا۔ شیر جھلّایا تو تھا ہی شعلہ بار آنکھوں سے گھورتا ہوا دوڑا مگر نزدیک آتے ہی اُس کی آنکھیں جھپک گئیں اور خطاوار شخص کی طرح جو اپنے آقا سے معافی کا طالب ہو زمین پر لیٹ گیا۔ سادھو نے آہوئے نیم جان کو آغوش میں اُٹھا لیا اور مندر میں لاکر مرگ چھالے پر لِٹا دیا۔ چند بوٹیاں پتھر پر گھِس کر اُس کے زخموں پر لگائیں۔ اور تب اپنی کفنی کو جس پر تازہ گلہائے خون زیب دے رہے تھے دھونے کے لیے چشمے کی طرف چلا۔ جیسے کوئی شیو کا پوجاری کمل کے پھُولوں کو جل دان کے لیے لے جاتا ہو۔ پرتاپ اس حیرت انگیز روحانی کرشمہ سے اتنا متاثر ہوا کہ کچھ دیر تک نقشِ دیوار کی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر سوچنے لگا افسوس! کیا میری آتما اتنی کمزور ہے۔ کیا مجھے اپنی جان اتنی پیاری ہے!

پرتاپ چند اپنی اس بزدلی پر ایسا جھنجھلایا کہ آنکھیں سُرخ ہوگئیں خُون جوش کھانے لگا۔ ایک مضبوط لکڑی کا کندہ اُٹھاکر کسی بدمست شرابی کی طرح لڑکھڑاتی ٹانگوں سے دوڑتا ہوا شیر کے کِلے پر جا پہنچا۔ شیر نے اُسے دیکھا اور دیکھتے ہی اُس کے تیور بدل گئے۔ بادل کی طرح گرجا اور قریب تھا کہ جست مار کر پرتاپ کی گردن دبوچے کہ اتنے میں اس نے

لکڑی کا کندہ اپنی پوری طاقت سے اُس کے سر پر پٹک دیا۔ مگر شیر کے فولادی سر پر اس کا کیا اثر ہوسکتا تھا وہ اور بھی جھلّایا اور اس زور سے گرجا کہ جنگل کے تمام جانور اپنے اپنے کمین گاہوں سے نکل پڑے اور دونوں اگلے پنجے اُس کی کمر میں ڈال دیے۔ دفعتاً اُس کے سر پر گنڈا سے کا بھر پور ہاتھ پڑا۔ طیش کھاکر پیچھے کی طرف دیکھا تو سادھو بابا کھڑے ہیں اس نے فوراً پرتاپ کو چھوڑ دیا اور درد سے کراہتا بھاگا۔

پرتاپ چند نے ان بابا جی کو اکثر مندر سے آتے جاتے دیکھا تھا مگر اس وقت جو اور نزدیک سے اُن کے پُرجلال چہرہ پر نگاہ ڈالی تو صورت کچھ مانوس معلوم ہوئی۔ سوچنے لگا کہ میں نے انھیں دیکھا ہے مگر حافظہ نے یاری نہ دی۔ ندامت سے سر جھکاکر بولا۔ ’’میں نے آپ کو کہیں اور دیکھا ہے۔‘‘

سادھو جی نے مسکراکر فرمایا۔ ’’یہ کیوں نہیں کہتے کہ برسوں آپ کی گود میں کھیلا ہوں۔‘‘

اتنا سنتے ہی پرتاپ کی آنکھوں سے پردہ سا ہٹ گیا۔ کلیجہ نے جست ماری اور لبوں تک آپہنچا۔ ایک پُرجوش فرزندانہ بے خودی کے ساتھ اُن کے سینے سے لپٹ گیا اور آنکھوں سے آنسو کے قطرے گرنے لگے۔ منشی سنجیون لال نے پدرانہ شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور آنسو پونچھے۔

تیّاری

جیسے کوئی منجدھار میں پڑی کشتی طوفان کے تھپیڑوں اور تلاطم کے جھکولوں سے اپنی جان بچا کر کسی بندرگاہ کے آغوش میں جا پہنچتی ہے۔ اسی طرح پرتاپ چند اب ایک ایسے مسکن میں آگیا تھا۔ جہاں اُس کے دماغ کو اطمینان تھا اور دل کو قرار۔ وہ اب اُس بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح نہ تھا جو اندھیری رات میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہو۔ اب اُسے اپنا راستہ اُس کے نشیب و فراز اور منزلِ مقصود صاف نظر آتے تھے۔ منشی سجیون لال کی صحبت اور تلقین نے چند ہی مہینوں میں اُس کے دل سے وہ کمزوریاں محو کردیں۔ جنھیں وہ سخت کوششوں کے بعد بھی دور کرنے میں پورے طور پر کامیاب نہ ہوا تھا۔ ایک عارفِ کامل کی چند روزہ صحبت تزکیۂ نفس کے لیے برسوں کی اندرونی کشمکش اور مطالعہ سے بدرجہا زیادہ مفید ہوتی ہے۔

منشی جی اُسے ہر روز بھگوت گیتا پڑھاتے۔ اُنھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اسی بحرِ عمیق کی غواصی میں صرف کیا تھا اور ادھر تین چار سال تک کتنے ہی یوگیوں اور سنیاسیوں کے خرمنِ دانش سے خوشہ چینی کی تھی۔ وہ ایک ایک نکتہ کی ایسی تشریح کرتے۔ اُن کا لہجہ ایسا دلکش اور طرزِ بیان ایسا سرور انگیز تھا کہ پرتاپ پر خودفراموشی کا عالم طاری ہوجاتا۔ اُن کے ایک ایک لفظ میں وہ اثر ہوتا تھا جو کسی خانقاہِ روحانیت کے بسنے والے ہی کی باتوں میں ہوسکتا ہے۔ پرتاپ چند کے خیالات روز بروز زیادہ پاک۔ زیادہ بے غرض اور حوصلے زیادہ وسیع اور زیادہ بلند ہوتے جاتے تھے۔ اُس نے یوگ کی مشق بھی شروع کردی تھی جوں جوں اس میدان میں وہ قدم آگے بڑھاتا تھا۔ اُس کی ہمدردیاں زیادہ وسیع اور عام ہوتی جاتی تھیں۔

اسی طرح دو سال گزر گئے۔ پرتاپ چند کے قوائے جسمانی شیروں کی طرح مضبوط اور تنومند ہوگئے۔ اونچی سے اونچی پہاڑیوں پر سے بے تکان چڑھ جاتا۔ منزلوں کی مسافت طے کرکے یوں آ بیٹھتا گویا کسی باغ کی سیر کرکے لوٹا ہے۔ قوتِ برداشت اتنی مضبوط ہوگئی تھی کہ برفستانی چوٹیوں پر سنگین چٹانوں کا بستر بناکر ایسے آرام سے لیٹتا گویا آراستہ مکان میں

مخملی گدّوں پر لیٹا ہوا ہے اس کا چہرہ ایسا روشن ہوگیا تھا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں جھپک جاتی تھیں۔ اُس پر شانوں تک بکھرے ہوئے بال اور درد سے بھری ہوئی آنکھیں اُسے رحم کی مورت بنائے دیتی تھیں۔ روشن رخساروں پر سبزۂ نودمیدہ ایسے معلوم ہوتے تھے گویا پروانے شمع پر نثار ہو رہے ہیں کیسا حُسن مردانہ تھا کہ پہلی ہی نظر میں اُس کی تصویر پردۂ دل پر ہمیشہ کے لیے کھینچ جاتی تھی یقیناً جب وہ اپنا آسن بچھا کر یوگ سادھن کرتا ہوگا تو کیلاش کی بسنے والی اپسرائیں اُس پر نثار ہوتی ہوں گی۔ جس وقت وہ جڑی بوٹیوں کا بقچہ لے کر قدم بڑھاتا ہوا چلتا تو پہاڑوں کے بسنے والے مرد اور عورتیں اضطراری طور پر اس کے روبرو سر جُھکاتے اور جس وقت تک جھاڑیاں اور چٹانیں اُسے اپنے دامنوں میں چھپا لیتیں اُس کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھا کرتے۔ اُس کے علاج میں وہ تاثیر تھی۔ باتوں میں وہ مٹھاس اور آنکھوں میں وہ جادو کہ گرد و نواح کے لوگ سمجھتے وہ دیو لوک کا کوئی رِشی ہے۔

ایک روز سجیون لال نے پرتاپ چند سے کہا۔ ”بالانند جی! چلو تمھیں اب دوسرے مقامات کی سیر کراؤں۔ اس پاک سرزمین میں کتنے ہی سنیاسی اور رِشی دُنیا سے مُنہ موڑکر بھگوت بھجن کر رہے ہیں۔ میں نے ایک بار سب کے درشن کر لیے ہیں مگر اب پھر اُن کے درشنوں کے لیے جی بے چین ہو رہا ہے۔

پرتاپ۔ میں بسرو چشم حاضر ہوں۔ یہاں سے کس طرف کا قصد ہے؟

سجیون لال۔ پہلے سنت دھام کو چلیں گے۔ وہاں کئی مہاتماؤں کے درشن ہوں گے۔ وہاں سے پُورب کی طرف کیلاش ہے۔ کیلاش سے سیدھے گیان سروور کی طرف سدھاریں گے۔ ایسا دلکش مقام پردۂ زمین پر اور کہیں نہ ہوگا۔ عین ساگر کے کنارے شری برھانند جی کا دھام ہے۔ اُن کے قدموں پر سر جُھکائیں گے۔ مجھے کتنے ہی رِشیوں سے فیض محبت کا موقع رہے مگر برھانند جی تاروں میں چاند ہیں تمھیں دیکھ کر وہ بہت خوش ہوں گے۔

پرتاپ چند نے روانگی کی تیاری کرنی شروع کی اور تیاری ہی کیا تھی وہ مرگ چھالے جڑی بوٹیوں کا بقچہ اور چند کتابیں اس مسکن کی ساری کائنات تھی۔ انھیں اِس نے بغل میں دبایا اور دونوں آدمی چل کھڑے ہوئے۔ مگر ابھی یہ پہاڑی سے اُترے بھی نہ تھے کہ جنگلی جانوروں کے غول کے غول چیختے چلّاتے اُچھلتے کُودتے نظر آئے۔ ہرن۔ بکریاں۔

ریچھ۔ شیر۔ چیتے سب کے سب پہلو بہ پہلو بھاگے چلے آتے تھے۔ گویا ہر ایک اپنی دُھن میں ایسا مست تھا کہ اُسے دوسروں کی خبر نہ تھی۔ آن کی آن میں اِن جانوروں نے دونوں بھگوڑوں کے گرد حلقہ باندھ لیا۔ کوئی اُن کے ہاتھ چاٹنے لگا۔ کوئی پیروں پر سر رگڑنے لگا۔ کوئی دردناک آواز میں چیخ رہا تھا۔ کوئی اُکڑوں بیٹھا ہوا زمین کی طرف تاک رہا تھا۔ گویا اپنے محسن کی جُدائی کا صدمہ اظہار کی قابلیت سے بہت زیادہ دلدوز تھا۔ بے زبانوں کے دل میں بھی وہی جذبۂ محبت اور وہی صدمۂ فراق ہوتا ہے جو حضرت انسان کی زندگیاں تلخ کردیا کرتا ہے۔ اگرچہ اس کا اظہار صرف اُنھیں لوگوں کے روبرو ہوتا ہے جن کی اندرونی آنکھیں کُھلی ہوئی ہیں اور جن کی آتمائیں اس قدر وسیع ہیں کہ جسم ظاہر کی نیرنگیاں اُن کا احاطہ نہیں کرسکتیں اس کوہستان کے ایک ایک ذی روح سے ان دونوں آدمیوں کو سچّی ہمدردی تھی۔ اُن کا مسکن ان بے زبانوں کی خوش فعلیوں کا اکھاڑہ تھا اور اُن کے ننھے ننھے خوبصورت بچوں کے سونے کا گہوارہ اور کلیلیں کرنے کا میدان۔ اس پُرسحر حلقہ میں آکر اُن کی باہمی رنجشیں اور کدورتیں مِٹ جایا کرتی تھیں۔

شام ہوگئی تھی اور دونوں آدمی مردانہ وار قدم بڑھاتے چلے جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اس کوہستان کے ایک ایک گوشہ کا نقشہ اُن کی نگاہوں میں کھینچا ہوا ہے۔ نہ اُن کے قدم پھسلتے تھے نہ ڈگمگاتے تھے۔ تیرہ و تار وادیاں جہاں شاید کسی ذی روح نے قدم نہ رکھا ہو اور عمودی چوٹیاں جن کی بلندی کو پرندے بھی نگاہِ حسرت سے دیکھیں۔ اُن کے لیے ایسے آسان اور سہل گزار راستے تھے۔ جیسے کوئی صاف ستھری سڑک۔ یا کسی باغ کی روش۔ اُن کے دل مردوں کے دل تھے اور اعضا شیروں کے۔ پرتاپ کا تو خیر عنفوانِ شباب تھا۔ مگر منشی جی بھی باوجود پیرانہ سالی کے ایک چٹان سے دوسری چٹان پر بے دھڑک کُود جاتے اور پُرشور کوہستانی نالوں میں بے مُحابا گُھس پڑتے۔ گویا ان موانعات ظاہر کی اُن کی نگاہوں میں کوئی وقعت نہ تھی۔

اس طرح بادہ پیمائی میں کئی مہینے لگے۔ دن بھر راستہ چلتے اور رات کے وقت کسی مہاتما رشی کے استھان پر ٹھہر جاتے اور اُس کے ست سنگ سے فیض یاب ہوتے۔ پرتاپ چند کو اکثر یہ خیال گزرتا کہ اگر یہ فقراء قدسی صفات کی خدمت کی طرف متوجہ ہوتے تو مکر و فریب۔ جور و جبر کا نشان مٹا دیتے۔ کیسے روشن دل لوگ تھے! کیسے مستغنی! دولت و

شہرت۔ ثروت و جاہ۔ نام و نمود اور دوسری دنیاوی نعمتیں جو حضرتِ انسان کی زندگی کا معراج خیال کی جاتی ہیں۔ اُن کی نگاہوں میں محض سنگریزے تھے جو حقیقت کے موتی اور گیان سروور کے نواح میں آپہنچے آہ! کیسا سہانا منظر تھا اسے دلکش کہنا اس کی مذمت کرنا ہے۔ اگر دنیا میں کوئی جگہ ایسی ہی ہے جسے اُس کی آنکھ کہہ سکیں تو وہ کوہِ ہمالہ ہے اور یہ جگہ اس آنکھ کی پُتلی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جسے پرانوں میں دیو لوک کا مقدس نام دیا گیا۔ یہاں گندھرب اور اپسرائیں بستی ہیں اور ان کے بہشتی نغموں کی دلآویز صدا شوق کے کانوں میں آتی ہے۔ پرتاپ پر اس منظر نے خودمستی کی کیفیت طاری کردی۔ نگاہیں جدھر جاتیں اُدھر سے ہٹنے کا نام نہ لیتیں۔ رُوح اور قلب پر ایک تقدس آمیز رعب چھا رہا تھا۔ کوئی کیسا ہی بے اعتقاد شخص کیوں نہ ہو۔ مگر اس پاک سرزمین میں داخل ہوتے ہی اُس کی روح پر وہ سرور ہوگا جو اسے مدّت العمر یاد رہے گا۔ یہاں کی ہوا میں سانس لینا اور یہاں کی زمین پر قدم رکھنا جامِ روحانیت سے شادکام ہونا ہے۔ دونوں طرف جہاں تک نگاہ جاتی ہے سر بہ فلک پہاڑیوں کا سلسلہ چلا جاتا ہے۔ ایک کے اوپر ایک۔ ایک دلپذیر بے قاعدگی کے ساتھ لدی ہوئی ہیں۔ گویا آسمان پر منڈلانے والے بادل یہاں سیر کرنے کے لیے اُتر آئے ہیں اُن کی چوٹیوں پر جابجا برف کے تودے پڑے ہوئے ہیں۔ جنھیں آفتاب کی آخری شعاعوں نے زرنگار بنا دیا ہے۔ جیسے اتنی بلندی پر روحانِ شمشی کے لیے سنہرے تخت سجائے گئے ہوں۔ انھیں پہاڑیوں کے بیچ میں گیان سروور آہستہ آہستہ موجیں مار رہا ہے۔ گیان کی طرح اتھاہ اور اپار۔ اُس میں ہنس بط اور بگلے خوش فعلیاں کر رہے ہیں۔ گویا آسمان پر تارے نکلے ہوئے ہیں۔

یکایک منشی سجیون لال نے کہا۔"بالا جی دیکھو جھیل کے کنارے وہ چھوٹی سی کٹی جو نظر آرہی ہے وہی برھمانند جی کا ستھان ہے۔" یہ سُنتے ہی اشتیاق نے پرتاپ چند کے قدم اور بھی تیز کردیے۔ ذرا دیر میں دونوں آدمی کُٹی کے دروازے پر پہنچ گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ سوامی برھمانند جی جھیل کے کنارے ایک چٹان پر بیٹھے ہوئے سندھیا کرنے میں مصروف ہیں۔ اُن کا چہرہ ایسا پُرجلال ہے۔ گویا آفتاب ابھی ابھی گیان سروور کے آغوش سے نکل رہا ہے۔

برجن شاعرہ ہوگئی

جب سے منشی سجیون لال تیرتھ جاترا کو نکلے اور پرتاپ چند الہ آباد چلا گیا اس وقت سے سُباما کی زندگی کی روش بالکل تبدیل ہوگئی تھی اُس نے ٹھیکہ کے کاروبار کو ترقی دینا شروع کیا اور اُسے نہایت وسیع پیمانے پر پہنچا دیا۔ مستری جی بدستور دیانت اور ہوشیاری سے اپنا کام کرتے تھے۔ منشی سجیون لال کے زمانے میں بھی کاروبار کو اتنا فروغ نہ حاصل ہوا تھا۔ سُباما رات کی رات بیٹھے اینٹ پتھر سے سر مارا کرتی تھی اور سُرخی چونے کے ذکر میں پریشان رہتی۔ پائی پائی کا حساب جانچتی اور کبھی کبھی خود مزدوروں کے کام کی دیکھ بھال کرتی۔ ان کاموں میں اُسے ایسا انہاک ہوا کہ دان اور برت سے جو اُس کے پُرانے شغل تھے۔ کسی قدر لاپروائی ظاہر ہونے لگی باوجود روز افزوں آمدنی کے سُباما نے خرچ کی کوئی مد زیادہ نہ ہونے دی۔ کوڑی کوڑی دانتوں سے پکڑتی اور یہ سب اس لیے کہ پرتاپ چند صاحبِ مال ہوجائے اور اپنی زندگی بھر فارغ البال و خوشحال رہے۔

سُباما کو اپنے ہونہار بیٹے پر ناز تھا۔ اس کی زندگی کی رفتار دیکھ دیکھ کر اسے یقین ہوگیا تھا۔ کہ جو آرزو دل میں رکھ کر میں نے اولاد مانگی تھی وہ آرزو ضرور پوری ہوگی۔ وہ کالج کے پرنسپل اور پروفیسروں سے پرتاپ کا حال خفیہ طور پر دریافت کرتی تھی اور اُن کی رپورٹوں کا مطالعہ اس کے لیے ایک دلچسپ فسانہ تھا۔ ایسی صورت میں الہ آباد سے پرتاپ چند کے لاپتہ ہوجانے کا تار پہنچنا گویا دل و دماغ پر بجلی کا گرنا تھا۔ سُباما نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور سر تھام کر بیٹھ گئی۔ تیسرے دن پرتاپ چند کی کتابیں۔ کپڑے اور دوسرے اسباب بھی آپہنچے۔ یہ زخم پر اور چرکا تھا۔

ایک دن وہ پرتاپ چند کی کتابیں اُلٹ پلٹ رہی تھی کہ اُسے ایک ریشمی رومال میں بہت سے خطوط حفاظت سے لپیٹے ہوئے دکھائی دیے۔ یہ برجن کے خطوط تھے سُباما انھیں پڑھنے لگی اور ایک ایک کرکے سارا دفتر ختم کرڈالا۔ آج وہ بہت روئی دوسرے دن جب برجن نے خبر سُنی تو وہ گھبرائی ہوئی سُباما کے یہاں آئی۔ سُباما نے چٹھیوں کا ایک پلندا اُس کے سامنے پھینک دیا اور منہ پھیر لیا۔ برجن کا چہرہ سرخ ہوگیا وہ اُٹھ کر کھڑی ہوگئی اور

پُرغرور لہجہ میں بولی:۔"چچی۔ اس بدگمانی پر آپ بہت پچھتائیں گی۔" یہ کہہ کر وہ اُلٹے قدم اپنے گھر لوٹ آئی۔

پریموتی کی مرنے کی خبر پاتے ہی پران ناتھ پٹنہ سے اور رادھاچرن نینی تال سے روانہ ہوئے۔ اس کے جیتے جی آتے تو ملاقات ہوتی۔ مرنے پر آئے تو مٹی دیکھنی بھی نہ نصیب ہوئی۔ مرتک سنسکار سب بڑی دُھوم سے ادا کیے گئے۔ دو ہفتہ گاؤں میں خوب چہل پہل رہی۔ اس کے بعد رادھا چرن مُراد آباد چلے گئے اور پران ناتھ نے پٹنہ چلنے کی تیاری شروع کی۔ اُن کا ارادہ تھا کہ بیوی کو الہ آباد پہنچاتے ہوئے پٹنہ جائیں مگر سیوتی نے ضد کی کہ جب یہاں تک آئے ہیں تو برجن کے پاس بھی ضرور چلنا چاہیے ورنہ اُسے صدمہ ہوگا۔ سمجھے گی کہ مجھے بیکس سمجھ کر ان لوگوں نے بھی تیاگ دیا۔ للّو نے بہت حیلہ و حُجت کی کہ مجھ سے جواب طلب ہوجائے گا۔ معطل ہوجاؤں گا۔ کیا عجب ہے کہ تنزلی کی بھی نوبت آجائے۔ آخر سیوتی نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر اُن کی طرف اس انوکھی نگاہ سے دیکھا جس میں مایوسی بھی تھی اور محبت بھی۔ ضد بھی تھی اور رضا بھی۔ للّو اس نگاہِ سحر کار کی تاب نہ لاسکے۔ رضا نے وہ کام کر دکھایا جو ضد سے مشکل تھا۔ بیوی کے گُلِ عارض کا بوسہ لے بولے۔"رو دیں کیوں؟"

سیوتی۔ تم رُلانے لگے ہی ہو۔

پران۔ اچھا تمھارا ہی کہنا کریں گے۔ لو اب خوش ہوجاؤ۔

للّو مدہوش ہوگیا۔ اس نگاہ میں خُموں کا نشہ تھا۔ اسی نگاہ نے گھر تباہ کردیے ہیں۔ گلوں پر خنجر چلا دیے ہیں۔ سلطنتیں مٹا دی ہیں۔ للّو نے تو کوئی غیر معمولی کام نہیں کیا صرف ایک معزز عہدہ سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ایک ننّھی سی آنکھ میں کتنی لطافت ہے!

سیوتی کا اس خانۂ ویران میں آنا گویا پھولوں میں مہک کا آنا تھا۔ ہفتہ بھر کے لیے اچھّے دنوں کی بُوباس آگئی۔ برجن بہت خوش ہوئی اور خوب روئی۔ مادھوی نے منوّ کو گود میں لے کر خُوب سا پیار کیا۔ مردانے کمرے مہینوں سے بند تھے۔ آج اُن کی قسمتیں بھی کُھلیں۔ اُجڑا ہوا آشیانہ بسا۔

پریموتی کے چلے جانے کے بعد برجن اس گھر میں اکیلی رہ گئی تھی۔ صرف مادھوی اس کی انیس و غمخوار تھی۔ اس تنہائی۔ سوزِ جگر اور دردِ دل نے اُس کا وہ ذاتی جوہر کھول دیا جو اب تک چھپا ہوا تھا اور جس نے اُس کے نام کو زندۂ جاوید بنا دیا۔ وہ شعر و سخن میں طبع آزمائی کرنے لگی۔ شاعری سچّے جذبات کی تصویر ہے اور سچّے جذبات خواہ وہ درد کے ہوں یا مسرّت کے اسی وقت دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ جب ہم درد یا مسرّت کا مزا چکھتے ہیں اور جذبات کے پیدا ہونے کے بعد ان کا زبان قلم تک آنا تو ایک آسان بات ہے۔ برجن اِن دنوں رات کی رات بیٹھے بھاشا میں اپنے خیال کے موتی پرویا کرتی۔ اس کا ایک ایک لفظ سوز اور ویراگ کا ایک ایک دفتر ہوتا تھا۔ دوسرے شاعروں کے دِل میں دوستوں کی واہ واہ اور سخن سنجوں کی سبحان اللہ سے ولولے پیدا ہوتے ہیں مگر برجن اپنی داستانِ غم اپنے ہی دل کو سُناتی تھی۔ اس کے بلند خیالوں کی داد دینے شمع خاموش تھی اور سمندِ فکر کو تازیانہ لگانے والی بیکسی۔

سیوتی کو آئے دو تین دن گزرے تھے۔ ایک دن اس نے برجن سے کہا۔"میں تمھیں اکثر کسی گہرے خیال میں ڈوبا ہوا پاتی ہوں اور کچھ لکھتے بھی دیکھتی ہوں۔ مجھ سے نہ بتاؤگی؟" برجن شرما گئی۔ بہانہ کرنے لگی کہ کچھ نہیں۔ یُوں ہی جی کچھ کھویا سا رہتا ہے۔ سیوتی نے کہا میں نہ مانوں گی۔ یہ کہہ کر وہ برجن کا صندوقچہ اُٹھا لائی۔ جس میں شاعری کے آبدار موتی رکھے ہوئے تھے۔ مجبور ہوکر برجن نے اُسے اپنی تازہ نظم سنانی شروع کی منہ سے پہلے مصرعہ کا نکلنا تھا کہ سیوتی کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اور جب تک ساری نظم نہ ختم ہوئی وہ نقشِ حیرت بنی بیٹھی رہی۔ پران ناتھ کی صحبت نے اس میں سخن فہمی کا مادہ پیدا کردیا تھا۔ ہر تازہ مصرعہ سے اس کے گوشۂ جگر میں ایک کسک سی ہوتی تھی۔ اور آنکھیں بھر بھر آتی تھیں۔ جب برجن خاموش ہوئی تو ایک سماں بندھا ہوا تھا۔ جیسے کوئی دلکش نغمہ بند ہوگیا ہو۔ سیوتی نے برجن کو گلے لگا لیا اور دوڑی ہوئی للّو کے پاس گئی جیسے کوئی بچّہ نیا کھلونا پاکر خوشی سے دوڑتا ہوا اپنے ہم جولیوں کو دِکھانے جائے۔ پران ناتھ اپنے آقائے نامدار کو عرضی لکھ رہے تھے کہ میری والدہ سخت بیمار ہوگئیں اس وجہ سے حاضرِ خدمت ہونے میں دیر ہوئی۔ امیدوار ہوں کہ ایک ہفتہ کی اتفاقیہ رخصت عطا فرمائی جاوے۔ سیوتی کو دیکھ کر چٹ اپنی درخواست چُھپا دی اور مسکرائے۔ انسان کیسا مکار ہے۔ اپنے آپ کو بھی دھوکا دینے سے نہیں چوکتا۔

سیوتی۔ ذرا اندر چلو۔ تمھیں برجن کی کبتا سُنواؤں۔ پھڑک اُٹھو گے۔

پران۔ اچھا اب انھیں کبتا کا شوق ہوا ہے۔ ان کی بھاوج بھی تو گایا کرتی تھیں۔"تم تو شیام بڑے بے کھبر ہو۔"

سیوتی۔ ذرا چل کر سنو تو۔ پیچھے ہنسنا۔ مجھے تو اس کی شاعری پر اچنبھا ہو رہا ہے۔

پران۔ چلو ایک خط لکھ کر آتا ہوں۔ ابھی۔

سیوتی۔ اب یہی مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میں آ کے کاغذ نوچ ڈالوں گی۔

سیوتی پران ناتھ کو کشاں کشاں لے آئی۔ وہ ابھی تک یہی سمجھ رہے تھے کہ برجن نے کوئی معمولی بھجن بنایا ہوگا۔ اُسی کو سُنانے کے لیے بے قرار ہو رہی ہوگی مگر جب اندر آکر بیٹھے اور برجن نے شرماتے ہوئے اپنی پُرزور نظم "پریم کی متوالی" پڑھنی شروع کی تو حضرت کی آنکھیں کُھل گئیں۔ نظم کیا تھی دردِ دل کا ایک دریا اور رازِ اُلفت کا ایک دفتر تھی۔ للّو سُنتے تھے اور وجد میں آآکر جُھومتے تھے۔ الفاظ کی ایک ایک نشست پر۔ خیال کی ایک ایک پرواز پر بے اختیار دل سے داد نکلتی تھی۔ انھوں نے بہت سے شاعروں کے کلام دیکھے تھے۔ مگر یہ بلندپروازی۔ یہ تازگی یہ جذبہ کہیں نظر نہ آیا تھا۔ اس وقت کاسا سماں بندھا ہوا تھا جب طلوعِ آفتاب کے قبل بادِ نسیم لہراتی ہوئی چلتی ہے۔ کلیاں کھلتی ہیں۔ پھُول مہکتے ہیں اور آسمان پر ہلکی سُرخی چھا جاتی ہے۔ ایک ایک شعر میں گلہائے تازہ کی شوخی اور شبنم کی تازگی موجود تھی۔ اُس پر برجن کا سُریلاپن اور آواز کی گرمی نشہ پر بادِ صبا کا کام کر رہی تھی۔ آہ! یہ وہ اشعار تھے جن پر برجن نے دل کو شمع کی طرح جلایا تھا۔ للّو تمسخر کی نیت سے آئے تھے مگر جب وہ اُٹھے ہیں تو واقعی ایسا محسوس ہوتا تھا۔ گویا پہلو سے دِل نکل گیا۔ ایک روز انھوں نے برجن سے کہا۔"تمھارا کلام چھپے تو خوب مقبول ہو" برجن نے سر جھکا کر کہا۔ مجھے یقین نہیں کہ کوئی اس کی قدر کرے گا۔

پران ناتھ۔ایسا ممکن ہی نہیں۔ اگر دلوں میں کچھ بھی احساس باقی ہے تو تمھارے کلام کی ضرور قدر ہوگی۔ اگر ایسے لوگ موجود ہیں جو پھولوں کی مہک سے سرشار ہوجاتے ہیں جو چڑیوں کی چہک اور چاندانی رات کے سُہانے پن کا لُطف اُٹھا سکتے ہیں تو وہ تمھاری کبتا کو ضرور دل میں جگہ دیں گے۔

برجن کے دل میں وہ گدگدی پیدا ہوئی جو ہر ایک مصنف کو اپنے فکر سخن کی داد ملنے اور اپنے کلام کے مقبول و مطبوع ہونے کے خیال سے ہوتی ہے۔ تاہم وہ نہیں نہیں کرتی رہی مگر وہ نہیں ہاں کے برابر تھی۔ الہ آباد سے اُن دِنوں "کملا" نام کا اچھا رسالہ نکلتا تھا۔ پران ناتھ نے "پریم کی متوالی" کو وہاں بھیج دیا۔ ایڈیٹر صاحب ایک نکتہ سنج بزرگ تھے۔ دل کھول کر کلام کی داد دی۔ اور جب یہ متوالی نازنین کملا کے وشوں میں رنگین لباس پہن کر نکلی تو لوگوں نے اُسے دِلوں میں بٹھایا اور آنکھوں میں جگہ دی۔ شاید ہی کسی شاعر کی فکرِ اوّلین کو ایسی قبولیتِ عام نصیب ہوئی ہو۔ لوگ پڑھتے اور حیرت سے ایک دوسرے کا مُنہ تکتے۔ سخن فہم حلقوں میں ہفتوں تک متوالی نازنین کے چرچے رہے۔ کسی کو یقین ہی نہ آتا۔ کہ یہ ایک گُم نام شاعرہ کا کلام ہے۔ فیصلہ یہی تھا کہ اس شاعر کو الہام ہوگیا ہے۔

اب ماہ بہ ماہ کملا کے صفحے برجن کے کلام سے مزیّن ہونے لگے اور "بھارت مہلا" کو پسندِ عام نے شاعری کے مسندِ اعزاز پر جا بٹھایا۔ "بھارت مہلا" کا نام بچّہ بچّہ کی زبان پر چڑھ گیا۔ کوئی اخبار یا رسالہ ایسا نہ تھا جو "بھارت مہلا" کے کلام سے اپنے تئیں نہ سنوارتا ہو۔ اخبار کھولتے ہی ناظرین کی آنکھیں "بھارت مہلا" کو ڈھونڈھنے لگتیں۔ ہاں اُس کی آتش بیانیاں اب کسی کو حیرت میں نہ ڈالتیں۔ اُس نے خود شاعری کا معیار اُونچا کر دیا تھا۔ قلمرو سخن کی رانی کے لیے کمالِ شاعری خواہ وہ کتنا ہی اعلیٰ کیوں نہ ہو ایک لازمی امر تھا نہ کہ قابلِ حیرت۔

تین سال تک کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ کہ "بھارت مہلا" کون ہے۔ آخر پران ناتھ سے نہ رہا گیا۔ برجن سے انھیں سخن فہمانہ عقیدت ہوگئی تھی اور وہ مہینوں سے اُس کے حالاتِ زندگی لکھنے کی فکر میں پریشان تھے۔ سیوتی کے ذریعہ سے رفتہ رفتہ اُس کے سوانح زندگی سب دریافت کرلیے اور "بھارت مہلا" کے عنوان سے ایک پُرزور مضمون لکھا۔ پران ناتھ نے پہلے کبھی کوئی مضمون نہ لکھا تھا۔ مگر فرطِ عقیدت نے ان کے قلم کو تیز اور فصیح بنا دیا تھا۔ عبارت اول سے آخیر تک چست اور خیالات پاکیزہ تھے۔

اس مضمون کا شائع ہونا تھا کہ برجن کو ہرچہار طرف سے قدردانی کے نذرانے ملنے لگے رادھا چرن مُراد آباد سے اُس کی ملاقات کو آئے۔ کملا۔ اماديئی۔ سیتا۔ چندر کنور اور

کتنی ہی پُرانی سکھیاں جنھوں نے یاد بُھلا دی تھی۔ ہر روز برجن کے درشنوں کو آنے لگیں۔ بڑے بڑے صاحبِ نظر رؤسا جو خود داری کے شان میں حکام کے روبرو بھی سر نہ جھکاتے تھے۔ برجن کے دروازہ کی زیارت کو آتے تھے۔ چندرا خود تو نہ آسکی مگر خط میں لکھا جی چاہتا ہے کہ تمھارے پیروں پر سر رکھ کر گھنٹوں روؤں۔ برجن کے دروازہ پر ہر دم ایک میلہ سا لگا رہتا تھا۔

امتحان

منشی سنجیون لال اور پرتاپ چند جوں ہی سوامی برھمانند جی کے روبرو پہنچے کہ اُنھوں نے چونک کر دیکھا۔ اُن کی بڑی بڑی آنکھیں نور حقیقت سے ایسی لبریز تھیں جیسے گیان سرووَر آبِ مصفا سے۔ دونوں نوواردوں نے اُن کے قدم آنکھوں سے لگائے۔ سوامی جی نے اُنھیں اُٹھا کر چھاتی سے لگا لیا۔ اور منشی جی سے دیر تک سفر کی کیفیتیں پوچھتے رہے۔ بعد ازاں مسکراکر پرتاپ کی طرف دیکھا اور فرطِ شفقت سے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ ''تھک تو نہیں گئے۔''

پرتاپ چند کچھ جواب نہ دے سکا۔ اُسے اس وقت وہ سرورِ قلب ہو رہا تھا۔ جس کا مزہ دل لیتا ہے مگر زبان نہیں کہہ سکتی۔ جس وقت وہ سوامی جی کے سینہ سے لپٹا ہے اسے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پریم کے دریائے بے پایاں میں غوطہ لگا رہا ہوں۔ اس کا دل اور دماغ خود بخود کسی پُرزور کشش سے کھنچا ہوا چلا جاتا تھا۔ جیسے کوئی کشتی لہروں کی زد میں لنگر تڑا کر بہہ جاتی ہے۔ وہ کیفیت اُس کی ہو رہی تھی۔ کلیجہ تھا کہ اُمڈا چلا آتا تھا۔ اُسے حیرت ہوتی تھی کہ میری یہ حالت کیوں ہوئی جاتی ہے۔ حُسن و عشق کی کشش کا اُسے کچھ تجربہ ہوچکا تھا مگر اس وقت محبت کا جو پُرسرور غلبہ اُس کی روح پر ہو رہا تھا۔ وہ خیال اور فکر اور تمیز کے انداز سے باہر تھا۔

مگر یہ کیفیت صرف پرتاپ ہی کی نہ تھی۔ منشی جی حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ سوامی برھمانند جی کی پُرنور آنکھیں بھی آپ گوں ہوگئی ہیں اور اُن کے روشن چہرہ پر جو سُرور اور عافیت کی تصویر تھا پریشانی کے آثار نمایاں ہیں۔ یہ کیوں؟ کیا کشتی نے دریا میں ہلچل ڈال دی اور دریا بھی وہ جس کی تھاہ نہیں۔ ایسا تو کہیں ہوتے نہیں دیکھا۔

دوسرے دن سوامی جی نے بالکرام کو ویدوں کی تلقین کرنی شروع کی۔ ایسے عارفِ کامل کے رُوبرو زانوئے ارادت تہ کرنا وہ موقع تھا۔ جس پر فرشتے بھی ناز کریں تو بجا ہے۔ جس وقت وہ زبان مُبارک سے اپنے دل ربا لہجہ میں وید کے رچاؤں کی تشریح کرنے لگتے تو ہوا کی چڑیاں اور کوہ و بیابان کے جانور یوں آکر جمع ہوتے گویا کسی نے اُن پر جادُو کردیا

ہے۔ درختوں کا جھومنا بند ہوجاتا۔ مان سروور کی لہریں تھم جاتیں۔ ساری فطرت پر ایک مدہوشی کا عالم چھا جاتا۔ کلام پاک کے یہ ادنیٰ کرشمے ہیں۔ سوامی جی کے خیالات کیلاش کی چوٹیوں سے بھی زیادہ بلند اور گیان سروور کی سطح بلوریں سے بھی زیادہ روشن تھے۔ حقائق معرفت پر جب تقریر فرماتے تو معنی کا دریا بہا دیتے۔ ادب اور فلسفہ کے بادشاہ۔ مبارک تھیں وہ راتیں جب سوامی جی ایک مرگ چھالے پر مان سروور کے لبِ آب لیٹتے اور ویاس اور والمیک کے پاکیزہ خیالات کی داد دیتے۔ حیرت تو یہ تھی کہ اس کنجِ عافیت میں بھی سوامی جی علم اور تہذیب کی تازہ ترین رفتار سے آگاہ تھے اور اکثر جدید علمی انکشافات اور نظری تحقیقات پر ایسے پُروزن خیالات کا اظہار کرتے کہ پرتاپ دنگ رہ جاتا۔ اِس کُٹی کے آستانے پر دُنیا کے کتنے ہی علماء و فضلا نے جبہہ سائی کی تھی اور کتنے ہی سیاح و مدبّر۔ فلسفی اور شاعر ہر سال اس مقام کی زیارت کو آیا کرتے تھے۔ یورپ کے مصالح ملکی کی کتنی گتھیاں اسی گیان سروور کے کنارے سلجھائی گئی تھیں اور تاریخ و فلسفہ کے کتنے ہی عقدے یہاں حل ہوئے تھے۔ پرتاپ چند کو یہاں یورپ کے بعض نامور علماء سے ملنے کا اتفاق ہوا اور بہت سی ایسی تصنیفیں دیکھنے میں آئیں جو الہ آباد کے کُتب خانوں میں بھی نظر نہ آئی تھیں۔ یہ اُن زائرین کی یادگاریں تھیں جو وقتاً فوقتاً یہاں آئے تھے اور جب کبھی دُنیا کے کسی حصہ میں کسی صیغۂ علم پر کوئی معرکے کی کتاب لکھی جاتی تو خود مصنف یا سوامی جی کا کوئی معتقد اسے ضرور یہاں بھیج دیا کرتا۔ ایک بادشاہ تھا کہ اپنے تخت پر بیٹھا ہوا دوردراز کے ممالک سے علم و تحقیقات کے خراج لیا کرتا تھا۔ مادی سلطنت ایک محدود شے ہے مگر روحانی سلطنت دُنیا سے بھی زیادہ وسیع اور وسعت سے بھی زیادہ فراخ ہے۔ تختِ زرنگار کی فقیری بوریے کے سامنے کوئی ہستی نہیں۔ پرتاپ چند نے اپنی عقل و ذہن کا دامن اس علم و ہنر کے کان سے خوب آزادی کے ساتھ بھرا اور یورپ کے کئی زبانوں کا بھی ماہر ہوگیا۔

پانچ سال گزر گئے۔ گرمی کے دن تھے۔ کوہ اور دریا نے گرمی سے تنگ آکر اپنے سفید لباس اُتارنے شروع کیے تھے۔ آسمان کا نیلاپن آنکھوں میں کھپا جاتا تھا۔ چاروں طرف دل فریب ہریالی پھیلی ہوئی تھی۔ ایک روز پرتاپ چند گیان سروور کے کنارے یوگ سادھن میں مصروف تھا کہ سوامی جی نے منشی بجیون لال سے کہا۔

"میرے خیال میں بالا جی کو اب یہاں زیادہ ٹھہرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں کئی دن سے سوچ رہا ہوں کہ انھیں رخصت کردوں مگر اُن سے کچھ ایسی محبت ہوگئی ہے کہ جدائی کا خیال شاق گزرتا ہے۔ آپ کو میری اس کمزوری پر تعجب ہوتا ہوگا مگر میں آج آپ سے کہتا ہوں کہ پرتاپ چند میرا بیٹا ہے۔"

سجیون لال۔ (حیرت سے) ایں۔

سوامی جی۔ اسی خیال سے آپ میری کمزوری معافی کے قابل سمجھیں۔ پہلے ہی جب میری نگاہ اس کے چہرہ پر پڑی تو پُرانی محبت تازہ ہوگئی۔ اور میں ضبط و استقلال سے کام نہ لیتا تو یقین تھا کہ آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے اور راز افشا ہوجاتا۔ آج پورے بیس سال گزرے جب میں نے دُنیا سے مُنہ موڑا اس وقت کی تصویر آج بھی میری نگاہوں میں کھنچی ہوئی ہے۔ جب میں شام کے وقت سُباما سے رُخصت ہوا ہوں پرتاپ چھ سالوں کا بھی نہ ہوا تھا۔ وہ بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ میں نے اُس کی طرف آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا اور ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگیا مگر پرماتما کے سوا اور کون جان سکتا ہے کہ اسے اپنے خیال سے دُور رکھنے کے لیے میں نے کتنے ضبط اور ترک سے کام لیا۔ برسوں تک ہر دم اُس کی موہنی صورت آنکھوں کے سامنے پھرتی رہتی تھی۔ بارے ایشور کی دیا سے میں نفس پر غالب ہوا اور اٹھارہ برسوں تک پرتاپ ایک لمحہ کے لیے بھی میرے دھیان میں نہیں آیا۔ مگر جوں ہی آپ کے ساتھ اُسے دیکھا پُرانی یاد تازہ ہوگئی۔ مجھے اپنے ویراگ پر گھمنڈ تھا۔ میرا خیال تھا کہ اب مایا کا میرے دل میں گزر نہیں ہوسکتا مگر بالا جی نے میرا یہ غرور چور چور کرڈالا۔ میں اتنے دنوں کے یوگ سادھن کے بعد بھی آج ایک کمزور انسان ہوں۔ یہ تعلق محض جسمانی نہیں بلکہ روحانی ہوتا ہے اور یوگ تپ۔ ویراگ کوئی بھی اس تعلق کو نہیں توڑسکتا۔

سجیون لال۔ مہاراج! آپ نے جو کچھ کر دکھایا وہ بھی معجزے سے کم نہیں۔ سُباما جیسی دیوی۔ پرتاپ جیسا بیٹا ہر شخص نہیں تیاگ سکتا۔

سوامی جی۔ مِتر یہ سب ایشور کی رچنا تھی مجھے شروع ہی سے اپنے بھائیوں کی بھلائی کا خیال پیدا ہوگیا تھا اور جو کچھ میرے کیے ہوسکتا تھا اُس سے اُن کی خدمت کرتا رہتا تھا

مگر یہ دلی آرزو تھی کہ ایشور میرے گھر میں کوئی قوم کا فدائی پیدا کرتا۔ ایشور سے ہمیشہ یہی پرارتھنا کیا کرتا۔ آخر لکشمی جی نے سُباما کو درشن دیا اور سُباما نے مہارانی سے مُنہ مانگا بردان پایا۔ اسی راْت کو مجھے بھی ویراگ کا سندیسہ ملا۔

سجیون لال۔ ایشور کی لیلا اپار ہے۔ اگر مہاراج ویراگ نہ پاتے تو بالاجی آج کِس کی سرن لیتے۔

سوامی جی۔ بالا جی ابھی تہ پر نہیں پہنچے ہیں اور نہ میں اُنھیں جتانا مناسب سمجھتا ہوں ورنہ وہ یہاں سے جانا ہرگز منظور نہ کریں گے۔ دیکھیے اس تھوڑی سی مُدّت میں اُنھوں نے کیسا حیرت انگیز کام کیا ہے۔ اس سِن میں ایسا ضبط اور یوگ میں نہیں دیکھا۔ مجھے فخر ہے کہ میں ایسے بیٹے کا باپ ہوں۔

سجیون لال۔ پچھلے دنوں کونٹ پنڈا شام سے اُنھوں نے راج نیت پر جو مباحثہ کیا اُسے سن کر میں حیرت میں آگیا۔

سوامی جی۔ یہ کونٹ علماء میں سر آمد روزگار سمجھے جاتے ہیں۔

سجیون لال۔ مجھے لنکا میں ایک بار ان سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔

سوامی جی۔ خیر علم تو ایک ایسی چیز ہے جو شوق و شغف سے روزبروز ترقی پاسکتی ہے مگر اس وقت بالاجی کو ہمیشہ کے لیے رخصت کرنے سے پہلے میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کی اِن کے دل میں کمزوری تو نہیں باقی ہے۔ مجھے تجربہ ہے کہ بعض آدمی مُدّت تک ویراگ میں رہنے کے بعد یکایک ناگفتہ بہ کمزوریاں کر بیٹھتے ہیں۔ خصوصاً اس ویراگی کے لیے جو دُنیا میں رہ کر اُس سے الگ رہنے کا حوصلہ رکھتا ہو انتہا درجہ کے مضبوط دل کی ضرورت ہے ہم اور اپ اس کنج خلوت میں بیٹھے ہوئے دنیا کی گمراہیوں اور لغزشوں سے بچے رہ سکتے ہیں مگر پانی پر کنول بن جانا اس سے بدرجہا مشکل بات ہے۔

سجیون لال۔ مجھے یقین کامل ہے کہ کوئی دُنیاوی طاقت بالاجی کو فرض اور حق کے راستہ سے نہیں پھیر سکتی۔

سوامی جی۔ خیال تو میرا بھی ایسا ہی ہے مگر یقین جب ہی ہوسکتا ہے جب ایک بار اُنھیں آزما لوں۔ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ اُن کا یہ ضبط اور ترک ارادی ہے یا طبیعت

ثانی۔ قوم کی خدمت پہلے تو ایک تپسیا معلوم ہوتی ہے مگر دنوں کے ساتھ ناخدائے قوم کا ظاہری اعزاز و اقتدار بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ اُس کے روبرو بادشاہوں کی گردنیں بھی جھکنے لگتی ہیں اور کبھی کبھی ایسا ہوا ہے کہ جو آنکھیں شمشیر برہنہ کے سامنے کبھی نہیں جھپکیں وہ مے گلفام کے ایک پیالہ سے سرشار ہوگئی ہیں اور جو دل سختیوں اور آفتوں کے طوفان سے بھی نہیں ڈرے وہ مدارات و عنایات کی خوشگوار تھپکیوں میں نہ سنبھل سکے۔

سجیون لال۔اس کا امتحان کیوں کر ہوگا؟

سوامی جی۔ہم اور آپ مل کر بالاجی کے نفس پر زور ڈالیں گے۔ آپ کو اس لیے شریک کرنا چاہتا ہوں کہ میں تنہا غالباً اُن کی آتما پر کچھ اثر نہ پہنچا سکوں گا۔ اُن کی یوگ شکتی اِن دنون بہت بڑھی ہوئی ہے۔

پرتاپ چند گیان سروور کے کنارے اپنے خیال میں مگن بیٹھا ہوا تھا کہ اُسے کچھ غنودگی سی معلوم ہوئی اور جمائیاں آنے لگیں مگر اس نے چونک کر آنکھیں ملیں اور اپنے خیالوں میں غرق ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس پر پھر غنودگی کا غلبہ ہوا اور آنکھیں جھپکنے لگیں۔ جیسے کوئی رات بھر کا جاگا ہوا آدمی صبح کے وقت نیند سے متوالا ہوجائے۔ پرتاپ کو تعجب ہوا کہ آج مجھے اتنی نیند کیوں آرہی ہے۔ اُس نے پانی کے چھینٹے مُنہ پر دیے اور دل میں مضبوط ارادہ کرلیا کہ اب نیند کو ہرگز نہ آنے دوں گا۔ لیکن آدھ گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ پھر وہی کیفیت ہوئی۔ آنکھیں خوابِ گراں سے مخمور ہوکر مُندنے لگیں اور انگڑائیوں کے مارے اعضا ٹوٹنے لگے۔ پرتاپ کی سمجھ میں نہ آیا کہ میری یہ حالت کیوں ہو رہی ہے۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور کچھ دیر تک تیزی سے ٹہلتا رہا۔ بعد ازاں اپنی جگہ پر آبیٹھا۔

اسی طرح نیند نے اُس پر چھ ناکام حملے کیے ایک سے ایک پُرزور مگر ساتواں حملہ پرتاپ سے برداشت نہ ہوسکا۔ آنکھیں بند ہوگئیں اور گردن جُھک گئی۔ اُس کی آتما اب کی بار مغلوب ہوگئی۔ مدہوشی کا غلبہ ہوتے ہی پرتاپ چند کو ایسا معلوم ہوا کہ میں کسی پُرفضا باغ میں آگیا ہوں۔ عنبر بیز ہوائیں چل رہی ہیں اور ہر ایک درخت پر خوش رنگ اور شیریں نوا چڑیاں بیٹھی چہک رہی ہیں۔ ہوا میں کچھ ایسی فرحت ہے۔ طیور کی شیریں نوائیوں میں وہ مستانہ پن اور پھُولوں کی مہک میں وہ نشہ کہ دل و دماغ متوالے ہوئے جاتے ہیں۔

بہار اپنی دل فریبیوں کے پُورے سامان لے کر آ پہنچی ہے۔ پرتاپ متحیّر تھا کہ میں اِس جنت کدہ میں کیوں کر آ پہنچا ہوں۔ ابھی تو میں گیان سرووَر کے کنارے بیٹھا ہوا تھا کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ یہ سوچ کر اُس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا اور پختہ یقین کرلیا کہ یہ خواب نہیں ہے۔ ضرور میں بھٹک کر کسی کے باغیچہ میں چلا آیا۔

وہ اِدھر اُدھر روشوں میں ٹہلنے لگا کہ دفعتاً ایک نازنین سایہ دار درختوں کی آڑ سے خراماں خراماں آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس پر حُسن کا رُوپ تھا اور نزاکت کا سنگار۔ وہ روشنی کی ایک تصویر معلوم ہوتی تھی۔ پرتاپ چند کو دیکھتے ہی وہ ٹھٹکی اور چشمِ پُرنم سے دیکھ کر بولی:۔"پرتاپ۔"

پرتاپ چند نے اسے پہچان لیا۔ وہ برج رانی تھی مگر اس آب وگل کی برجن سے بدرجہا حسین۔ متحیر ہوکر بولا۔"برجن! تم یہاں کہاں!"

برج رانی۔ جہاں تم ہو وہاں میں بھی ہوں۔ محبت نے تمھارا پتہ دیا۔ اگر تم مہک بن کر بھی پھُولوں میں سماجاتے تو میں تمھیں ڈھونڈ نکالتی۔ تمھیں شاید معلوم نہیں۔ میں نے دوسرا جنم لیا ہے۔

پرتاپ۔ (حیرت سے) دوسرا جنم۔

برج رانی۔ ہاں اب کی میرا جنم دیو لوک میں ہوا ہے مگر یہاں بھی جب سے ہوش سنبھالا ہے تمھارے بیوگ میں گھُل رہی ہوں۔ یہ میرے باپ کا باغ ہے۔ تمھارا استھان یہاں سے بہت قریب ہے تمھیں معلوم نہیں مگر میں دن میں کئی بار تمھارے درشن کرتی رہی ہوں۔ میرے بھاگ اچھے تھے کہ اس لوک میں جنم ہوا۔ ایشور نے شاید میری آرزوئیں پُوری کرنے کے لیے مجھے تمھارے پہلو میں بھیجا ہے۔

پرتاپ۔ برجن! ایسی باتیں زبان سے نہ نکالو! کیا تم کو نہیں معلوم کہ میرا تم سے ہمیشہ پاک تعلق رہا ہے۔

برج رانی۔ پیارے۔ اِن خیالوں سے میرے ابھاگے دل کو تسکین نہیں ہوتی۔ پریم کی آگ نے اس سب خیالات کو جلا کر خاک کردیا ہے میں نے خیال کیا تھا کہ تم نظروں سے دُور ہوجاؤ گے۔ تو دل تمھیں بُھلا دے گا۔ میں نے دل کو بہت سمجھایا۔ مدتوں تک شعر و سخن سے جی بہلاتی رہی۔ تم آج بھی لوگوں کو میرے کلام کا مداح

پاؤں گے میں نے شہرت اور عزت اور دولت سب پائی اور سب سے جی سیر ہوگیا مگر تمھاری محبت کا نقش دل سے نہ مٹا۔ دوسرا جنم لے کر بھی اسی آرزو میں گھلتی رہی۔ میں برسوں سے یہی سوچ رہی ہوں کہ تمھیں اپنی داستانِ غم سناؤں یا نہ سناؤں۔ کبھی یہ خیال ہوتا تھا کہ اگر محبت میں رُوحانی طاقت ہے تو ہم اور تم ضرور ملیں گے۔ کبھی سوچتی کہ تم مجھے بھول گئے ہوگے مگر دل کو کسی طرح نہ سمجھا سکی۔ آج مجبور ہوکر میں نے شرم و حیا کو طاق پر رکھا اور تمھارے سامنے کھڑی ہوں۔ تم میرے لیے جو فیصلہ مناسب سمجھو وہ کرو۔ میں تمھاری ہوں۔ خواہ مجھے اپنے پہلو میں جگہ دو خواہ خیال میں بھی نہ لاؤ۔ میں تمھاری سیوا میں رہ کر تمھارے ساتھ سب کچھ سہنے کے لیے تیار ہوں۔ میرے پتا اس لوک کے راجا ہیں۔ میرے سِوا اُن کے کوئی اولاد نہیں مگر میں سب تیاگ دوں گی۔ میں تمھارے ساتھ فاقے کروں گی۔ کنویں سے پانی کھینچوں گی......"

یہ کہتے کہتے برجن کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں اور گلا روندھ گیا۔

پرتاپ چند عجیب مخمصے میں مبتلا تھا۔ برجن نے اُس کی محبت کا راگ گایا تھا اور یہ راگ سُن کر ایسا کون مرد ہے جو مدہوش نہ ہوجائے وہ ذرا دیر کے لیے بالکل بے کیف ہوگیا۔ سوچنے لگا آہ! کیسی سچّی محبت ہے۔ کیسی غیر فانی۔ کیسی پاکیزہ۔ کیسی بے غرض! برجن تو سچ مچ دیوی ہے۔ تب انسانوں کی دیوی تھی۔ اب دیوتاؤں کی دیوی ہے تو میرے لیے یہ بہشت اور یہ دولت اور یہ سکھ تیاگ دے گی! میں کیسے تیری اس محبت کو داد دوں۔ میں تجھے کیسے بتلا دوں کہ میں ان قربانیوں کے لائق نہیں ہوں۔

پرتاپ چند اِنھیں خیالات میں ڈوبا ہوا تھا اتنے میں برجن نے نزاکت سے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔"پیارے میں نے تم پر فیصلہ چھوڑ دیا مگر دل کانپ رہا ہے کہ کہیں بے انصافی نہ کر بیٹھو (ہاتھ جوڑ کر) ایسا نہ کرنا! نہیں تو تمھاری برجن مرجائے گی۔ میں تم سے کچھ نہیں مانگتی۔ میں تم سے محبت نہیں مانگتی۔ میں تمھارا دل نہیں مانگتی۔ میں تم سے صرف تمھارے ساتھ رہنے کی۔ تمھاری خدمت کرنے کی اجازت چاہتی ہوں اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں مانگتی۔ تمھارا دل میرے مان کا نہیں۔ اُسے لینے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ میری محبت پُرغرض ہے۔ حُسن و شباب چند روزہ۔ دولت فانی۔ تمھاری محبت غیر محدود ہے ......"

پرتاپ چند کی جی میں آیا کہ اس دیوی کے قدموں پر سر رکھ دوں وہ کچھ جواب نہ دے سکا۔ برجن کی روحانی عظمت نے اُسے بالکل پست کردیا۔ قریب تھا کہ وہ اس خودفراموشی کے عالم میں اپنا برت بُھول جائے۔ کہ یکایک سوامی برھما نند جی کا یہ قول اُسے یاد آگیا۔

"ہر نیک اور اعلیٰ کام کے راستے میں بڑے بڑے سخت امتحانات کا سامنا ہوتا ہے۔ وہی پُورا مرد جو اِن امتحانات سے بے داغ نکل جائے۔ بسا اوقات یہ امتحانات رنگ و روپ بدل کر آتے ہیں اس وقت ان سے مقابلہ کرنا اور بھی دشوار ہوجاتا ہے۔" اس قول کے یاد آتے ہی پرتاپ کا خیال کہیں سے کہیں جا پہنچا۔ ضرور میں اس وقت امتحان میں پڑا ہوا ہوں۔ وہی طاقت جو مجھے یوں پرکھ رہی ہے برجن کی زبان و دل پر بھی اپنا جادو چلا رہی ہے۔ یہ خیال کرتے ہوئے اُس نے جواب دیا۔"برجن۔ مجھ میں یہ بیان کرنے کی طاقت نہیں کہ اس وقت تم سے مل کر طبیعت کیسی خوش ہوئی مجھے فخر ہے کہ تم جیسی پاکیزہ اوصاف دیوی مجھ سے محبت رکھتی ہے۔ اس محبت کے مقابلہ میں میری ہستی کی کچھ وقعت نہیں۔ کاش میں اس قابل ہوتا کہ اس اتھاہ پریم کی کچھ قدر کرسکتا۔ مجھ جیسا مٹی کا انسان تمھارے لائق نہیں۔ میں تمھاری پرستش کرسکتا ہوں مگر محبت نہیں۔ میں تمھارے قدموں کی خاک پیشانی پر مل سکتا ہوں مگر تمھاری پاکیزہ محبت کو اپنی بشریت سے آلود نہیں کرسکتا۔"

برج رانی کی آنکھوں سے آنسو کا دریا بہہ نکلا ذرا دیر کے بعد بولی۔"تمھارا فیصلہ مجھے بہ سرو چشم منظور ہے۔ ایشور تمھیں سرسبز کرے۔ یہی میری دعا ہے۔ میرے لیے یہی خوشی کافی ہے کہ میری عزّت اور محبت تمھارے دل میں موجود ہے۔ پرتاپ یقین مانو میں صدق دل سے اپنی خودغرضی پر نادم ہوں۔ محبت انسان کو خود غرض بنا دیتی ہے۔ یہ اس کا تقاضا ہے۔ حالانکہ میں تمھاری محبت کی طالب نہ تھی۔ میری یہ خواہش نہ تھی کہ تمھاری محبت سے بہارِ زندگی لوٹوں۔ خیر نوشتہ تقدیر سے کیا چارہ! میری آخری التجا یہ ہے کہ اب میری یاد اپنے دل سے نکال ڈالنا۔ ایسا نہ ہو کہ کسی وقت میری یاد تمھیں ستائے اور رُلائے۔ ہائے! تم رو رہے ہو۔ پیارے روؤ مت۔ ایشور کے لیے اپنے اوپر ایسا ظلم نہ کرو ورنہ پرتاپ پچھتاؤ گے۔ تمھیں تجربہ ہوجائے گا کہ قوم کی خدمت اور قوم کی محبت دل

کے لیے کافی غذا نہیں ہے۔ تمھیں سب کچھ ملے گا مگر برجن نہ ملے گی۔ مجھے پرماتما نے تمھارے لیے پیدا کیا ہے اسے کیا جواب دو گے؟"

پرتاپ نے روتے ہوئے جواب دیا۔"برجن میری پرتگیا مت توڑو۔ تمھارے روبرو یوں کھڑا رہ کر میں اپنے برت پر قائم نہیں رہ سکتا۔ مجھے اب رخصت کرو۔ میں جب تک زندہ رہوں گا تمھاری پرستش کرتا رہوں گا۔ تمھاری یاد میرے دل سے نہیں نکل سکتی۔"

یہ کہتے کہتے وفورِ اشک سے اُس کی زبان بند ہوگئی۔ جب گھی خوب کھول جاتا ہے تو اُس کا بولنا بند ہوجاتا ہے برجن نے سر جُھکاکر اسے پرنام کیا اور نظروں سے غائب ہوگئی۔

شام کا وقت تھا۔ ہماچل سر پر سنہرا تاج رکھے کھڑا تھا۔ چڑیاں بسیرا لے رہی تھیں آسمان پر سے دو ایک شوخ نظر تارے گھورنے لگے تھے۔ پرتاب چند نے دیکھا کہ برجن گیان سروور کے نیلگوں پانی میں کھڑی ہے۔ گویا جل دیوی اپنے سنگھاسن پر رونق افروز ہے اور ایسی آواز سے جس میں کوئل کی کوک، پپیہے کی ہوک اور شیاما کی چہک مِلی ہوئی ہے یہ دل سوز نغمہ الاپ رہی ہے۔

بن ہری کیوں راکھیں من دھیر

گھر آنگن نہ سُہات رین دین۔ بسرے بھوجن نیر

بن ہری کیوں راکھیں من دھیر

مچھلیاں روتی تھیں اور پیڑ پتے سر دُھنتے تھے۔ برجن کمر تک پانی میں چلی گئی اور پھر یہ آواز آئی۔

پُن پُن وہی سُرت آوت چت چتوت جمنا تیر

بن ہری کیوں راکھیں من دھیر

برجن نے پرتاپ چند کی طرف دیکھ کر ہاتھ جوڑے پھر گلے تک پانی میں چلی گئی۔ ایک کمل کِھل گیا۔ اور یہ آواز آئی۔

مت اُپجس آس ہو سر اپنے ۔ کٹھن مدن کی پیر

بن ہری کیوں راکھیں من دھیر

چند تارے کان لگائے سُن رہے تھے۔ آسمان کی سُرخی مِٹ چکی تھی برجن نے پرتاپ چند کو پرنام کیا اور پانی میں غوطہ لگایا۔ پُورنماشی کا چاند دیکھتے دیکھتے ڈوب گیا۔ پرتاپ دوڑا پیر لڑکھڑائے اور بے ہوش ہوکر زمین پر گِرپڑا۔

گنگا جمنا کا مِلاپ

ہمارے ناظرین مادھوی کے نام سے غیرمانوس نہ ہوں گے جس طرح ایک سنگ ریزہ کسی پُرفن کاریگر کے ہاتھوں میں موتیوں کے تول بکنے کے قابل ہوجاتا ہے۔ اسی طرح برج رانی نے مادھوی کو سکھا پڑھا کر اپنے ہی سا بنا لیا تھا۔ اُس کی خلقی نیک مزاجی اور شرافت کی دو ایک مثالیں برجن کے اُن خطوط میں ملتی ہیں جو اُس نے مجگاؤں سے کملاچرن مرحوم کے نام لکھے تھے۔ کبھی کبھی جنگلی پھولوں میں وہ بُوباس اور رنگ روپ مل جاتا ہے جو بجی ہوئی روشوں اور مرصّع کیاریوں کو کبھی میسّر نہیں ہوسکتا۔ مادھوی تھی تو ایک غریب جاہل برہمن کی لڑکی مگر فطرت نے اُسے جنس حسنہ کے کل پاکیزہ اوصاف عطا کیے تھے اور اس میں تعلیم اور تربیت قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کردی تھی۔ مادھوی اور برجن کا ملاپ اُس وقت ہوا جب برجن سُسرال آئی۔ اس بھولی بھالی لڑکی نے اُسی وقت سے برجن کے ساتھ غیرمعمولی محبت ظاہر کرنا شروع کی۔ معلوم نہیں اُسے دیوی سمجھتی تھی یا کیا مگر کبھی اس نے برجن کے مرضی کے خلاف ایک لفظ بھی مُنہ سے نہیں نکالا۔ برجن بھی اُسے اپنے ساتھ سُلاتی، کھلاتی اور اچھے اچھے ریشمی کپڑے پہناتی۔ اس سے زیادہ محبت وہ اپنی چھوٹی بہن کو بھی نہیں کرسکتی تھی۔

دل کو دل سے لگاؤ ہوتا ہے۔ برجن کو سسرال میں آنے کے بہت پہلے ہی معلوم ہوگیا تھا کہ میں ہی پرتاپ چند کے خوابوں کی پری ہوں۔ اُس کی ایک ایک نظر میں ایک ایک بات میں وہ اپنی محبت کی جھلک دیکھتی اور افسوس کرتی۔ ایک روز جب کہ وہ کملاچرن کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی اُسے یہ خیال کرکے رونا آیا تھا کہ میری تو یوں لطف سے گزرتی ہے اور بے چارے پرتاپ کے دل میں نہ جانے کیا بیت رہی ہوگی۔ مادھوی اس وقت گیارھویں سال میں تھی اور اُس کے رنگ و رُوپ کا نِکھار۔ سلیقہ گفتگو اور گُن دیکھ دیکھ کر سب کو حیرت ہوتی تھی۔ برجن کو معا خیال آیا کیا میری مادھوی اس قابل نہیں کہ پرتاپ اسے اپنے گلے کا ہار بنائیں۔ اُس دن سے وہ مادھوی کو تربیت اور خاطرداری میں اور بھی زیادہ منہمک ہوگئی۔ وہ سوچ سوچ کر دل میں پھولی نہ سماتی کہ جب بینا سولہ سترہ سال کی

ہوجائے گی اُس وقت میں پرتاپ کے پاس جاؤں گی اور اُس سے ہاتھ جوڑ کر کہوں گی کہ مادھوی میری بہن ہے اُسے آج سے تم اپنی چیری سمجھو۔ کیا پرتاپ میری بات ٹال دیں گے؟ نہیں ایسا وہ نہیں کرسکتے مزہ تو جب ہے کہ خود مادھوی کو چچی اپنی بنانے کی مجھ سے استدعا کریں۔ اسی خیال سے برجن نے پرتاپ چند کے اوصافِ حمیدہ کا نقش مادھوی کے دل میں جمانا شروع کردیا تھا تاکہ اس کا رویاں رویاں پرتاپ کی محبت میں سرشار ہوجاوے۔ وہ جب پرتاپ چند کا بکھان کرنے لگتی تو خودبخود اُس کے الفاظ غیر معمولی طور پر شیریں اور فصیح ہوجاتے۔ رفتہ رفتہ مادھوی کا بچہ دل چاشنیٔ اُلفت کے مزے لینے گا۔ آئینہ میں بال پڑ گیا۔

بھولی مادھوی سوچنے لگی میں کیسی خوش قسمت ہوں۔ مجھے ایسا سوامی ملے گا جس کے پیر دھونے کے لائق بھی میں نہیں ہوں۔ مگر کیا وہ مجھے اپنی چیری بنائیں گے۔ کچھ ہو میں ضرور اُن کی رانی بنوں گی اور پریم میں کچھ کھچاؤ ہے تو میں انھیں ضرور اپنا لوں گی۔ مگر اس غریب کو کیا معلوم تھا کہ یہ آرزوئیں حسرت بن کر آنکھوں کے راستہ بہہ جائیں گی۔ اُس کا پندرھواں سال پورا بھی نہ ہوا تھا کہ برجن پر خانہ تباہی کے صدمے آپڑے۔ اس طُوفان کے جھونکے نے مادھوی کی اس خیالی پھلواڑی کا ستیاناس کردیا۔ اسی اثنا میں پرتاپ چند کے لاپتہ ہونے کی خبر ملی۔ طُوفان نے جو کسر رکھ چھوڑی تھی وہ اس آگ نے جلا کر راکھ کردی۔

مگر خیال کوئی چیز ہے تو مادھوی پرتاپ چند کی بیوی بن چکی اس نے اپنا تن اور من انھیں سونپ دیا۔ پرتاپ کو خبر نہیں مگر آج اُسے ایسے بیش بہا چیز ملی ہے جس کے مقابلہ میں دُنیا کی کوئی چیز نہیں ٹھہر سکتی۔ مادھوی نے صرف ایک بار پرتاپ کو دیکھا تھا اور صرف ایک بار اُس کی امرت کی سی باتیں سُنیں تھیں مگر برجن کی شیریں بیانیوں نے اُس کے سینہ میں آگ کی وہ چنگاری ڈال دی تھی جو رُوئی کے تودے میں گھُس کر اسے جلا کر خاکستر کردیتی ہے۔ پرتاپ کا پتہ نہیں ہے مگر مادھوی اُس کی پُرسوز محبت میں روز بروز گھلتی جاتی ہے اس دن سے کوئی ایسا برت نہیں تھا جو مادھوی نہ رکھتی ہو کوئی ایسا دیوتا نہیں تھا جس کی وہ پُوجا نہ کرتی ہو اور یہ سب اس لیے کہ پرتاپ چند کو ایشور جہاں کہیں بھی ہو خیریت سے رکھے۔ ان خیالات نے اس لڑکی کو اور بھی زیاد متین۔ نیک مزاج اور

شریف بنا دیا۔ شاید اُس کے دل نے فیصلہ کرلیا تھا کہ میرا بیاہ پرتاپ چند سے ہوچکا۔ برجن اُس کی یہ حالت دیکھتی اور روتی کہ یہ آگ میری ہی لگائی ہوئی ہے۔ اب یہ گُلِ نورس کِس کے گلے کا ہار بنے گا۔ وہ کس کی ہوکر رہے گی ہائے! جس بیج کو میں نے اتنی محنتوں سے اگایا اور شہد اور دودھ سے سینچا۔ اُس کا پھول اس طرح شاخ پر کملایا جاتا ہے! برجن تو خیر شعرو سخن میں اُلجھی رہتی۔ یہی باغیچہ اُس کا ہمدم اور پودے اس کے مونس تھے مگر مادھوی کو یہ مشغلہ کہاں۔ اُس کا مونس اور ہمدم صرف خیالِ یار تھا۔ اُس کا یار جو اب تک اُس کے لیے بیگانۂ محض تھا۔ ایک روز پرتاپ کے چلے جانے کے بعد مادھوی نے خواب دیکھا کہ وہ سنیاسی ہوگیا ہے۔ آج مادھوی کا اتھاہ پریم ظاہر ہوا۔ اُسے الہام سا ہوگیا کہ پرتاب نے ضرور سنیاس لے لیا۔ آج سے وہ بھی تپسونی بن گئی۔ ذاتی آرام و آسائش کا خیال دل سے جاتا رہا۔

جب کبھی بیٹھے بیٹھے مادھوی کا جی بہت گھبراتا تو وہ پرتاپ چند کے گھر جا بیٹھتی وہاں اُس کے دل کو ذرا دیر کے لیے تسکین ہوجاتی تھی۔ جب سے سُباما کو برجن کے خطوط کا بیاض ملا تھا۔ اُس کی زندگی نے عجیب روش اختیار کرلی تھی غرورِ حُسنہ اُس کے اوصاف کا رُکن خاص تھا۔ اس نے پیشانی پر بل تک نہ آنے دیا تھا۔ زبان سے افسوس و ملال کا ایک لفظ بھی نہ نکلنے دیا۔ نہ آنکھوں سے حسرت کے آنسو بہنے پائے۔ حسبِ معمول ٹھیکہ کا کاروبار کرتی رہی بلکہ اب اور بھی مصروفیت و انہماک کے ساتھ۔ ہاں اب بجائے بخیلانہ کفایت شعاری کے مزاج میں فراخدلی آگئی تھی۔ یہ مکان مادھوی کے لیے ایک پاک مندر تھا۔ جب تک برجن اور سُباما کے دلوں میں گانٹھ پڑی ہوئی تھی وہ یہاں بہت کم آتی تھی۔ مگر جب آخرکار برجن کی پاکیزہ شاعری، پاکیزہ خیالات اور پاکیزہ طرزِ زندگی نے دونوں عورتوں کے دِلوں کی گانٹھ کھول دی اور وہ گنگا جمنا کی طرح باہم گلے مِل گئیں۔ تو مادھوی کی آمدو رفت بھی بڑھی۔ سُباما کے پاس دن کے دن بیٹھی رہ جاتی۔ اس گھر کی ایک ایک اُنگل زمین پرتاپ چند کی یادگار تھی۔ اسی آنگن میں بالاجی نے کاٹھ کے گھوڑے دوڑائے تھے اور اسی حوض میں کاغذ کی ناویں چلائی تھیں۔ ناویں تو شاید زمانہ کے بھنور میں پڑکر ڈوب گئیں مگر گھوڑا اب بھی موجود تھا۔ بینا نے اُس کی بوسیدہ ہڈیوں میں جان ڈال دی اور اُور اُسے باغیچہ میں حوض کے کنارے ایک گلاب کے سایہ میں باندھ دیا۔ یہی کمرہ بالاجی کی

آرام گاہ تھا۔ مادھوی اُسے اب اپنے دیوتا کا مندر سمجھتی ہے۔ اِسی پلنگ نے بالاجی کو مدتوں تک اپنے آغوش میں تھپک تھپک کر سلایا تھا۔ مادھوی اب اُسے پھولوں سے سجاتی ہے کیا پلنگ نے ایسے دن بھی کبھی دیکھے تھے۔ مادھوی نے اس کمرہ کو ایسا آراستہ کردیا جیسا وہ کبھی نہ تھا۔ تصویروں کے چہرہ پر سے گرد کا نقاب اُٹھ گیا۔ لیمپ کے نصیب پھر روشن ہوئے۔ مادھوی کی اس ہمہ گیر محبت سے سُباما کا کفر بھی ٹوٹ گیا۔ مدّت سے اس کی زبان پر پرتاپ چند کا نام کبھی نہیں آیا تھا۔ برجن سے میل جول بھی ہوگیا مگر دونوں عورتوں میں کبھی پرتاپ کا ذکر نہیں آیا۔ حیا برجن کی دامنگیر تھی اور خود داری سُباما کی مگر مادھوی کے شعلۂ محبت نے پتھر کو بھی پگھلا دیا۔ جب وہ ایک خودر فتگی کے عالم میں پرتاپ کے بچپنے کی باتیں پوچھنے لگتی تو سُباما سے ضبط نہ ہوتا۔ اُس کی آنکھیں بھر آتیں۔ تب دو کی دونوں روتیں اور دن دن بھر اُن کی باتیں ختم نہ ہوتیں۔ کیا اب بھی مادھوی کا حالِ دل سُباما سے چھپ سکتا تھا۔ وہ اکثر سوچتی کہ کیا یہ تپسونی یوں ہی محبت کی آگ میں جلتی رہے گی اور بلا کسی اُمید کے!

آٹھ نو سال بیت گئے۔ ایک روز برج رانی نے کملا کا پیکٹ کھولا تو سرورق پر ایک نہایت پُر جلال تصویر کئی رنگوں میں بنی ہوئی نظر آئی۔ یہ کسی مہاتما کی تصویر تھی۔ اُسے خیال آیا کہ میں نے ان مہاتما کو کہیں ضرور دیکھا ہے۔ سوچتے سوچتے یکایک اُس کا خیال پرتاپ چند تک جا پہنچا۔ فرطِ مسرّت سے اُچھل پڑی اور بولی۔ ''مادھوی ذرا یہاں آجاؤ۔''

مادھوی پھولوں کی کیاریاں سینچ رہی تھی۔ اس کے دل بہلاؤ کا آج کل یہی مشغلہ تھا۔ ساڑی پانی میں لت پت۔ سر کے بال بکھرے۔ ماتھے پر پسینہ کی بوندیں۔ آنکھوں میں پریم کا رس۔ آکر کھڑی ہوگئی۔ برجن نے کہا۔ ''آتجھے ایک تصویر دِکھاؤں۔''

مادھوی۔ کس کی تصویر ہے۔ دیکھوں۔

مادھوی نے تصویر کو بغور دیکھا اور آبدیدہ ہوگئی۔

برجن۔ پہچان گئی۔

مادھوی۔ کیوں؟ یہ شکل مَیں کئی بار خواب میں دیکھ چکی ہوں۔ چہرے سے تیج برس رہا ہے۔

برجن۔ دیکھو کچھ حالات بھی لکھے ہیں۔

مادھوی نے دوسرا ورق اُلٹا تو 'سوامی بالاجی' کی سُرخی نظر آئی۔

تھوڑی دیر تک دو کی دونوں خاموش۔ محویت کی تصویر بنی ہوئی یہ مضمون پڑھتی رہیں۔ بعد ازاں بات چیت ہونے لگی۔

برجن۔ میں تو پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ اُنھوں نے ضرور سنیاس لے لیا ہوگا۔

مادھوی زمین کی طرف تاکتی رہی۔ مُنہ سے کچھ نہ بولی۔

برجن۔ تب میں اور اب میں کتنا فرق ہے؟ چہرہ پر جلال برس رہا ہے۔ تب ایسے وجیہہ نہ تھے۔

مادھوی۔ ہوں۔

برجن۔ ایشور اُن کی مدد کرے۔ بڑی تپسیا کی ہے (آبدیدہ ہوکر) کیا اتفاقات ہیں ہم اور وہ ساتھ ساتھ کھیلے۔ ساتھ ساتھ رہے۔ آج وہ سنیاسی ہیں اور میں بیراگن۔ نہ جانے اُنھیں ہم لوگوں کی کچھ سُدھ بھی ہے یا نہیں۔ جس نے سنیاس لے لیا اُسے کسی سے کیا ناطہ جب چچی کے پاس ایک خط نہ لکھا تو بھلا ہماری یاد کیا باقی ہوگی مادھوی! بچپنے میں وہ کبھی جوگی جوگی کھیلتے تو میں مٹھائیوں کی بھکشا دیا کرتی تھی۔

مادھوی نے رو کر کہا۔''نہ جانے کب درشن ہوں گے۔'' یہ کہہ کر شرم سے سر جُھکا لیا۔

برجن۔ آئیں گے جلد۔ راجا دھرم سنگھ اور بھیّا دونوں انھیں ضرور لائیں گے۔

مادھوی۔ ان دونوں آدمیوں نے بھی بڑے حوصلے کا کام کیا ہے۔

برجن۔ کیسا کچھ! راجا صاحب یہاں سے سیر کرنے گئے تھے۔ شاید خطاب کی آرزو کھینچ لے گئی تھی۔ اُن کی جائداد دو ڈھائی کروڑ سے کم کی نہیں۔ پچاس لاکھ تو سالانہ نفع ہے۔ اُن کا اس فراخدلی سے ساری جائداد کارِخیر میں وقف کردینا اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی بھی ارپن کردینا بڑا بھاری تیاگ ہے۔ بھیّا نے بھی گُل کا نام روشن کردیا۔ مجھے اُن کی طرف سے ایسی اُمید نہ تھی۔

مادھوی۔ چندرا بہن آتی ہوں گی۔

برجن۔ ہاں اب وہاں کیا کریں گی۔۔ اُنھیں بھیّا کا یہ کام شاید ہی پسند آیا ہو۔ جھلاتی ہوئی آتی ہوگی۔

مادھوی۔ درشنوں کو لوگ بہت دُور دُور سے آئے تھے۔
برجن۔ تقریر کی کیسی تعریف کی ہے اُن کی زبان میں تو پہلے ہی جادو تھا اب کیا پوچھنا۔
بھیّا کے دل پر جس کی تقریر کا ایسا اثر ہو وہ ساری دُنیا پر اپنا جادو پھیلا سکتا ہے۔
مادھوی۔ چلو چچی کے یہاں چلیں۔
برجن۔ ہاں ان کا تو خیال ہی نہیں۔ دیکھیں کیا کہتی ہیں خوش تو کیا ہوں گی۔
مادھوی۔ اُن کی تو ابھلاکھا ہی یہ تھی۔ خوش کیوں نہ ہوں گی۔
برجن۔ چل، ماں یہ خبر سُن کر کبھی نہیں خوش ہو سکتی۔

دونوں عورتیں گھر سے باہر نکلیں۔ دونوں حُسن کی رانی تھیں۔ برجن کو دیکھ کر اکثر آدمی سر تعظیم خم کرتے تھے۔ لوگ فرطِ ادب سے اُس کے سامنے سے ہٹ جاتے۔ خاص و عام میں اس کی یکسان عزّت تھی۔

کوئی مادھوی سے پُوچھے تیرے پَیر اب زمین پر کیوں نہیں پڑتے۔ تیرے زرد چہرے پر کیوں مسرّت کی سُرخی جھلکا کرتی ہے۔ تجھے کون سی دولت مِل گئی۔ تو اب متفکر و مغموم نہیں نظر آتی۔ تجھے اپنے پیتم سے ملنے کی اب کوئی اُمید نہیں۔ تجھ پر محبت کی نگاہیں کبھی نہیں پڑیں۔ تیرے کانوں میں محبت کی آوازیں کبھی نہیں پہنچیتیں پھر تو کیوں پھُولی نہیں سماتی۔ اس کا جواب مادھوی کیا دے گی۔ کچھ نہیں۔ وہ سر جُھکا لے گی اور اُس کی آنکھیں نیچے جُھک جائیں گی۔ جیسے ڈالیاں پھُولوں کے بوجھ سے جُھک جاتی ہیں اور شاید آنسو کے چند قطرے ٹپک پڑیں مگر اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلے گا۔

مادھوی محبت کے نشہ سے متوالی ہے۔ اس کا دل دیوانۂ محبت ہے۔ اُس کی محبت بازار کا سودا نہیں۔ اس کا پریم کسی چیز کا بُھوکا نہیں۔ وہ محبت کے عوض محبت نہیں چاہتی اُسے ناز ہے کہ ایسے پاک منش آدمی کی صورت میرے دل میں جلوہ گزیں ہے۔ اور یہی اُس کی دیوانگی۔ اُس کے پریم۔ اُس کے عشق کا صلہ ہے۔

دوسرے مہینے میں برج رانی نے بالاجی کے خیر مقدم میں ایک پُرزور نظم لکھی۔ یہ شاعرانہ معجزہ تھا۔ جب یہ نظم شائع ہوئی تو علمی دُنیا باوجود برجن کی روز افزوں بلند پروازیوں سے مانوس ہونے کے حیرت میں آگئی وہ طائرِ فکر جو شاعری

کے آسمان میں کُرۂ ہوا سے بھی آگے نکل جاتا۔ اب کی تارا بن کر چمکا۔ ایک ایک شعر الہامی روشنی سے منور تھا۔ جن لوگوں نے وہ نظم پڑھی بالاجی کے فدائی ہوگئے۔ شاعر وہ شعبدہ باز ہے جس کی پٹاری میں بجائے سانپوں کے دل بند ہوتے ہیں۔

تاریخ کا ایک ورق

ناظرین۔ بالاجی کے قومی کارنامے آپ کو تاریخ کے صفحوں میں آبِ زر سے لکھے ہوئے ملیں گے۔ ہم نے ان صفحات میں اُن حالات اور واقعات کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ تذکرہ کیا ہے جو اس کارنامے کے محرک ہوئے۔ کسی گری ہوئی قوم کو اُبھارنا بہت مشکل کام ہے۔ مگر اس کا صلہ بھی ساری دُنیا کی دولت سے زیادہ گراں بہا اور بیش قدر ہوتا ہے۔ بالاجی کے نام پر آج مورخ کا قلم وجد کرنے لگتا ہے۔ شعراء اُس کے نام پر بلند پروازیوں کے موتی نثار کرتے ہیں۔ ملک کے در و دیوار اُس کا جُس گا رہے ہیں۔ اُس کا ذکر آتے ہی لوگوں کے سر تعظیم سے جُھک جاتے ہیں اور دل قومی جوش سے لبریز ہوجاتا ہیں۔

کسی گری ہوئی قوم کو اُبھارنا آسان کام نہیں مگر اُس کا صلہ جنت کی نعمتوں سے بھی زیادہ حیات بخش ہوتا ہے۔ بچّے ان کی گود میں بالاجی کے کارنامے سُنتے ہیں اُس کی یاد دلوں میں حوصلہ اور بازوؤں میں قوت پیدا کردیتی ہے۔ اس کے نام سے بستیاں بس رہی ہیں اور درسگاہیں کُھل رہی ہیں۔ اس کے نام پر زبانیں فصاحت کے پھُول چڑھاتی ہیں۔ امرا اپنے محلوں میں اور غربا اپنے جھونپڑوں میں اسِ کے گُن گاتے ہیں۔ اُس کی صورت آنکھوں سے نہیں اُترتی۔ اُس کی پُرزور اور پُرحوصلہ آواز اب تک کانوں میں گونج رہی ہے اُس کے خیالات آنے والی نسلوں کے دماغوں کو سنواریں گے اور صدیوں تک اُس کے ہم وطنوں کے لیے گنبدِ نور کا کام دیں گے۔

دیکھیے ایک بے یار و مددگار شخص قوم کو اُبھارنے میں کہاں تک کامیاب ہوسکتا ہے۔ اس کام کے راستہ میں دولت کی اور مددگاروں کی کمی حائل نہیں ہوسکتی۔ روحانی قوت۔ دردمندِ دل۔ وسیع ہمدردیاں۔ یہ ضروری سامان ہیں۔ ابھی بہت دن نہیں گزرے کہ پرتاپ چند ایک گمنام آدمی تھا۔ آج اُس کا نام بچّہ بچّہ کی زبان پر ہے۔ کیا اُس کے پاس قارون کا خزانہ تھا! پنگھٹ پر جب عورتیں کولہوں پر گھڑے رکھے پانی کے لیے آتی ہیں تب بالاجی ہی کے چرچے ہوتے ہیں اور اُنھیں کے جُس گائے جاتے ہیں۔ اناج کے کھیتوں میں اُنھیں کی

بڑائی ہوتی ہے۔ یہی قومی خدمت گزار کا انعام ہے۔ کلکتہ میں جب وہ گئے پھولوں کی برکھا ہوئی۔ ہزاروں مَن پھُول پیروں تلے روند ڈالے گئے۔ اُس دن مندروں میں دیوتاؤں کو پھولوں کی باس نہ ملی۔ رنگین مزاجوں کے گلے میں پھُولوں کے گجرے نہ دکھائی دیے اور حسینوں کی سیجیں پھُولوں سے نہ سجائی جاسکیں۔ مگر بالاجی کو اس نمائش اور دھوم دھام سے مطلق دلچسپی نہ ہوئی۔ دوسرے دن جب وہ بھاگیرتھی کے کنارے پانی میں غروبِ آفتاب کی بہار دیکھ رہے تھے تو کئی عورتیں پانی بھرنے آئیں اور گھڑوں کو پانی میں گھماگھما کر باتیں کرنے لگیں۔

ایک نے کہا۔ بہن تو نے سُنا نہیں۔ بالاجی آئے ہیں۔

دوسری بولی۔ ہمارے ایسے بھاگ کہاں جو اُن کے درشن ملیں۔

تیسری بولی۔ تو چلنے پر راضی ہو تو میں تیرے ساتھ چلوں۔ وہ آج اپنی گئو شالہ دیکھنے آئیں گے۔ کون دُور ہے۔ مجھے گئوؤں کے لیے کھلی اور دانہ بھی لے جانا ہے ایک پنتھ دو کاج ہوجائے گا۔

چوتھی بولی۔ ایسے دیوتا کے درشن نہ کریں گی تو بڑا پاپ ہوگا۔ دیکھ جب سے ان کا گئوشالہ کھُلا ہے لڑکوں کو دونوں وقت دُودھ پینے کو مِل جاتا ہے۔ نہیں تو روکھی روٹیوں کو ترستے تھے۔

بالاجی نے یہ باتیں سُنیں اور بھاگیرتھی کے گلنار پانی کی طرح چہرہ سُرخ ہوگیا۔ اُنھوں نے گاؤں گاؤں گئوشالے کھلوا دیے تھے۔ اُن کا سدھانت تھا کہ ہماری قومی تباہی اور زوال کا اصلی سبب ہمارا جسمانی ضعف اور ذاتوں کی بے جا تفریق ہے جب ہمارے بچّے روکھی روٹیوں کو ترستے ہیں اور دُودھ گھی کی خوشبو بھی اُن کے ناک تک نہیں پہنچنے پاتی تو کوئی تعجب نہیں کہ ان کے قویٰ ایسے ضعیف، چہرے ایسے پژمردہ اور اعضا ایسے کمزور ہیں۔ بلند ارادے اور اونچے خیالات، چوڑے سینوں اور مضبوط کلائیوں میں رہا کرتے ہیں۔ جب قوائے جسمانی کا یہ حال ہے تو خیالات کیسے اُونچے اُڑیں۔ استقلال کہاں سے آئے۔ جرأت کہاں سے پیدا ہو۔ پھول کیسے کھِلیں۔جب جڑ کو غذا نہیں پہنچتی۔ پھل کہاں سے آئیں جب پیڑ سوکھ جاتا ہے۔ زمین کو تر کردو۔ اُس میں پانس ڈال دو۔ پھر دیکھو کہ کیسے خوشنما اور خوشبودار پھُول کھِلتے ہیں اور کیسے لذیذ اور رسیلے پھل لگتے ہیں۔ جسمانی ضعف سے زیادہ

مہیب قومی دشمن وہ شرمناک حقارت ہے جس سے ہم اپنے بھائیوں کو دیکھتے ہیں۔ ہم نے نیچی اور اونچی ذاتیں مقرّر کر رکھی ہیں اور فطرت کے اس زبردست قانون کی خلاف ورزی کر رہے ہیں کہ خلقت بتدریج ترقی کرتی ہوئی اعلیٰ تر مدارج پر پہنچتی ہے۔ آج تک جتنے رِشی اور مہاتما ہو گزرے ہیں۔ اِن سبھوں نے آریہ ورت سے اس تفریق کے مٹانے کی کوششیں کی ہیں۔ مہاتما بدّھ وہ پہلے بزرگ تھے جنھوں نے ہندوؤں کی پیشانی پر سے اس بے انصافی اور ظلم کا داغ مٹانا چاہا اور انھیں بہت کچھ کامیابی ہوئی اُن کے بعد سری شنکر، سری رامانج، سری چیتن، سری رام کرشن، سری سوامی دیانند اور سوامی رام تیرتھ سبھی مہاتماؤں نے یہی تعلیم دی کہ اپنے بھائیوں کو اپنا بھائی سمجھو۔ جاہل بھائی بھی تمھارا بھائی ہے اور نادار بھائی بھی تمھارا بھائی ہے۔ اُسے حقیر مت سمجھو۔ تمھاری نجات اتفاق سے ہوگی تفریق سے نہیں جو شخص اپنے ہم وطنوں پر حقارت کی نگاہ ڈالتا ہے وہ کبھی ترقی کے زینہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ پیارو! جب تک ایک چمار کے سامنے برہمن سر تعظیم جُھکانا نہ سیکھے گا۔ اس وقت تک قوم کی ناؤ ہرگز نہ پار لگے گی۔ یقین مانو۔ تمھاری ناؤ جگہ سے ایک انگل بھی نہ ٹلے گی۔ تمھارے ڈانڈے ٹوٹ جائیں گے۔ تمھارے بادبان پھٹ جائیں گے اور تمھارے ملّاح ہانپ ہانپ کر بے دم ہوجائیں گے۔

یہ بالاجی کے خیالات ہیں۔ افسوس ہے کہ اُن کی زندگی نے وفا نہ کی ورنہ وہ ہندوستان کے لیے کیا کچھ نہ کرجاتے۔ تاہم جو کچھ اُنھوں نے کیا اس پر ہر ایک ہندوستانی فخر کرسکتا ہے۔ ایسا کون سا گاؤں ہے جہاں بالاجی کا گئوشالہ نہ قائم ہو۔ ہندوستا کی چپّہ چپّہ زمین کو اُنھوں نے اپنے قدموں سے روشن کیا۔ پونا۔ بمبئی۔ مدراس۔ میسور۔ کٹک۔ گجرات جیسے۔ دُور دراز جگہوں میں مہینوں رہے اور اپنی بلند آواز سے سوتی ہوئی آتماؤں کو جگاتے رہے۔ چھ ہفتہ کی کوشش میں اُنھوں نے صرف میسور میں کم و بیش تین ہزار گئوشالے کھلوا دیے۔ آفتاب کی چمک سے پانی میں بھی ایسی چمک آجاتی ہے کہ آنکھیں نہیں ٹھہرتیں۔ بالاجی کا جوش اور حوصلہ دوسروں کو سرگرم، پُرجوش اور حوصلہ مند بنا دیتا تھا۔ جہاں جہاں بالاجی نے گئوشالے قائم کیے وہاں خودبخود اکھاڑے بن گئے ہیں خم کی خوش آئند صدائیں صبح کو مُبارک باد دیتی ہیں اور للکار کی پُرجوش آوازیں درختوں کو نیند سے جگاتی ہیں۔

ذات کی باہمی تفریق مٹانے کے لیے اُنھوں نے جو زبردست کوششیں کیں وہ صفحۂ تاریخ کے لیے ہمیشہ باعثِ ناز رہیں گی۔ وہ مُبارک گھڑی تھی جب اُنھوں نے پٹنہ میں "ارجن سبھا" کی بنیاد ڈالی۔ تین سال کے اندر ایسا شاید ہی کوئی شہر یا گاؤں تھا جہاں 'ارجن سبھا' کی شاخیں نہ کھل گئی ہوں۔ یہ انھیں ارجن سبھاؤں کی کوششوں کا پھل ہے کہ آج ہر قصبہ میں نیچی ذاتوں کے لیے جُدا جُدا مدرسے، جُداجدا بورڈنگ ہاؤس قائم ہیں۔ 'ارجن سبھا' کے ممبران مدرسوں میں تعلیم دیتے ہیں اور ان ذاتوں کے تمدن اور معاشرت کے عیوب کی اصلاح کرنے میں سرگرم ہیں۔ یہ لوگ گاؤں گاؤں گھومتے ہیں اور ہندو قوم کے مظلوموں کو بیداری کا مژدہ سناتے ہیں۔ اُن سے بھائیوں کی طرح بغلگیر ہوتے ہیں اور ان کے دلوں میں خود داری کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ مبارک اور جاں بخش ہوتا تھا وہ نظارہ جب بالاجی اپنے مظلوم بھائیوں کے ساتھ زمین پر بیٹھ کر اُن کا دل اور حوصلہ بڑھانے کی باتیں کرتے تھے۔ آج بالاجی کا نام سُن کر یہ لوگ پھُولے نہیں سماتے ان لوگوں میں اخلاق و عادات کے سُدھارنے کی جو کوشش آپ دیکھتے ہیں۔ یہ بالاجی ہی کی جانفشانیوں کا نتیجۂ نیک ہے۔

ہمارے قومی کاموں کا ایسا کوئی جزو نہیں ہے جو بالاجی کی عنایت کا ممنون نہ ہو۔ اُن کا وقت۔ اُن کا دھیان۔ اُن کی سرگرمی اور اُن کا سب کچھ قوم کی خدمت کے لیے وقف تھا۔ وہ قوم کے سرتاج اور قوم کے چاکر دونوں ہی تھے۔

بنارس میں آمد

جب سے شہرت نے برج رانی کو اپنا منظورِ نظر بنایا تھا اُس کے یہاں ہردم عورتوں کا جمگھٹ لگا رہتا تھا۔ شہر میں مستورات کی کئی سبھائیں تھیں اُن کے متعلق سارا بوجھ اُسی کو اُٹھانا پڑتا۔ اس کے علاوہ دوسرے شہروں سے بھی اکثر عورتیں اُس کی مُلاقات کو آتی رہتی تھیں۔ جو تیرتھ جاترا کرنے کے لیے بنارس آتا تھا، وہ برجن سے ضرور ملاقات کرتا۔ راجا دھرم سنگھ نے اُس کے کلام کا مجموعہ بڑی آب و تاب سے شائع کیا تھا۔ اور اس مجموعہ نے اُس کی شاعرانہ سطوت کا ڈنکا بجا دیا تھا۔ ہندوستان کا تو کیا شمار یوروپ اور امریکا کے سربرآوردہ شعرا نے بھی اسے اُس کے محاسنِ کلام پر مبارک باد دی۔ ہندوستان میں شاید ہی ایسا کوئی خوش مذاق شخص ہوگا۔ جس کی کتابوں کا طاق اس دیوان سے آراستہ نہ ہو اور برجن کے کلام کی قدر کرنے والوں میں بالاجی کا درجہ سب سے بڑھا ہوا تھا۔ وہ اپنی پُرزور تقریروں اور تحریروں میں اُسی کے کلام کی سندیں دیا کرتے تھے۔ اور ایک بار 'سرسوتی' میں اُس کی پُرزور تنقید لکھی تھی۔

ایک روز برجن صبح کے وقت بیٹھی ہوئی تھی کہ سیتا۔ چندرکنور۔ رُکمنی اور رانی آئیں۔ چندرکنور زیوروں سے لدی ہوئی تھی۔ سیتا متین اور خاموش۔ رُکمنی کا چہرہ پژمُردہ۔ الوداع شباب کی تصویر اور رانی ناک چوٹی سے درست۔ عطر میں ڈوبی ہوئی۔ چندرا نے ان عورتوں کو فرش پر بٹھایا اور اُن کی خاطرمدارت کی۔ برجن نے صبح کا وقت فکرِ سخن کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ اس وقت وہ بلا کسی ضرورت کے سکھیوں سہیلیوں سے نہ ملتی جلتی تھی۔ باغیچہ میں ایک خوبصورت کُنج تھا۔ گُلاب کی خُوشبو سے بسی ہوئی ہوائیں آتی تھیں۔ وہیں برجن ایک قالین پر بیٹھی ہوئی فکرِسخن کیا کرتی تھی اور بحرِ معنی سے جو موتی وہ نکالتی اسے مادھوی سلک رقم میں پرو دیا کرتی۔ آج بہت دنوں کے بعد اور اہلِ شہر کے متواتر تقاضوں پر برجن نے بالاجی کو بنارس میں آنے کی دعوت دینے کے لیے قلم اُٹھایا تھا۔ بنارس ہی وہ شہر تھا جس کی یاد کبھی کبھی بالاجی کو بے چین کردیا کرتی تھی مگر باوجود اہلِ بنارس کے مسلسل دعوت اور اصرار کے انھیں بنارس آنے کی کبھی فرصت نہ ملی۔

سیلون اور رنگون تک گئے مگر بنارس کی طرف رُخ نہ کیا۔ اس شہر کو وہ امتحان کدہ سمجھا کرتے تھے۔ اسی لیے آج برجن انھیں بنارس آنے کی دعوت دے رہی ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ دعوت انھیں ضرور کھینچ لائے گی۔ جب کوئی تازہ خیال آجاتا ہے تو برجن کا چاند سا چہرہ چمک اُٹھتا ہے اور مادھوی کے چہرہ پر سُرخی کی جھلک آجاتی ہے۔ باغیچہ میں گُلاب کے بہت پھول کھِلے ہیں۔ رات کی شبنم میں نِکھر کر وہ اس وقت بہت سُہانے معلوم ہوتے ہیں مگر اس وقت جو تازگی اور سُہاناپن ان دونوں پھُولوں پر ہے اُسے دیکھ دیکھ کر دوسرے پھُول شرمائے جاتے ہیں۔ دونوں پھُول باغِ فردوس کے پھُول ہیں۔

مگر نہیں۔ ہم بُھولتے ہیں۔ ایسے حُسن دلآویز کو پھُول سے کیا نسبت۔ پھُول میں وہ دلآویزی کہاں۔ وہ رس کہاں۔ وہ کشش کہاں۔ کسی نے ایسا پھُول دیکھا ہے جسے دیکھنے سے کبھی آنکھیں آسودہ نہ ہوں اور دیکھنے کی ہوس باقی رہے۔ ایسا پھُول کہاں ہے جسے دیکھ کر دل پر ایک بجلی سی کوند جائے۔ جس کی صورت دل پر نقش ہوجائے۔ شعرا نے پھُول کا رُتبہ بڑھا رکھا ہے۔ پھر کیا اس حُسن کو چاند سے تشبیہہ دیں۔ آہ! یہاں بھی شاعروں نے ٹھوکر کھائی ہے۔ چاند میں وہ دل فریبی کہاں۔ چاند میں روشنی ہے۔ چمک ہے مگر حُسن کہاں۔ کیا چاند بھی ایسی چیز ہے جسے دیکھنے سے جی نہ بھرے کیا چاند بھی جگر کو مسوسنے لگتا ہے۔ کیا چاند کو دیکھ کر بھی رُوح پر ایک نشہ سا ہوجاتا ہے۔ حق یہ ہے کہ حُسن کی تشبیہہ دُنیا کی کسی چیز سے نہیں دی جاسکتی۔ کسی چیز میں یہ کشش۔ یہ اثر۔ یہ دلآویزی نہیں۔

نو بجتے بجتے برجن کمرہ میں آئی۔ سیوتی بولی۔ ''آج بڑی دیر لگائی۔''

برجن۔ کُنتی نے سُورج کے بُلانے کے لیے کتنی تپسیا کی تھی۔

سیتا۔ بالاجی بڑے نِٹھر ہیں۔ میں تو ایسے آدمی سے کبھی نہ بولوں۔

رُکمنی۔ جس نے سنیاس لے لیا اُسے گھر بار سے کیا ناطہ۔

چندرکنور۔ یہاں آئیں گے تو مُنہ پر کہہ دوں گی کہ حضرت یہ معشوقانہ انکار کہاں سے سیکھا؟

رُکمنی۔ مہارانی رِشی مہاتماؤں کا تو ادب کیا کرو۔ زبان کیا ہے کترنی ہے؟

چندرکنور۔ اور نہیں کب تک صبر کریں جی۔ سب جگہ جاتے ہیں یہیں آتے پیر تھکتے ہیں۔

برجن۔ (مسکراکر) اب بہت جلد درشن پاؤگی۔ مجھے یقین ہے کہ اس مہینہ میں وہ ضرور آئیں گے۔

سیتا۔ دھنیہ بھاگ کہ درشن تو ملیں گے۔ میں تو جب اُن کا حال پڑھتی ہوں تو یہی جی چاہتا ہے کہ پا جاؤں تو پیر پکڑکر گھنٹوں روؤں۔

رُکمنی۔ ایشور نے اُن کے ہاتھوں میں بڑا جَس دیا ہے۔ دارانگر کی رانی صاحبہ مر ہی چکی تھیں۔ یقین مانو دم ٹوٹ رہا تھا کہ بالاجی کو خبر ہوئی۔ فوراً پہنچے اور دم کی دم میں اُٹھا کر بٹھا دیا۔ ہمارے منشی جی (شوہر) ان دنوں وہیں تھے۔ کہتے تھے کہ رانی جی نے خزانہ کی کُنجی لے کر بالاجی کے پیروں پر رکھ دی اور کہا آپ اس کے مالک ہیں۔ بالاجی نے خزانہ کی کُنجی نہ لے کر کہا۔ مجھے خزانہ درکار نہیں آپ اپنی ریاست میں تین سو گئوشالے کھلوا دیجیے۔ زبان سے نکلنے کی دیر تھی آج دارا نگر میں دودھ کی ندی بہتی ہے۔ ایسا مہاتما کون ہوگا۔

چندرکنور۔ راجا نولکھا کا تپِ دق اُنھیں کی بوٹیوں سے چُھوٹا۔ سارے حکیم ڈاکٹر جواب دے چکے تھے۔ جب بالاجی چلنے لگے تو مہارانی صاحبہ نے نولاکھ کا موتیوں کا ہار ان کے پیروں پر رکھ دیا۔ مگر اُس کی طرف دیکھا تک نہیں۔

رانی۔ عجیب مُردہ طبیعت کے ہیں۔

رُکمنی۔ ہاں اور کیا۔ انھیں چاہیے تھا کہ ہار لے لیتے بلکہ گلے میں ڈال لیتے۔

برجن۔ نہیں لے کر رانی کو پہنا دیتے۔ کیوں سکھی؟

رانی۔ ہاں میں اُس ہار کے لیے غلامی لکھ دیتی۔

چندرکنور۔ ہمارے یہاں تو 'ارجن سبھا' کے ممبر بن بیٹھے ہیں۔ ڈھائی سو روپے لاکھ جتن کرکے رکھ چھوڑا تھا۔ اسے اُٹھا لے گئے۔ کہ گھوڑا لیں گے۔ کیا ارجن سبھا والے بلا گھوڑے کے نہیں چلتے۔

رانی۔ کل یہ لوگ قطار باندھ کر میرے مکان کے سامنے سے جارہے تھے۔ بڑا اچھا معلوم ہوتا تھا۔

اسی اثنا میں سیوتی تازہ اخبار لائی۔

برجن۔ کوئی نئی خبر ہے؟

سیوتی۔ ہاں بالاجی مانکپور آئے ہیں۔ ایک اہیر نے اپنی لڑکی کی شادی کا نوید بھیجا تھا۔ اس پر الہ آباد سے ارجن سبھا کے ممبروں کے ساتھ راتوں رات مانکپور پہنچے۔ اہیروں نے بڑے جوش سے خیرمقدم کیا۔ اور مل کر پانچ سو گائیں اُنھیں بھینٹ دی ہیں۔ بالاجی نے دُلہن کو دعا دی اور دُولھا کو گلے لگایا۔ پانچ اہیر ارجن سبھا کے ممبر بنائے گئے۔

برجن۔ نہایت دلچسپ خبر ہے۔ مادھوی اسے کاٹ کر رکھ لینا۔ اور کچھ؟

سیوتی۔ پٹنہ کے باسیوں نے ایک ٹھاکر دوارہ بنوایا ہے۔ پٹنہ کی ارجن سبھا نے بڑے دھوم دھام سے اُس کا جلسہ کیا۔

برجن۔ پٹنہ کے لوگ خوب سرگرمی سے کام کر رہے ہیں۔

چندرکنور۔ کیا سوریں بھی اب سیندور پہنیں گی۔ باسی ٹھاکردوارے بنوائیں گے۔

رُکمنی۔ کیوں وہ آدمی نہیں ہیں۔ ایشور نے انھیں نہیں بنایا۔ آپ ہی اپنے مالک کی پُوجا کرنا جانتی ہیں۔

چندرکنور۔ چلو ہٹو باسیوں سے مجھے ملاتی ہو۔ یہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔

رُکمنی۔ہاں تمھارا رنگ ذرا صاف ہے نا اور گہنے کپڑے سے لیس ہو۔ بس اتنا ہی فرق ہے کہ اور کچھ۔

چندرکنور۔ اتنا ہی فرق کیوں ہے۔ زمین کو آسمان سے ملاتی ہو میں کچھواہوں کے خاندان میں ہوں۔ معلوم ہے!

رُکمنی۔ ہاں معلوم ہے اور نہیں معلوم تھا تو اب معلوم ہوگیا۔ ٹھاکر صاحب کسی باسی سے بدبدکر کشتی لڑیں گے؟ یا سر پر ٹیڑھی پگیا ہی رکھنا جانتے ہیں۔ میں تو جانتی ہوں کہ کوئی معمولی باسی بھی انھیں بغل میں دبا لے گا۔

چندرکنور۔ مُنہ میں زبان ہے جو چاہے کہہ لو۔ ہمارے باوا جے پُور میں صوبہ دار تھے۔ ہم لوگوں کی بیر تا دُنیا میں مشہور ہے۔

برجن۔ اچھا اب اس قضیہ کو جانے دو۔ تم دونوں جب آتی ہو لڑتی ہی آتی ہو۔

ایک مہینہ اور گزرا۔ برجن کی تازہ نظم خیرمقدم کا پیغام لے کر بالاجی کے پاس پہنچی مگر یہ نہ معلوم ہوا کہ اُنھوں نے دعوت قبول کی یا نہیں۔ اہلِ بنارس راہ

دیکھتے دیکھتے تھک گئے۔ بالاجی روزبروز دکھن کی طرف بڑھتے جاتے تھے۔ آخر لوگوں کو مایوسی سی ہوگئی اور سب سے زیادہ مایوسی برجن کو ہوئی۔

ایک روز جب کسی کو شان و گمان بھی نہ تھا کہ بالاجی بنارس آئیں گے۔ پران ناتھ نے آکر کہا۔ "بہن لو خوش ہوجاؤ۔ آج بالاجی تشریف لا رہے ہیں۔"

برجن کچھ لکھ رہی تھی۔ ہاتھ سے قلم چھوٹ پڑا۔ مادھوی اُٹھ کر دروازہ کی طرف لپکی۔ پران ناتھ نے مسکراکر کہا ابھی آٹھوڑے ہی گئے کہ یوں بے صبر ہوئی جاتی ہو۔

مادھوی۔ کب آئیں گے؟ اِدھر ہی سے ہوکر جائیں گے؟

پران ناتھ۔ یہی تو نہیں معلوم کدھر سے آئیں گے۔ انھیں جلوس اور دھوم دھام سے سخت نفرت ہے۔ اسی لیے پہلے سے آنے کی تاریخ نہیں مقرر کی۔ راجا صاحب کے پاس آج صبح کو ایک آدمی نے آکر خبر دی کہ بالاجی آرہے ہیں، اور کہا ہے کہ میرے استقبال کے لیے دھوم دھام نہ ہو۔ مگر یہاں بنارس کے لوگ اسے کب مانتے ہیں۔ استقبال ہوگا اور دھوم دھام کے ساتھ جلوس نکلے گا اور ایسا شاندار کہ شہر کی تاریخ میں یاد رکھنے کے قابل۔ چاروں طرف آدمی چھوٹے ہوئے ہیں کہ جوں ہی اُنھیں آتے دیکھیں ہر ایک محلّہ میں ٹیلیفون سے خبر پہنچا دی جائے۔ کالج اور اسکول کے طلباء وردیاں پہنے بیرقیں لیے اشارہ کے منتظر ہیں۔ گھرگھر پھُول برسانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ بازار میں دُکانیں سجائی جا رہی ہیں۔ شہر میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی ہے۔

مادھوی۔ اِدھر سے جائیں گے تو ہم اُنھیں روک لیں گے۔

پران ناتھ۔ ہم نے کوئی تیاری تو کی ہی نہیں۔ روک کیا لیں گے۔ اور یہ بھی تو نہیں معلوم کہ کدھر سے جائیں گے۔ رادھا چرن نے دھوکا دیا۔ اُنھوں نے کہا تھا کہ میں امرتسر کی طرف سے اُن کے آنے تک لوٹ آؤں گا اور ابھی تک اُن کا کہیں پتہ نہیں۔ خیر۔

برجن۔ (سوچ کر) آرتی اُتارنے کا انتظام تو کرنا ہی ہوگا۔

پران ناتھ۔ ہاں اب کیا اتنا بھی نہ ہوگا۔ میں باہر فرش وغیرہ بچھواتا ہوں۔

پران ناتھ باہر تیاریوں میں مصروف تھے۔ مادھوی پھول چُننے لگی۔ برجن نے روپہلا تھال دھودھاکر صاف کیا۔ سیوتی اور چندرا اندر سب چیزیں قرینہ سے رکھنے لگیں۔

مادھوی خوشی کے مارے پھولی نہ سماتی تھی۔ بار بار چونک کر دروازہ کر طرف دیکھتی کہ کہیں وہ آتو نہیں گئے۔ بار بار کان لگا کر سُنتی کہ کہیں باجے کی آوازیں تو نہیں آرہی ہیں۔ دل مارے خوشی کے دھڑک رہا تھا۔ پھول چُنتی تھی مگر دھیان دوسری طرف تھا۔ ہاتھوں میں کتنے ہی کانٹے چُبھا لیے۔ پھول کے ساتھ کئی پیڑوں کی شاخیں مروڑ ڈالیں۔ کئی دفعہ شاخوں میں اُلجھ کر گری۔ کئی دفعہ ساڑی کانٹوں میں پھنسا دی۔ اس وقت اس کی حالت بالکل بچّوں کی سی تھی۔

مگر برجن کا چہرہ بالکل اُداس تھا۔ جیسے بھرا ہوا پیالہ ذرا سا ہلنے سے بھی چھلک پڑتا ہے۔ اُسی طرح جوں جوں پُرانی باتیں یاد آتی تھیں اُس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے تھے۔ آہ! کبھی وہ دن تھے کہ ہم اور وہ بھائی بہن تھے۔ ساتھ کھیلتے تھے۔ ساتھ رہتے تھے یا آج سولہ سال گزر گئے اُن کی صورت دیکھنی بھی نصیب نہ ہوئی۔ تب میں ذرا بھی روتی تو وہ میرے آنسو پونچھتے اور میرا دل بہلاتے۔ اب اُنھیں کیا خبر کہ یہ آنکھیں کتنا روئی ہیں اور اس دل نے کیسے کیسے صدمے اُٹھائے ہیں۔ کیا خبر تھی کہ ہماری قسمتیں ایسے گُل کھلائیں گی۔ ایک بیوگن ہوجائے گی اور دوسرا سنیاسی۔

یکایک مادھوی کو خیال آیا کہ سُباما کو شاید بالاجی کے آنے کی خبر نہ ہوئی ہو۔ برجن کے پاس آکر بولی۔"بہن ذرا میں چچی کے یہاں جاتی ہوں۔ نہ جانے کسی نے ان سے کہا یا نہیں۔

پران ناتھ باہر سے آرہے تھے۔ یہ سُن کر بولے۔ وہاں سویرے ہی سب سے پہلے خبر ہوگئی۔ خوب تیاریاں ہو رہی ہیں۔ بالاجی بھی سیدھے گھر کی ہی طرف جائیں گے۔ ادھر سے اب نہ آئیں گے۔

برجن۔ تو ہم لوگوں کو چلنا چاہیے۔ کہیں دیر نہ ہوجائے۔

مادھوی۔ آرتی کا تھال لاؤ۔

برجن۔ کون لے چلے گا۔ مہری کو بلا لو (چونک کر) ارے یہ تیرے ہاتھوں۔میں خُون کہاں سے آیا؟

مادھوی۔ اُونہہ۔ پھُول چُنتی تھی۔ کانٹے لگ گئے ہوں گے۔

چندرا۔ ابھی تو نئی ساڑی آئی ہے۔ آج ہی پھاڑ کے رکھ دی۔

مادھوی۔ تمھاری بلا سے۔

مادھوی نے یہ کہہ تو دیا مگر آنکھیں پُرآب ہو گئیں۔ چندرا یوں بہت نیک عورت تھی مگر جب سے بابو رادھا چرن نے قومی خدمت کے لیے نوکری سے استعفا دیا وہ بالاجی کے نام سے چڑتی تھی۔ برجن سے تو کچھ کہہ نہ سکتی تھی۔ مادھوی کو چھیڑتی رہتی تھی۔ برجن نے چندرا کی طرف گھور کر مادھوی سے کہا۔"جاؤ صندوق سے دوسری ساڑی نکال لو اِسے رکھ آؤ۔ رام رام مار کے ہاتھ چھلنی کر ڈالا۔"

مادھوی۔ دیر ہو جائے گی۔ میں یوں ہی چلوں گی۔

برجن۔ نہیں ابھی گھنٹہ بھر سے زیادہ مہلت ہے۔

یہ کہہ کر برجن نے پیار سے مادھوی کا ہاتھ دھویا۔ اُس کے بال گوندھے۔ ایک خوبصورت ساڑی پہنائی۔ چادر اُڑھائی اور اُسے گلے سے لگا کر پُرآب آنکھوں سے تاکتی ہوئی بولی۔ بہن۔ دیکھو دھیرج ہاتھ سے نہ جائے۔

مادھوی مسکرا کر بولی۔"تم میرے ہی ساتھ رہنا۔ مجھے سنبھالتی رہنا۔ مجھے اپنے دل پر آج بھروسہ نہیں ہے۔

برجن سمجھ گئی کہ آج پریم نے مدہوشی کا درجہ اختیار کیا ہے اور شاید یہی اُس کی انتہا ہے۔ آہ! یہ باولی بالو کی دیوار کھڑی کر رہی ہے۔

تھوڑی دیر میں مادھوی۔ برجن۔ سیوتی چندرا کئی عورتوں کے ساتھ سُباما کے گھر کو چلیں۔ وہاں کی تیاریاں دیکھیں تو دنگ رہ گئیں۔ دروازہ پر ایک نہایت وسیع شامیانہ کھڑا تھا۔ فرش فروش اور شیشہ و آلات سے آراستہ۔ نوبت جھڑ رہی تھی۔ بڑے بڑے ٹوکروں میں میوے اور مٹھائیاں رکھی ہوئی تھیں۔ شہر کے رُوسائے نامدار خوش وضع لباس پہنے ہوئے استقبال کرنے کو کھڑے تھے۔ فِٹن اور گاڑیاں ایک بھی نظر نہ آتی تھیں کیونکہ بالاجی ہمیشہ پیدل ہی چلا کرتے تھے۔ بہت سے لوگ گلے میں جھولیاں ڈالے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ جن میں شاید بالاجی پر نثار کرنے کے لیے روپے پیسے بھرے ہوئے تھے۔ راجا دھرم سنگھ کے پانچوں لڑکے رنگین

کپڑے پہنے زعفرانی صافے باندھے۔ ریشمی جھنڈیاں کمر میں کھونسے بگل بجا رہے تھے۔ جوں ہی لوگوں کی نظر برجن پر پڑی ہزاروں سر فرطِ ادب سے خم ہوگئے۔ جب یہ خاتونیں اندر گئیں تو وہاں بھی آنگن اور سائبان اور کمرے دُلہن کی طرح سجے ہوئے پائے۔ صدہا عورتیں مبارکباد کے گانے گانے کے لیے بیٹھی ہوئی تھیں۔ پھولوں کے ڈھیر جابجا پڑے ہوئے تھے۔ سُباما ایک سفید ساڑھی پہنے۔ صبر و حِلم کی تصویر بنی ہوئی دروازے پر کھڑی تھی۔ برجن اور مادھوی کو دیکھتے ہی آبدیدہ ہوگئی۔ برجن بولی۔ ''چچی آج اس گھر کے بھاگ جاگ گئے۔'' سُباما نے روکر کہا۔ ''تمھاری بدولت مجھے آج یہ دن دیکھنا نصیب ہوا ہے ایشور تمھیں اس کا پھل دے۔''

غم نصیب ماں کے تہِ دل سے یہ دعا نکلی۔ ایک غم نصیب ماں کی بد دعا نے راجا دشرتھ کو بیٹے کے فراق میں شربتِ مرگ چکھایا تھا۔ کیا سُباما کی یہ دعا بے اثر رہے گی؟

دونوں ابھی اسی طرح کی باتیں کر رہی تھیں کہ گھنٹے اور ناقوسوں کی صدائیں آنے لگیں۔ شور مچا کہ بالاجی آپہنچے۔ عورتوں نے مباک باد گانا شروع کیا۔ مادھوی نے آرتی کا تھال لے لیا اور راستہ کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ ذرا دیر میں وردی پوش نوجوانوں کی ایک جماعت نظر آئی۔ اُس کے بعد ارجن سبھا کے ایک سو پچیس ممبر گھوڑوں پر سوار دِکھائی دیے۔ اُن کے پیچھے بے شمار آدمیوں کا ہجوم تھا۔ سارا شہر پھٹ پڑا تھا شانے سے شانے چھل رہے تھے۔ سمندر کی ایک لہر تھی کہ بڑھتی چلی آتی تھی۔ اس ہجوم میں بالاجی کا چہرہ ایسا نظر آتا تھا جیسے بادل میں سے چاند نکلا ہو۔ پیشانی پر سُرخ چندن کا تلک تھا اور گردن میں گیروے رنگ کی ایک چادر پڑی ہوئی تھی۔

سُباما دروازہ پر کھڑی تھی۔ جوں ہی بالاجی کا چہرہ اُسے نظر آیا۔ ضبط ہاتھ سے جاتا رہا۔ دروازہ سے باہر نکل پڑی اور سر جُھکائے آنکھوں سے موتی پروتی بالاجی کی طرف چلی۔ آج اس نے اپنا کھویا ہوا لال پایا ہے اور اُسے گلے لگانے کے لیے بے قرار ہو رہی ہے۔

سُباما کو اس طرح آتے دیکھ کر سب لوگ رُک گئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے

کوئی دیوی اُتر آئی ہے۔ چوطرفہ سناٹا چھا گیا۔ بالاجی نے کئی قدم آگے بڑھ کر ماں کو پرنام کیا اور اُس کے پیروں پر گر پڑے۔ سُباما نے اُن کا سر اپنی گود میں لے لیا اور اُن کے ماتھے پر کئی بوسے دیے۔ آج اس نے اپنا کھویا ہوا لال پایا ہے۔ اُس پر آنکھوں سے موتی برسا رہی ہے۔

اس روح افزا نظارہ کو دیکھ کر لوگوں کے دل قومیت کے نشہ سے مدہوش ہوگئے۔ پچاس ہزار گلوں سے آواز آئی۔"بالاجی کی جے" بادل گرجا اور چاروں طرف سے پھولوں کی برکھا ہونے لگی۔ پھر اُسی طرح گھن گرج کر صدا بلند ہوئی "منشی سالگرام کی جے۔" اور ہزاروں آدمی حُبِّ وطن کے نشہ سے مست ہوکر دوڑے اور سُباما کے قدموں کی خاک پیشانی پر ملنے لگے۔ ان نعروں سے سُباما ایسی خوش ہو رہی تھی جیسے مہور کے سُننے سے ناگن متوالی ہوجاتی ہے۔ آج اس نے اپنا کھویا ہوا لال پایا ہے۔ اس بے بہا رتن کے ملنے سے وہ رانی ہوگئی ہے اُسی رتن کی بدولت آج اُس کے قدموں کی خاک لوگوں کی آنکھوں کا سُرمہ اور ماتھے کا چندن بن رہی ہے۔

عجیب حیات بخش نظارہ تھا بار بار جے جے کار کے نعرے بلند ہوتے تھے۔ اور عالمِ بالا کے بسنے والوں کو بھارت کی بیداری کا مژدہ سُناتے تھے۔ ماں اپنے بیٹے کو کلیجے سے لگائے ہوئے ہے۔ بہت دن کے بعد آج اس نے کھویا ہوا لال پایا ہے۔ وہ لال جو اُس کی جنم بھر کی کمائی تھی۔ پھُول چاروں طرف سے نثار ہو رہے ہیں۔ زر و جواہر کی بارش ہو رہی ہے۔ ماں اور بیٹا کمر تک پھُولوں کے سمندر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ایسا پُر اثر سین کس کی آنکھوں نے دیکھا ہوگا!

سُباما بالاجی کا ہاتھ پکڑے ہوئے گھر کی طرف چلی۔ دروازہ پر پہنچتے ہی عورتیں مبارک باد گانے لگیں اور مادھوی سُنہرے تھال میں دُھوپ، دِیپ پھُولوں سے آرتی اُتارنے لگی۔ برجن نے پھُولوں کی مالا اُن کے گلے میں ڈالی۔ وہ مالا جسے مادھوی نے اپنے خُون سے رنگا تھا۔ بالاجی نے چشمِ پُرآب سے برجن کی طرف دیکھ کر پرنام کیا۔

مادھوی کو بالاجی کے درشن کی کتنی آرزو تھی۔ مگر اس وقت اُس کی آنکھیں زمین کی طرف جھکی ہوئی ہیں۔ بالاجی کی طرف نہیں تاک سکتی۔ اُسے خوف ہے کہ میری آنکھیں دل کا بھید کھول دیں گی۔ اُن میں پریم رس بھرا ہوا ہے۔ آج پہلی بار مادھوی کے

دل میں نئی آرزوئیں پیدا ہوئی ہیں۔ اب تک اُس کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ بالاجی کے درشن پاؤں مگر آج آرزوؤں نے سر اُبھارا ہے۔ پُوری ہونے کے لیے نہیں۔ آج باغِ حسرت میں ایک نئی کلی لگی ہے۔ کھِلنے کے لیے نہیں بلکہ مُرجھانے کے لیے اور مُرجھاکر خاک میں مِل جانے کے لیے۔ مادھوی کو کون سمجھائے کہ تُو اِن آرزوؤں کو دل میں نہ پیدا ہونے دے۔ یہ آرزوئیں تجھے بہت رُلائیں گی۔ تیری محبت خیالی ہے۔ تو اُس کے مزے سے واقف ہے۔ کیا اب واقعی محبت کا مزہ لیا چاہتی ہے۔

پریم کا سپنا

انسان کا دل آرزوؤں کا کاشانہ ہے اور حسرتوں کی بستی۔ کوئی زمانہ وہ تھا کہ مادھوی ماں کی گود میں کھیلتی تھی۔ اس وقت دل آرزوؤں اور حسرتوں سے خالی تھا۔ مگر جب مٹی کے گھروندے بنانے لگی۔ اُس وقت دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ میں اپنی گڑیا کا بیاہ کروں۔ سب لڑکیاں اپنی گڑیا بیاہ رہی ہیں۔ کیا میری گڑیا کنواری رہے گی۔ میں اپنی گڑیا کو گہنے بنوا دوں گی۔ اُس کا بیاہ رچاؤں گی۔ اس آرزو نے اُسے مہینوں رُلایا۔ مگر گڑیا کی قسمت میں بیاہ نہ بدا تھا۔ ایک روز بادل گھر آئے اور موسلا دھار پانی برسا۔ گھروندا مینہ میں بہہ گیا۔ اور گڑیا کے بیاہ کی حسرت رہ گئی۔

کچھ دن اور گزرے۔ ماں کے ساتھ برجن کے یہاں آنے جانے لگی۔ اُس کی میٹھی میٹھی باتیں سنتی اور خوش ہوتی۔ اُس کے تھال میں کھاتی اور اُس کی گود میں سوتی۔ اس وقت بھی اُس کے دل میں ایک آرزو تھی کہ میرا خوب اچھا گھر ہوتا۔ اس میں چاندی کے کواڑ لگے ہوتے۔ زمین ایسی صاف ہوتی کہ مکھی بیٹھے اور پھسل جائے۔ میں برجن کو اپنے گھر لے جاتی وہاں اچھی اچھی چیزیں بناتی اور کھلاتی اور اچھے سے پلنگ پر سُلاتی۔ اور اُس کی خوب سیوا کرتی۔ یہ آرزو برسوں تک دل میں چٹکیاں لیتی رہی۔ مگر اُسی گھروندے کے طرح یہ گھر بھی ڈھے گیا۔ اور آرزوئیں مبدل بہ حسرت ہوگئیں۔

کچھ دن اور گزرے۔ بہار کے دن آئے۔ برجن نے اُس کے دل پر پرتاپ چند کی تصویر کھینچنی شروع کی۔ ان دِنوں اس ذکر کے سوا کوئی بات اچھی نہ لگتی۔ آخر پرتاپ چند کی چیری بننے کی آرزو دل میں پیدا ہوئی۔ لیٹے لیٹے دل سے باتیں کیا کرتی۔ راتوں کو جاگ جاگ کر من کی مٹھائی کھاتی۔ ان خیالوں سے دل پر ایک نشہ سا ہوجاتا مگر پرتاپ چند اسی اثنا میں لاپتہ ہوگئے۔ اور اسی مٹی کے گھروندے کی طرح یہ ہوائی قلعے بھی ڈھے گئے۔ آرزوؤں کی جگہ دل میں حسرتیں رہ گئیں۔

اب حسرتوں کے ہجوم سے دل میں آرزوؤں کی جگہ باقی نہ رہی۔ دیوتاؤں کی اُپاسنا کرنے لگی۔ برت رکھنے لگی تاکہ پرتاپ چند پر زمانہ کی بُری نگاہ نہ پڑے اس طرح ایک

مدت تک اُس نے تپسونی کی زندگی بسر کی۔ خیالِ محبت کے نشہ میں چُور رہتی۔ مگر آج تپسونی کا برت ٹوٹ گیا اور دل میں نئی آرزوؤں نے سر اُٹھایا۔ دس سال کی تپسیا ایک لمحہ میں بھنگ ہوگئی۔ کیا یہ آرزوئیں بھی اسی مٹی کے گھروندے کی طرح پامال ہوجائیں گی؟

آج جب سے مادھوی نے بالاجی کی آرتی اُتاری ہے اُس کے آنسو نہیں تھمتے سارا دن گزر گیا اور ایک ایک کرکے تارے نکلنے لگے۔ سورج تھک کر چھپ گئے اور چڑیاں تھک کر گھونسلوں میں آبیٹھیں۔ مگر مادھوی کی آنکھیں نہیں تھکیں۔ وہ سوچتی کہ ہائے! کیا میں اسی طرح رونے کے لیے بنائی گئی ہوں میں کبھی ہنسی بھی تھی۔ کہ جس کے بدلے اتنا روتی ہوں۔ آہ! روتے روتے آدھی عمر گزر گئی۔ کیا یہ باقی دن بھی یُوں ہی کٹیں گے۔ کیا میری زندگی میں ایک دن بھی ایسا نہ آئے گا جسے یاد کرکے تسکین ہو کہ میں نے بھی کبھی اچھے دن دیکھے تھے۔ آج سے پہلے مادھوی کبھی ایسی یاس زدہ اور شکستہ خاطر نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنی خیالی محبت میں مخمور تھی۔ آج اس کے دل میں نئی آرزوئیں پیدا ہوئی ہیں۔ اور یہ آنسو اُنھیں کے کرشمے ہیں جو دل سولہ برسوں تک حسرتوں کی آرام گاہ رہ چکا ہو وہی اس وقت مادھوی کے خیالات کا اندازہ لگا سکتا ہے۔

سُباما کے دل میں بھی آج نئی آرزوؤں نے سر اُبھارا تھا۔ جب تک بالاجی کو نہ دیکھا تھا سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ ایک نظر دیکھ کر کلیجہ ٹھنڈا کرلیتی۔ آج جب ایک نظر دیکھ لیا تو کچھ اور دیکھنے کی ہوس پیدا ہوئی مگر افسوس! مادھوی کے گھروندے کی طرح خاک میں مِل جانے کے لیے۔

آج سُباما، برجن اور بالاجی میں شام تک باتیں ہوتی رہیں۔ بالاجی نے اپنے تجربات بیان کیے۔ سُباما نے اپنی رام کہانی سُنائی اور برجن نے کہا تھوڑا سُنا بہت۔ منشی سجیون لال کے سنیاس کی خبر پاکر دونو روئیں۔ جب چراغ جلنے کا وقت آپہنچا تو بالاجی گنگا کی طرف سندھیا کرنے چلنے گئے اور سُباما کھانا پکانے بیٹھی۔ آج کتنے دنوں کے بعد وہ من لگا کر کھانا پکا رہی ہے۔

دونوں باتیں کرنے لگیں۔

سُباما۔ میری یہ دلی لالسا تھی کہ میرا لڑکا دُنیا میں نیک نام ہو اور ایشور نے میری لالسا پوری کردی۔ پرتاپ نے باپ کا اور خاندان کا نام روشن کر دیا۔ آج جب سویرے میرے

پتی کی جے منائی جا رہی تھی تو میرا دل اُمڈ اُمڈ آتا تھا۔ میں صرف اتنا چاہتی ہوں
کہ وہ یہ ویراگ تیاگ دیں۔ دیش کا اُپکار کرنے سے میں اُنھیں نہیں روکتی۔ میں
نے تو دیوی جی سے یہی بردان مانگا تھا۔ مگر انھیں سنیاس میں دیکھ کر میرا کلیجہ بیٹھا
جاتا ہے۔

برجن۔ سُباما کا مطلب سمجھ گئی۔ بولی۔ "چچی یہ بات تو میرے دل میں پہلے ہی سے جمی ہوئی
تھی۔ موقع پاتے ہی ضرور ذکر کروں گی۔"

سُباما۔ موقع شاید ہی ملے۔ اِن کا کون ٹھکانا۔ اسی وقت جی میں آوے کہیں چل دیں سُنتی
ہوں سونٹا ہاتھ میں لیے اکیلے جنگلوں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ مجھ سے اب
بے چاری مادھوی کی دشا نہیں دیکھی جاتی۔ اسے دیکھتی ہوں تو جیسے کوئی میرے
کلیجے کو کچلنے لگتا ہے۔ میں نے بہت عورتیں دیکھیں اور بہتوں کا حال کتابوں میں
پڑھا مگر ایسا پریم کہیں نہیں دیکھا۔ بے چاری نے آدھی عمر رو رو کر کاٹ دی اور
کبھی مُنہ سے شکایت کا ایک لفظ نہیں نکالا۔ میں نے کبھی اِسے روتے نہیں دیکھا مگر
رونے والی آنکھیں اور ہنسنے والے مُنہ چھپے نہیں رہتے۔ مجھے ایسی ہی بہو کی لالسا
تھی۔ وہ بھی ایشور نے پُوری کردی۔ تم سے سچ کہتی ہوں میں اُسے اپنی بہو ہی
سمجھتی ہوں۔ آج سے نہیں برسوں سے۔

برج رانی۔ آج اُسے دن بھر روتے گزرا۔ بہت اُداس دکھائی دیتی ہے۔

سُباما۔ تو آج ہی اُس کا ذکر چھیڑو۔ ایسا نہ ہو کل کسی طرف کی راہ لیں تو پھر ایک جُگ تک
انتظار کرنا پڑے۔

برج رانی۔ (غور کرکے) ذکر کرنے کو تو میں کردوں مگر مادھوی خود جیسی خوبی سے یہ کام
کرسکتی ہے۔ کوئی دوسرا نہیں کرسکتا۔

سُباما۔ وہ بے چاری اپنی زبان سے کیا کہے گی؟

برج رانی۔ اُس کی آنکھیں آپ ساری رام کہانی کہہ دیں گی۔

سُباما۔ وہ اپنے دل میں کیا کہیں گے۔

برج رانی۔ کہیں گے کیا؟ یہ تمھاری بُھول ہے کہ تم مادھوی کو کنواری سمجھ رہی ہو۔ مدت
گزری کہ وہ پرتاپ چند کی دُلہن بن چکی ہے۔ ایشور کے یہاں اُس کا بیاہ اُن سے

ہو چکا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا دُنیا آدمیوں سے خالی تھی۔ مادھوی جیسی عورت کو کون آنکھوں میں نہ بٹھائے گا۔ کیا اُس نے اپنی آدھی جوانی مُفت میں رو رو کر گنوائی ہے۔ اُس نے آج تک خیال میں بھی کسی غیر شخص کو جگہ نہیں دی۔ بارہ برسوں سے تپسوِنی کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ وہ پلنگ پر نہیں سوئی۔ کوئی رنگین کپڑا نہیں پہنا۔ بال تک نہیں گوندھائے۔ کیا یہ سب باتیں نہیں کہتیں کہ مادھوی کا بیاہ اُن سے ہو چکا۔ دِلوں کا ملاپ سچّا بیاہ ہے۔ سیندور کا ٹیکہ اور گٹھ بندھن اور بھانوریں یہ سب دُنیا کے ڈھکوسلے ہیں۔

سُباما۔ اچھا جیسا مناسب سمجھو کرو۔ میں صرف جگ ہنسائی سے ڈرتی ہوں۔

رات کے نو بج گئے تھے۔ آسمان پر تارے چھٹکے ہوئے تھے۔ مادھوی باغیچہ میں اکیلی بیٹھی ہوئی تاروں کو دیکھتی تھی۔ اور دل میں سوچتی تھی کہ یہ دیکھنے میں کیسے چمکیلے ہیں مگر کتنی دُور۔ کوئی وہاں تک پہنچ سکتا ہے؟ کیا میری امیدیں بھی انھیں تاروں کی طرح ہیں۔ اتنے میں برجن نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر ہلایا۔ مادھوی چونک پڑی۔

برجن۔ اندھیرے میں بیٹھی یہاں کیا کر رہی ہے؟

مادھوی۔ کچھ نہیں۔ تاروں کو دیکھ رہی ہوں وہ کیسے خوشنما ہیں۔ مگر مِل نہیں سکتے۔ برجن کے کلیجے میں برچھی سی لگ گئی۔ ضبط کرکے بولی۔ ”تارے گننے کا یہ وقت نہیں ہے۔ جس مہمان کے لیے آج سویرے تک پھولی نہیں سماتی تھی۔ کیا اسی طرح اس کی مہمانداری کروگی؟

مادھوی۔ میں ایسے مہمان کی مہمانداری کرنے کے قابل کب ہوں؟

برجن۔ اچھا یہاں سے اُٹھو تو۔ میں مہمانداری کرنے کا ڈھنگ بتاؤں گی۔

یہ کہہ کر برجن نے مادھوی کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھا دیا۔ دونوں اندر آئیں۔ سُباما کھانا پکا چکی تھی۔ بالاجی کو ماں کا بنایا ہوا کھانا آج مدتوں کے بعد ملا۔ بڑی رغبت سے کھایا۔ سُباما کھِلاتی جاتی تھی اور روتی جاتی تھی۔ جب بالاجی کھا پی کر لیٹے تو برجن نے مادھوی سے کہا۔ ”اب یہاں کونے میں منہ ڈھانپ کر کیا بیٹھی ہو؟“

مادھوی۔ کچھ دے دو کھاکے سو رہوں۔ اب یہی جی چاہتا ہے۔

برجن۔ مادھوی ایسی نراس نہ ہو۔ کیا اتنے دنوں کا برت ایک دن میں بھنگ کردے گی۔

مادھوی اُٹھی مگر دل بیٹھا جاتا تھا۔ جیسے بادلوں کی کالی گھٹائیں اُٹھتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب جل تھل ایک ہوجائے گا۔ مگر یکایک پچھوا ہوا چلنے لگتی ہے اور سارے بادل کائی کی طرح پھٹ جاتے ہیں۔ اسی طرح اس وقت مادھوی کے دل کی کیفیت ہورہی تھی۔

یہ مبارک دن دیکھنے کی آرزو اُس کے دل میں کتنے دنوں سے تھی۔ کبھی وہ دن آئے گا کہ میں اُن کے درشن پاؤں گی۔ اور اُن کی امرت کی سی باتیں سنوں گی۔ اس دن کے لیے اُس نے کیسی کیسی منتیں مانی تھیں۔ اس دن کے خیال ہی سے اُس کا دل کیسا کھل اُٹھتا تھا۔

آج صبح مادھوی بہت خوش تھی۔ اُس نے بڑے شوق سے پھولوں کا ہار گوندھا تھا۔ سینکڑوں کانٹے ہاتھ میں چُبھا لیے۔ متوالوں کی طرح گرگر پڑتی تھی۔ یہ سب خوشی اور نشہ اسی لیے تو تھا کہ آج وہ مبارک دن آگیا۔ آج وہ دن آگیا۔ جس کی طرف ایک مدتِ دراز سے آنکھیں لگی ہوئی تھیں۔ وہ زمانہ بھی اب یاد نہیں جب یہ آرزو دل میں نہ رہی ہو۔ مگر اس وقت مادھوی کے دل کی وہ کیفیت نہیں۔ خوشی کی بھی انتہا ہوتی ہے۔ غالبًا وہ مادھوی کی خوشی کی انتہا تھی۔ جب وہ باغیچہ میں جُھوم جُھوم کر پھولوں سے آنچل بھر رہی تھی۔ جس نے کبھی خوشی کا مزہ ہی نہ چکھا ہو۔ اس کے لیے اتنی ہی خوشی معراجِ کامرانی ہے۔ وہ غریب اس سے زیادہ خوشی کا بوجھ نہیں سنبھال سکتی۔ جن ہونٹوں پر کبھی ہنسی ہی نہیں آئی۔ اُن کا مسکرانا ہی ہنسی ہے۔ تم ایسوں سے زیادہ ہنسنے کی اُمید کیوں رکھتے ہو۔ مادھوی بالاجی کی طرف چلی مگر اس طرح نہیں جیسے ایک نئی نویلی بہو ارمانوں سے بھری ہوئی سنگار کیے اپنے پتی کے پاس جاتی ہے۔ یہی کمرہ تھا جسے وہ اپنے دیوتا کا مندر سمجھتی تھی۔ جب مندر خالی تھا۔ تب وہ آآکر اس میں آنسوؤں کے پھول چڑھاتی تھی۔ آج جب دیوتا نے باس کیا ہے تو وہ کیوں یوں مچل مچل کر آرہی ہے۔

رات خوب بھیگ چکی تھی۔ سڑک پر سے گاڑیوں کی گھنٹیوں کی آوازیں کان میں آرہی تھیں۔ مادھوی دبے پاؤں بالاجی کے کمرہ کے دروازہ تک گئی۔ اُس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اندر جانے کی ہمّت نہ پڑی۔ کسی نے پیر تھام لیے۔ اُلٹے قدم لوٹ آئی۔ اور زمین پر

بیٹھ کر رونے لگی۔ اُس کے دل نے کہا مادھوی! یہ بڑے شرم کی بات ہے۔ تُو بالا جی کی چیری سہی۔ مانا کہ تجھے اُن سے پریم ہے مگر تُو ان کی دُلہن نہیں ہے۔ تجھے اس وقت اُن کے کمرہ میں قدم رکھنا ہرگز مناسب نہیں۔ تیرا پریم تجھے اُن کی پتنی نہیں بنا سکتا۔ پریم اور چیز ہے۔ سُہاگ اور چیز۔ پریم دل کا جھکاؤ ہے۔ بیاہ ایک پاک فرض ہے۔ تب مادھوی کو ایک بیاہ یاد آیا۔ دولھے نے بھری سبھا میں دُلہن کی بانہہ پکڑی تھی اور کہا تھا کہ اس استری کو میں اپنے گھر کہ مالکہ اور اپنے دل کی دیوی سمجھتا رہوں گا۔ اس سبھا کے لوگ اور آکاش اور اگنی اور دیوتا اس کے گواہ رہیں۔ آہ! کیسے مُبارک الفاظ ہیں۔ مجھے بھی کبھی یہ الفاظ سُننے نصیب ہوئے تھے۔ میں نہ اگنی کو اپنا ساکشی بنا سکتی ہوں نہ دیوتاؤں کو نہ آکاش کو۔ مگر اے اگنی۔ اے آکاش کے تارو۔ !ے دیولوک کے باسیو تم شاہد رہنا کہ مادھوی نے بالا جی کی پاک صورت کو دل میں جگہ دی مگر کسی ناپاک خیال کو دل میں نہ آنے دیا۔ اگر میں نے کمرہ کے اندر قدم رکھا ہو تو اے اگنی تم اسی وقت مجھے جلاکر راکھ کر دو۔ اے آکاش! اگر تونے اپنی ہزار آنکھوں سے بھی مجھے کمرہ میں جاتے دیکھا ہو تو ابھی دم مجھ پر اِندر کا بجر گرا دے۔

مادھوی کچھ دیر تک انھیں خیالات میں ڈُوبی بیٹھی رہی۔ یکایک اُس کے کان میں بَھک بَھک! کی آواز آئی۔ اس نے چونک کر دیکھا تو بالا جی کا کمرہ بہت زیادہ روشن ہوگیا تھا۔ اور کھڑکیوں سے روشنی باہر نکل کر صحن میں پھیل رہی تھی۔ مادھوی کے پیر تلے سے مٹی نکل گئی۔ معاً خیال گزرا کہ میز کا لیمپ بھبک اُٹھا۔ ہوا کی طرح وہ بالا جی کے کمرہ میں گھسی۔ دیکھا تو لیمپ زمین پر پھٹ گر گر پڑا ہے۔ اور فرش میں تیل کے پھیل جانے سے آگ لگ گئی ہے۔ دوسرے کنارے پر بالا جی آرام سے سو رہے تھے۔ ابھی تک اُن کی نیند نہ کُھلی تھی۔ اُنھوں نے قالین سمیٹ کر ایک کونے میں رکھ دیا تھا۔ بجلی کی طرح لپک کر مادھوی نے یہ قالین اُٹھا لیا اور اُسے شعلوں کے اُوپر گرا دیا۔ دھماکے کی آواز ہوئی تو بالا جی نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ کمرہ میں دھواں بھرا ہوا تھا۔ اور چاروں طرف تیل کی بدبُو پھیلی ہوئی تھی۔ واقعہ کی صُورت سمجھ گئے بولے ”بڑی خیریت ہوئی ورنہ کمرہ میں آگ لگ گئی تھی۔“

مادھوی۔ جی ہاں ذرا لیمپ گر پڑا تھا۔

بالاجی۔ تم بڑے موقع سے آپہنچیں۔ کیسے معلوم ہوا تمھیں؟
مادھوی۔ میں یہیں باہر بیٹھی ہوئی تھی۔
بالاجی۔ تم کو بڑی تکلیف ہوئی۔ اب جاکر سوؤ۔ رات زیادہ ہوگئی ہے۔
مادھوی۔ چلی جاؤں گی۔ سونا تو روز ہے۔ یہ موقع نہ جانے پھر کب آئے۔

مادھوی کی آواز میں غضب کا درد تھا۔ بالاجی نے اُس کی طرف غور سے دیکھا۔ اٹھارہ سال پہلے انھوں نے مادھوی کو دیکھا تھا۔ اس وقت وہ ایک کھِلتی ہوئی کلی تھی۔ اور آج ایک مُرجھایا ہوا پھُول۔ نہ چہرہ پر تازگی نہ آنکھوں میں خوشی۔ نہ مانگ میں سُہاگ کا ڈورا تھا۔ نہ ماتھے پر سیندور کا ٹیکہ۔ جسم پر زیوروں کا نشان بھی نہ تھا۔ بالاجی نے قیافہ سے سمجھا کہ بدھاتا نے عین شباب میں اس دُکھیا کا سُہاگ ہر لیا ہے۔ بہت مغموم ہوکر بولے۔"کیوں مادھوی۔ تمھارا بیاہ تو ہوگیا ہے؟"

مادھوی کے کلیجے میں چُھری اُتر گئی۔ آبدیدہ ہوکر بولی:۔"جی ہاں ہوگیا ہے۔"

بالاجی۔ اور تمھارا پتی؟
مادھوی۔ انھیں میری کچھ سُدھ ہی نہیں۔ اُن کا بیاہ مُجھ سے نہیں ہوا؟
بالا جی متحیر ہوکر بولے۔"تمھارا پتی کیا کرتا ہے؟"
مادھوی۔ دیش کی سیوا۔

بالاجی کی آنکھوں کے سامنے سے ایک پردہ سا ہٹ گیا۔ مادھوی کا مطلب سمجھ گئے۔ پوچھا۔

مادھوی! اس بیاہ کے کتنے دن ہوئے؟

مادھوی۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔ بہت دن ہوئے۔ شاید اٹھارہ بیس سال۔

بالاجی کی آنکھیں پُرآب ہوگئیں اور چہرہ پر قومی غرور کا نشہ سا چھا گیا۔ بھارت ماتا! آج اس گئے گزرے زمانے میں بھی تمھاری گود میں ایسی ایسی دیویاں کھیل رہی ہیں جو ایک خیال پر اپنی زندگی اور جوانی کی آرزوئیں قربان کرسکتی ہیں۔ بولے۔ ایسے پتی کو تم تیاگ کیوں نہیں دیتیں؟

مادھوی نے بالاجی کی طرف پُرغرور نگاہوں سے دیکھا۔ اور بولی۔"سوامی جی! آپ اپنی زبان سے ایسا نہ فرمائیں۔ میں ہندو عورت ہوں۔ میں نے گاندھاری اور ساوتری کے

کُل میں جنم لیا ہے۔ جسے ایک بار دل سے اپنا پتی مان چکی اُسے نہیں تیاگ سکتی۔ اگر میری زندگی یوں ہی روتے روتے کٹ جائے تو بھی اپنے پتی کی طرف سے مجھے مطلق ملال نہ ہوگا۔ جب تک میرے تن میں جان رہے گی۔ میں ایشور سے اُن کی بھلائی چاہتی رہوں گی۔ میرے لیے یہی کیا کم ہے کہ ایسے مہاتما کے پریم نے میرے دل میں باس کیا۔ میں اسی کو اپنا سوبھاگیہ سمجھتی ہوں۔ آج اٹھارہ سال سے زیادہ ہوا کہ میں نے بناؤ سنگار کا خیال تک دل میں نہیں آنے دیا۔ میں نے ایک بار اپنے سوامی کو دُور سے دیکھا تھا اور وہ تصویر ایک دم کے لیے بھی میری نگاہوں سے نہیں اُتری۔ جب کبھی میں بیمار ہوئی ہوں۔ اُسی تصویر نے میری تیمار داری کی ہے۔ جب کبھی میں نے بیوگ کے دُکھ سے بے چین ہوکر آنسو بہائے ہیں۔ اُسی تصویر نے مجھے ڈھارس دیا ہے۔ اُس پتی کو میں کیسے تیاگ دُوں۔ میں اُس کی ہوں اور ہمیشہ اُسی کی رہوں گی۔ میرا دل اور میری جان اُس کے نذر ہوچکے اگر وہ کہے تو آج میں آگ کی گود میں ایسی خوشی سے جا بیٹھوں۔ گویا پھُولوں کا سیج ہے۔ اگر میری جان اُس کے کسی کام آئے تو میں ایسی خوشی سے دے دوں گی۔ جیسے کوئی اُپاسک دیوتا پر پھُول چڑھا دیتا ہے۔

مادھوی کا چہرہ جوش سے گلگوں ہو رہا تھا۔ بالاجی نے اُس کی سُنیں اور دم بخود ہوگئے۔ یہ وہ عورت ہے جس نے صرف میرے خیال پر اپنی زندگی قربان کردی۔ اس خیال سے بالاجی کی آنکھیں پُر آب ہوگئیں۔ جس پریم نے ایک عورت کی زندگی جلا کر خاک کردی ہو۔ اُس کے لیے ایک آدمی کے استقلال کو جلا ڈالنا کوئی بڑی بات نہیں۔ پریم کے مقابلے میں ضبط کوئی چیز نہیں ہے۔ بولے۔"مادھوی! تم جیسی دیویاں بھارت کے لیے سرمایۂ ناز ہیں۔ میں بڑا خوش نصیب ہوں کہ تمھارے پریم جیسی انمول چیز یُوں میرے ہاتھ آرہی ہے۔ اگر تم نے میرے لیے جوگنی بننا پسند کیا ہے تو میں بھی تمھارے لیے اس سنیاس اور ویراگ کو خیرباد کہہ سکتا ہوں جس کے لیے تم نے اپنے تئیں مٹا دیا ہے۔ وہ تمھارے لیے بڑی سے بڑی قربانی کرنے سے بھی نہ ہچکے گا۔"

مادھوی نے فوراً جواب دیا۔ وہ اس جواب کے لیے پہلے ہی سے تیار تھی۔"سوامی جی! میں بہت کمزور اور بے عقل عورت ہوں۔ مگر میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ ذاتی آرام کا خیال آج تک ایک لمحہ کے لیے بھی میرے دل میں نہیں آیا۔ اگر آپ نے یہ خیال کیا کہ

میرے پریم کا معراج صرف یہ ہے کہ آپ کے پَیروں میں سنسار کے بندھنوں کی بیڑیاں ڈال دُوں تو (ہاتھ جوڑکر) آپ نے اس کی حقیقت بالکل غلط سمجھی۔ میرے پریم کا معراج وہی تھا جو آج مجھے حاصل ہوگیا۔ آج کا دن میری زندگی کا سب سے مبارک دن ہے۔ آج میں اپنے پران ناتھ کے سامنے کھڑی ہوں اور اپنے کانوں سے اُن کی امرت مئی باتیں سُن رہی ہوں۔ سوامی جی! مجھے اُمید نہ تھی کہ اس زندگی میں مجھے یہ دن دیکھنا نصیب ہوگا۔ اگر میرے پاس دُنیا کا راج ہوتا تو میں اِس خوشی میں اُسے آپ کے قدموں پر نثار کردیتی۔ میں ہاتھ جوڑ کر آپ سے منّت کرتی ہوں کہ مجھے اب چرنوں سے الگ نہ کیجیے گا۔ میں سنیاس لے لوں گی اور آپ کے ساتھ رہوں گی۔ میں ویراگن بنوں گی۔ بھبوت رماؤں گی۔ مگر آپ کا ساتھ نہ چھوڑوں گی۔ پران ناتھ میں نے بہت دُکھ سہے ہیں۔ مگر اب یہ جلن نہیں سہی جاتی تھی۔"

یہ کہتے کہتے مادھوی کا گلا روندھ گیا اور آنکھوں سے پریم کی دھارا بہنے لگی۔ اُس سے وہاں نہ بیٹھا گیا۔ اُٹھ کر پرنام کیا اور برجن کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ برج رانی نے اسے گلے لگا لیا اور پوچھا۔ کیا بات چیت ہوئی؟

مادھوی۔ جو تم چاہتی تھیں۔

برج رانی۔ سچ۔ کیا بولے؟

مادھوی۔ یہ نہ بتلاؤں گی۔

برج رانی کو گویا بڑی دولت مل گئی۔ بولی۔ ایشور نے بہت دنوں میں میرا حوصلہ پورا کیا۔ میں اپنے یہاں سے بیاہ کروں گی۔ مادھوی مایوسانہ انداز سے مسکرائی۔ برجن نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔"ہم کو بُھول تو نہ جائے گی۔" اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ پھر آواز سنبھال کر بولی۔"تو ہم سے اب بچھڑ جائے گی۔"

مادھوی۔ "میں تمھیں چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گی۔"

برجن۔ "چل باتیں نہ بنا۔"

مادھوی۔ "دیکھ لینا۔"

برجن۔ "دیکھا ہے۔ جوڑا کیسا پہنے گی۔"

مادھوی۔ سفید جیسے بگلے کا پر۔
برجن۔ سہاگ کا جوڑا کیسریے رنگ کا ہوتا ہے۔
مادھوی۔ میرا اُجلا رہے گا۔
برجن۔ تجھے چندر ہار بہت پسند تھا۔ میں اپنا دے دوں گی۔
مادھوی۔ (مسکرا کر) ہار کی جگہ کنٹھی دے دینا۔
برجن۔ کیسی باتیں کر رہی ہے؟
مادھوی۔ اپنے سنگار کی۔
برجن۔ تیری باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ تو اس وقت اتنی اُداس کیوں ہے۔ تُو نے اس رتن کے لیے کیسی کیسی تپسیا کی۔ کیسا کیسا جوگ سادھا۔ کیسے کیسے برت رکھے اور آج تجھے جب وہ رتن مل گیا تو تُو خوش نہیں دکھائی دیتی۔
مادھوی۔ تم بیاہ کی بات چیت کرتی ہو۔ اس سے مجھے صدمہ ہوتا ہے۔
برجن۔ یہی تو خوش ہونے کی بات ہے۔
مادھوی۔ بہن میرے بھاگ میں وہ خوشی لکھی ہی نہیں۔ جو چڑیا بادلوں میں گھونسلا بنانا چاہتی ہے وہ سدا ڈالیوں پر رہے گی۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ زندگی کے یہ چند سال اسی طرح پریم کا سپنا دیکھنے میں کاٹ دُوں۔

الوداع

دوسرے دن بالاجی اشنان دھیان سے فارغ ہوکر راجا دھرم سنگھ کا انتظار کرنے لگے۔ آج راج گھاٹ پر ایک عظیم الشان گئوشالہ کی بنیاد پڑنے والی تھی۔ شہر کے کوچہ و بازار مُسکراتے نظر آتے تھے۔ سڑک پر دو رویہ بیرقیں اور جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔ سڑکیں نہا دھوکر اپنا سینہ فرشِ راہ کیے ہوئے تھیں۔ دروازے پھولوں کی مالا گلے میں ڈالے خیرمقدم کرنے کے لیے تیار تھے۔ کیونکہ آج اس حبیبِ وطن کی آمد ہے جس نے اپنا سب کچھ ملک پر قربان کردیا ہے۔

خوشی کی دیوی اپنی سکھیوں اور سہیلیوں کے ساتھ محوِ خرام تھی۔ ہوا مستی سے جُھومتی پھرتی تھی۔ رنج و غم کا کہیں نشان نہ تھا۔ جابجا نوبت جھڑ رہی تھی۔ مرد خوش وضع لباس زیبِ تن کیے اِٹھلاتے تھے۔ عورتیں سولہوں سنگار کیے منگل گیت گاتی تھیں۔ لڑکے زعفرانی صافے باندھے کلیلیں کرتے تھے ہر مرد و زن کے چہرہ سے خوشی جھلک رہی تھی۔ کیونکہ آج قوم کے ایک سچے جان نثار کی آمد ہے۔ جس نے اپنا سب کچھ قوم کی نذر کردیا ہے۔

بالاجی جب اپنے جاں نثار رفیقوں کے ساتھ راج گھاٹ کی طرف چلے تو سورج نے گوشۂ مشرق سے نکل کر ان کا استقبال کیا۔ اُن کا مردانہ چہرہ جوں ہی لوگوں نے دیکھا ہزاروں زبانوں سے "بھارت کی جے" کا پُرخروش نعرہ نکلا اور فضائے آسمان کو چیرتا ہوا گنبد گردوں تک جا پہنچا۔ گھنٹے اور ناقوس کی صدائیں بلند ہوئیں اور مسرّت کے دلآویز نغمے ہوا میں گونجنے لگے۔ جس طرح شمع کو دیکھتے ہی پروانے اُس پر نثار ہونے کو ٹُوٹ پڑتے ہیں۔ اُسی طرح بالاجی کو دیکھ کر لوگ بڑی تیزی سے اُن کے چاروں طرف جمع ہوگئے۔ 'ارجن سبھا' کے سوا سو ممبروں نے باقاعدہ سلام کیا۔ اُن کی خوشنما وردیاں اور سبک خرام گھوڑے نظروں میں کھُبے جاتے تھے۔ اس جماعت کا ایک ایک ممبر قوم کا سچّا جاں نثار تھا اور اُن کے پُرجوش نعرے لوگوں کے دلوں کو حوصلہ سے لبریز کیے دیتے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ نوبتیں جھڑ رہی تھیں۔ پھُول اور میوے برس رہے

تھے۔ جابجا شہر کی للنائیں سنگار کیے سُنہرے تھالوں میں کافور، پھول اور صندل لے آرتی اُتارتی جاتی تھیں۔ دُکانیں عروسِ زیبا کی طرح آراستہ تھیں۔ سارا شہر رشکِ چمن بنا ہوا تھا اور جس طرح ساون کے مہینے میں کالی کالی گھٹائیں اُٹھتی ہیں اور رہ رہ کر رعد کی گھن گرج صدا دِلوں کو ہلا دیتی ہے اسی طرح اس خلقت بے پایاں کی زبانوں سے ''بھارت کی جے'' کی حوصلہ خیز آوازیں دلوں میں ولولہ اور گرمی پیدا کر رہی تھیں۔ جب بالاجی چوک میں پہنچے تو ایک عجیب نظارہ دیکھا۔ پانچ سو نو عمر لڑکے اودے رنگ کے لیس دار کوٹ پہنے زعفرانی رنگ کے پیچ دار صافے باندھے اور ہاتھوں میں خُوبصورت سونٹے لیے سر راہ کھڑے تھے۔ بالا جی کو دیکھتے ہی وہ دس دس کی قطاروں میں ہوگئے اور اپنے ڈنڈے بجا بجا کر یہ پُر اثر گیت گانے لگے۔

بالاجی تیرا آنا مبارک ہوئے

دھن دھن بھاگ ہیں اس نگری کے — دھن دھن بھاگ ہمارے

دھن دھن اس نگری کے باسی — جہاں تیرے چرن پدھارے

بالاجی تیرا آنا مبارک ہوئے

کیسا نظارہ دلکشا تھا۔ نغمہ اگرچہ سادہ تھا مگر متعدد موزوں آوازوں نے مِل کر اُسے بلا کا دلکش اور پُراثر بنا دیا تھا۔ لوگوں کے قدم وہیں جم گئے اور چوطرفہ سناٹا چھا گیا۔ خموشی میں یہ ترانہ ایسا ہی سُہانا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے رات کے سناٹے میں نغمۂ عندلیب۔ سارا عالم نقشِ حیرت بنا کھڑا تھا۔ غریب بھارت باسیو! تم نے ایسے نظارے کہاں دیکھے۔ اس وقت خوب سیر ہوکر دیکھ لو۔ تم رقّاصانِ دلنواز کی نغمہ سرائیوں سے آسودہ ہوگئے۔ حسینوں کی نازک ادائیاں بہت دیکھ چکے۔ گل و گلشن کی بہت سیریں کیں مگر وہ مسرت علوی۔ وہ حوصلہ نہ طرب خیز جو اس وقت تم محسوس کر رہے ہو۔ تمھیں کہیں اور بھی حاصل ہوا تھا۔ رقّاصانِ دلنواز کے نغمے اور حسینوں کی نازک ادائیاں اور گل و گلشن کی سیریں تمھارے نفس کو خوش کرتی ہیں مگر تمھارے حوصلوں کو پست اور کمزور بنا دیتی ہیں۔ لیکن ایسے نظام تم میں قومیت اور قومی جوش اور قومی ہمدردی کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ اگر تم نے اپنی زندگی میں ایک بار بھی یہ نظارہ دیکھا ہے تو اس کا پاک نقش تمھارے دِلوں سے کبھی نہ مٹے گا۔

بالاجی کا وجیہہ چہرہ روحانی مسرت کی روشنی سے منور ہو رہا تھا اور آنکھوں سے سچے قومی غرور کی شعاعیں نکل رہی تھیں جس طرح کسان اپنے لہلہاتے ہوئے کھیت کو دیکھ کر خوشی کے نشہ سے متوالا ہوجاتا ہے وہی کیفیت اس وقت بالاجی کی تھی۔ جب نغمہ بند ہوگیا۔ تو انھوں نے چند قدم آگے بڑھ کر وہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو اُٹھاکر اپنے کندھوں پر بٹھا لیا اور عالمِ مستی میں زور سے ایک نعرہ لگایا۔"بھارت ماتا کی جے۔"

اس طرح خراماں خراماں لوگ راج گھاٹ پہنچے۔ یہاں گئوشالہ کی ایک شاندار سر بہ فلک عمارت استقبال کے لیے کھڑی تھی۔ صحن میں مخملی فرش بچھا ہوا تھا۔ محرابیں، ستون اور دروازے خوشنما پھولوں اور پتیوں سے سجے ہوئے تھے۔ مکان کے اندر کئی ہزار گائیں بندھی ہوئی تھیں۔ بالاجی نے اپنے ہاتھوں سے اُن کے ناندوں میں کھلی اور بھوسہ ڈالا۔ اُنھیں پیار سے تھپکیاں دیں۔ ایک وسیع کمرہ میں سنگِ مرمر کا مثمن حوض بنا ہوا تھا۔ دودھ سے لبریز۔ بالاجی نے ایک چلّو دودھ لے کے آنکھوں سے لگایا اور پی گئے۔ اس کے بعد ہزاروں آدمی اس چشمہ آبِ حیات سے فیضیاب ہوئے۔

ابھی صحن میں لوگ اطمینان سے بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ کئی آدمی بدحواس دوڑتے ہوئے آئے اور کہا کہ پنڈت بدلوشاستری، سیٹھ اُتم چند اور لالہ مکھن لال باہر کھڑے غل مچا رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم کو بالاجی سے دو دو باتیں کرلینے دو۔ بدلو شاستری بنارس کے نامی گرامی پنڈت تھے۔ خوبصورت ہلالی تلک لگاتے۔ سبز بانات کی مرزائی پہنتے اور بسنتی پگڑی باندھتے تھے۔ اُتم چند اور مکھن لال دونوں شہر کے رئیس اعظم لکھ پتی آدمی تھے۔ خطاب کے لیے ہزاروں لاکھوں خرچ کرتے اور اعلیٰ عہدہ داروں کی تواضع و تکریم و خاطر و مدارت کو فرض اولیٰ سمجھتے تھے۔ ان حضرات کا شہر کے آدمیوں پر بڑا دباؤ تھا۔ بدلوشاستری جب کبھی شاستر ارتھ کرتے تو یہ یقینی بات تھی کہ فریق ثانی کی خیریت نہیں۔ خصوصاً بنارس کے پنڈے اور پراگوال اور اسی قبیل کے دوسرے مُفت خور تو ان کے پسینہ کی جگہ خُون بہانے کو تیار رہتے تھے۔ شاستری جی بنارس میں سناتن دھرم کے وکیل اور رکن اعظم مشہور تھے۔ اُتم چند اور مکھن لال بھی مذہبی جوش و خروش سے لبریز تھے۔ اس وقت اُن کی تشریف آوری فتنہ انگیزی سے خالی نہ تھی۔ سناتن دھرم کا فرضِ اولین تمدن کے نقائص کی حمایت کرنا ہے اور چونکہ بالاجی اصلاح کے پُرزور حامی تھے۔ اس لیے ان کی

مخالفت کرنا اور انھیں زک دینا سناتن دھرم کے اراکین کا فرضِ مذہبی تھا۔ بالاجی کی روز افزوں کامیابیوں کو دیکھ دیکھ کر اُن کے کلیجے پر سانپ لوٹتا رہتا تھا۔ اور یہ لوگ عرصہ سے بالاجی کے ساتھ شاستر ارتھ کرنے یا بہ الفاظ دیگر فوجداری کرنے کا موقع ڈھونڈھ رہے تھے۔ آج اُن کی دلی مرادیں بر آئیں۔ پنڈوں اور پراگ والوں کی ایک جمعیت کثیر لے کر آپہنچے۔

بالاجی نے ان مہاتماؤں کے آنے کی خبر سنی تو باہر نکل آئے۔ مگر یہاں کی کیفیت دیکھی تو ہوش اُڑ گئے۔ طرفین کے لوگ۔ لاٹھیاں سنبھالے۔ آستین چڑھائے گتھنے کو تیار کھڑے تھے۔ شاستر جی پراگ والوں کو وار کرنے کے لیے للکار رہے تھے اور سیٹھ جی بآوازِ بلند فرما رہے تھے۔ کہ ان شوُدروں کی دھجّیاں اُڑا دو۔ ہم عدالت میں دیکھ لیں گے۔ تمھارا بال بیکا نہ ہونے پائے گا۔ مکھن لال صاحب بھی گلا پھاڑ پھاڑکر فرماتے تھے کہ نِکل آئے جسے بوتا ہو۔ ایک ایک کو سبز باغ دکھا دوں گا۔ بالاجی نے جب یہ رنگ دیکھا تو راجا دھرم سنگھ سے بولے۔ آپ بدلو شاستری کو جاکر سمجھا دیجیے کہ اس شروفساد سے باز آئیں ورنہ طرفین کا نقصان ہوگا اور جگ ہنسائی ہوگی۔ الگ راجا صاحب کی آنکھوں سے انگارے برس رہے تھے بولے اس شخص سے بات کرنا میں اپنی توہین سمجھتا ہوں۔ اسے پراگ والوں کی جمعیت پر غرہ ہے۔ مگر میں آج اُن کی ساری شیخی کرکری کیے دیتا ہوں۔ اُن کا منشا بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ آپ پر وار کریں مگر جب تک میں اور میرے پانچوں بیٹے زندہ ہیں کوئی آپ کی طرف آنکھ نہیں اُٹھا سکتا۔ بس آپ کے ایک اشارہ کی دیر ہے اور میں دم کی دم میں انھیں اس شرارت کا مزہ چکھا دوں گا۔

بالاجی سمجھ گئے کہ یہ شیر بپھر گیا ہے۔ اس سے مصالحت کی اُمید رکھنی فضول ہے۔ راجپوت جب بپھرتا ہے تو اسے مرنے مارنے کے سوائے اور کوئی خیال نہیں رہتا۔ بولے۔"راجا صاحب! آپ دُوراندیش ہوکر ایسی باتیں کرتے ہیں۔ یہ موقع ایسی باتوں کا نہیں ہے۔ آگے بڑھ کر اپنے آدمیوں کو روکیے ورنہ نتیجہ بہت بُرا ہوجائے گا۔"

بالاجی یہ کہتے کہتے یکایک رُک گئے۔ سمندر کی لہروں کی طرح لوگ اِدھر اُدھر سے اُمڈتے چلے آتے تھے۔ ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں اور آنکھوں میں خُون کی سُرخی۔ چہرے غضب ناک۔ تیوروں پر بل پڑے ہوئے۔ دیکھتے دیکھتے یہ جماعت کثیر پراگ والوں کے سر

پر پہنچ گئی اور قریب تھا کہ لاٹھیاں سروں کا بوسہ لیں اور سنگینیں کلیجوں میں چُھبیں کہ بالاجی بجلی کی طرح کوند کر ایک گھوڑے پر سوار ہوگئے۔ اور نہایت پُرزور لہجہ میں فرمایا۔

"بھائیوں! یہ کیا اندھیر ہے۔ اگر مجھے اپنا دوست سمجھتے ہو تو فوراً ہاتھ نیچے کرلو اور پیروں کو ایک انچ آگے مت بڑھنے دو مجھے فخر ہے کہ تمھارے دِلوں میں مردانہ غصّہ اور جوش موجزن ہو رہا ہے۔ مردانہ غصّہ ایک پاک جذبہ اور مقدّس جوش ہے۔ مگر مردانہ ضبط اس سے بھی زیادہ پاک اور مقدّس ہے۔ اس وقت اپنے غصّہ کو ضبط سے روکو۔ کیا تم اپنے قوم کے ساتھ کل فرائض ادا کرچکے کہ یُوں جان دینے پر آمادہ ہو۔ کیا تم مشعل لے کر بھی کنوئیں میں گرنا چاہتے ہو۔ یہ لوگ تمھارے ہم وطن۔ تمھارے بھائی۔ تمھارے ہی خون ہیں۔ اُنھیں اپنا دشمن مت سمجھو اگر وہ جاہل ہیں تو اُن کی جہالت کو دُور کرنا تمھارا فرض ہے۔ اگر وہ تمھیں گالیاں دیں تو تم بُرا مت مانو۔ اگر وہ تم سے لڑنے پر آمادہ ہوں تو تم سلامت روی اختیار کرو اور ایک ہوشیار حکیم کی طرح اپنے بدمزاج مریضوں کے علاج کرنے میں مصروف رہو۔ میں نے تم کو بآواز بلند منع کردیا ہے۔ اگر میرے حکم کے خلاف تم میں سے کسی نے ہاتھ اُٹھایا تو وہ قوم کا دشمن ہوگا۔"

ان پُرزور الفاظ نے چوطرفہ سکوت کا عالم طاری کردیا جو جہاں تھا وہیں نقش بہ دیوار بن گیا۔ اس ایک شخص کی آواز میں کسی قیامت کا اثر تھا۔ جس نے پچاس ہزار آدمیوں کے اُمڈتے ہوئے جوش کو یوں فرو کردیا۔ جیسے کوئی ہوشیار کوچبان شریر گھوڑے کو روک لیتا ہے اور یہ طاقت اُسے کس نے دی تھی؟ نہ اُس کے سر پر تاجِ شاہی تھا۔ نہ وہ کسی فوج کا سپہ سالار تھا۔ یہ صرف اُس پاک اور بے غرض قومی خدمت کا جلوہ تھا جو اُس نے انجام دی تھی۔ خادمِ قوم کے اعزاز و امتیاز کا پیمانہ وہ قربانیاں ہوتی ہیں جو وہ اپنے قوم کے لیے کرتا ہے۔

پنڈوں اور پراگ والوں نے بالاجی کی پُرجلال صورت دیکھی اور پُرزور آواز سُنی تو اُن کا جوش بھی فرد ہوگیا۔ جس طرح آفتاب کے نکلتے ہی کُہرا پھٹ جاتا ہے۔ اُسی طرح بالاجی کے آنے سے مخالفین کی یہ فوج منتشر ہوگئی۔ کتنے ہی آدمیوں نے جو شر و فساد کی نیت سے آئے تھے فرطِ عقیدت سے بالاجی کے روبرو سر جھکایا۔ اور اُن کے عقیدت مندوں کے زمرہ میں شامل ہوگئے۔ بدلو شاستری نے ہرچند چاہا کہ پنڈوں کے تعصب اور جہالت کو

مشتعل کریں مگر ناکام رہے۔

اس وقت بالاجی نے ایک نہایت پُرزور تقریر کی۔ جس کا ایک ایک لفظ آج تک سُننے والوں کے دلوں میں منقوش ہے اور جو اہلِ ہند کے لیے ہمیشہ مشعل کا کام دے گا۔ بالاجی کی یوں تو بہت سی تقریریں ہیں مگر وہ جوش وہ شعلہ اور وہ بلندی جس سے یہ تقریر مرصع ہے۔ اُن کی کسی تقریر میں نظر نہیں آتی۔ اُنھوں نے جادوئے کلام کے زور سے چند لمحوں میں پنڈوں کو اہیروں اور پاسیوں سے گلے ملا دیا۔ اُس جاؤو صفت تقریر کے یہ آخری الفاظ تھے۔

"اگر آپ مستقل مزاجی سے کام کرتے چلے جائیں گے تو ضرور ایک دن آپ کو منزل مقصود کا سُنہرا مینار دکھائی دے گا۔ مگر استقلال کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ استقلال بڑی زبردست قوت ہے۔ استقلال مردانہ خوبیوں کا بادشاہ ہے۔ استقلال اوصافِ دلاوری کا جوہر ہے۔ اسے ہرگز ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ تمھارے سامنے آزمائشیں آئیں گی۔ تمھیں متواتر مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ناکامیاں تمھاری عنان گیر ہوں گی۔ ایسی حالتوں میں سوائے استقلال کے تمھیں کوئی قابلِ اعتماد رہنما نہ ملے گا۔ استقلال اگر کامیاب نہ بھی ہوسکے تو دُنیا میں اپنا نشان چھوڑ جاتا ہے۔"

جب بالاجی مکان کی طرف چلے تو آفتاب گوشۂ مغرب میں چھپ رہا تھا۔ اُنھیں چوک کی رونق اور زندہ دلی دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ آج شہر والوں نے اس حبیبِ وطن کی آمد کی مبارک باد میں شہر کو چراغاں کرنے کی تیاریاں کی تھیں۔ سڑک کے دونوں طرف محرابیں بنائی جا رہی تھیں۔ چوراہوں پر رفیع الشان پھاٹک کھڑے تھے اور دُکانوں پر جھاڑ فانوس اور ہانڈیاں زیب دے رہی تھیں۔ اس عام مسرّت کے جوش میں لوگ اپنے ذاتی دُکھڑے بُھول گئے تھے مگر اتفاقات نے کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ مسرّت کے یہ سامان درہم برہم ہوگئے۔ بالاجی نے مکان پر پہنچ کر اخبار کھولا تو چہرہ زرد ہوگیا۔ اور دلِ دردمند سے ایک ٹھنڈی سانس نکل آئی۔

راجا صاحب نے گھبراکر پوچھا۔"خیریت تو ہے؟"

بالاجی۔ سدیا میں طوفان آگیا۔ اور دریا کا باندھ پھٹ پڑا۔ دس ہزار آدمی خانہ تباہ ہوگئے۔

دھرم سنگھ۔ اُف!

بالاجی۔ ہزاروں آدمی سیلاب میں بہہ گئے۔ سارا شہر مسمار ہوگیا۔ مکانوں کی چھتوں پر کشتیاں چل رہی ہیں۔ ارجن سبھا کے لوگ پہنچ گئے ہیں اور حتی الوسع آدمیوں کو تباہ ہونے سے بچا رہے ہیں۔ مگر اُن کی تعداد بہت کم ہے۔

دھرم سنگھ۔ (چشم پُر آب ہوکر) یا ایشور۔ تو ہی اِن غریبوں کا مالک ہے۔

بالاجی۔ گوپال گئوشالہ بہہ گیا۔ ایک ہزار گائیں سیلاب کی نذر ہوگئیں۔ تین گھنٹہ تک لگاتار موسلادھار مینہہ برستا رہا۔ ۱۶ انچ پانی گرا۔ شہر کے جنوبی حصہّ میں ساری آبادی جمع ہے۔ نہ رہنے کو مکان ہیں نہ کھانے کو دانہ۔ لاشوں کا انبار لگا ہوا ہے۔ بہت سے لوگ بُھوکوں مرے جاتے ہیں اور لوگوں کے نالہ و شیون سے کلیجہ مُنہ کو آیا جاتا ہے۔ سب مصیبت زدہ آدمی بالاجی کو بُلانے کی رٹ لگا رہے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ میرے پہنچنے سے ان کی مصیبتیں رفع ہوجائیں گی۔

تھوڑی دیر تک بالاجی آنکھیں بند کیے گہرے خیال میں ڈوبے بیٹھے رہے۔ بعد ازاں بولے۔"میرا جانا ضروری ہے۔ میں اسی وقت جاؤں گا۔ آپ سدیا کے 'ارجن سبھا' کو تار دے دیجیے کہ وہ اس کام میں میرا ہاتھ بٹانے کو تیار رہیں۔"

راجا صاحب نے منّت آمیز لہجہ میں کہا۔"ارشاد ہو تو میں بھی ساتھ چلوں۔"

بالاجی۔ میں وہاں پہنچ کر آپ کو اطلاع دُوں گا۔ میرے خیال میں آپ کے جانے کی ضرورت نہ ہوگی۔

دھرم سنگھ۔ بہتر ہوتا کہ آپ علی الصباح جاتے۔

بالاجی۔ جی نہیں۔ مجھے یہاں لمحہ بھر ٹھہرنا شاق گزر رہا ہے۔ ابھی مجھے وہاں تک پہنچنے میں کئی دن لگیں گے۔

دم کی دم میں سارے شہر میں یہ خبر پھیل گئی کہ سدیا میں طُوفان آگیا اور بالاجی وہاں اسی وقت جا رہے ہیں۔ یہ سُنتے ہی ہزاروں آدمی بالاجی کو رخصت کرنے کے لیے نکل پڑے اور نو بجتے بجتے دروازہ پر قریباً پچیس ہزار آدمیوں کا مجمع ہوگیا۔ سدیا کی خبریں ہر کس و ناکس کی زبان پر تھیں۔ لوگ اُن مصیبت زدوں کی حالت پر ہمدردی و افسوس کر رہے تھے۔ صدہا آدمی بالاجی کے ساتھ جانے پر آمادہ تھے اور سدیا والوں کی امداد کے لیے ایک

فنڈ کھولنے کا چرچا ہو رہا تھا۔

اُدھر رانی دھرم سنگھ کے محل میں شہر کی خاتونوں نے آج سُباما کو مُبارک باد دینے کے لیے ایک جلسہ کیا تھا۔ عالیشان حویلی کا ایک ایک گوشہ عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ پہلے برج رانی نے کئی عورتوں کے ساتھ ایک مبارک باد کا سُہانا گیت گایا اور اس کے بعد سب عورتیں حلقہ باندھ کر گاتی بجاتیں آرتی کا تھال لیے سُباما کے مکان پر آئیں۔ سیوتی اور چندرا مہمانوں کا مصافحہ کرنے کے لیے پہلے ہی سے موجود تھیں۔سُباما ہر ایک خاتون سے گلے ملی اور اُنھیں دُعا دی کہ تمھاری گود میں بھی ایسے ہی سپُوت بچّے کھیلیں۔ پھر رانی صاحبہ نے اُس کی آرتی اُتاری اور گانا ہونے لگا۔ آج مادھوی کا چہرہ پھُول کی طرح کھِلا ہوا تھا۔ کل کی طرح آج وہ مایوس و مغموم نہ تھی۔ آرزوئیں بس کی گانٹھ ہیں اِنھیں آرزوؤں نے کل اُسے رُلایا تھا۔ مگر آج اُس کا دل اُن آرزوؤں سے خالی ہو گیا ہے۔ اسی لیے چہرہ شگفتہ اور آنکھیں روشن ہیں۔ بے آرزو رہ کر اس دیوی نے ساری زندگی کاٹ دی مگر باآرزو رہ کر اس سے ایک دن کا دُکھ بھی نہ جھیلا گیا۔

سُہانے راگوں کے اَلاپ سے مکان گونج رہا تھا کہ یکایک سدیا کی خبر یہاں بھی پہنچی اور راجا دھرم سنگھ یہ کہتے ہوئے سُنائی دیے۔"آپ لوگ بالاجی کو رخصت کرنے کے لیے تیار ہوجائیں۔ وہ اسی وقت سدیا جا رہے ہیں۔"

یہ سنتے ہی آدھی رات کی سی خاموشی چھاگئی۔ سُباما گھبرا کر اُٹھی اور دروازہ کی طرف لپکی۔ گویا وہ بالاجی کو روک لے گی۔ اُس کے ساتھ سب کی سب عورتیں اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ اور اُس کے پیچھے پیچھے چلیں۔ برج رانی نے کہا چچی! کیا اُنھیں زبردستی رخصت کروگی۔ ابھی تو وہ اپنے کمرے ہی میں ہیں۔

سُباما۔ میں اُنھیں نہ جانے دوں گی۔ رخصت کرنا کیسا؟

برج رانی۔ اُن کا سدیا جانا ضروری ہے۔

سُباما۔ میں کیا سدیا کو لے کر چاٹوں گی۔ بھاڑ میں جائے۔ آخر میں بھی تو کوئی ہوں۔ میرا بھی تو ان پر کوئی حق ہے۔

برج رانی۔ تمھیں میری قسم اس وقت اِس قسم کی باتیں نہ کرنا ہزاروں آدمی محض اُن کے بھروسے پر جی رہے ہیں۔ یہ نہ جائیں گے تو قہر ہوجائے گا۔

محبتِ مادرانہ اِنسانیت اور قومیت کے احساس پر غالب آگئی۔ مگر برج رانی نے سمجھاکر روک لیا۔ سُباما اس واقعہ کو یاد کرکے ہمیشہ افسوس کرتی تھی۔ اُسے تعجب ہوتا تھا کہ میں آپے سے باہر کیوں ہوگئی تھی۔ رانی صاحبہ نے پوچھا۔"برجن! بالاجی کو جے مالا کون پہنائے گا۔"

برجن۔ آپ۔

رانی صاحبہ۔ اور تم کیا کروگی؟

برجن۔ میں اُن کے ماتھے پر تِلک لگاؤں گی۔

رانی صاحبہ۔ مادھوی کہاں ہیں؟

برجن۔ (آہستہ سے) اُسے نہ چھیڑو۔ بے چاری اپنے خیال میں مگن ہے۔

اسی اثنا میں بالاجی باہر نکلے۔ انھیں دیکھتے ہی لوگوں نے پُرجوش نعرہ مارا۔ "بھارت کی جے" عورتیں بھی اُن کی طرف بڑھیں۔ بالاجی نے سُباما کو دیکھا تو نزدیک آکر اُس کے قدم چوم لیے۔ سُباما نے انھیں اُٹھاکر چھاتی سے لگایا۔ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر وفورِ جذبات نے زبان نہ کھلنے دی۔ رانی صاحبہ پھولوں کا جے مال لے کر چلیں کہ اُن کے گلے میں ڈال دوں مگر پیر تھرّائے اور آگے نہ بڑھ سکیں۔ برج رانی چندن کا تھال لے کر چلی مگر آنکھیں ندی کی طرح اُمڈ آئیں اور دل بیٹھ گیا۔ تب مادھوی چلی اُس کی آنکھوں میں پریم کی چمک تھی اور چہرہ پر پریم کی سُرخی۔ ہونٹوں پر دلآویز مسکراہٹ جھلک رہی تھی اور دل پریم کے نشہ میں مگن تھا۔ اُس نے بالاجی کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا جو اَتھاہ محبت سے لبریز تھیں اور تب سر نیچا کرکے پھول کا جے مال گلے میں ڈال دیا۔ ماتھے پر چندن کا ٹیکہ لگایا اور پریم کا بیڑا ہاتھ میں دے دیا۔ مراسمِ ظاہری کی کسر تھی وہ بھی پوری ہوگئی اُس وقت بالاجی نے گہری سانس لی اور انھیں معلوم ہوا کہ میں پریم کے اپار سمندر میں بہا جا رہا ہوں۔ ضبط کا لنگر اُکھڑ گیا اور اس شخص کی طرح جو یکایک پانی میں پھسل پڑا ہو اُنھوں نے بے اختیار مادھوی کی بانہہ پکڑ لی۔ مگر آہ! جس تنکے کا اُنھوں نے سہارا لیا وہ خود پریم کی دھار میں تیزی سے بہا جا رہا تھا۔ اُن کا ہاتھ پڑتے ہی مادھوی کے رگ رگ میں تجلّی سی کوند گئی۔ بدن میں پسینہ آگیا اور جس طرح ہوا کے جھونکے سے پنکھڑیوں پر جمے ہوئے شبنم کے قطرے زمین پر گر پڑتے ہیں۔ اُسی طرح مادھوی کی آنکھوں سے آنسو کی بوندیں

بالاجی کے ہاتھ پر ٹپک پڑیں۔ یہ پریم کے موتی تھے جو ان متوالی آنکھوں نے بالاجی کے بھینٹ کیے ہیں۔ آج سے یہ آنکھیں پھر نہ روئیں گی۔

آسمان پر تارے چھٹکے ہوئے تھے۔ اور اُن کی آڑ میں بیٹھی ہوئی دیویاں یہ نظارہ دیکھ رہی تھیں آج صبح بالاجی کے خیر مقدم میں یہ نغمہ گایا جارہا تھا۔

بالاجی تیرا آنا مبارک ہوئے

اور اس وقت عورتیں اپنے دلکش اور من بھانے سُروں میں گارہی ہیں۔

بالا جی تیرا جانا مبارک ہوئے

آنا بھی مبارک تھا اور جانا بھی مبارک ہے۔ آنے کے وقت بھی آنکھوں سے آنسو نکلے تھے اور جانے کے وقت بھی نکل رہے ہیں۔ کل وہ مہمان کا خیر مقدم کرنے کے لیے آئے تھے۔ آج اس کو الوداع کر رہے ہیں۔ اُن کا رنگ رُوپ بالکل یکساں ہے مگر اُن میں کتنا فرق ہے۔

متوالی جوگن

مادھوی پہلے ہی سے مُرجھائی ہوئی کلی تھی۔ حسرت نے اُسے خاک میں مِلا دیا۔ بیس سال کی تپسونی جوگن بن گئی۔ اُس غریب کی بھی کیا زندگی تھی کہ یا تو دل میں کوئی آرزو پیدا ہی نہیں ہوئی یا ہوئی تو قسمت نے اُسے پھُولنے پھلنے نہ دیا۔ اُس کا پریم عشق کا دریائے بے کنار تھا۔ اُس میں ایسا سیلاب آیا کہ زندگی کی آرزوئیں اور حسرتیں فنا ہوگئیں۔ اُس نے جوگنوں سے بستر پہن لیے اور علائقِ دنیا سے آزاد ہوگئی۔ دُنیا انھیں ارمانوں اور آرزوؤں کا دوسرا نام ہے۔ جس نے اِنھیں گورِحسرت میں دفن کردیا۔ اسے دُنیا میں سمجھنا بُھول ہے۔

اس پریم کے نشہ سے متوالی جوگن کو ایک جگہ قیام نہ تھا۔ بُوئے گُل کی طرح دیس دیس بِچرتی اور پریم کے شبد سُناتی پھرتی تھی۔ اُس کے زرد چہرہ پر گیروے رنگ کی کفنی بہت سُہانی معلوم ہوتی تھی۔ یہ پریم کی مُورت دیکھ کر لوگوں کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے۔ جب وہ اپنی بین پر کوئی بھجن گانے لگتی تو سُننے والوں کے دل پریم اور انوراگ سے سرشار ہوجاتے تھے۔ اس کا ایک ایک شبد پریم رس میں ڈوبا ہوتا تھا۔

متوالی جوگن کو بالاجی کے نام سے عشق تھا۔ وہ اپنے پدوں میں اکثر اُنھیں کی کیرت سُناتی تھی۔ جس دن سے اس نے جوگیا بھیس لیا اور لوک لاج کو پریم پر نچھاور کردیا۔ اُسی دن سے اُس کی زبان پر گویا سرسوتی بیٹھ گئیں۔ اُس کے رسیلے پد سُننے کو لوگ سینکڑوں کوس سے چلے آتے تھے۔ جس طرح بنسی کی صدا سُنتے ہی انسانوں کا ایک دریا اُمڈ پڑتا اُس کے پد سُننا آنند کے پیالے پینا تھا۔

اس جوگن کو کسی نے ہنستے یا روتے نہیں دیکھا۔ اسے نہ کسی بات کا رنج تھا نہ کسی بات کی خوشی۔ جس دل میں آرزوئیں نہ ہوں وہ کیوں ہنسے اور کیوں روئے۔ اس کا چہرہ آنند کی تصویر تھا۔ اُس پر نگاہ پڑتے ہی دیکھنے والوں کی آنکھیں پاک سُرور سے لبریز ہوجاتی تھیں۔

بیوہ

کاشی کے آریہ مندر میں پنڈت امرناتھ کی تقریر ہو رہی ہے، ناظرین مسحور بیٹھے ہوئے ہیں۔

پروفیسر دان ناتھ نے آگے کھسک کر اپنے دوست بابو امرت رائے کے کان میں کہا"رٹی ہوئی تقریر ہے۔"

امرت رائے اسپیچ سننے میں محو تھے۔ اس کا جواب نہ دیا۔

دان ناتھ نے پھر کہا "صاف رٹی ہوئی تقریر ہے۔ یہاں بیٹھنا فضول ہے، ٹینس کا وقت نکلا جا رہا ہے۔"

امرت رائے نے پھر بھی کچھ جواب نہ دیا۔ آخر دان ناتھ نے مایوسانہ انداز سے کہا۔ "بھئی میں تو جاتا ہوں۔"

امرت رائے نے ان کی طرف بغیر دیکھے ہی کہا "جاؤ شوق سے۔"

"تم کب تک بیٹھے رہو گے؟"

"میں تو آخر تک تقریر سُن کر آؤں گا۔"

"بالکل بغلول ہو۔ آخر اس تقریر میں ہے کیا؟"

"تو تم جاؤ۔ میں تمھیں جبراً روکتا تو نہیں۔"

"اجی گھنٹوں بولے گا۔ رانڈ کا چرخہ ہے یا تقریر ہے۔"

"سننے بھی دو، بیکار بک بک کر رہے ہو۔ تمھیں جانا ہو تو جاؤ۔ میں تقریر ختم کرکے ہی اٹھوں گا۔"

"پچھتاؤ گے۔ آج پریما بھی کھیلنے آئے گی۔"

"تم اس سے میری طرف سے معافی مانگ لینا۔"

"مجھے کیا غرض ہے کہ آپ کی طرف سے معافی مانگوں۔"

"اچھا نہ مانگنا۔ کسی صورت سے گلا تو چھوڑو۔"

دان ناتھ آسانی سے گلا چھوڑنے والے آدمی نہ تھے۔ گھڑی نکال کر دیکھی، پہلو بدلا اور بے صبری کے انداز سے پھر امرت رائے کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کی توجہ تقریر کی طرف نہیں، مقرر کی ڈاڑھی کی طرف تھی۔ ڈاڑھی کی جنبشِ پیہم میں انھیں بڑا مزا آرہا تھا۔ کچھ نہ کچھ بولتے رہنے کا مرض تھا۔ ایسا دلچسپ نظارہ دیکھ کر خاموش کیسے رہتے؟ امرت رائے کا ہاتھ دبا کر بولے ”آپ کی ڈاڑھی کتنی صفائی سے ہل رہی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ نوچ کر رکھ دوں۔“

امرت رائے نے مکدر ہوکر کہا۔ ”تم بڑے بدنصیب ہو کہ ایسی دل آویز اور پُراثر تقریر کا لطف نہیں اُٹھا سکتے۔“

مقرر نے کہا۔ ”میں آپ صاحبوں کے رو برو تقریر کرنے نہیں کھڑا ہوا ہوں۔“

دان ناتھ۔ (آہستہ سے) ”اور کیا آپ گھاس کھودنے آئے ہیں۔“

مقرر۔ ”باتیں بہت ہوچکیں اب عمل کا موقع ہے۔“

دان ناتھ۔ (آہستہ سے) ”جب آپ کی زبان آپ کے قابو میں رہے۔“

مقرر۔ ”جو اصحاب اپنی رفیقِ زندگی کا داغ اُٹھاچکے ہیں وہ براہِ کرم اپنے ہاتھ اُٹھائیں۔“

دان ناتھ۔ (دبی آواز سے) ”افوہ! یہاں تو آدھے سے زیادہ رنڈوے نکل آئے۔“

مقرر۔ ”جو اصحاب اس خیال سے متفق ہوں کہ رنڈووں کو کنواریوں سے شادی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے وہ براہِ کرم اپنے ہاتھ اُٹھائیں۔“

صرف ایک ہاتھ اُٹھتا ہے! یہ بابو امرت رائے کا ہاتھ ہے۔ اہلِ جلسہ ان کی طرف پُرسوال دلچسپی کی نگاہوں سے دیکھنے لگتے ہیں۔

دان ناتھ نے امرت رائے کے کان میں کہا۔ ”یہ کیا بیہودہ حرکت ہے؟ ہاتھ نیچے کرو۔“

امرت رائے میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالات میں اس سے بہتر دوسرا معاشرتی اصول نہیں ہے۔

مقرر نے امرت رائے کو ان کی اخلاقی جرأت پر مبارک باد دی۔ چند جملوں میں ناظرین کی پست ہمتی پر افسوس کیا اور بیٹھ گئے۔ جلسہ ختم ہوگیا۔

اہلِ جلسہ ایک ایک کر کے رخصت ہوگئے، دان ناتھ بھی باہر چلے آئے مگر

امرت رائے ابھی تک محویت کی حالت میں دنیا و ما فیہا سے بے خبر اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دان ناتھ نے ایک منٹ تک باہر کھڑے ان کا انتظار کیا، تب اندر جاکر بولے "ارے اب تو چلو گے یا یہیں ڈھئی دوگے؟"

امرت رائے نے چونک کر کہا "ہاں ہاں چلو۔"

دونوں دوست آکر موٹر میں بیٹھے، موٹر چل پڑی۔

دان ناتھ کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔پوچھا "آج تمھیں یہ حماقت کیا سوجھی" امرت رائے تمسخر کے انداز سے جواب دیا "وہی سوجھی جو تمھیں سوجھی۔"

"پریما سنے گی تو کیا کہے گی؟"

"بے حد خوش ہوگی۔ کم سے کم اسے خوش ہونا چاہیے۔ اپنے احباب کو فرض کے سامنے سر جھکاتے دیکھ کر کون خوش نہیں ہوتا؟"

دان ناتھ نے ملامت کی "اجی جاؤ بھی، باتیں بناتے ہو اسے تم سے کتنی محبت ہے یہ تم سے پوشیدہ نہیں ہے، ابھی شادی نہیں ہوئی (حالانکہ تم خود اس کے ذمے دار ہو) یہ درست ہے لیکن سارا شہر جانتا ہے کہ وہ تمھاری منگیتر ہے۔ سوچو اس کے اور تمھارے درمیان کتنی خط و کتابت ہوچکی ہے۔ وہ دل میں تمھیں اپنا شوہر تسلیم کرچکی ہے۔ ایسی نازنین تمھیں دنیا کے پردے پر نہیں ملے گی۔ یہ سمجھ لو کہ تمھاری زندگی تباہ ہوجائے گی۔ اپنے ساتھ اس کی زندگی بھی خراب کر دوگے۔ فرض کے نام پر جو چاہو کرو مگر پریما کو دل سے نہیں نکال سکتے۔"

امرت رائے متانت سے بولے۔"یہ سب میں خوب سمجھ رہا ہوں بھائی جان، لیکن میرا ضمیر کہہ رہا ہے کہ مجھے اس سے شادی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، پنڈت امرناتھ کی تقریر نے میری آنکھیں کھول دیں۔"

امرناتھ کا نام آتے ہی دان ناتھ نے ناک سکوڑ کر کہا۔

"کیا کہنا ہے واہ! اس نے رٹ کر ایک تقریر کر دی اور تم لٹو ہوگئے۔ یہ اچھا اصول ہے کہ جس کی پہلی بیوی مرچکی ہو وہ کسی کنواری لڑکی سے شادی نہ کرے۔"

امرت رائے نے کہا "انصاف تو یہی کہتا ہے۔"

دان ناتھ بولے "تو بس ایک تمھارے انصاف پر چلنے سے قوم کی نجات ہوجائے گی، تم تنہا کچھ نہیں کرسکتے، ہاں نکو بن سکتے ہو۔"

امرت رائے نے پُرزور نظروں سے تاکتے ہوئے کہا ”آدمی تنہا بھی بہت کچھ کرسکتا ہے۔ تنہا آدمیوں نے خیالات میں انقلاب پیدا کردیے ہیں۔ دنیا کی صورت بدل دی ہے۔ افراد کی داستانِ عمل سے تاریخیں پُر ہیں۔ گوتم بدھ کون تھا وہ تنہا حق کی تلاش میں نکلا تھا اور اس کے دورانِ حیات میں ہی آدھی دنیا اس کے قدموں پر سر جھکا چکی تھی، افراد کے نام سے قوموں کے نام روشن ہیں، قومیں تباہ ہوگئیں آج ان کا نشان بھی باقی نہیں، مگر مخصوص ہستیوں کے نام ابھی باقی ہیں۔ میں اکیلا کچھ نہ کرسکوں یہ دوسری بات ہے۔ اکثر جماعتیں بھی کچھ نہیں کرسکتیں۔ میرا خیال ہے کہ جماعتیں کبھی کچھ نہیں کرسکتیں لیکن آدمی اکیلا کچھ نہیں کرسکتا، میں اس کلیے کو کبھی تسلیم نہ کروں گا۔“

دان ناتھ سہل پسند آدمی تھے۔ کسی اصول کے لیے تکلیف اُٹھانا انھوں نے سیکھا ہی نہ تھا۔ ایک کالج میں پروفیسر تھے۔ گیارہ بجے جاتے تھے دو بجے لوٹ آتے تھے۔ باقی سارا وقت کتب بینی اور سیر و تفریح میں اُڑا دیتے تھے۔

اس کے برعکس امرت رائے اصول پرور آدمی تھے اور بڑے دُھن کے پکے۔ ایک بار کوئی فیصلہ کرکے اس سے منحرف نہ ہوتے تھے۔ پیشہ وکالت تھا مگر اس پیشے سے انھیں نفرت تھی۔ بنائے ہوئے مقدمے بھول کر بھی نہ لیتے تھے، لیکن جو مقدمہ لے لیتے اس کے لیے جان لڑا دیتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ انھیں ناکامی کا صدمہ بہت کم اُٹھانا پڑتا تھا۔ ان کی پہلی شادی اس وقت ہوئی تھی جب وہ کالج میں پڑھتے تھے۔ ایک لڑکا بھی پیدا ہوا لیکن زچہ اور بچہ دونوں زچہ خانے ہی میں داغِ مفارقت دے گئے۔ امرت رائے کو اپنی بہن سے بڑی محبت تھی۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ اب کبھی شادی نہ کروں گا۔ لیکن جب بہن کی شادی ہوگئی اور والدین بھی ایک ہفتے کے اندر ہیضے کے شکار ہوگئے، تو سونا گھر پھاڑ کھانے لگا۔ دو سال سیر و سیاحت میں بسر کیے، لوٹے تو ہولی کے دن ان کے سُسر نے اس تقریب میں ان کی دعوت کی، وہ امرت رائے کے اطوار پر پہلے ہی سے فدا تھے۔ ان کی چھوٹی لڑکی پریما اب شادی کے قابل ہوگئی تھی اس کے لیے امرت رائے سے بہتر شوہر انھیں دوسرا نظر نہ آیا۔ دو سال قبل امرت رائے نے پریما کو دیکھا تھا، وہ شگفتہ کلی اب ایک شگفتہ پھول تھی جس کی نزاکت اور لطافت آنکھوں کو لبھاتی تھی۔ امرت رائے کا غم نصیب دل یہاں سے محبت کا اثر لے کر لوٹا۔ تب سے جب طبیعت گھبراتی سسرال چلے

جاتے اور دو گھڑی ہنس بول کر چلے آتے۔ ایک دن ان کی ساس نے ان سے مطلب کی بات کہہ دی، امرت رائے تو پریما کے رنگ و بو پر پہلے ہی نثار تھے۔ اندھے کو جیسے آنکھیں مل گئیں۔ شادی طے ہوگئی اسی مہینے شادی ہونے والی تھی کہ آج امرت رائے نے عام جلسے میں اس نئے اصول کو تسلیم کر کے اپنا ارادہ فسخ کردیا۔

دان ناتھ نے ان کی لمبی تقریر سن کر کہا ''تو تمھارا یہ قطعی فیصلہ ہے۔''

''بیشک۔''

''اور پریما کو کیا جواب دو گے؟''

''اسے مجھ سے بہت اچھا شوہر مل جائے گا۔''

دان ناتھ نے دلسوزی کے ساتھ کہا ''کیا باتیں کرتے ہو۔ تم سمجھتے ہو، محبت کوئی بازار کا سودا ہے جی چاہا لیا جی چاہا نہ لیا۔ مگر تمھارا یہ خیال غلط ہے۔ پریما محض تمھاری منگیتر نہیں ہے، تمھاری معشوقہ بھی ہے۔ یہ خبر پاکر اس کے دل کی کیا کیفیت ہوگی۔ شاید اس کا اندازہ تم نہیں کرسکتے۔ میں تو یہی کہوں گا کہ تم اپنے ساتھ ہی اس کے ساتھ بھی بڑی بے انصافی کر رہے ہو۔''

امرت رائے ایک لمحہ کے لیے فکر میں ڈوب گئے۔ اپنے متعلق تو انھیں ذرا بھی اندیشہ نہ تھا، وہ اپنے تیئں فرض پر نثار کرسکتے تھے۔ لیکن پریما کا کیا حال ہوگا، اس کا خیال انھیں نہ آیا تھا۔ ہاں اتنا وہ جانتے تھے کہ پریما بلند خیال عورت ہے اور ان کے ایثار کی اس کی نگاہوں میں ضرور وقعت ہوگی۔ اگر وہ اتنی ہی فرض شناس ہے جتنا میں سمجھتا ہوں تو میرے اس فیصلے پر اسے مطلق رنج نہ ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ اسے خوشی ہوگی۔ کم از کم مجھے یہ امید ضرور ہے۔''

دان ناتھ نے منہ بنا کر کہا ''تم سمجھتے ہوگے کہ بڑا میدان مار آئے ہو اور جو سُنے گا وہ پھولوں کا ہار لے کر تمھارے گلے میں ڈالنے دوڑے گا۔ لیکن میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ تم محض شہرت کے بھوکے ہو۔ لیکن عورتوں کو شہرت کی اتنی ہوس نہیں ہوتی۔ پریما کتنا ہی پاکیزہ خیال ہو وہ یہ کبھی پسند نہ کرے گی کہ تم اس سے اتنی بے دردی کے ساتھ کنارہ کش ہوجاؤ۔''

امرت رائے کا بنگلہ آگیا۔ موٹر رُک گیا۔ امرت رائے اُتر کر اپنے کمرے کی طرف

چلے۔ دان ناتھ ذرا اس انتظار میں کھڑے رہے کہ یہ مجھے بلائیں تو میں جاؤں، لیکن جب امرت رائے نے ان کی طرف پھر کر بھی نہ دیکھا تو انھیں خوف ہوا کہ شاید میری باتیں انھیں ناگوار گزریں۔ کمرے کے دروازے پر جاکر بولے "کیوں بھائی مجھ سے ناراض ہوگئے؟"

امرت رائے نے پُرنم آنکھوں سے دیکھ کر کہا "نہیں دان ناتھ تمھاری جھڑکیوں میں مزا ہے جو دوسروں کی واہ وا میں نہیں۔ میں جانتا ہوں تم نے اس وقت جو کہا ہے وہ محض محبت سے کہا ہے، دل میں تو تم خوب سمجھتے ہو کہ میں شہرت کا حریص نہیں بلکہ زندگی میں کچھ کام کرنا چاہتا ہوں۔"

دان ناتھ نے اندر جاکر امرت رائے کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولے "پھر سوچ لو۔ ایسا نہ ہو پیچھے پچھتانا پڑے۔"

امرت رائے نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اس کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ بھائی جان سچ پوچھو تو آج میں اپنے دل میں جس عالی ہمتی کا احساس کر رہا ہوں وہ ایک نیا تجربہ ہے۔ آج کئی ماہ کی کشمکش کے بعد میں نے اپنے اوپر فتح پائی ہے۔ مجھے پریما سے جتنی محبت ہے، اس سے کئی گنی محبت میرے ایک دوست کو اس سے ہے۔ اس شریف آدمی نے کبھی بھول کر بھی اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا لیکن میں جانتا ہوں اس کی محبت کتنی جاں سوز، کتنی گہری اور کتنی پاکیزہ ہے۔ میں تقدیر کی کتنی چوٹیں سہہ چکا ہوں۔ ایک چوٹ اور بھی سہہ سکتا ہوں۔ لیکن میرے اس دوست نے ابھی ناکامی کی ایک چوٹ بھی نہیں سہی ہے اور یہ ناکامی اس کے لیے سوہانِ روح ہوجائے گی۔"

یہ اشارہ کس کی طرف تھا دان ناتھ سے مخفی نہ رہا۔ جب امرت رائے کی بیوی کا انتقال ہوا اسی وقت پریما سے دان ناتھ کی شادی کا تذکرہ درپیش تھا۔ جب پریما کی بہن کا انتقال ہوگیا تو اس کے والد لالہ بدری پرشاد نے دان ناتھ کی طرف سے مُنہ پھیر لیا۔ دان ناتھ علم، دولت اور وقار، کسی بات میں بھی امرت رائے کے مدِّ مقابل نہ تھے سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ پریما بھی امرت رائے کی جانب زیادہ متوجہ معلوم ہوتی تھی۔ دان ناتھ اتنے مایوس ہوئے کہ طے کر لیا کبھی شادی نہ کروں گا۔ دونوں دوستوں میں ذرا بھی کدورت نہ پیدا ہوئی۔ دان ناتھ یوں بظاہر تو ہمیشہ خوش رہتے تھے لیکن دنیا سے ان کا

دل بیزار ہوگیا تھا۔ زندگی بار معلوم ہوتی تھی۔ امرت رائے کو اپنے دلی دوست کی حالت پر افسوس ہوتا تھا اور وہ اپنے دل کو اس آزمائش کے لیے مہینوں سے تیار کر رہے تھے۔ لیکن پریما جیسی عدیم المثال نازنین سے دست بردار ہوجانا آسان نہ تھا۔ ایسی حالت میں دان ناتھ کا یہ اصرار دوستانہ ہمدردی پر اتنا زیادہ بنی نہ تھا جتنا امرت رائے کے جذبۂ ایثار کی گہرائی تک پہنچنے کی خواہش پر، جس تمنا کو انھوں نے سینہ کو چیر کر نکال ڈالا تھا جس کے پورے ہونے کی اس کی زندگی میں مطلق امید نہ تھی، وہی تمنا آج ان کے سینہ میں مشعل کی طرح روشن ہوگئی اس کے ساتھ ہی امرت رائے کے اس ملکوتی ایثار نے ان کے دل پر بہت گہرا اثر پیدا کیا، رقت آمیز لہجے میں بولے ”تو کیا اسی خیال سے تم نے آج یہ فیصلہ کر لیا۔ اگر تمھارا وہ دوست اس فیصلے سے فائدہ اُٹھائے تو میں کہوں گا کہ وہ تمھارا دوست نہیں دشمن ہے اور پھر کیا معلوم ہے کہ اس حالت میں پریما کی شادی تمھارے دوست سے ہی ہو۔“

امرت رائے نے تشویشناک لہجے میں کہا ”ہاں یہ اندیشہ ضرور ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ میرا دوست اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دے گا۔“

دان ناتھ نے افسردہ خاطر ہوکر کہا۔ ”تم اسے اتنا کمینہ سمجھنا چاہو تو سمجھ لو لیکن میں کہے دیتا ہوں کہ اگر میں اس دوست کو پہچان سکا ہوں تو وہ اپنے عوض تمھیں ناکامی کا شکار نہ بننے دے گا۔“

یہ کہتے ہوئے دان ناتھ باہر نکل آئے اور امرت رائے دروازے پر کھڑے انھیں پُرغرور نگاہوں سے دیکھتے رہے وہ دل میں کہہ رہے تھے اس شخص میں کتنا ضبط ہے۔“

(۲)

ادھر دونوں دوستوں میں باتیں ہو رہی تھیں، ادھر لالہ بدری پرشاد کے گھر میں ماتم سا چھایا ہوا تھا۔ بڑی دیر کے بعد ان کی بیوی دیوکی نے کہا ”تم ذرا امرت رائے کے پاس چلے کیوں نہیں جاتے؟“

بدری پرشاد نے اعتراض کے انداز سے کہا ”جاکر کیا کروں۔“

”جاکر سمجھاؤ اور کیا کروگے۔“

”میں اس چھوکرے کے پاس نہیں جاسکتا۔“

"آخر کیوں؟ کوئی ہرج ہے۔"

"اب تم سے کیا بتاؤں۔ جب مجھے اس کا فیصلہ معلوم ہوگیا تو میرا اس کے پاس جانا غیر مناسب ہی نہیں اہانت آمیز ہے۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ وہ بدھوا بواہ کے حامی ہیں۔ سمجھتے ہیں اس سے ملک آسمان پر پہنچ جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں بدھوا بواہ ملک کے لیے زہر قاتل ہے، اس سے ہندو عظمت اور پاکیزگی کے رہے سہے نشان بھی مٹ جائیں گے۔ ایسی حالت میں ہمارا اب ان سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔"

دیوکی نے جواب دیا"یہ کوئی بات نہیں ہے۔ آج اگر ہمارا کملا مسلمان ہوجائے تو کیا ہم اس کے پاس آنا جانا چھوڑ دیں گے؟ ہم سے جہاں تک ہوسکے گا اسے سمجھائیں گے اور اسے سیدھے راستے پر لانے کی کوشش کریں گے۔"

دیوکی کے اس جواب سے بدری پرشاد کچھ نرم تو پڑے لیکن پھر بھی قائل نہ ہوئے۔ بولے"بھئی میں تو اب امرت رائے کے پاس نہ جاؤں گا۔ تم اگر سوچتی ہو کہ وہ سمجھانے سے راہِ راست پر آجائیں گے تو انھیں بلا لو، خود چلی جاؤ۔ لیکن مجھ سے جانے کو نہ کہو، میں انھیں دیکھ کر شاید آپے سے باہر ہو جاؤں۔ کہو تو جاؤں؟"

دیوکی۔ "نہیں معاف کیجیے۔ اس سے تو یہی اچھا ہے کہ تم نہ جاؤ۔ میں کل انھیں بلا لوں گی۔ "**بدری**" بلانے کو بلا لو لیکن یہ میں کبھی پسند نہ کروں گا کہ تم ان کی خوشامد کرو۔ میں پریما کو ان کے گلے لگانا نہیں چاہتا۔ اس کے لیے 'بر' کی کمی نہیں ہے۔"

دیوکی۔"پریما ان لڑکیوں میں نہیں ہے کہ تم اس کی شادی جس کے ساتھ چاہو کر دو، ذرا جاکر اس کی حالت تو دیکھو تو معلوم ہو، جب سے یہ خبر ملی ہے اکیلی چھت پر پڑی رو رہی ہے۔"

بدری ۔"اجی یہ تو لڑکیوں کا قاعدہ ہے، دس پانچ روز میں آپ ہی آپ سنبھل جائے گی۔"

دیوکی۔ "کون پریما؟ میں کہتی ہوں وہ اس غم میں رو کر جان دیدے گی۔ تم ابھی اُسے نہیں جانتے۔"

بدری پرشاد نے جھنجھلا کر کہا۔"اگر وہ رو رو کر مرجانا چاہتی ہے تو مرجائے لیکن

میں امرت رائے کی خوشامد نہ کروں گا۔"

بدری پرشاد باہر چلے گئے، دیوکی بڑے شش و پنج میں پڑگئی۔ شوہر کی عادت سے خوب واقف تھی لیکن انھیں اتنا کج فہم اس نے نہ سمجھا تھا۔ اسے پوری امید تھی کہ امرت رائے سمجھانے سے اپنے فیصلہ تبدیل کر دیں گے۔ لیکن ان کے پاس کیسے جائے، شوہر سے راڑ کیسے مول لے۔

دفعتاً پریما اوپر سے آکر چارپائی کے پاس کھڑی ہوگئی، اس کی آنکھیں سرخ تھی، دیوکی نے سمجھا کر کہا۔"رومت بیٹی۔ میں کل انھیں بلا لوں گی، میری بات وہ کبھی نہ ٹالیں گے۔"

پریما نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "نہیں اماں آپ کے پیروں پڑتی ہوں، ان سے کچھ نہ کہیے۔ میں کارِ خیر میں رُکاوٹ نہیں ڈالنا چاہتی۔ انھوں نے ہماری بدنصیب بہنوں کی خاطر یہ فیصلہ کیا ہے۔ ہمارے یہاں کتنے ایسے آدمی ہیں جو اتنی جرأت کر سکیں۔ میں ان کے اس نیک ارادہ میں حائل نہ ہوں گی۔"

دیوکی نے حیرت زدہ نگاہوں سے پریما کو دیکھا۔ لڑکی کیا کہہ رہی ہے، ان کی سمجھ میں نہ آیا۔

پریما پھر بولی۔"اگر ایسے نیک طبیعت اور روشن خیال آدمی قربانیاں نہ کریں گے تو کون کرے گا؟"

دیوکی نے پوچھا۔"اور تو، اپنے دل کو کیسے سمجھائے گی بیٹی۔ اس خیال سے تجھے تسکین ہوگی؟"

پریما نے متانت سے جواب دیا۔"مجھے اس کا بالکل دُکھ نہیں ہے، اماں جی! میں آپ سے سچ کہتی ہوں، میں بھی اس کام میں ان کی مدد کروں گی۔ جب تک آپ لوگوں کا ہاتھ میرے سر پر ہے مجھے کس بات کی فکر ہے۔ آپ لوگ میرے لیے ذرا بھی اندیشہ نہ کریں۔ میں کنواری رہ کر بہت سُکھی رہوں گی۔"

دیوکی نے پُراشک نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔"ماں باپ کس کے سدا بیٹھے رہتے ہیں بیٹی! اپنی آنکھوں کے سامنے جو کام ہوجاوے وہی اچھا۔ لڑکی تو ان کی بھی کنواری نہیں رہنے پاتی جن کے گھروں میں کھانے کا ٹھکانا نہیں ہے۔ بھیک مانگ کر لوگ لڑکی کا بیاہ

کرتے ہیں۔ محلّہ میں کوئی لڑکی یتیم ہوجاتی ہے تو چندہ سے اس کا بیاہ کر دیا جاتا ہے، میرے یہاں کس بات کی کمی ہے؟ میں تمھارے لیے کوئی اور لڑکا تلاش کروں گی۔ یہ جانے سُنے آدمی تھے اُتنا ہی تھا ورنہ برادری میں ایک سے ایک بڑے ہوئے ہیں۔ میں کل تمھارے بابو جی کو بھیجتی ہوں۔"

پریما کا دل کانپ اُٹھا۔ آج تین برس سے امرت رائے کی مورت کو اپنے دل کے مندر میں بٹھا کر وہ پوجتی چلی آئی تھی، اس مورت کو اس کے دل سے کون نکال سکتا تھا دل میں اس مورت کو بٹھائے ہوئے کیا وہ کسی دوسرے شخص سے بیاہ کرسکتی تھی؟ وہ بیاہ ہوگا یا بیاہ کا ڈھونگ؟ اس زندگی کا خیال کتنا خوفناک، کتنا دل ہلا دینے والا تھا؟ پریما نے زمین کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔

"نہیں اماں جی! میرے لیے آپ کوئی فکر نہ کریں۔ میں نے کنواری ہی رہنے کا قصد کر لیا ہے۔"

بابو کملا پرشاد کی آمد آمد کا شور سنائی دیا، آپ سنیما کے بے طرح دلدادہ تھے۔ روز ہی جاتا کرتے تھے۔ نوکروں سے وہ سختی کے ساتھ کام لیتے تھے۔ خصوصاً باہر سے آنے پر تو کسی ایک کی مرمت سے باز نہ رہ سکتے تھے۔ ان کے بوٹ کی چرچراہٹ سنتے ہی نوکروں میں ہلچل پڑجاتی تھی۔

کملا پرشاد نے آتے ہی آتے کہار سے پوچھا۔"برف لائے؟"

کہار نے دبی زبان سے کہا۔ "ابھی تو نہیں سرکار۔"

کملا پرشاد نے گرج کر کہا۔"زور سے بولو، برف لائے یا نہیں؟ مُنہ میں زبان نہیں ہے۔"

کہار کی آواز اب بالکل بند ہوگئی۔ کملا پرشاد نے کہار کے دونوں کانوں کو پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔"ہم پوچھتے ہیں برف لائے یا نہیں؟"

کہار نے دیکھا کہ اب بغیر مُنہ کھولے ہوئے کانوں کے اُکھڑ جانے کا احتمال ہے تو آہستہ سے بولا۔ نہیں سرکار!

کملا۔ کیوں نہیں لائے؟

کہار۔ پیسے نہ تھے۔

کملا۔ کیوں پیسے نہ تھے؟ گھر میں جاکر مانگے تھے؟

کہار۔ ہاں سرکار کسی نے سنا نہیں۔

کملا۔ جھوٹ بولتا ہے۔ میں جا کر دریافت کرتا ہوں، اگر معلوم ہوا کہ تو نے پیسے نہیں مانگے تو کچا ہی کھا جاؤں گا، راسکل۔

کملا پرشاد نے کپڑے بھی نہیں اُتارے۔ غصّے میں بھرے ہوئے گھر میں جاکر ماں سے پوچھا۔ ''کیوں اماں! بدلو تم سے برف کے لیے پیسے مانگنے آیا تھا۔''

دیوکی نے بغیر ان کی طرف دیکھے ہی کہا۔ ''آیا ہوگا، یاد نہیں آتا، بابو امرت رائے سے ملاقات تو نہیں ہوئی؟''

کملا۔ نہیں ان سے تو ملاقات نہیں ہوئی، ان کی طرف گیا تھا۔ لیکن جب سُنا کہ وہ کسی جلسہ میں گئے ہیں تو میں سنیما دیکھنے چلا گیا۔ جلسوں کا تو انھیں مرض ہے اور میں بالکل فضول سمجھتا ہوں، کوئی فائدہ نہیں۔ بغیر لکچر سنے بھی آدمی زندہ رہ سکتا ہے اور لکچر دینے والوں کے بغیر دنیا کے پاتال میں چلے جانے کا اندیشہ نہیں۔ جہاں دیکھو لکچرار ہی لکچرار نظر آتے ہیں۔ برساتی مینڈکوں کی طرح ٹرٹر کیا اور چلتے ہوئے، اپنا وقت کھویا اور دوسروں کو پریشان کیا۔ سب کے سب بے وقوف ہیں۔

دیوکی۔ ''امرت رائے نے تو آج ناؤ ہی ڈبو دی، اب کسی بدھوا سے بیاہ کرنے کی ٹھان لی ہے۔'' کملا پرشاد نے زور سے قہقہہ لگا کر کہا اور یہ جلسے والے کریں گے کیا؟ یہی تو ان سبھوں کو سوجھتی ہے۔ لالہ اب کسی بیوہ سے شادی کریں گے؟ اچھی بات ہے میں ضرور بارات میں جاؤں گا۔ خواہ اور کوئی جائے یا نہ جائے۔ ذرا دیکھوں نئے ڈھنگ کی شادی کیسی ہوتی ہے۔ وہاں بھی سب لکچربازی کریں گے۔ ان لوگوں کے لیے اور کیا ہوگا۔ سب کے سب بے وقوف ہیں۔ عقل کسی کو چھو نہیں گئی۔''

دیوکی۔ تم ذرا ان کے پاس چلے جاتے۔

کملا۔ اس وقت تو بادشاہ بھی بلائے تو نہ جاؤں۔ ہاں کسی روز جاکر ذرا خیر عافیت پوچھ آؤں گا مگر ہے پورا خبطی! میں تو جانتا تھا کہ اس میں کچھ سمجھ ہوگی، مگر نرا بونگا نکلا! اب بتاؤ زیادہ پڑھنے سے کیا فائدہ ہوا؟ بہت اچھا ہوا کہ میں نے پڑھنا چھوڑ دیا۔ بہت پڑھنے سے عقل ماری جاتی ہے۔ جب آنکھیں کمزور ہوجاتی ہیں تو عقل کیسے بچی رہ

سکتی ہے؟ تو کوئی بیوہ بھی ٹھیک ہوگئی یا نہیں؟ کہاں ہے مصرانی کہہ دو کہ اب تمھاری چاندی ہے۔ کل ہی سندیس بھیج دیں۔ کوئی اور نہ جائے تو میں جانے کو تیار ہوں۔ بڑا مزا رہے گا! کہاں ہے مصرانی۔ اب ان کی قسمت کھل رہے گی۔ برادری ہی کی بیوہ ہے نا کہ برادری کی قید بھی نہیں رہی؟

دیوکی یہ تو نہیں جانتی، اب کیا ایسے بھرشٹ (ناپاک) ہوجائیں گے۔

کملا۔ یہ سبھا والے۔ جو کچھ نہ کر گزریں وہ تھوڑا۔ ان سبھوں کو بیٹھے بیٹھے ایسی بے پر کی اُڑانے کی سوجھتی ہے۔ ایک روز پنجاب سے کوئی بوکھل (خبطی) آیا تھا کہہ گیا کہ ذات پات توڑ دو۔ کیوں کہ اس سے ملک میں پھوٹ بڑھتی ہے، ایسے ہی ایک اور جانگلو آکر کہہ گیا کہ چماروں پاسیوں کو بھائی سمجھنا چاہیے۔ ان سے کسی طرح کا پرہیز نہ کرنا چاہیے۔ بس سب کے سب بیٹھے یہی سوچا کرتے ہیں کہ کوئی نئی بات نکالنی چاہیے۔ بڈھے گاندھی جی کو اور کچھ نہ سوجھی تو سوراج ہی کا ڈنکا پیٹ چلے۔ سبھوں نے عقل بیچ کھائی ہے۔'' اتنے ہی میں ایک حسینہ نے صحن میں قدم رکھا۔ کملا پرشاد کو دیکھ کر ڈیوڑھی پر ٹھٹھک گئی۔ دیوکی نے کملا سے کہا۔ ''تم ذرا کمرہ میں چلے جاؤ۔ پورنا ڈیوڑھی پر کھڑی ہے۔

پورنا کو دیکھتے ہی پریما دوڑ کر اس کے گلے سے لپٹ گئی۔ پڑوس میں ایک پنڈت بسنت کمار رہتے تھے۔ کسی دفتر میں نوکر تھے، پورنا انھیں کی بیوی تھی، بہت ہی حسین، بہت ہی نیک، مکان میں کوئی دوسرا نہ تھا۔ جب دس بجے پنڈت جی دفتر چلے جاتے تو وہ یہیں چلی آتی اور دو سہیلیاں شام تک بیٹھی ہنستی بولتی رہتیں۔ پریما کو اس سے اتنی محبت تھی کہ اگر کسی دن وہ کسی سبب سے نہ آتی، وہ خود اس کے یہاں جاتی۔ آج بسنت کمار کہیں دعوت میں گئے تھے، پورنا کا جی گھبرایا تو وہ یہاں چلی آئی۔ پریما اس کا ہاتھ پکڑے اوپر کمرے میں لے گئی۔

پورنا نے چادر الگنی پر رکھتے ہوئے کہا۔''تمھارے بھیّا آنگن میں کھڑے تھے اور میں منہ کھولے چلی آئی تھی۔ مجھ پر ان کی نظر پڑ گئی ہوگی۔''

پریما۔ بھیّا میں کسی کو تاکنے کی لت نہیں ہے۔ یہی تو ان میں ایک گن (وصف) ہے۔ آپ کے پنڈت جی کہیں گئے ہیں کیا؟

پورنا۔ ہاں آج ایک نیوتے (دعوت) میں گئے ہیں۔

پریما۔ وہ کسی سبھا سماج میں نہیں جاتے۔ کہتے ہیں کہ ایشور نے دنیا بنائی ہے اور وہی اپنی مرضی سے ہر بات کا بندوبست کرتا ہے۔ میں اس کے کاموں کو سدھارنے کی ہمّت نہیں کرسکتا۔

پریما۔ آج کی سبھا دیکھنے لائق تھی۔ تم ہوتیں تو میں بھی جاتی۔ سماج سدھار پر ایک مہاشے کا بڑا اچھا لکچر ہوا۔

پورنا۔ عورتوں کے سدھار کا رونا رویا گیا تھا۔

پریما۔ تو کیا عورتوں کے سدھار کی ضرورت نہیں ہے۔

پورنا۔ پہلے مرد لوگ تو اپنی دشا (حالت) سدھار لیں۔ پھر عورتوں کو دشا سدھاریں گے۔ ان کی دشا سدھر جائے تو عورتیں آپ ہی آپ سدھر جائیں۔ ساری برائیوں کی جڑ مرد ہی ہیں۔

پریما نے ہنس کر کہا۔ ''نہیں بہن! سماج میں عورت مرد دونوں ہی ہیں اور جب تک دونوں کا سدھار نہ ہوگا زندگی میں سکھ نہ ملے گا۔ مردوں کے ودوان ہونے سے کیا عورتیں ودوان ہوجائیں گی۔ مرد تو زیادہ تر سادے ہی کپڑے پہنتے ہیں۔ پھر عورتیں کیوں گہنوں پر جان دیتی ہیں۔ قیمتی کپڑوں کی تو کوئی بات نہیں۔ مردوں میں تو کتنے ہی بن بیاہے رہ جاتے ہیں۔ عورتوں کو کیوں بن بیاہا رہنے میں زندگی بے کار معلوم ہوتی ہے؟ بتاؤ میں تو سوچتی ہوں کہ بن بیاہے رہنے میں جو سکھ ہے وہ بیاہ کرکے رہنے میں نہیں۔''

پورنا نے آہستہ سے پریما کو دھکا دے کر کہا۔ ''چلو بہن تم بھی کیسی باتیں کرتی ہو۔ بابو امرت رائے سنیں گے تو تمھاری خوب خبر لیں گے۔ میں انھیں لکھ بھیجوں گی کہ یہ اپنا بیاہ نہ کریں گی، آپ کوئی دوسرا دروازہ دیکھیں۔''

پریما نے امرت رائے کے عہد کا حال نہ کہا۔ وہ جانتی تھی کہ اس سے پورنا کی نگاہ میں ان کی قدر بہت کم ہوجائے گی۔ بولی۔''وہ خود بیاہ نہ کریں گے۔''

پورنا۔ چلو جھوٹ بکتی ہو۔

پریما۔ ''نہیں بہن جھوٹ نہیں۔ شادی کرنے کی ان کی خواہش نہیں ہے۔ دیدی (بڑی

بہن) کے مرجانے کے بعد وہ کچھ تیاگی سے ہوگئے تھے۔ بابو جی کے بہت گھیرنے پر اور مجھ پر رحم کرکے وہ شادی کرنے پر تیار ہوئے تھے مگر اب ان کا ارادہ بدل گیا ہے اور میں بھی سمجھتی ہوں کہ جب ایک شخص خود گرہستی کے جھنجھٹ میں نہ پھنس کر سماج کی سیوا کرنا چاہتا ہے تو اس کے پیر کی بیڑی بننا ٹھیک نہیں ہے۔ میں تم سے سچ کہتی ہوں پورنا مجھے اس کا رنج نہیں ہے۔ ان کی دیکھا دیکھی میں بھی کچھ کرے جاؤں گی۔" پورنا کی حیرت بڑھتی ہی گئی بولی۔"آج چار بجے تک تم ایسی باتیں نہ کرتی تھیں۔ یکایک یہ کیسی کایا پلٹ ہوگئی۔ انھوں نے کسی سے کچھ کہا ہے کیا؟"

پریما۔ بلا کہے بھی تو آدمی اپنی خواہش ظاہر کرسکتا ہے۔

پورنا۔ میں ایک خط لکھ کر ان سے پوچھوں گی۔

پریما۔ نہیں پورنا تمھارے پیروں پڑتی ہوں، خط وط نہ لکھنا۔ میں کسی کے نیک ارادہ میں رکاوٹ نہ ڈالوں گی۔ میں اگر اور کوئی مدد نہیں کرسکتی تو کم سے کم ان کی راہ کا کانٹا نہ بنوں گی۔

پورنا۔ ساری عمر روتے کٹے گی کہے دیتی ہوں۔

پریما۔ ایسا کوئی دُکھ نہیں ہے جو آدمی سہہ نہ سکے وہ جانتے ہیں کہ مجھے اس سے دُکھ نہیں سُکھ ہوگا۔ ورنہ وہ کبھی ایسا ارادہ نہ کرتے۔ میں ایسے حوصلے والے آدمی کا حوصلہ بڑھانا اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ اسے گرہستی میں نہیں پھنسانا چاہتی۔ پورنا نے بے پروائی سے کہا۔ "تمھاری مایا (لیلا) میری سمجھ میں نہیں آتی بہن، معاف کرنا میں کبھی نہ مانوں گی کہ تم کو اس سے دُکھ نہ ہوگا۔"

پریما۔ تو پھر انھیں بھی ہوگا؟

پورنا۔ مردوں کا دل سخت ہوتا ہے۔

پریما۔ تو میں بھی اپنا دل سخت بنالوں گی۔

پورنا۔ اچھا بنا لینا۔ لو اب نہ کہوں گی۔ لاؤ باجا، تمھیں ایک گیت سناؤں۔ پریما نے ہارمونیم سنبھالا اور پورنا گانے لگی۔

(۳)

ہولی کا دن آیا، پنڈت بسنت کمار کے لیے یہ بھنگ پینے کا دن تھا۔ انھوں نے مہینوں پہلے سے بھنگ منگا رکھی تھی۔ اپنے دوستوں کو بھنگ کی دعوت دے چکے تھے۔ سویرے اُٹھتے ہی پہلا کام جو انھوں نے کیا وہ بھنگ کا دھونا تھا۔ محلے کے دو چار لونڈے اور دو چار بے فکرے جمع ہوگئے۔ بھنگ دُھلنے لگی۔ کوئی مرچ پینے لگا۔ کوئی بادام چھیلنے لگا۔ دو آدمی دودھ کا بندوبست کرنے کے لیے گئے۔ دو آدمی سِل بٹّا دھونے لگے۔ ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔

دفعتاً بابو کملا پرشاد آپہنچے۔ یہ جمگھٹا دیکھ کر بولے۔ "کیا ہو رہا ہے بھئی! ہمارا بھی حصہ ہے نا؟"

کملا۔ "اجی میٹھی 'پلاؤ' نمکین کیا۔ مگر یار زعفران اور کیوڑا ضرور ہو۔ کسی کو بھیجیے میرے ہاں سے لے آئے۔ کسی لڑکے کو بھیجیے جو اندر جاکر پریما سے مانگ لائے کہیں بیوی صاحبہ کے پاس نہ چلا جائے ورنہ مفت گالیاں ملیں، تیوہار کے دن ان کا مزاج گرم ہوجایا کرتا ہے۔ یار بسنت کمار بیویوں کے خوش رکھنے کا آسان نسخہ بتاؤ میں تو عاجز آگیا ہوں۔"

بسنت کمار نے مسکرا کر کہا۔ "ہمارے یہاں تو یہ مرض کبھی نہیں ہوتا۔"

کملا۔ تو یار تم بڑے خوش نصیب ہو۔ کیا پورنا تم سے کبھی نہیں روٹھتی؟

بسنت۔ کبھی نہیں۔

کملا۔ کبھی کسی چیز کے لیے ضد نہیں کرتی۔

بسنت۔ کبھی نہیں۔

کملا۔ تو یار تم بڑے خوش نصیب ہو۔ یہاں تو دوامی قید ہوگئی ہے اور گھڑی بھر بھی گھر سے باہر رہوں تو جواب طلب ہوتا ہے۔ سنیما روزانہ جاتا ہوں اور ہرروز گھنٹوں مناؤ کرنا پڑتا ہے۔

بسنت۔ تو سنیما دیکھنا چھوڑ دیجیے۔

کملا۔ واہ وا۔ یہ تو تم نے خوب کہی، قسم اللہ پاک کی، خوب کہی، جس کل وہ بٹھائے اسی کل بیٹھ جاؤں۔ پھر جھگڑا ہی نہ ہو۔ کیوں؟ اچھی بات ہے۔ کل دن بھر گھر سے نکلوں

گا نہیں۔ دیکھوں تو تب کیا کہتی ہے۔ دیکھنا اب تک وہ چھوکرا زعفران اور کیوڑا لے کر نہیں لوٹا۔ کان میں بھنک پڑگئی ہوگی۔ پریما کو منع کردیا ہوگا۔ بھئی اب تو نہیں رہا جاتا۔ آج جو کوئی میرے منہ لگا تو بُرا ہوگا۔ میں ابھی جاکر سب چیزیں بھیجے دیتا ہوں مگر جب تک میں نہ آؤں آپ تیار نہ کرایئے گا۔ یہاں اس فن کے استاد ہیں۔ موروثی بات ہے دادا ایک تولہ کا ناشتہ کرتے ہیں عمر میں کبھی ایک دن کا بھی ناغہ نہیں کیا، مگر کیا مجال کہ نشہ ہوجائے۔

یہ کہہ کر کملا پرشاد جھلائے ہوئے گھر چلے گئے۔ بسنت کمار کسی کام سے اندر گئے تو دیکھا کہ پورنا اُبٹن پیس رہی ہے۔ پنڈت جی کے بیاہ کے بعد یہ دوسری ہولی تھی۔ پہلی ہولی میں بے چارے خالی ہاتھ تھے۔ پورنا کی کچھ خاطر نہ کرسکے تھے۔ مگر اب کے انھوں نے بڑی تیاریاں کی تھیں۔ محنت کرکے کوئی ڈیڑھ سو روپے پیدا کیے تھے۔ اس میں سے پورنا کے لیے ایک عمدہ ساڑی لائے تھے۔ دو ایک چھوٹی موٹی چیزیں بھی بنوا دی تھیں۔ پورنا آج وہ ساڑی پہن کر انھیں اپسرا سی معلوم پڑنے لگی۔ پاس جاکر بولے۔"آج تو جی چاہتا ہے تمھیں آنکھوں میں بٹھا لوں۔"

پورنا نے اُبٹن ایک پیالی میں اُٹھاتے ہوئے ان کی آنکھوں سے آنکھیں ملا کر کہا۔"یہ دیکھو میں تو پہلے ہی بیٹھی ہوئی ہوں۔"

بسنت۔ ذرا اشنان کرتا آؤں۔ کملا بابو اب دس بجے سے پہلے نہ لوٹیں گے۔

پورنا۔ پہلے ذرا یہاں آکر بیٹھ جاؤ۔ اُبٹن تو لگا دوں۔ پھر نہانے جانا۔

بسنت۔ نہیں نہیں، رہنے دو۔ میں اُبٹن نہ لگاؤں گا۔ لاؤ میری دھوتی دو۔

پورنا۔ واہ اُبٹن کیوں نہ لگاؤ گے۔ آج کی تو یہ رسم ہے۔ آ کے بیٹھ جاؤ۔

بسنت۔ بڑی گرمی ہے۔ بالکل جی نہیں چاہتا۔

پورنا نے لپک کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُبٹن بھرا ہاتھ ان کے بدن پر پھیر دیا۔ بولی۔"سیدھے سے کہتی تھی تو نہیں مانتے تھے۔ اب تو بیٹھو گے۔"

بسنت نے جھینپ کر کہا۔"مگر ذرا جلدی کرنا۔ دھوپ ہو رہی ہے۔"

پورنا۔ اب گنگا جی کہاں جاؤ گے۔ یہیں نہا لینا۔

بسنت۔ نہیں۔ آج گنگا کنارے بڑی بہار ہو گی۔

پورنا۔ اچھا تو جلدی لوٹ آنا۔ یہ نہیں کہ اِدھر اُدھر تیرنے لگو۔ نہاتے وقت تم بہت دور تک تیر جایا کرتے ہو۔

پنڈت جی اُبٹن لگوا کر نہانے کے لیے چلے۔ ان کا قاعدہ تھا کہ گھاٹ سے ذرا الگ نہایا کرتے تھے۔ تیراک بھی اچھّے تھے۔ کئی بار شہر کے اچھّے تیراکوں سے بازی جیت چکے تھے۔ اگرچہ آج گھر سے وعدہ کرکے چلے تھے کہ تیروں گا نہیں۔ مگر ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے اور صاف پانی میں اُٹھتی ہوئی لہریں ایسی بھلی معلوم ہوتی تھیں کہ دل تیرنے کے لیے بے قرار ہو اُٹھا۔ وہ فوراً پانی میں کود پڑے اور ادھر ادھر کلیلیں کرنے لگے۔ دفعتاً انھیں منجدھار میں کوئی سرخ چیز بہتی نظر آئی۔ غور سے دیکھا تو کنول تھے۔ آفتاب کی شعاعوں میں چمکتے ہوئے وہ ایسے خوشنما معلوم ہوتے تھے کہ بسنت کمار کا جی ان پر للچا گیا۔ سوچا کہ اگر یہ مل جائیں تو پورنا کے کانوں کے لیے جھومک بناؤں۔ اس کی خوشی کا اندازہ کرکے ان کا دل ناچ اُٹھا۔ بیچ دھارے تک تیر جانا ان کے لیے کوئی بڑی بات نہ تھی۔ انھیں پورا یقین تھا کہ میں پھول لا سکتا ہوں۔ جوانی دیوانی ہے۔ یہ نہ سوچا کہ جیوں جیوں میں آگے بڑھوں گا پھول بھی تو بڑھیں گے۔ ان کی طرف چلے اور کوئی پندرہ منٹ میں منجدھار میں پہنچ گئے۔

مگر وہاں جاکر دیکھا تو پھول اتنی ہی دور آگے تھے۔ اب کچھ تکان معلوم ہونے لگی تھی مگر بیچ میں کوئی ریت بھی نہ پڑتی تھی جس پر بیٹھ کر دم لیتے۔ آگے ہی بڑھتے گئے کبھی ہاتھ کبھی پیروں سے زور لگاتے، پھولوں تک پہنچے۔ مگر اس وقت تک کل اعضا سُست پڑگئے تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے جب پھولوں کو پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھانا چاہا تو ہاتھ نہ اُٹھ سکا۔ آخر ان کو دانتوں میں دبا لیا اور پلٹ پڑے۔ مگر جب وہاں سے انھوں نے کنارے کی طرف دیکھا تو ایسا معلوم ہوا گویا ہزاروں کوس کی منزل ہے۔ بدن بالکل نڈھال ہوگیا تھا اور پانی کا بہاؤ بھی خلاف تھا۔ ان کی ہمّت چھوٹ گئی۔ ہاتھ پیر ڈھیلے پڑگئے۔ قریب کوئی کشتی یا ڈونگی نہ تھی اور کنارے تک آواز ہی نہ پہنچ سکتی تھی۔ سمجھ گئے یہیں غرق دریا ہونا پڑے گا۔ ایک لمحہ کے لیے پورنا کی یاد آئی۔ ہائے وہ ان کی راہ دیکھ رہی ہوگی۔ اسے کیا معلوم وہ اپنی زندگی کا خاتمہ کرچکے۔ بسنت کمار نے ایک بار پھر زور لگایا مگر

ہاتھ پیر نہ ہل سکے۔ اب ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ کنارے پر سے لوگوں نے انھیں دیکھا۔ دو چار آدمی پانی میں کود بھی پڑے۔ مگر ایک ہی لمحہ میں بسنت کمار لہروں میں سما گئے۔ صرف کنول کے پھول پانی میں تیرتے رہ گئے گویا زندگی کا خاتمہ ہوجانے کے بعد اس کی ناکام آرزوئیں اپنا خونیں جلوہ دکھا رہی تھیں۔

(۴)

لالہ بدری پرشاد کی شرافت مشہور تھی۔ ان سے ٹھگ کر کوئی پیسہ بھی نہ لے سکتا تھا مگر مذہب کے معاملے میں وہ بہت ہی فراخ دل تھے۔ خودغرضوں سے وہ کوسوں بھاگتے تھے، مگر محتاجوں کی مدد کرنے میں کبھی نہ چوکتے تھے۔ پھر پورنا تو ان کی پڑوسن ہی نہیں برہمنی بھی، اس پر ان کی لڑکی کی سہیلی، اس کی مدد کیوں نہ کرتے؟ پورنا کے ساتھ دو چار معمولی گہنوں کے سوا اور کیا تھا۔ تیرھویں کے دن اس نے وہ سب گہنے لاکر لالہ جی کے سامنے رکھ دیے اور آبدیدہ ہوکر بولی۔"میں اب انھیں رکھ کر کیا کروں گی۔"

بدری پرشاد نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔"میں انھیں لے کر کیا کروں گا بیٹی! تم یہ نہ سمجھو کہ میں دھرم یا پُن سمجھ کر یہ کام کر رہا ہوں۔ یہ میرا فرض ہے۔ ان گہنوں کو اپنے پاس رکھو۔ کون جانے کس وقت ان کی ضرورت پڑے۔ جب تک میں زندہ ہوں تمھیں اپنی بیٹی سمجھتا رہوں گا۔ تمھیں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔"

تیرھویں بڑی دھوم سے ہوئی۔ کئی سو برہمنوں نے کھانا کھایا۔ دان دچھنا میں بھی کوئی کمی نہ کی گئی۔

رات کے بارہ بج گئے تھے۔ لالہ بدری پرشاد برہمنوں کو کھانا کھلاکر لوٹے تو دیکھا کہ پریما ان کے کمرے میں کھڑی ہے۔ بولے۔"یہاں کیوں کھڑی ہو بیٹی! رات بہت گئی جاکر سو رہو۔"

پریما۔ آپ نے ابھی کھانا نہیں کھایا ہے نا؟

بدری۔ اب اتنی رات گئے میں کھانا نہ کھاؤں گا۔ تھک بھی بہت گیا ہوں لیٹتے ہی لیٹتے سوجاؤں گا۔

یہ کہہ کر بدری پرشاد پلنگ پر بیٹھ گئے اور ایک لمحہ کے بعد بولے۔"کیوں بیٹی پورنا کے مائیکہ میں کوئی نہیں ہے؟ میں نے اس سے نہ پوچھا کہ شاید اس کو رنج ہو۔"

پریما۔ مائیکہ میں کون ہے۔ ماں باپ پہلے ہی مر چکے تھے۔ ماما نے بیاہ کر دیا تھا۔ مگر جب سے بیاہ ہوا پھر کبھی جھانکنے تک نہیں۔ سسرال میں بھی سگا کوئی نہیں ہے۔ پنڈت جی کے دم سے ناتا تھا۔

بدری پرشاد نے بسترے کی چادر برابر کرتے ہوئے کہا۔"میں سوچتا ہوں کہ پورنا کو اپنے ہی مکان میں رکھوں تو کیا ہرج ہے؟ اکیلی عورت کیسے رہے گی؟"

پریما۔ ہوگا بہت اچھا۔ مگر اماں جی مانیں تب تو۔

بدری۔ مانیں گی کیوں نہیں، پورنا تو انکار نہ کرے گی؟

پریما۔ پوچھوں گی، میں سمجھتی ہوں کہ انھیں انکار نہ ہوگا۔

بدری۔ اچھا مان لو کہ وہ اپنے ہی گھر میں رہے تو اس کا خرچ کوئی بیس روپے میں چل جائے گا۔

پریما نے احسان مند نگاہوں سے والد کی طرف دیکھ کر کہا۔"بڑے مزے سے۔ پنڈت جی پچاس ہی روپے تو پاتے تھے۔"

بدری پرشاد نے تشویش کے لہجے میں کہا۔ "میرے لیے بیس، پچیس، تیس سب برابر ہیں۔ مگر مجھے اپنی زندگی ہی کی بات تو نہیں سوچنی ہے۔ اگر آج نہ رہوں تو کملا کوڑی پھوڑ کر نہ دے گا، اس کے لیے کوئی مستقل بندوبست کر دینا چاہتا ہوں ابھی ہاتھ میں روپے نہیں ورنہ کل ہی چار ہزار روپے کسی معتبر بینک میں جمع کر دیتا۔ سود سے اس کی پرورش ہوتی رہتی۔ یہ شرط کر دیتا کہ اصل میں سے اس کو کچھ نہ دیا جائے۔"

دفعتاً کملا پرشاد آنکھیں ملتے ہوئے آکر کھڑے ہوئے اور بولے۔ "ابھی آپ سوئے نہیں۔ گرمی لگتی ہے تو پنکھا لاکر رکھ دوں۔ رات زیادہ ہوگئی۔"

بدری۔"نہیں گرمی نہیں ہے۔ پریما سے کچھ باتیں کرنے لگا تھا۔ تم سے بھی کچھ صلاح لینا چاہتا تھا۔ تم آپ ہی آپ آگئے۔ میں سوچتا ہوں پورنا یہیں آکر رہے تو کیا ہرج ہے۔"

کملا پرشاد نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔"یہاں اماں نہ راضی ہوں گی۔"

بدری۔اماں کی بات چھوڑ دو۔ تمھیں تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔

کملا پرشاد نے زور دے کر کہا۔ ”میں تو کبھی صلاح نہ دوں گا۔ دنیا میں سبھی
طرح کے آدمی ہیں۔ نہ جانے لوگ کیا سمجھیں۔ ذرا دور تک سوچیے۔“

بدری۔ اس کی پرورش کے لیے تو کوئی نہ کوئی انتظام کرنا ہی ہوگا۔

کملا۔ ہم کیا کرسکتے ہیں۔

بدری۔ تو اور کون کرے گا۔

کملا۔ شہر میں ہمیں تو نہیں ہیں؟ اور بہت سے مالدار لوگ ہیں۔ اپنی حیثیت کے مطابق ہم
بھی کچھ امداد کریں گے۔

بدری پرشاد نے تمسخر کرتے ہوئے کہا۔ ”تو چندہ کھول دیا جائے کیوں؟ اچھی
بات ہے تو جاؤ گھوم گھوم کر چندہ وصول کرو۔“

کملا۔ میں کیوں چندہ جمع کرنے لگا۔

بدری۔ تب کون کرے گا؟

کملا پرشاد نے اس معاملے میں مطلق غور نہ کیا تھا۔ بے دلی سے بولا۔ ”آخر
آپ نے کوئی تجویز تو سوچی ہوگی جو مناسب سمجھیے وہ کیجیے۔“

بدری۔ میں کیا کروں گا۔ میری تجویز کی اب وقعت ہی کیا ہے۔ چراغ سحری ہو رہا ہوں۔
میری زندگی کا کیا ٹھکانا۔ آج مرا کل دوسرا دن۔ میری آنکھیں بند ہوتے ہی تم
سب درہم برہم کرڈالو تو مفت میں اور بدنامی ہو۔

کملا پرشاد نے بہت رنجیدہ ہوکر کہا۔ ”آپ مجھے اتنا کمینہ خیال کرتے ہیں یہ
مجھے معلوم نہ تھا۔“

بدری پرشاد بیٹے کو بہت زیادہ پیار کرتے تھے۔ یہ دیکھ کر، میری باتوں سے
اسے صدمہ پہنچا ہے، انھوں نے فوراً بات بنائی۔ ”نہیں نہیں میں تمھیں کمینہ نہیں
سمجھتا۔ بہت ممکن ہے کہ آج ہم جو بات کرسکتے ہیں وہ کل کے حالات تبدیل
ہوجانے کے بعد نہ کرسکیں۔“

کملا۔ ایشور نہ کرے کہ میں وہ مصیبت جھیلنے کے لیے بیٹھا رہوں۔ لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں
کہ آپ جو کچھ کرجائیں گے، اس میں کملا پرشاد کو کبھی کسی حالت میں اعتراض نہ
ہوگا۔ آپ گھر کے مالک ہیں۔ آپ ہی نے یہ دولت پیدا کی ہے۔ آپ کو اس پر

پورا اختیار ہے۔ تجویز کرنے کے پیشتر میں جو چاہے کہوں۔ جب آپ ایک بات طے کردیں گے تو میں اس کے خلاف زبان تک نہ ہلاؤں گا۔

بدری۔ تو کل چار ہزار روپے پورنا کے نام بینک میں جمع کردو اور یہ شرط لگا دو کہ وہ اصل میں سے کچھ نہ لے سکے۔ اس کے بعد روپے ہمارے ہوجائیں گے۔ کملا کو گویا چوٹ سی لگی۔ بولے۔ "خوب سوچ لیجیے۔"

بدری پرشاد نے تصفیہ کے لہجے میں کہا۔ "خوب سوچ لیا ہے۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ وہ اسے منظور کرتی ہے یا نہیں۔"

کملا۔ کیا اس کی منظوری میں بھی کوئی شرط ہے۔

بدری پرشاد نے حقارت آمیز لہجہ میں کہا۔ "تمھاری یہ بُری عادت ہے کہ تم سب کو خودغرض سمجھنے لگتے ہو۔ کوئی شریف آدمی دوسروں کا احسان سر پر نہیں لینا چاہتا۔ انسان کی فطرت ہی ایسی ہے۔ گئے گزروں کی بات جانے دو۔ لیکن جس میں خودداری کا ذرا بھی شائبہ ہے وہ دوسروں سے مدد نہیں لینا چاہتے۔ مجھے تو شک نہیں بلکہ یقین ہے کہ پورنا کبھی اس پر رضامند نہ ہوگی۔ وہ محنت کرے گی لیکن جب تک مجبور نہ ہوجائے ہماری مدد کو بھی قبول نہ کرے گی۔

پریما نے بڑے جوش سے کہا۔ "مجھے بھی یہی شبہ ہے۔ راضی ہوگی بھی تو بڑی مشکل سے۔"

بدری۔ تم اس سے اس کا ذکر کرنا کل ہی۔

پریما۔ نہیں دادا، مجھ سے نہ بنے گا۔ وہ اور میں دونوں ہی اب تک بہنوں کی طرح رہی ہیں۔ مجھ سے اس طرح کی گفتگو اب کیسے ہوگی۔ میں تو رونے لگوں گی۔

بدری۔ تو میں ہی طے کرلوں گا۔ ہاں کل شاید مجھے فرصت نہ ملے، تب تک تمھاری اماں سے باتیں ہوں گی۔ میرا خیال ہے وہ راضی ہوجائیں گی۔

کملا پرشاد خانہ داری کے انتظام میں اپنے کو لاثانی سمجھتے تھے۔ یوں تو عقل میں وہ اپنے کو افلاطون سے رتی بھر کم نہ سمجھتے تھے، لیکن خانہ داری میں تو ان کا کمال مسلمہ تھا۔ سنیما روز دیکھتے تھے مگر کیا مجال جو جیب سے ایک پیسہ بھی خرچ کریں۔ منیجر سے دوستی کر رکھی تھی۔ اس کے یہاں کبھی کبھی دعوت کھا آیا کرتے

تھے۔ پیسوں کا کام دھیلوں میں نکالتے تھے اور بڑی خوبصورتی سے کبھی کبھی لالہ بدری پرشاد سے اس معاملے میں ان کی ٹھن بھی جایا کرتی تھی۔ بوڑھے لالہ جی بیٹے کی اس تنگ دلی پر کبھی کبھی کھری کھری کہہ ڈالتے تھے۔ کملا پرشاد سمجھ گئے کہ لالہ جی اس وقت کوئی اعتراض نہ سنیں گے بلکہ اعتراض سے ان پر اُلٹا ہی اثر پڑے گا۔ اس لیے انھوں نے مصلحت سے کام لینے کا ارادہ کیا۔ علی الصباح پورنا کے دروازے پر جاکر آواز دی۔ پورنا پہلے تو ان سے پردہ کرتی تھی مگر اب بہو بن کر بیٹھنے سے کام نہ چل سکتا تھا۔ انھیں اندر بلا لیا، کملا بابو اندر جاکر چارپائی پر بیٹھے۔ ایک لمحہ میں پورنا ان کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ پورنا کی پیشانی گھونگھٹ سے ڈھکی ہوئی تھی لیکن دونوں نم آنکھیں تشکر سے بھری ہوئی زمین کی طرف تک رہی تھیں۔

کملا اسے دیکھ کر سکتے میں آگیا۔ وہ اس ارادے سے آیا تھا کہ اسے کسی طرح یہاں سے ٹال دوں۔ میکے چلے جانے کی تحریک کروں۔ اسے اس کی ذرا بھی پرواہ نہ تھی کہ آئندہ اس بیکس کا کیا حشر ہوگا۔ اس کی گزر بسر کیسے ہوگی۔ اس کی حفاظت کون کرے گا۔ وہ اس وقت اپنے یہاں سے ٹال کر اپنے سر کا بوجھ ہٹا دینا چاہتا تھا۔ لیکن اس بیوہ کی بھولی بھالی معصوم صورت دیکھ کر اس تنگ دلی پر غیرت آئی۔ کون آدمی ایسا سنگ دل ہے جو کسی گلِ نازک کو توڑ کر بھاڑ میں جھونک دے۔ زندگی میں پہلی بار اس کا دل حسن سے متاثر ہوا۔ اندھیرے گھر میں چراغ جل اٹھا۔ بولا۔ ”تمھیں اب یہاں اکیلے رہنے میں بڑی تکلیف ہوگی۔ ادھر پریما بھی اکیلی گھبرایا کرتی ہے، اگر تم بھی جاکر اس کے ساتھ رہو تو کیا ہرج ہے۔“

پورنا سر نیچا کیے ایک لمحہ تک سوچنے کے بعد بولی۔ ”ہرج کیا ہے یہاں بھی تو آپ ہی لوگوں کے بھروسے پر پڑی ہوں۔“

کملا۔ تو آج چلی چلو۔ بابو جی کی بھی یہی خواہش ہے۔ میں جاکر آدمیوں کو اسباب لے جانے کے لیے بھیجے دیتا ہوں۔

پورنا۔ نہیں بابو جی، اتنی جلدی نہ کیجیے۔ سوچ لینے دیجیے۔

کملا۔ اس میں سوچنے کی کون سی بات ہے۔ یہاں اکیلی کیسے پڑی رہوگی؟

پورنا۔ اکیلی تو نہیں ہوں۔ مہری بھی یہیں سونے کو کہتی ہے۔

کملا۔ اچھا! وہ بلو، ہاں بڑھیا ہے تو سیدھی مگر ٹری ہے۔ آخر میرے گھر چلنے میں تمھیں کیا پس و پیش ہے۔

پورنا۔ کچھ نہیں۔ پس و پیش کیا ہے۔

کملا۔ تو آدمیوں کو جاکر بھیج دوں؟

پورنا۔ بھیج دیجیے گا، ابھی جلدی کیا ہے؟

کملا۔ تم ناحق اتنا سوچا کرتی ہو، پورنا! کیا تم سمجھتی ہو کہ تمھارا جانا میرے گھر کے اور لوگوں کو بُرا معلوم ہوگا؟

کملا کا قیاس درست نکلا۔ پورنا کو واقعی یہی اعتراض تھا مگر وہ لحاظ کے سبب اسے ظاہر نہ کرسکتی تھی۔ اس نے سمجھا بابو جی نے میرے دل کی بات تاڑ لی۔ اس سے وہ نادم ہوئی۔ بابو صاحب کے گھر والوں کے متعلق ایسا خیال اسے نہ ہونا چاہیے تھا۔ مگر کملا پرشاد نے اس کے پس و پیش کا خاتمہ کر دیا۔ بولے۔"تمھارا یہ خیال بالکل قدرتی ہے پورنا۔ مگر سوچو، میرے مکان میں ایسا کون سا آدمی ہے جو تمھاری مخالفت کرسکے۔ بابو جی کی خود ہی یہ خواہش ہے۔ مجھے تم خود ہی جانتی ہو۔ پنڈت بسنت کمار سے میری کتنی گہری دوستی تھی۔ یہ تم سے پوشیدہ نہیں۔ پریما تمھاری سہیلی ہی ہے۔ بابو جی کو تم سے کتنی محبت ہے، تم یہ جانتی ہو، رہ گئی سومترا اسے ذرا بُرا لگے گا۔ تم سے کوئی پردہ نہیں مگر اس کی پرواہ کون کرتا ہے۔ اسے خوش رکھنے کا بھی تمھیں ایک گر بتائے دیتا ہوں۔ کبھی کبھی یہ منتر پڑھ دیا کرنا۔ وہ تمھاری بُرائی نہ کرے گی۔ بس اس کی خوبصورتی کی تعریف کر دینا۔ تم یہ نہ سمجھنا کی تعریف کرنے سے وہ سمجھ جائے گی کہ یہ مجھے بنا رہی ہے۔ تم چاہے جتنا سرا ہو وہ اسے ٹھیک ہی سمجھے گی۔ اسی منتر سے میں اسے نچایا کرتا ہوں۔ وہی منتر تمھیں بتائے دیتا ہوں۔"

پورنا کو ہنسی آگئی بولی۔"آپ تو ان کی ہنسی اُڑا رہے ہیں۔ بھلا ایسا کون ہوگا جسے اتنی سمجھ نہ ہو۔"

کملا۔ اتنی سمجھ کو تم معمولی بات سمجھ رہی ہو۔ تم کو یہ سُن کر تعجب ہوگا۔ مگر اپنی تعریف

سن کر ہم اتنے متوالے ہوجاتے ہیں کہ پھر ہم میں اچھا بُرا سمجھنے کی تمیز ہی نہیں رہ جاتی۔ بڑے سے بڑا مہاتما بھی اپنی تعریف سن کر خوشی سے پھول اُٹھتا ہے۔ ہاں تعریف کرنے والے کے لفظوں میں بھگتی (عقیدت) کی جھلک ہونا ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شعراء کو جھوٹی تعریفوں کے پُل باندھنے کے لیے راجے مہاراجے انعام و اکرام کیوں دیتے۔ بتاؤ راجا صاحب طمنچہ کی آواز سن کر چونک پڑتے ہیں۔ کانوں میں انگلی ڈال لیتے ہیں اور گھر میں بھاگتے ہیں۔ مگر دربار کا شاعر شجاعت میں ارجن اور درونا چار سے دو ہاتھ اور اونچا اُٹھا دیتا ہے تو راجا صاحب کی بانچھیں کھل جاتی ہیں۔ انھیں مطلق یہ خیال نہیں ہوتا کہ میرا مضحکہ اُڑایا جا رہا ہے۔ ایسی تعریفوں میں ہم الفاظ کو نہیں، ان کے چھپے ہوئے جذبات کو دیکھتے ہیں۔ سومترا رنگ روپ میں اپنے برابر کسی کو نہیں سمجھتی۔ اسے نہ جانے یہ خبط کیسے ہوگیا۔ یہ کہتے ہوئے بہت رنج ہوتا ہے مگر ایسی عورت کے ہاتھوں میری زندگی خراب ہوگئی۔ مجھے معلوم ہی نہیں ہوا کہ محبت کسے کہتے ہیں۔ دنیا میں سب سے زیادہ بدنصیب آدمی ہوں۔ شاید پچھلے جنم کے گناہوں کا پراشچت کر رہا ہوں۔ سومترا سے بولنے کو جی نہیں کرتا۔ لیکن منہ سے کچھ نہیں کہتا کہ کہیں گھر میں کہرام نہ مچ جائے۔ لوگ سمجھتے ہیں میں آوارہ ہوں۔ تفریح کے لیے سنیما اور تھیٹر جاتا ہوں لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں پورنا میں ان تماشوں میں محض اپنے دردِ دل کو بہلانے کے لیے جاتا ہوں۔ اپنی گرسنہ آرزوؤں کو اور کیسے سمجھاؤں۔ دل کی آگ کو کیسے بجھاؤں۔ کبھی کبھی جی میں آتا ہے کہ سنیاسی ہوجاؤں۔ اور شاید، ایک دن مجھے...... یہی کرنا پڑے گا۔ تم سمجھتی ہوگی یہ حضرت کہاں کا چھپڑا لے بیٹھے معاف کرنا۔ نہ جانے میں آج کیوں تم سے یہ تذکرہ کرنے لگا۔ آج تک میں نے ان خیالات کو کبھی ظاہر نہیں کیا تھا۔ حسرت نصیب دل ہی سے ہمدردی کی امید ہوتی ہے۔ بس یہی سمجھ لو، تو میں جاکر آدمیوں کو بھیجے دیتا ہوں۔ تمھارا اسباب اُٹھا لے جائیں۔

پورنا کو اب کیا عذر ہو سکتا تھا۔ اس کا جی اب بھی گھر چھوڑنے کو نہ چاہتا تھا۔ لیکن اب وہ اس تحریک کو نہ ٹال سکی۔ اسے یہ خوف بھی ہوا کہ میرے انکار

سے ان کو ملال نہ ہو۔ اس بیکس کے لیے اس وقت تنکے کا سہارا بھی بہت تھا، تو بھلا اس کشتی کو کیسے حقیر سمجھتی۔ لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ وہ اسے پار لے جانے والی کشتی نہیں بلکہ ایک خوفناک دریائی جانور ہے جو اس کی روح کو نگل جائے گا۔

(۵)

پورنا کو اپنے گھر سے نکلتے وقت بہت رنج ہونے لگا۔ اس نے اپنی بامسرت زندگی کے تین سال اسی گھر میں کاٹے تھے۔ یہیں سہاگ کے سکھ دیکھے۔ یہیں رنڈاپے کے دکھ بھی دیکھے۔ اس گھر کو چھوڑتے اس کا دل پھٹا جاتا تھا جس وقت چاروں کہار اس کا اسباب اُٹھانے کے لیے گھر میں آئے تو یکایک رو پڑی۔ اس کے دل میں کچھ ایسے جذبات پیدا ہوگئے جیسے نعش کے اُٹھاتے وقت سوگ کرنے والوں کے دل میں پیدا ہوجاتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ نعش گھر میں نہیں رہ سکتی اور جتنی جلدی اس کا کفن دفن ہوجائے اتنا ہی اچھا۔ وہ ایک لمحہ کے لیے اس کی محبت کے جوش میں آکر اس کے پاؤ سے لپٹ جاتے ہیں اور مایوسی سے پاگل ہوکر ہلا دینے والی آواز میں رو پڑتے ہیں۔ یہ گمانِ باطل کہ شاید لاش میں زندگی کے کچھ آثار باقی ہوں، ایک پردہ کی طرح آنکھوں کے سامنے سے دور ہوجاتا ہے اور دنیاوی محبت کا آخری رشتہ شکست ہوجاتا ہے۔اسی طرح پورنا بھی مکان کے ایک گوشہ میں منہ چھپاکر رونے لگی۔ اپنے پیارے سوامی کی یادگار کا یہ سہارا بھی رنج کے بحر بیکراں میں غائب ہوگیا۔ اس مکان کا ایک ایک گوشہ اس کے لیے دلکش یادگاروں سے مملو تھا، سہاگ کے سورج کے غروب ہوجانے پر بھی یہاں اس کی کچھ چمک نظر آتی تھی۔ سہاگ کے سہانے گیت کے ختم ہوجانے پر بھی یہاں اس کی گونج اُٹھ رہی تھی۔ اس مکان میں ادھر ادھر چلتے ہوئے اسے اپنے سہاگ کا دکھ بھرا گھمنڈ محسوس ہوتا رہتا تھا۔ آج اس سورج کی آخری چمک مٹی جا رہی تھی۔ آج اس گیت کی وہ گونج ایک غیر محدود خلا میں ڈوبی جاتی تھی۔ آج وہ گھمنڈ دل کو چیر کر نکلا جا رہا تھا۔

پڑوس کی عورتوں کو جب معلوم ہوا کہ پورنا یہاں سے جا رہی ہے تو سب اسے رخصت کرنے آئیں۔ پورنا کے اخلاق و انکسار نے سبھی کے قلوب کو مسخر کر لیا تھا۔ پورنا کے پاس دولت نہ تھی مگر میٹھی باتیں تھیں۔ بشاش چہرہ تھا۔ ہمدردی تھی۔ خدمت گزاری تھی جو دولت کی بہ نسبت کہیں زیادہ قیمتی جواہر ہیں اور جن کی ضرورت لوگوں کو دولت

سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ پورنا ان سبھوں سے گلے مل کر رخصت ہوئی، گویا لڑکی سسرال جاتی ہو۔شام کے وقت وہ اپنی مہری بلّو کے ساتھ روتی ہوئی اس طرح چلی گویا کوئی جلاوطن ہو۔ پیچھے مڑمڑ کر اپنے پیارے گھر کو دیکھتی جاتی تھی۔ گویا اس کا دل وہیں رہ گیا ہو۔

پریما اپنے دروازے پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ پورنا کو دیکھتے ہی دوڑ کر اس کے گلے سے لپٹ گئی۔ اس گھر میں پورنا عموماً روز ہی آیا کرتی تھی۔ یہاں آتے ہی اس کا دل خوش ہوجاتا تھا۔ ہنسی کھیل میں وقت کٹ جاتا تھا مگر آج اس گھر میں قدم رکھنے میں پس و پیش ہو رہا تھا۔ شاید وہ پچھتا رہی تھی کہ ناحق ہی آئی۔ پریما کے گلے مل کر بھی اس کا دل خوش نہ ہوا۔ تب وہ سہیلی کی حیثیت سے آتی تھی۔ آج وہ ان کی دست نگر بن کر آئی تھی۔ تب اس کا آنا معمولی بات تھی۔ اس کی کوئی خاص آؤ بھگت نہ ہوتی تھی۔ لوگ اس کی پیشوائی کے لیے نہ دوڑتے تھے۔ آج اس کے آتے ہی دیوکی مودی خانہ کا دروازہ کھلا چھوڑ کر نکل آئی۔ سومترا اپنے بال گتھا رہی تھی۔ آدھی گتھی ہوئی چوٹی پر آنچل ڈال کر بھاگی۔ مہریاں اپنے اپنے کام چھوڑ کر نکل آئیں۔ کملا پرشاد پہلے ہی آنگن میں کھڑے تھے۔ لالہ بدری پرشاد سندھیا کرنے جارہے تھے۔ اسے ملتوی کرکے آنگن میں آپہنچے۔ یہ خاطرداریاں دیکھ کر پورنا کا دل بیٹھا جارہا تھا۔ اس دل جوئی کا باعث اعزاز نہیں رحم تھا۔

دیوکی کو سومترا کی کوئی بات نہ بھاتی تھی اس کا ہنسنا، بولنا، چلنا، پھرنا، اُٹھنا، بیٹھنا، پہننا، اوڑھنا سبھی انھیں پھوہڑپن کی انتہائی حد سے تجاوز کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا اور وہ ہمیشہ اس کی سخت تنقید کرتی رہتی تھیں۔ ان کی تنقیدوں میں محبت اور بزرگانہ نصیحت کا رنگ تھا یا منافرت کا، اس کا فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ سومترا تو اسے منافرت ہی سمجھتی تھی اس لیے وہ انھیں اور بھی چڑھاتی رہتی تھی۔دیوکی سویرے اُٹھنے کو تاکید کرتی تھی۔ سومترا پہروں دن چڑھے اُٹھتی تھی۔ دیوکی گھونگھٹ نکالنے کو کہتی تھی۔ سومترا اس کے جواب میں آدھا سر کھلا رکھتی تھی۔ دیوکی مہریوں سے احتراز کرنے کی تعلیم دیتی تھی، سومترا مہریوں سے ہنسی دل لگی کرتی رہتی تھی۔دیوکی کو پورنا کا یہاں آنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ سومترا اسے بھانپ گئی۔ پہلے ہی سے اس نے شوہر کی اس تجویز پر ناک سکیڑی تھی۔ یہ جان کر کہ یہ تجویز پوری ہوکر رہے گی، اس نے اس سے اختلاف کرکے اُلجھن لینا مناسب نہ سمجھا تھا۔ وہ ساس کے دل کا رنگ سمجھ رہی تھی۔ یہ بھی جانتی تھی کہ پورنا بھی سمجھ رہی ہے۔ اس

لیے پورنا سے اسے محبت اور ہمدردی پیدا ہوگئی۔ اب تک دیوکی پورنا کو دکھا کر سومترا کو شرمندہ کرنا چاہتی تھی اس لیے سومترا پورنا سے جلتی تھی۔ آج دیوکی پورنا سے بے اعتنائی کر رہی تھی اس لیے سومترا کا اس سے بہناپا ہوجانا لازم ہوگیا۔

پورنا آج بھی بہت دیر تک پریما کے پاس نہ بیٹھی۔ دل بہت اداس تھا۔ آج اسے اپنے حالت کا اندازہ ہوا تھا۔ اتنی جلدی اس کی حالت کیا سے کیا ہوگئی تھی۔ یہ آج اس کی سمجھ میں آرہا تھا۔ یہ گھر اس کے کھپریل والے گھر سے کہیں زیادہ آرام دہ تھا۔ اس کے کمرہ میں فرش تھا، چارپائی تھی، الماریاں تھیں، برقی روشنی تھی، پنکھا تھا، مگر اس وقت بجلی کی روشنی اس کی آنکھوں میں چبھ رہی تھی اور پنکھے کی ہوا شعلہ کی طرح جسم کو جھلسائے ڈالتی تھی۔ پریما کے بہت اصرار کرنے پر بھی وہ آج کچھ نہ کھا سکی۔ تقدیر اس کے ساتھ کیسا کھیل کھیل رہی تھی۔ اس کے سر تاج کو اس کے ہاتھ سے چھین کر اب اس کو کھلونے سے خوش کرنا چاہتی تھی۔ اس کی دونوں آنکھیں پھوڑ کر اسے سہانے منظر کی سیر کرا رہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ کاٹ کر جل بہار کرنے کے لیے اتھاہ سمندر میں ڈھکیل رہی تھی۔

گیارہ بج گئے تھے۔ پورنا روشنی سے آنکھیں ہٹا کر تاریکی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس گہری تاریکی میں اسے کتنے خوش نما منظر نظر آرہے تھے۔ وہی اپنا کھپریل کا مکان تھا۔ وہی پُرانی چارپائی تھی۔ وہ چھوٹا سا صحن تھا اور اس کے شوہر دفتر سے آکر اس کی طرف ہنستے ہوئے اور محبت بھری نگاہوں سے تاکتے ہوئے جیب سے کوئی چیز نکال کر دکھاتے اور پھر چھپا لیتے تھے۔ وہ بیٹھی ہوئی پان لگا رہی تھی۔ جھپٹ کر اُٹھی اور شوہر کے دونوں ہاتھ پکڑ کر بولی۔"دکھا دو کیا ہے؟" شوہر نے مٹھی بند کرلی، اس کی دلچسپی اور بڑھی۔ اس نے خوب زور لگا کر مٹھی کھولی۔ مگر اس میں کچھ نہ تھا، آہ، آج اس کھیل، اس چھیڑ چھاڑ میں اسے اپنی زندگی کی تفسیر چھپی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔

دفعتاً سومترا نے آکر پوچھا۔"ارے تم تو وہاں کھڑکی کے سامنے کھڑی ہو۔ میں نے سمجھا تھا تمھیں نیند آگئی ہوگی۔"

پورنا نے آنسو پونچھ ڈالے اور آواز سنبھال کر کہا۔"یہ تو تم جھوٹ کہتی ہو بہن۔ یہ سوچتیں تو تم آتی کیوں؟"

سومترا نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔"سوچا تو یہی تھا سچ کہتی ہوں، مگر نہ جانے کیوں چلی آئی۔ شاید تمھیں سوتا دیکھ کر لوٹ جانے ہی کے لیے آئی تھی، سچ کہتی ہوں۔ اب لیٹو نا رات تو بہت ہوگئی۔"

پورنا نے کچھ متفکر ہوکر پوچھا۔"اب تک تم کیسے جاگ رہی ہو؟"

سومترا۔ تمام دن سویا جو کرتی ہوں۔

پورنا۔ تو کیوں سوتی ہو تمام دن؟

سومترا۔ یہی رات کو جاگنے کے لیے۔

سومترا ہنسنے لگی، ایک لمحہ میں یکایک اس کا چہرہ سنجیدہ ہوگیا۔ بولی۔"اپنے ماں باپ کی زرپرستی کا پراشچت کر رہی ہوں۔ بہن، اور کیا" یہ کہتے کہتے وہ آبدیدہ ہوگئی۔

پورنا یہ سن کر متحیر ہوگئی، اس کی زندگی کے نغمۂ شیریں میں یہ کرخت آواز کیوں؟

سومترا کسی اندرونی تکلیف سے بے قرار ہوکر بولی۔"تم دیکھ لینا بہن! ایک روز یہ محل ڈھ جائے گا۔ یہ بد دعا میرے منہ سے باربار نکلتی ہے۔"

پورنا نے تعجب سے کہا۔"ایسا کیوں کہتی ہو بہن" پھر اسے ایک بات یاد آگئی، پوچھا، کیا ابھی بھیا جی نہیں آئے۔"

سومترا دروازے کی طرف خوف زدہ نگاہوں سے دیکھتی ہوئی بولی۔

"ابھی نہیں، بارہ ہی تو بجے ہیں، اتنی جلدی کیوں آئیں گے؟ نہ ایک، نہ دو، نہ تین میرا بیاہ تو اس محل سے ہوا ہے۔ لالہ بدری پرشاد کی بہو ہوں۔ اس سے زیادہ سکھ کا خیال کون کرسکتا ہے؟ بھگوان نے کس لیے مجھے جنم دیا، سمجھ میں نہیں آتا۔ اس گھر میں میرا کوئی اپنا نہیں ہے بہن! میں زبردستی پڑی ہوئی ہوں۔ میرے مرنے جینے کی کسی کو پرواہ نہیں ہے۔ تم سے یہی التجا ہے کہ مجھ پر رحم کرنا۔ ٹوٹے ہوئے تاروں سے میٹھے سُر نہیں نکلتے تھے۔ تم سے نہ جانے کیا کیا کہوں گی۔ کسی سے کہہ نہ دینا، نہیں تو اور مصیبت میں پھنس جاؤں گی۔ ہم دونوں دکھیا ہیں۔ تمھارے دل میں میٹھی یادیں ہیں، میرے دل میں وہ بھی نہیں۔ میں نے سکھ دیکھا

ہی نہیں اور نہ دیکھنے کی امید ہی رکھتی ہوں۔"

پورنا نے ایک لمبی سانس کھینچ کر کہا۔"میری تقدیر سے اپنی تقدیر کا مقابلہ نہ کرو بہن، دست نگری سے بڑی مصیبت بدنصیبی کے خزانے میں بھی نہیں ہے۔"

سومترا سوکھی ہنسی ہنس کر بولی۔ "وہ مصیبت کیا میرے سر نہیں ہے بہن! اگر مجھے کہیں ٹھکانا ہوتا، اس گھر میں لمحہ بھر بھی نہ رہتی۔ سینکڑوں بار والدین کو لکھ چکی ہوں کہ مجھے بلا لو میں عمر بھر تمھاری خدمت کرتی رہوں گی مگر انھوں نے بھی میری طرف سے اپنا دل سخت کرلیا ہے۔ جواب میں نصیحتوں کا ایک دفتر آجاتا ہے۔ جسے میں کبھی نہیں پڑھتی۔ اس گھر میں صرف میرے سُسر ہیں جنھیں ایشور نے دل دیا ہے اور سب کے سب پتھر کے دیوتا ہیں۔ میں تم سے سچ کہتی ہوں بہن! مجھے اس کا رنج نہیں کہ یہ حضرت کیوں اتنی رات گئے گھر کو آتے ہیں یا ان کا دل کسی اور سے اٹکا ہوا ہے۔ اگر آج مجھے یہ معلوم ہوجائے کہ کسی کی محبت میں گرفتار ہوگئے ہیں تو میری آدھی تکلیف مٹ جائے۔ میں موسلوں سے ڈھول بجاؤں۔ مجھے تو یہ رونا ہے کہ ان کے دل ہی نہیں بلکہ دل کی جگہ خودغرضی کا ایک روڑا رکھا ہوا ہے۔ نہ کتابوں سے دلچسپی نہ گانے سے۔ نہ کھیل سے دلچسپی ہے صرف پیسے سے! مجھے تو یقین نہیں کہ انھیں سنیما میں مزہ آتا ہوگا، وہاں بھی کوئی نہ کوئی غرض ہے لین دین، سوائے ڈیوڑھے، گھاٹے، نفع میں ان کی جان بسی رہتی ہے اور مجھے ان باتوں سے نفرت ہے۔ کمرے میں آتے ہی تو پہلی بات جو ان کے منہ سے نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ بتی ابھی تک کیوں نہیں بجھائی۔ وہ دیکھو سواری آگئی۔ اب گھنٹے دو گھنٹے کفایت کی نصیحت سننی پڑے گی۔ یوں میں روپے کو ہیچ نہیں سمجھتی۔ جمع کرنا اچھی بات ہے مگر، یہ کیا، آدمی روپے کا غلام ہوجائے۔ صرف انھیں چڑھانے کے لیے کچھ نہ کچھ فضول خرچی کیا کرتی ہوں۔ مزا تو یہ ہے کہ انھیں اپنے ہی پیسوں کی ماکھ نہیں ہوتی، میں اپنے پاس سے کچھ خرچ نہیں کرسکتی! پتا جی (والد صاحب) مہینے میں چالیس پچاس روپے بھیج دیتے ہیں۔ ورنہ اس گھر کی کانی کوڑی نہ ملے۔ میری جو خواہش ہوتی ہے، کرتی ہوں، سو بھی آپ سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس پر بھی کئی بار جھگڑا ہوچکا ہے۔ سونے لگنا تو بتی بجھا دینا۔ بہن جاتی

ہوں۔"

سومترا چلی گئی۔ پورنا نے بتی بجھا دی اور لیٹی، مگر نیند کہاں؟ آج ہی اس مکان میں قدم رکھا تھا اور آج ہی اس کو اپنی جلدبازی پر افسوس ہو رہا تھا۔ یہ یقینی تھا کہ وہ بہت دن یہاں نہ رہے گی۔

(٦)

لالہ بدری پرشاد کے لیے امرت رائے سے اب کوئی واسطہ رکھنا غیر ممکن تھا۔ شادی تو دوسری بات تھی سماج میں اتنی زبردست بداخلاقی کا موید بن کر امرت رائے نے خود کو ان کی نظروں سے گرا دیا تھا۔ان سے اب کسی قسم کا تعلق پیدا کرنا بدری پرشاد کے لیے ذلت کی بات تھی۔ امرت رائے کے بعد دان ناتھ سے بہتر شخص انھیں کوئی اور نظر نہ پڑا۔ زیادہ پرسش و جستجو کرنے کا اب موقع بھی نہ تھا۔ امرت رائے کے انتظار میں پہلے ہی بہت دیر ہوچکی تھی، برادری میں لوگ انگشت نمائی کرنے لگے تھے۔ نئے شخص کی جستجو میں شادی کے ایک غیر معین وقت تک ٹل جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لیے دل کو ادھر اُدھر نہ دوڑا کر انھوں نے دان ناتھ ہی کے ساتھ عقد پختہ کرنے کا تہیہ کرلیا، دیوکی نے بھی کوئی اعتراض نہ کیا۔ پریما نے اس معاملے میں لاپروائی ظاہر کی۔ اب اس کے لیے سبھی مرد برابر تھے اور ہر کسی کے ساتھ زندگی کا نباہ کرسکتی تھی۔ اس کی چلتی تو وہ دوشیزہ ہی رہنا پسند کرتی۔ مگر جوان لڑکی بیٹھی رہے یہ خاندان کے لیے بدنامی کی بات تھی۔ اس معاملے میں وہ کسی قسم کے بے جا ضد کرکے والدین کا دل نہ دُکھانا چاہتی تھی۔

جس دن امرت رائے نے وہ زبردست عہد کیا۔ اسی دن پریما نے سمجھ لیا کہ اب زندگی میں میرے لیے سکھ کا خاتمہ ہوگیا۔ مگر بن بیاہ رہ کر اپنا مضحکہ کرانے کی بہ نسبت کسی کی ہوکر رہنا کہیں زیادہ بہتر تھا۔ آج سے دو تین برس قبل دان ناتھ ہی سے اس کے بیاہ کی بات چیت ہو رہی تھی۔ اسے وہ جانتی تھی۔ درمیان میں حالات تبدیل نہ ہوگئے ہوتے تو آج وہ دان ناتھ کے گھر میں ہوتی۔ دان ناتھ کو وہ کئی بار دیکھ بھی چکی تھی۔ اس میں محبت ہے، شرافت ہے، علمیت ہے، یہ باتیں اسے معلوم تھیں، ان کی نیک چلنی پر بھی کسی کو شبہہ نہ تھا۔وہ دیکھنے میں بھی بہت سجے گٹھے آدمی تھے۔ برہمچریہ (تجرد) کی رونق چہرے پر نمایاں تھی۔ انھیں اس سے محبت تھی۔ یہ راز پریما سے مخفی نہ تھا۔ آنکھیں دل

کے راز کو آشکار کر ہی دیتی ہیں۔ امرت رائے نے مذاق ہی مذاق میں پریما سے اس کا تذکرہ بھی کردیا تھا۔ یہ سب ہوتے ہوئے بھی پریما کو ان کا اگر کچھ خیال تھا تو وہ اتنا ہی کہ وہ امرت رائے کی دلی دوست ہیں۔ ان میں بڑی محبت ہے۔ وہ دولت مند نہیں تھے مگر یہ کوئی عیب نہ تھا۔ کیونکہ پریما شوقین نہ تھی۔ کیوں اس کا دل امرت رائے کی طرف رجوع ہوتا تھا۔ اس کا کوئی خاص سبب اس کو نہ معلوم تھا۔ مگر ایسی حالت میں اس کے لیے کوئی اور تدبیر نہ تھی۔ اب تک اس نے دان ناتھ کو کبھی اس نگاہ سے نہ دیکھا تھا۔ مگر اب دل میں وہ جگہ خالی ہوجانے کے بعد دان ناتھ کو اس میں بٹھانے میں اسے تکلیف نہ ہوئی۔ اس نے دل کو ٹٹول کر دیکھا تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ دان ناتھ سے محبت بھی کرسکتی ہے۔ بدری پرشاد شادی کے معاملے میں اس کی رضامندی ضروری سمجھتے تھے۔ پریما تیار تھی اس لیے دان ناتھ کے پاس پیغام بھیج دیا۔

دان ناتھ اب بڑے شش و پنج میں پڑے۔ یہ پیغام پاتے ہی انھیں خوشی سے پھول اُٹھنا چاہیے تھا۔ مگر یہ بات نہ ہوئی۔ انھیں اپنی منظوری لکھ بھیجنے میں ایک ہفتہ سے زائد لگ گیا۔ طرح طرح کے اندیشے ہوتے تھے۔ وہ پریما کو خوش رکھ سکیں گے؟ اس کے دل پر قابو پاسکیں گے؟ ایسا نہ ہو کہ زندگی وبال ہوجائے؟ ان کا دل ان سوالات کا بہت ہی تشفی بخش جواب دیتا تھا۔ محبت میں اگر دل کو کھینچنے کی طاقت ہے تو وہ ضرور کامیاب ہوں گے۔ لیکن اخلاقی اعتبار سے انھیں اپنا طرزِ عمل دوستی ہی کے خلاف نہیں، شرافت کے خلاف معلوم ہوتا تھا۔ اپنی جان سے زیادہ پیارے دوست کی بے نفسی سے فائدہ اُٹھانے کا خیال انھیں پریشان کر دیتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اس کا گھر جل رہا ہے اور وہ تاپ رہے ہیں۔ انھیں یقین تھا کہ پریما سے جتنی محبت مجھے ہے، اتنی امرت رائے کو نہیں ہے۔ اس کے بغیر انھیں اپنی زندگی خشک معلوم ہوتی تھی۔ ان کا میلان متاہل زندگی کی جانب تھا۔ خدمت کے جذبات ان کی فطرت میں نہ تھے۔ نام و نمود کی تمنا بھی نہ تھی۔ ایثار کا ذکر تو بہت دور کی بات تھی۔

بالآخر بہت غوروخوض کے بعد انھوں نے بھی طے کیا "ایک بار امرت رائے کو پھر ٹٹولنا چاہیے۔ اگر اب بھی وہ ان کی رائے تبدیل کرسکے تو عین خوشی کی بات ہوگی۔ زندگی کی مسرت تو تمنا میں ہے۔ بالفرض یہ خواہش پوری ہوئی تو کوئی دوسری آکھڑی ہوگی۔ جب

ایک نہ ایک خواہش کا موجود رہنا یقینی ہے تو یہی کیوں نہ رہے، اس سے اور مسرت انگیز دوسری کون سی خواہش ہو سکتی ہے؟ اس کے سوا یہ اندیشہ بھی تو تھا کہ کہیں زندگی کا یہ ناٹک فراقیہ نہ ثابت ہو۔ پہلی محبت کتنی لافانی ہوتی ہے اسے وہ خوب جانتے تھے۔

آج کل کالج تو بند تھا مگر دان ناتھ ''ڈاکٹر'' کے لقب کے لیے ایک کتاب لکھ رہے تھے۔ کھانا کھا کر کالج چلے جاتے تھے۔ یہاں کتب خانے میں بیٹھ کر جتنی آسانیاں تھیں وہ مکان پر نہ ہو سکتی تھیں۔ آج وہ تمام دن کتب خانے میں بیٹھے رہے مگر نہ تو ایک حرف لکھا اور نہ ایک سطر پڑھی۔ انھوں نے وہ مشکل کام کر ڈالنے کا آج تہیہ کرلیا تھا جسے وہ کئی روز سے ٹالتے آرہے تھے۔ کیا کیا باتیں ہوں گی، دل میں یہی سوچتے ہوئے وہ امرت رائے کے بنگلے پر جا پہنچے۔ آفتاب پھولوں اور پتیوں پر اپنی آخری برلت کی زریں بارش کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ ٹم ٹم تیار کھڑی تھی مگر امرت رائے کا پتا نہ تھا۔ نوکر سے پوچھا تو معلوم ہوا کمرے میں ہیں۔ کمرے کے دروازے کا پردہ اُٹھاتے ہی بولے۔ ''بھلے آدمی، تمھیں گرمی بھی نہیں لگتی، یہاں سانس لینی مشکل ہے اور بیٹھے ہوئے تپیا کر رہے ہیں۔''

روشنی کی ایک باریک شعاع چق کے اندر جاتی ہوئی امرت رائے کے چہرے پر پڑی۔ دان ناتھ چونک پڑے، وہ چہرہ زرد ہو رہا تھا، آٹھ دس روز قبل جو رونق تھی اس کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ گھبرا کر کہا ''یہ تمھاری کیا حالت ہے؟ کہیں لو تو نہیں لگ گئی؟ کیسی طبیعت ہے؟''

امرت رائے نے دان ناتھ کو گلے لگاتے ہوئے کہا ''ایسا بھی کبھی ہوا ہے کہ تم نے مجھے دیکھ کر یہ کہا ہو، آج کل تم خوب تندرست ہو۔ تمھیں تو میں ہمیشہ ہی بیمار نظر آتا ہوں۔ ہر مرتبہ پیشتر سے زیادہ۔ جیتا کیسے ہوں، یہ ایشور ہی جانے مگر ذرا اپنی صورت تو دیکھو۔ دنیا بھر کے اصولوں کو چاٹے بیٹھے ہو مگر اتنا نہیں ہو سکتا کہ شام کو سیر ہی کرلیا کرو۔''

دان ناتھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس ٹم ٹم ہوتی تو سارا دن دوڑاتا۔ گھوڑا بھی یاد کرتا کہ کسی سے پالا پڑا تھا۔ پیادہ پا تو مجھے گھومنے میں لطف نہیں آتا۔ تمھیں دنیا میں بڑے بڑے کام کرنے ہیں۔ جسم کی حفاظت کرو۔ تمھیں نے دنیا کی نجات کا ٹھیکہ

لیا ہے۔ یہاں کیا ایک روز چپکے سے دنیا سے چل دینا ہے۔ چاہتا تو میں بھی ہوں کہ باقاعدہ زندگی بسر کروں مگر جب نبھ جاوے تب تو۔ کتنی بار ڈنڈ، مگدر، ڈینل شروع کیا، مگر کیا کبھی نباہ سکا؟ آخر سمجھ گیا تندرستی میرے لیے ہی نہیں، پھر اس کے لیے کیوں مفت حیران ہوں؟ اتنا جانتا ہوں کہ دائم المریض لوگوں کی عمریں طویل ہوتی ہیں۔ تم سال میں ایک بار ملیریا کے موسم میں مر کے جیتے ہو۔ تمھیں بخارا آتا ہے تو سیدھا ۱۰۶ درجہ تک جا پہنچتا ہے۔ مجھے ایک تو بخار آتا ہی نہیں، اور آیا بھی تو ۱۰۱ درجے سے آگے بڑھنے کی ہمت ہی نہیں کرتا۔ دیکھ لینا تم مجھ سے پہلے رخصت ہوگے۔ حالانکہ میری دلی تمنا یہی ہے کہ تمھاری گود میں میری جان نکلے۔ اگر تمھارے سامنے مروں تو میری یادگار ضرور قائم کرنا۔ تمھاری یادگار قائم کرنے والے تو بہت نکل آئیں گے مگر میری دوڑ تو تمھیں تک ہے! میری عظمت سے اور کون واقف ہے۔"

ان شرارت آمیز الفاظ میں مذاق کے ساتھ کتنا لگاؤ، کتنی زبردست محبت بھری ہوئی تھی کہ دونوں ہی دوستوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ دان ناتھ مسکرا پڑے۔ مگر امرت رائے کا چہرہ متین ہوگیا۔ دان ناتھ ہنس مکھ تھے مگر مذاق کا طرز سوز باطن کا پتا دے رہا تھا۔ امرت رائے نے پوچھا۔ "لالہ بدری پرشاد کے یہاں سے کوئی پیغام آیا؟ تم ادھر کئی روز سے دکھائی نہیں دیے۔ میں سمجھ گیا کہ وہاں اپنا رنگ جما رہے ہوں گے اس لیے گیا بھی نہیں۔"

امرت رائے نے اس معاملے کو چھیڑ کر دان ناتھ پر بڑا احسان کیا۔ ورنہ وہ یہاں گھنٹوں غپ شپ کرتے رہنے پر بھی وہ بات زبان پر نہ لا سکے۔ اب بھی ان کے بشرہ سے کچھ ایسا معلوم ہوا کہ تذکرہ فضول چھڑ گیا۔ بڑے تامل کے ساتھ بولے۔ "ہاں پیغام تو آیا ہے، مگر میں نے جواب دے دیا۔"

امرت رائے نے گھبرا کر پوچھا۔ "کیا جواب دے دیا۔"

دان ناتھ۔ جو میرے جی میں آیا۔

امرت۔ آخر سنوں تو تمھارے جی میں کیا آیا؟

دان ناتھ۔ یہی کہ مجھے منظور نہیں۔

امرت۔ یہ کیوں بھئی کیا پریما تمھارے قابل نہیں؟

دان ناتھ۔ نہیں، یہ بات نہیں۔ میں خود اس کے قابل نہیں ہوں۔

امرت رائے نے تیز لہجے میں کہا۔ "اس کے قابل نہیں ہو تو اتنے دنوں سے اس کے لیے تپسیا کیوں کر رہے ہو؟ میں درمیان میں نہ آپڑتا تو اس میں بھی کیا کوئی شبہ ہے کہ اس سے تمھارا عقد ہوگیا ہوتا؟ میں نے دیکھا کہ تم اس غم میں اپنی زندگی برباد کیے ڈالتے ہو۔ تم نے کتنے پیغام لوٹا دیے حتیٰ کہ مجھے اس سے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا کہ میں تمھارے راستے سے ہٹ جاؤں۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ اس کی جدائی میں گھلتے گھلتے کہیں تم ایک دن مجھے تنہا چھوڑ کر چلتا دھندا نہ کرو۔ میں نے اپنے دل کو ٹٹولا تو معلوم ہوا کہ میں اس صدمے کو برداشت کرسکتا ہوں، مگر تم نہیں برداشت کرسکتے۔ بھلے آدمی تمھارے لیے تو میں نے اپنے دل پر اتنا بڑا جبر کیا اور اب تم کاوے کاٹ رہے ہو۔ اب اگر تم نے ذرا بھی چوں چرا کی تو میں مار ہی ڈالوں گا۔ سمجھ لینا۔ چپکے سے میری ٹم ٹم پر بیٹھو اور لالہ بدری پرشاد کے پاس جاکر معاملہ طے کر آؤ۔"

دان ناتھ نے برقی بٹن دباتے ہوئے کہا۔ "تم اس کام کو جتنا آسان سمجھتے ہو اتنا آسان نہیں ہے، کم از کم میرے لیے۔"

امرت رائے نے دوست کے چہرے کو محبت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "میں یہ جانتا ہوں، بیشک آسان نہیں ہے۔ میں ہی رکاوٹ ڈالنے والا تھا۔ میں اب بھی ہوں۔ لیکن تم جانتے ہو کہ میں نے ایک بار جو بات ٹھان لی۔ اب برہما بھی اتر آئیں تو مجھے منحرف نہیں کرسکتے۔ پنڈت امرناتھ کا کہنا میرے دلنشیں ہوگیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پریما ہی نہیں کسی بھی دوشیزہ سے شادی کرنے کا حق مجھے نہیں ہے۔ ایشور نے وہ حق مجھ سے چھین لیا۔ پریما جیسی بیش بہا جنس کو پاکر چھوڑ دینے کا مجھے کتنا رنج ہو رہا ہے، یہ میں ہی جانتا ہوں اور کچھ کچھ تم بھی جانتے ہو۔ مگر اس رنج میں خواہ میری جان ہی جاتی رہے جس کا کوئی امکان نہیں ہے تو بھی اپنی زندگی میں پریما کو داخل نہ ہونے دوں گا۔ اب تم میری طرف سے مطمئن ہوگئے؟"

دان ناتھ اب بھی مطمئن نہ ہوئے تھے۔ ان کے دل میں ایک نہیں سیکڑوں روکاوٹیں پیدا ہورہی تھیں۔ یہ سمجھ کر کہ یہ نئی بات سن کر امرت رائے ہنس نہ

پڑیں وہ خود ہنس کر بولے۔ ''مجھ جیسے چھچھورے کو پریما قبول کرے گی۔ یہ بھی خیال آیا ہے آنجناب کو؟''

امرت رائے نے زور سے قہقہہ لگایا۔ ''بھئی واہ کیا بات سوچی ہے، مانتا ہوں! ارے احمق داس، جب لالہ بدری پرشاد نے تمھارے یہاں پیغام بھیجا تو سمجھ لو کہ انھوں نے پریما سے دریافت کرلیا ہے۔ ایسا کیے بغیر وہ کبھی پیغام نہ بھیجتے۔ لڑکی کو اعلیٰ تعلیم دینے کا کفارہ تو انھیں کرنا ہی پڑتا ہے۔ چند باتوں میں تو وہ ہم لوگوں سے بھی زیادہ فراخ دل ہیں اور چند باتوں میں جہلا سے بھی پست تر۔ پردے سے انھیں چڑ ہے، یہ جانتے ہی ہو۔ بدھوا بواہ ان کی آنکھوں میں بدترین اخلاقی گناہ ہے۔ تمھارا یہ اندیشہ تو بے بنیاد ثابت ہوا۔ ہاں یہ اندیشہ ہوسکتا ہے کہ پریما کو تم سے محبت نہ ہو۔ مگر ایسا خیال کرنا پریما کے ساتھ سخت ناانصافی کرنا ہے۔ وہ خاندانی رواج پر مٹنے والی سچی دیوی ہے۔ اس کی محبت کے معنی ہی ہیں ''شوہر پرستی۔'' محبت کی کسی دوسری صورت سے وہ واقف ہی نہیں اور نہ شاید واقف ہوگی۔ مجھ سے اس کو اس لیے محبت تھی کہ وہ مجھے اپنا ہونے والا شوہر خیال کرتی تھی۔ پس اس کی محبت اس فرض شناسی پر محمول ہے۔ ایسے فضول اندیشوں میں مفت دن گزرا رہے ہو۔ سہالگ نکل جائے گا تو پھر ایک سال امیدواری کرنی پڑے گی۔''

دان ناتھ فکر میں ڈوب گئے اگرچہ ان کے اعتراضوں کی تردید ہوچکی تھی مگر اب بھی ان کے دل میں ایسی متعدد باتیں تھیں جنھیں وہ ظاہر نہ کرسکتے تھے۔ شک دلیل سے دور ہوجانے پر بھی بالکل مٹ نہیں جاتا۔ دوست سے بے وفائی کا خیال ان کے دل میں کچھ اس قدر چھپ کر بیٹھا ہوا تھا کہ اس پر کوئی حربہ کارگر ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

دفعتاً امرت رائے نے گھنٹی بجائی۔ ایک بوڑھا آدمی سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ امرت رائے نے بدری پرشاد کے نام ایک خط لکھا اور دان ناتھ سے بولے۔ ''اس پر دستخط کرو۔''

دان ناتھ دریچے کے سامنے کھڑے سگار پی رہے تھے۔ پوچھا۔

''کیسا خط؟''

امرت۔ پڑھ لو سامنے تو ہے۔
دان۔ تم میری گردن پر چھری چلا رہے ہو۔
امرت۔ بس چپکے سے دستخط کردو۔ مجھے ایک جلسہ میں جانا ہے۔ دیر ہو رہی ہے۔
دان۔ تو گولی ہی کیوں نہ مار دو کہ ہمیشہ کا جھنجھٹ مٹ جائے۔
امرت۔ بس اب چیں چپڑ نہ کرو ورنہ یاد رکھو، پھر تمھاری صورت نہ دیکھوں گا۔ یہ دھمکی اپنا کام کرگئی۔ دان ناتھ نے خط پر دستخط کردیے اور تب بگڑ کر بولے۔ ''دیکھ لینا، میں آج سنکھیا کھا لیتا ہوں کہ نہیں، یہ خط دھرا ہی رہ جائے گا۔ سویرے ''رام نام ست'' ہوگا۔

امرت رائے نے خط ایک لفافے میں بند کرکے بوڑھے کو دیا۔ بدری پرشاد کا نام سنتے ہی بوڑھا مسکرایا اور خط لے کر چلا گیا۔

تب امرت رائے نے ہنس کر کہا۔ ''سنکھیا نہ ہو تو میں دے دوں گا۔ ایک بار کسی دوا میں ڈالنے کے لیے منگوائی تھی۔'' دان ناتھ نے بگڑ کر کہا۔ ''میں تمھارا سر توڑ دوں گا، تم ہمیشہ سے مجھ پر حکومت کرتے آئے ہو اور اب بھی کرنا چاہتے ہو۔ لیکن اب مجھ پر تمھارا کوئی داؤں نہ چلے گا۔ آخر میں بھی تو کوئی چیز ہوں۔''

امرت رائے اپنی ہنسی ضبط نہ کرسکے۔

(۷)

لالہ بدری پرشاد کو دان ناتھ کا خط کیا ملا۔ صدمے کے ساتھ ہی ذلت بھی ملی وہ امرت رائے کی تحریر پہچانتے تھے۔ اس کی ساری عاجزی اور التجا اس تحریر میں گم ہوگئی۔ غصہ سے ان کا دماغ گرم ہوگیا۔ دان ناتھ کے ہاتھ کیا ٹوٹ گئے تھے، جو اس نے امرت رائے سے یہ خط لکھایا؟ کیا اس کے پیروں میں مہندی لگی تھی جو یہاں تک نہ آسکتا تھا اور یہ امرت رائے بھی کتنا بے حیا ہے! وہ ایسا خط کس طرح لکھ سکا۔ ذرا بھی شرم نہ آئی۔

اب تک لالہ بدری پرشاد کو کچھ کچھ امید تھی کہ شاید امرت رائے کا جوش میں کیا ہوا عہد کچھ مدھم پڑجائے۔ تحریر دیکھ کر پہلے وہ یہی سمجھے تھے کہ امرت رائے نے معافی مانگی ہوگی لیکن خط پڑھا تو امید کا وہ باریک رشتہ بھی منقطع ہوگیا۔ دان ناتھ کا خط پاکر شاید وہ امرت رائے کو بلا کر دکھاتے اور ان کے جذباتِ حسد کو مشتعل کرکے اپنے پنجے

میں لانے کی کوشش کرتے۔ اس امید کی بھی دھجیاں اُڑ گئیں، اس نے جلے پر نمک چھڑک دیا۔ امرت رائے کی تحریر دیکھ کر غصہ سے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے انھوں نے دان ناتھ کو یہ خط لکھا۔

"لالہ دان ناتھ جی! آپ نے امرت رائے سے یہ خط لکھا کر میری اور پریما کی جتنی توہین کی ہے اس کا آپ مطلق اندازہ نہیں کرسکتے۔ مناسب تو یہی تھا کہ میں اسے پھاڑ کر پھینک دیتا اور آپ کو کوئی جواب نہ دیتا لیکن ...."

یہیں تک لکھنے پائے تھے کہ دیوکی نے آکر بڑے شوق سے پوچھا۔ "کیا لکھا ہے امرت رائے نے؟"

بدری پرشاد نے کاغذ کی طرف سر جھکائے ہوئے کہا۔ "ان کا کوئی خط نہیں آیا۔"

دیوکی۔ چلو کوئی خط کیوں نہیں آیا۔ میں نے کوٹھے پر دیکھا ان کا آدمی ایک خط لیے لپکا آرہا تھا۔

بدری۔ ہاں آدمی تو ان ہی کا تھا مگر خط تھا دان ناتھ کا! اسی کا جواب لکھ رہا ہوں۔ حضرت نے امرت رائے سے لکھوایا ہے اور نیچے اپنے دستخط کردیے ہیں۔ اپنے ہاتھ سے لکھتے شرم آتی تھی۔ بے ہودہ، شہدہ۔

دیوکی۔ "خط میں تھا کیا؟"

بدری۔ یہ پڑا ہے پڑھ کیوں نہیں لیتیں۔

دیوکی نے خط پڑھ کر کہا۔ "تو اس میں اتنا بگڑنے کی کون سی بات ہے؟ ذرا دیکھوں سرکار نے اس کا کیا جواب لکھا ہے؟"

بدری۔ لو دیکھو، ابھی تو شروع کیا ہے۔ ایسی خبر لوں گا کہ بچہ سارا شہدہ پن بھول جائیں۔

دیوکی نے بدری پرشاد کا خط پڑھا اور پھاڑ کر پھینک دیا۔

بدری پرشاد نے کڑک کر پوچھا۔ "پھاڑ کیوں ڈالا؟ تم کون ہوتی ہو میرا خط پھاڑنے والی؟"

دیوکی۔ تم کون ہوتے ہو ایسا خط لکھنے والے؟ امرت رائے کو کھو کر کیا ابھی جی بھر نہیں پایا۔ جو اب دانو کو بھی کھو دینے کی فکر کرنے لگے۔ تمھارے خط کا نتیجہ یہی ہوگا کہ

دانو پھر تمھیں اپنی صورت کبھی نہ دکھائے گا۔ زندگی تو میری لڑکی کی خراب ہوگی، تمھارا کیا بگڑے گا؟

بدری۔ ہاں اور کیا۔ لڑکی تو تمھاری ہے، میری تو کوئی ہوئی نہیں۔

دیوکی۔ آپ کی کوئی ہوتی تو اسے کنویں میں ڈھکیلنے کو یوں تیار نہ ہوجاتے۔ یہاں دوسرا کون لڑکا ہے پریما کے لائق، ذرا سنوں۔

بدری۔ دنیا لائق لڑکوں سے خالی نہیں ہے، ایک سے ایک بڑھ کر پڑے ہوئے ہیں۔

دیوکی۔ پاس کے دو تین شہروں میں تو کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ ہاں باہر کی میں نہیں کہتی، ستو باندھ کر کھوجنے نکلو گے تو معلوم ہوگا۔ برسوں دوڑتے گزر جائیں گے، پھر بھی بے جانے پہچانے گھر میں لڑکی کون بیاہے گا اور پریما کیوں ماننے لگی۔

بدری۔ اس نے اپنے ہاتھ سے کیوں خط نہیں لکھا۔ میرا تو یہ کہنا ہے کہ کیا اسے اتنا بھی نہیں معلوم کہ اس سے میری کتنی توہین ہوئی۔ سارے امتحانات تو پاس کیے بیٹھا ہے، ڈاکٹر بھی ہونے جارہا ہے۔ کیا اسے اتنا بھی نہیں معلوم۔ صاف بات ہے کہ دونوں مل کر میری توہین کرنا چاہتے ہیں۔

دیوکی۔ ہاں شہدے تو ہیں ہی، تمھاری توہین کرنے کے سوا اور ان کا کام ہی کیا ہے؟ صاف بات تو یہ ہے اور تمھاری سمجھ میں نہیں آتی۔ نہ جانے عقل تقسیم ہوتے وقت تم کہاں چلے گئے تھے؟ پچاس کے ہوئے اور اتنی موٹی سی بات نہیں سمجھ سکتے۔

بدری پرشاد نے ہنس کر کہا۔ ”میں تمھیں کھوجنے گیا تھا۔“

دیوکی ادھیڑ ہونے پر بھی خوش مذاق تھی، بولی ”واہ میں پہلے ہی پہنچ کر کئی حصے اڑا لے گئی۔ دونوں میں کتنی دوستی ہے، یہ تو جانتے ہی ہو۔ دان ناتھ لحاظ سے خود نہ لکھ سکا ہوگا۔ امرت بابو نے سوچا ہوگا، کہ لالہ جی کوئی اور لڑکا نہ ٹھیک کرنے لگیں۔ اس لیے یہ خط لکھ دانو سے جبراً دستخط کرا لیے ہوں گے۔“

بدری پرشاد نے خفت سے کہا۔ ”اتنا تو میں بھی سمجھتا ہوں، کیا ایسا گنوار ہوں۔“

دیوکی۔ تب کس لیے اتنا جامہ سے باہر ہو رہے تھے؟ بلاکر کہہ دو منظور ہے۔ بے چاری بوڑھی ماں کے بھاگ کھل جائیں گے۔ مجھے تو اس پر ترس آتا ہے۔

بدری۔ مجھے اب یہ افسوس ہو رہا ہے کہ پہلے ہی دانو سے کیوں نہ بیاہ کردیا، اتنے دنوں تک کیوں امرت رائے کا منہ تاکتا رہا۔ آخر وہی کرنا پڑا۔

دیوکی۔ تقدیر کو کون جانتا تھا اور حق تو یہ ہے کہ دانو نے پریما کے لیے تپسیا بھی بہت کی۔ چاہتا تو اب تک کبھی کی اس کی شادی ہوگئی ہوتی۔ کہاں سے پیغام نہیں آئے۔ رشتہ داروں نے کتنا سمجھایا مگر اس نے کبھی ہاں نہ کی۔ پریما اس کے دل میں بسی ہوئی ہے۔

بدری۔ لیکن پریما اسے قبول کرے گی۔ پہلے یہ تجویز کرلو۔ ایسا نہ ہو کہ میں یہاں منظور کرلوں اور پریما انکار کردے۔ اس بارے میں اس کی منظوری لے لینی چاہیے۔

دیوکی۔ پھر تم مجھے چڑھانے لگے۔ دانو میں کون سی برائی ہے جو وہ انکار کرے گی۔ لاکھوں میں ایک لڑکا ہے، ہاں یہ ضد ہو کہ کروں گی تو امرت رائے سے کروں گی ورنہ بے بیاہی رہوں گی تو جنم بھر ان کے نام پر بیٹھی رہے۔ امرت رائے تو اب کسی بدھوا ہی سے بیاہ کرے گا۔ ممکن ہے بیاہ ہی نہ کرے، اس کا وید ہی دوسرا ہے۔ میری بات مانو۔ دانو کو خط لکھ دو۔ پریما سے پوچھنے جانچنے کا کام نہیں۔ دل ایسی چیز نہیں جو قابو میں نہ آجائے۔ میرا دل تو اپنے پڑوس کے وکیل صاحب سے کرنے کا تھا۔ انھیں کوٹ پتلون پہنے بگھی پر کچہری جاتے دیکھ کر میں خوش ہوجاتی تھی مگر تمھارے نصیب جاگے، ماں باپ نے تمھارے پلے باندھ دیا۔ تو میں نے کیا کیا۔ دو ایک دن تو ضرور رنج ہوا مگر پھر ان کی طرف خیال بھی نہ گیا۔ تم شکل و صورت، عقل و تمیز، دولت و ثروت، کسی بات میں ان کی برابری نہ کرسکتے تھے مگر قسم لو جو میں نے شادی کے بعد کبھی بھولے سے ان کی یاد کی ہو۔

بدری۔ اچھا جبھی تم بار بار مائکے جایا کرتی تھیں!

دیوکی۔ مجھے چھیڑوگے تو میں کچھ کہہ بیٹھوں گی۔

بدری۔ تم نے اپنی بات کہہ ڈالی تو میں بھی کہے دیتا ہوں۔ میری بھی ایک عیسائی لڑکی سے محبت ہوگئی تھی۔ میں عیسائی ہونے والا تھا۔ رنگ روپ میں پری تھی۔ تم اس کے پیروں کی خاک کو بھی نہیں پہنچ سکتیں۔ مجھے اب تک اس کی یاد ستاتی ہے۔

دیوکی۔ جھوٹے کہیں کے! جب میں آئی تو مہینہ بھر تک تو تم مجھ سے بولتے شرماتے تھے۔

عیسائی عورت سے محبت کرتے تھے! وہ تو تمھیں بازار میں بیچ آتی! اور پھر تم لوگوں کی بات میں، نہیں چلاتی، سچ بھی ہو سکتی ہے۔

بدری۔ ذرا پریما کو بلا لو پوچھ لینا ہی اچھا ہے۔

دیوکی۔ (جھنجھلا کر) اس سے کیا پوچھوگے، اور وہ کیا کہے گی۔ یہی میری سمجھ میں نہیں آتا۔ مجھ سے جب اس بارے میں باتیں ہوتی ہیں وہ یہی کہتی رہی ہے کہ میں کنواری رہوں گی، وہی پھر کہے گی مگر اتنا میں جانتی ہوں کہ جس کے ساتھ تم بات چیت پکی کروگے اسے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اتنا وہ جانتی ہے کہ گرہست لڑکی کنواری نہیں رہ سکتی۔

بدری۔ رو رو کر جان تو نہ دے گی؟

دیوکی۔ نہیں میں ایسا نہیں سمجھتی! فرض کا اسے بڑا خیال رہتا ہے اور یوں تو پھر دُکھ ہی ہے جسے دل میں اپنا سوامی سمجھ چکی تھی، اسے دل سے نکال کر پھینک دینا کوئی سہل کام ہے؟ یہ زخم کہیں برسوں میں بھرے گا۔ اس سال وہ بیاہ کرنے پر راضی نہ ہوگی۔

بدری۔ اچھا میں ابھی آیا۔ پورنا سے پوچھوں۔ اِن پڑھی لکھی لڑکیوں کا مزاج کچھ اور ہی ہوجاتا ہے اگر فرض و محبت میں مخالفت ہوگئی تو ان کی ساری زندگی ہی رنج میں گزرتی ہے وہ محبت اور فرض پر ایثار کرنا نہیں جانتیں یا نہیں چاہتیں۔ ہاں محبت اور فرض میں میل ہوجائے تو ان کی زندگی اعلیٰ زندگی ہوجاتی ہے۔ ایسا ہی مزاج پریما کا معلوم ہوتا ہے۔ میں دانو کو لکھے دیتا ہوں کہ مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔ مگر پریما سے پوچھ کر ہی تصفیہ کرسکوں گا۔

دفعتاً کملا پرشاد آکر بولے۔ "آپ نے کچھ سنا ہے؟ بابو امرت رائے تو ایک بدھوا آشرم کھولنے جارہے ہیں۔ کمانے کا یہ ڈھنگ نکالا ہے۔"

بدری پرشاد نے ذرا چیں بہ جبیں ہوکر پوچھا۔ "کمانے کا یہ ڈھنگ کیسا؟ میں نہیں سمجھا۔"

کملا۔ وہی جو اور لیڈر کرتے ہیں۔ آشرم میں بیواؤں کی پرورش و پرداخت کی جائے گی، انھیں تعلیم بھی دی جائے گی۔ چندے کی رقمیں آئیں گی اور یار لوگ مزے کریں گے۔ کون جانتا ہے، کہاں سے کتنے روپے آئے، پھر مہینے بھر میں ایک جھوٹا سچا

حساب چھپوا دیا۔ سنا ہے کئی رؤسا نے بڑے بڑے چندے دینے کا وعدہ کیا ہے۔ پانچ لاکھ کا تخمینہ ہے۔ اس میں کم از کم پچاس ہزار تو یاروں کے ہیں! وکالت میں اتنے روپے اتنی جلدی کہاں ملے جاتے تھے؟

بدری۔ پچاس ہزار ہی بنائے تو کیا بنائے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ایک لاکھ سے کم پر ہاتھ صاف نہ کریں گے۔

کملا۔ ان لوگوں کو سوجھتی خوب ہے، ایسی باتیں ہم لوگوں کو نہیں سوجھتیں۔

بدری۔ جاکر دونوں ان کی شاگردی کرو۔ اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں ہے۔

کملا۔ تو کیا میں کچھ کہتا ہوں۔

بدری۔ ذرا بھی نہیں، تم کبھی جھوٹ بولے ہی نہیں۔ بھلا آج کیوں جھوٹ بولنے لگے۔ سچائی کے اوتار تمھیں تو ہو۔

دیوکی۔ سچ کہا ہے کہ ہون کرتے ہاتھ جلتے ہیں۔ وہ بے چارا تو اُپکار کے لیے اپنا سب کچھ ہون کیے بیٹھا ہے اور تمھاری نگاہوں میں اس نے دنیا والوں کو ٹھگنے کے لیے ایک سوانگ رچا ہے! آپ تو کچھ نہیں کرسکتے۔ دوسروں کے بھلے کاموں میں رکاوٹ ڈالنے کو تیار! انھیں ایشور نے کیا نہیں دیا ہے۔ جو یہ ڈھونگ رچتے؟

کملا۔ اچھا میں ہی جھوٹا سہی۔ اس میں جھگڑا کاہے کا؟ تھوڑے دنوں میں آپ ہی قلعی کھل جائے گی۔ آپ جیسے سیدھے سادے لوگ دنیا میں نہ ہوتے تو ایسے مکاروں کی تھیلیاں کون بھرتا؟

دیوکی۔ بس چپ بھی رہو ایسی باتیں تمھیں منہ سے نکالتے شرم نہیں آتی۔ کہیں پریما کے سامنے ایسی بے سر۔ پیر کی باتیں نہ کرنے لگنا۔ یاد ہے کہ تم نے ایک بار امرت رائے کو جھوٹا کہا تھا تو اس نے تین دن تک کھانا نہیں کھایا تھا۔

کملا۔ یہاں ان باتوں سے نہیں ڈرتے، خوشامد کی باتیں کرنا مجھے نہیں آتا۔ کہوں گا سچ ہی، چاہے کسی کو بھلا لگے یا برا۔ وہ ہماری توہین کرتے ہیں تو ہم ان کی پوجا نہ کریں گے۔ آخر وہ ہمارے کون ہوتے ہیں جو ہم ان کے کرتوتوں پر پردہ ڈالیں؟ میں تو انھیں اتنا بدنام کروں گا کہ سارے شہر میں کسی کو منہ نہ دکھا سکیں گے۔

یہ کہتا ہوا کملا چلا گیا۔ اسی وقت پریما نے کمرے میں قدم رکھا۔ اس کی

پلکیں نم تھیں۔ گویا ابھی روتی رہی ہو۔ اس کا نازک جسم ایسا لاغر ہوگیا تھا گویا کسی نغمہ کی آواز بازگشت ہو۔ چہرہ کسی ہجراں نصیب کی یاد ماضی کی طرح نحیف اور اداس تھا۔ اس نے آتے ہی کہا۔ ”دادا جی، آپ ذرا بابو دان ناتھ کو بلا کر سمجھا دیں کہ وہ کیوں جیجا پر جھوٹا الزام لگاتے پھرتے ہیں۔

بدری پرشاد نے متحیر ہوکر کہا۔ ”دان ناتھ! وہ بھلا کیوں امرت رائے پر حملہ کرنے لگے۔ ان میں جیسی دوستی ویسی تو میں نے اور کہیں دیکھی ہی نہیں۔“

پریما۔ یقین تو مجھے بھی نہیں آتا مگر بھیا جی یہی کہہ رہے ہیں۔ بدھوا آشرم کھولنے کا جیجا جی کا بہت دنوں سے ارادہ تھا۔ کئی بار مجھ سے اس کے متعلق گفتگو ہوچکی ہے لیکن بابو دان ناتھ اب یہ کہتے پھرتے ہیں کہ وہ اس چندے سے روپے جمع کر کے زمینداری خریدنا چاہتے ہیں۔

بدری۔ کملا کہتے تھے؟

پریما۔ ہاں بھیا جی کہتے تھے۔ دان ناتھ نے ان سے کہا ہو تو تعجب ہی کیا ہے۔

بدری۔ کملا جھوٹ بول رہا ہے، سراسر جھوٹ، دانو کو میں خوب جانتا ہوں اس کا سا شریف آدمی میں نے بہت کم دیکھا ہے۔ مجھے تو یقین ہے کہ آج امرت رائے کے نفع کے لیے جان دینے کا موقع آجائے تو دانو شوق سے اپنی جان قربان کردے گا۔ آدمی کیا ہیرا ہے۔ مجھ سے جب ملتا ہے بڑی عاجزی سے پیر چھو لیتا ہے۔

دیوکی۔ کتنا ہنس مکھ ہے، میں نے اسے جب دیکھا ہنستے ہی دیکھا۔ بالکل بچوں کا مزاج ہے۔ اس کی ماں رویا کرتی ہے کہ میں مرجاؤں گی تو دانو کو کون کھلا پلا کر سلائے گا؟ دن بھر بھوکا بیٹھا رہے گا۔ مگر کھانا نہ مانگے گا اور اگر کوئی بلا بلا کر کھلائے تو تمام دن کھاتا ہی رہے گا۔ بڑی سادہ طبیعت کا ہے۔ غرور تو چھو بھی نہیں گیا۔

بدری۔ اب کے ڈاکٹر ہوجائے گا۔

لالہ بدری پرشاد ان آدمیوں میں تھے جو دبدھے میں نہیں رہنا چاہتے۔ کسی نہ کسی فیصلہ پر پہنچ جانا ان کے دلی اطمینان کے لیے ضروری تھا۔ دان ناتھ کے خط کے تذکرہ کرنے کا ایسا نادر موقعہ پاکر وہ ضبط نہ کرسکے۔ بولے۔ ”یہ دیکھو پریما دانو نے ابھی ابھی یہ خط بھیجا ہے۔ میں تم سے مشورہ کرنے جا ہی رہا تھا کہ تم خود ہی

یہاں آگئیں۔"

خط کا مطلب کیا ہے، پریما اسے فوراً تاڑ گئی۔ اس کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے خط لے لیا۔ مگر تحریر دیکھ تو صاف امرت رائے کی ہے۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

تحریر دیکھ کر ایک دن اس کا دل کتنا خوش ہوجاتا تھا۔ آج وہی تحریر اس کی آنکھوں میں کانٹا بن کر چبھنے لگی۔ ایک ایک لفظ بچھوں کی طرح اس کے دل پر ڈنک مارنے لگا۔ اس نے خط لے کر دیکھا۔ وہی تحریر تھی۔ وہی اس کی جانی بوجھی خوشنما صاف تحریر، جو دلی اطمینان کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کا مطلب وہی تھا جو پریما نے سمجھا تھا۔ وہ اس کے لیے پہلے ہی سے تیار تھی۔ اسے یقین تھا کہ دان ناتھ اس موقع پر نہ چوکیں گے۔ اس نے خط کا جواب پہلے ہی سے سوچ رکھا تھا، شکریہ کے ساتھ صاف انکار مگر یہ امرت رائے کے قلم سے نکلے گا جس کا امکان ہی اس کے وہم و گمان سے باہر تھا۔ امرت رائے اتنے بے درد ہیں، اس کا اسے خیال بھی نہ ہوسکتا تھا۔ وہی دل جو امرت رائے کے ساتھ مصیبت کے سخت ترین صدمے اور آفتوں کی نا قابلِ برداشت تکلیفیں سہنے کو تیار تھا، آج اس بے اعتنائی کی ٹھیس نہ سہہ سکا۔ وہ بے مثال محبت وہ غیر محدود عقیدت جو پریما نے ان میں برسوں سے مرکوز کر رکھی تھی، ایک آہ سرد کے ساتھ جاتی رہی۔ اسے معلوم ہوا گویا اس کے سارے اعضا سست پڑگئے ہیں۔ گویا دل بھی ساکت ہوگیا ہے، گویا اس کی اپنی زبان پر بھی بالکل قابو نہیں ہے۔ اس کے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکل پڑے۔ "آپ کی جو مرضی ہو کیجیے، مجھے سب منظور ہے۔" وہ کہنے جا رہی تھی، جب کنوئیں میں گرنا ہی ہے تو جیسے کچا ویسے پکا، اس میں کوئی فرق نہیں، مگر جیسے اس کو کسی نے خبردار کردیا۔ وہ فوراً خط کو وہیں پھینک کر اپنے کمرہ میں لوٹ آئی اور دریچہ کے سامنے کھڑی ہوکر زاروقطار رونے لگی۔

شام ہوگئی تھی، آسمان میں ایک ایک کرکے تارے نکلتے آتے تھے۔ پریما کے دل میں اسی طرح ایک ایک کرکے یادداشتیں آنے لگیں۔ دیکھتے دیکھتے سارا آسمان تاروں سے جگمگا اُٹھا۔ پریما کا دل بھی یادداشتوں سے بندھ گیا۔ مگر ان بے شمار تاروں سے آسمان کی تاریکی کیا اور بھی گہری نہیں ہوگئی تھی۔

بیساکھ میں پریما کی شادی دان ناتھ کے ساتھ ہوگئی۔ بڑی دعوم دھام رہی۔ کُل شہر کے روٴسا کو مدعو کیا گیا۔ لالہ بدری پرشاد نے دونوں ہاتھوں سے دولت لٹائی۔ مگر دان ناتھ کی طرف سے کوئی تیاری نہ تھی۔ امرت رائے چندہ کی فراہمی کے لیے بہار کی طرف چلے گئے تھے اور تاکید کرگئے تھے، دھوم دھام مت کرنا۔ دان ناتھ ان کی مرضی کے خلاف کیسے چلتے۔

ادھر پورنا کے آنے سے سومترا کو گویا آنکھیں مل گئیں۔ اس کے ساتھ باتیں کرنے سے سومترا کو سیری نہ ہوتی۔ آدھی رات تک اپنا دکھڑا سنایا کرتی۔ زندگی میں اس کا کوئی ساتھی نہ تھا۔ شوہر کی بے رخی روز ہی اس کے دل میں چبھا کرتی تھی، اس بے رخی کا سبب کیا ہے، یہ مسئلہ اس سے حل نہ ہوتا تھا۔ وہ بہت خوبصورت نہ تھی، پھر بھی اسے کوئی بدصورت نہ کہہ سکتا تھا۔ بناؤ سنگھار کا تو اُسے مرض سا ہوگیا تھا۔ شوہر کے دل لُبھانے کے لیے وہ نت نیا بناؤ سنگھار کرتی تھی اور مقصد برآئی نہ ہونے سے اس کے دل میں آگ سی جلتی تھی! گھی کے چھینٹوں سے بھڑکنا تو آگ کے لیے قدرتی تھا۔ وہ پانی کے چھینٹوں سے بھی بھڑکتی تھی! کملا پرشاد جب اسے اپنی محبت جتاتے تو اس کے دل میں آتا کہ سینے میں چھری مار لوں۔ زخموں میں یونہی کیا کم درد ہوتا ہے کہ کوئی اس پر نمک چھڑکے؟ آج سے تین برس پہلے سومترا نے کملا کو پاکر اپنے کو دھنیہ مانا تھا۔ دو تین مہینے اس کے سکھ سے کٹے، مگر جوں جوں ہر دو طبائع کا تضاد آشکارا ہونے لگا۔ دونوں ایک دوسرے سے کھنچنے لگے۔ سومترا فیاض تھی کملا اعلیٰ درجے کا ممسک! وہ پیسہ کو ٹھیکری سمجھتی تھی۔ کملا کوڑیوں کو دانت سے پکڑتا تھا۔ سومترا عموماً فقیروں کو بھیک دینے جاتی تو اتنا دیتی کہ وہ ''چٹکی'' کی انتہائی حد سے تجاوز کرجاتا تھا۔ اس کے مائیکے سے ایک مرتبہ برہمنی کوئی خوش خبری لے آئی تھی، اسے اُٹھاکر نئی ریشمی ساڑھی دے دی۔ ادھر کملا کا یہ حال تھا کہ فقیر کی آواز سنتے ہی گرج اُٹھتے تھے۔ رول اُٹھاکر مارنے دوڑتے تھے۔ دو چار کو پیٹ بھی دیا تھا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ دروازہ پر جاکر کسی فقیر کی اگر کملا پرشاد کی مڈبھیڑ ہوگئی تو اسے دوسری مرتبہ وہاں جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ سومترا میں انکسار اور رحم تھا۔ کملا میں گھمنڈ چھچھوراپن اور خودغرضی۔ ایک آسمان پر کا جاندار تھا اور دوسرا زمین پر رینگنے والا، ان میں میل کیسے ہو؟

دان ناتھ نے آکر کہا۔ "کملا!"

پورنا کی آمد سے کملا اور سومترا ایک دوسرے سے اور بھی علاحدہ ہوگئے۔ سومترا کے دل کا بوجھ ہلکا سا ہوگیا۔ یہاں تو وہ دن کا دن بے پروائی سے پلنگ پر پڑے رہنے میں گزار دیتی، کہاں اب وہ ہر وقت ہنستی بولتی رہتی، کملا کی اس نے پروا ہی کرنا چھوڑ دی۔ وہ کب گھر میں آتا ہے اور کب جاتا ہے۔ کب کھاتا ہے اور سوتا ہے۔ ان باتوں کی اسے ذرا بھی فکر نہ رہی۔ کملا پرشاد بدقماش نہ تھا۔ سب کا یہی خیال تھا کہ اس میں خواہ کتنے ہی عیوب ہوں مگر عیاشی کا عیب نہ تھا۔ کسی عورت پر تاک جھانک کرتے اسے کسی نے نہ دیکھا تھا۔ پھر پورنا کے حسن نے اسے کس طرح گرویدہ کر لیا۔ یہ راز کون سمجھ سکتا ہے؟ شاید پورنا کی سادگی، عاجزی اور بیکسی نے کملا کی نفسیاتی خواہشوں کو متحرک کردیا، اس کی کنجوسی اور بزدلی ہی اس کے اخلاق کی بنیاد تھی۔ عیاشی گراں چیز ہے۔ جیب کے روپے خرچ کرکے بھی کسی آفت میں مبتلا ہوجانے کا جہاں ہر لمحہ امکان ہو ایسے کام میں کملا پرشاد جیسا ہوشیار آدمی نہ پڑسکتا تھا۔ پورنا کے بارے میں اسے کوئی تردد نہ تھا وہ اتنی سیدھی سادی تھی کہ اسے قابو میں لانے کے لیے کسی بڑی ریاضت کی ضرورت نہ تھی اور پھر یہاں تو نہ کسی کا خوف تھا نہ پھنسنے کا اندیشہ اور نہ مار کھانے کا خیال۔ پورنا کی بیکسی ان تمام اندیشوں کو غیر مسلح بنا دیا تھا۔ اس نے سمجھا تھا کہ اب اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی۔ صرف گھر والوں کی آنکھ بچا لینا کافی ہوگی اور یہ بات کچھ مشکل نہ تھی مگر یہاں بھی ایک رکاوٹ پیدا ہوگئی اور وہ سومترا تھی! سومترا پورنا کو ایک لمحہ کے لیے بھی نہ چھوڑتی تھی۔ دونوں کھانا کھانے ساتھ جاتیں۔ چھت پر دیکھو تو ساتھ۔ کمرہ میں دیکھو تو ساتھ، رات کو ساتھ، دن کو کبھی دونوں ساتھ ہی ساتھ سوجاتیں۔ کملا جب خواب گاہ میں جاکر سومترا کا انتظار کرتا کرتا سوجاتا تو نہ جانے کب وہ اس کے پاس آجاتی۔ پورنا سے تنہائی میں کوئی بات کرنے کا اسے موقع نہ ملتا تھا۔ وہ دل میں سومترا پر جھنجھلا کر رہ جاتا۔ آخر ایک روز اس سے ضبط نہ ہوسکا۔ رات کو جب سومترا آئی تو اس نے کہا۔

"تم رات دن پورنا کے پاس کیوں بیٹھی رہتی ہو؟ وہ اپنے دل میں سمجھتی ہوگی کہ یہ تو اچھی بلا گلے پڑی۔ ایسی تو بڑی سمجھدار بھی نہیں ہو کہ تمھاری باتوں میں اسے مزا آتا ہو، تمھاری بے وقوفی پر ہنستی ہوگی۔"

سومترا نے کہا۔ "اکیلی پڑی پڑی کیا کروں؟ یہ بھی تو اچھا نہیں لگتا کہ میں آرام سے سوؤں اور وہ اکیلی رویا کرے، اُٹھنا بھی چاہتی ہوں تو وہ لپٹ جاتی ہے۔ چھوڑتی ہی نہیں، دل میں میری بے وقوفی پر ہنستی ہے یا نہیں، یہ کون جانے؟ مگر میرا ساتھ اسے اچھا نہ لگتا ہو، یہ بات نہیں۔"

کملا۔ تمھیں یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ اس کی اور تمھاری کوئی برابری نہیں۔ وہ تمھاری سہیلی بننے کے قابل نہیں ہے۔

سومترا۔ میں ایسا نہیں سمجھتی۔

کملا۔ تمھیں اتنی سمجھ ہی نہیں۔ سمجھوگی کیا؟

سومترا۔ ایسی سمجھ کا نہ ہونا ہی اچھا ہے۔

اس روز سے سومترا سایہ کی طرح پورنا کے ساتھ رہنے لگی۔

کملا پرشاد کے طریقوں میں اب ایک عجیب تبدیلی سی ہوتی جاتی تھی۔ سنیما دیکھنے کا اب اسے شوق نہ تھا۔ نوکروں پر ڈانٹ پھٹکار بھی کم ہوگئی۔ کچھ فراخ دست بھی ہوگیا۔ ایک روز بازار سے بنگلہ مٹھائی لایا۔ سومترا کو دیتے ہوئے کہا۔ "ذرا اپنی سکھی کو چکھانا" سومترا نے مٹھائی لے لی مگر پورنا سے اس کا ذکر نہ کیا۔ دوسرے روز کملا نے پوچھا۔ "پورنا نے مٹھائی پسند کی ہوگی؟" سومترا نے جواب دیا۔ بالکل نہیں۔ وہ کہتی تھیں کہ مجھے مٹھائی سے کبھی رغبت نہیں رہی۔"

کئی روز کے بعد ایک روز کملا پرشاد دو ریشمی ساڑیاں لائے اور بے دھڑک اپنے کمرے میں گھُس گئے۔ دونوں سہیلیاں ایک ہی پلنگ پر لیٹی باتیں کر رہی تھیں۔ ایک دم اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ پورنا کا سر کھلا ہوا تھا۔ شرم کے مارے اس کے جسم میں پسینہ آگیا۔ سومترا نے شوہر کی طرف غصہ بھری نگاہوں سے دیکھا۔

کملا نے کہا۔ "ارے پورنا بھی یہیں ہیں۔ معاف کرنا پورنا مجھے معلوم نہ تھا۔ یہ دیکھو سومترا، دو ساڑیاں لایا ہوں۔ سستے داموں میں مل گئیں۔ ایک تم لے لو اور ایک پورنا کو دے دو۔"

سومترا نے ساڑیوں کو بے چھوئے ہی کہا، ان کی تو آج کوئی ضرورت نہ تھی۔ میرے پاس ساڑیوں کی کوئی کمی نہیں ہے اور پورنا ریشمی ساڑیاں پہننا چاہیں گی

تو میں اپنی نئی ساڑیوں میں سے ایک دے دوں گی "کیوں بہن! ان میں سے لوگی کوئی ساڑی؟

پورنا سر ہلا کر کہا۔ "نہیں، ریشمی لے کر کیا کروں گی؟"

کملا۔ کیوں ریشمی ساڑی تو کوئی چھوت کی چیز نہیں۔

سومترا۔ چھوت کی چیز نہیں مگر شوق کی چیز تو ہے۔ سب سے پہلے تو تمھاری والدہ ماجدہ ہی چھاتی پیٹنے لگیں گی۔

کملا۔ مگر اب تو میں لوٹانے نہ جاؤں گا۔ بزاز سمجھے گا دام سن کر ڈر گئے۔

سومترا۔ "بہت اچھی ہوں تو پریما کے پاس بھیج دوں۔ تمھاری خریدی ہوئی ساڑی پاکر اپنا بھاگ سراہیں گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ آج کل کہیں کوئی رقم مفت ہاتھ آگئی ہے۔ سچ کہنا کس کی گردن ریتی ہے؟ گانٹھ کے روپے خرچ کرکے تم ایسی بے کار چیز کبھی نہ لیتے ہوگے۔" کملا نے غضب آلود نگاہوں سے سومترا کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تمھارے باپ کی تجوری توڑی ہے اور بھلا کہاں ڈاکہ ڈالنے جاتا؟"

سومترا۔ مانگتے تو وہ یوں بھی دے دیتے۔ تجوری توڑنے کی نوبت نہ آتی۔ مگر عادت کو کیا کرو۔

کملا نے پورنا کی طرف منہ کر کے کہا۔ "سنتی ہو پورنا، ان کی باتیں! شوہر سے باتیں کرنے کا یہی طریقہ ہے؟ تم بھی انھیں نہیں سمجھاتیں۔ اور کچھ نہ سہی تو آدمی سیدھے منہ بات تو کرے۔ جب سے تم آئی ہو ان کا دماغ اور بھی آسمان پر چڑھ گیا۔

پورنا کو سومترا کی سختی بُری معلوم ہو رہی تھی۔ تنہائی میں کملا پرشاد سومترا کو جلاتے ہوں، مگر اس وقت سومترا ہی انھیں جلا رہی تھی۔ اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں کملا مجھ سے ناراض ہوگئے تو مجھے اس گھر سے نکلنا پڑے گا۔ کملا کو ناراض کرکے یہاں ایک دن بھی نباہ نہیں ہوسکتا، وہ یہ جانتی تھی اس لیے وہ سومترا کو سمجھاتی رہتی تھی، بولی۔ "میں تو برابر سمجھایا کرتی ہوں۔ بابو جی پوچھ لیجیے جھوٹ کہتی ہوں۔"

سومترا نے تیز لہجے میں کہا۔ "ان کے آنے سے میرا دماغ کیوں آسمان پر

چڑھ گیا، ذرا یہ بھی بتادو، مجھے انھوں نے راج گدی پر نہیں بٹھا دیا تھا۔ ہاں تب اکیلی پڑی رہتی تھی۔ اب گھڑی دو گھڑی ان کے ساتھ بیٹھ لیتی ہوں۔ کیا تم سے اتنا بھی نہیں دیکھا جاتا؟"

کملا۔ تم فضول بات بڑھاتی ہو سومترا! میں یہ کب کہتا ہوں کہ تم ان کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا ترک کردو۔ میں نے تو کوئی ایسی بات نہیں کہی۔

سومترا۔ اور کہنے کا مطلب ہی کیا کہ جب سے یہ آئی ہیں، تمھارا دماغ آسمان پر چڑھ گیا ہے؟

کملا۔ کچھ جھوٹ کہہ رہا ہوں؟ پورنا خود دیکھ رہی ہیں۔ تمھیں ان کی نیک صحبت سے کچھ اچھی باتیں سیکھنی چاہیے تھیں۔ یہاں انھیں لاکر رکھنے میں میرا ایک مقصد یہ بھی تھا مگر تم پر ان کی صحبت کا اُلٹا ہی اثر ہوا۔ یہ بے چاری سمجھاتی ہوں مگر تم کیوں ماننے لگیں؟ جب تم مجھی کو کچھ نہیں گنتیں تو یہ بے چاری کس گنتی میں ہیں؟ بھگوان سب کچھ دے مگر برے کا ساتھ نہ دے۔ تم ان میں سے ایک ساڑی رکھ لو پورنا۔ دوسری میں پریما کے پاس بھیجے دیتا ہوں۔

سومترا نے دونوں ساڑیوں کو اُٹھا کر دروازہ کی طرف پھینک دیا۔ دونوں کاغذ میں تہہ کی ہوئی رکھی تھیں۔ صحن میں جاکر گریں۔ مہری اس وقت صحن دھو رہی تھی، جب تک وہ دوڑ کر ساڑیاں اُٹھائے کاغذ بھیگ گیا اور ساڑیوں میں داغ پڑگئے۔

پورنا نے حقارت کے لہجے میں کہا۔ "بہن دیکھو تو ساڑیاں خراب ہوگئیں۔"

کملا۔ ان کی کرتوتیں دیکھتی جاؤ۔ اس پر میں ہی برا ہوں۔ مجھی میں دنیا بھر کے عیب ہیں۔

سومترا۔ تو لے کیو نہیں جاتے اپنی ساڑیاں؟

کملا۔ میں تمھیں تو نہیں دیتا۔

سومترا۔ پورنا بھی نہ لیں گی۔

کملا۔ تم ان کی طرف سے بولنے والی کون ہوتی ہو؟ تم نے اپنا ٹھیکہ لیا ہے یا زمانے بھر کا؟ بولو پورنا، ایک رکھ دوں نا؟ یہ سمجھ لو کہ تم نے انکار کر دیا تو مجھے بڑا رنج ہوگا۔

پورنا بڑے شش و پنج میں پڑگئی، اگر ساڑی لیتی ہے تو سومترا کو بُرا لگتا ہے، اگر نہیں لیتی تو کملا بُرا مانتے ہیں۔ سومترا! کیوں اتنی ہٹ کر رہی ہے۔ کیوں اتنا

جامہ سے باہر ہو رہی ہے، یہ بھی اس سے پوشیدہ نہ رہا۔ دونوں پہلوؤں پر غور کرکے اب اس نے سومترا ہی کو خوش رکھنے کا ارادہ کرلیا۔ کملا روٹھ کر اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، زیادہ سے زیادہ اسے یہاں سے چلا جانا پڑے گا۔ سومترا ناراض ہوگئی تو نہ جانے کیا غضب ڈھائے، نہ جانے اس کے دل میں کیسے کیسے بُرے خیالات پیدا ہوں، بولی۔

"بابو جی ریشمی ساڑیاں پہننے کی مجھے مناہی ہے، تو لے کر کیا کروں گی؟ ایسا ہی ہے تو کوئی موٹی مہین دھوتی لا دیجیے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے کملا پرشاد کی طرف معذور نگاہوں سے دیکھا۔ ان میں کتنی عاجزی، کتنی معذوری بھری ہوئی تھی، گویا وہ کہہ رہی تھیں کہ لینا تو چاہتی ہوں مگر لوں کیسے؟ انھیں آپ دیکھ رہے ہیں۔ کیا گھر سے نکالنے کی خواہش ہے؟

کملا پرشاد نے کوئی جواب نہ دیا۔ ساڑیاں چپکے سے اُٹھالیں اور پیر پٹکتے ہوئے باہر چلے گئے۔

(۹)

ساڑیاں لوٹا کر اور کملا پرشاد کو ناراض کرکے بھی پورنا کی مقصد براری نہ ہوسکی وہ اس شبہ کو ذرا بھی دور نہ کرسکی جو سومترا کے دل پر کسی خونخوار درندے کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ بے چاری دونوں طرف سے ہار گئی۔ کملا تو ناراض ہو ہی گیا تھا۔ سومترا نے بھی منہ پُھلا لیا۔ پورنا نے کئی بار ادھرادھر کی باتوں سے اس کا دل بہلانے کی کوشش کی مگر جب سومترا کی تیوریاں بدل گئیں اور اس نے جھڑک کر کہہ دیا کہ "اس وقت مجھ سے کچھ نہ کہو پورنا۔ مجھے کوئی بات نہیں سہاتی۔ میں جنم ہی سے ابھاگنی ہوں ورنہ اس گھر میں آتی ہی کیوں؟ تم آئیں تو سمجھی تھی کہ اور کچھ نہ ہوگا تو دُکھڑا ہی سنا دوں گی مگر بات کچھ اور ہی ہوگئی، تمھارا کوئی قصور نہیں، یہ سب میرے نصیبوں کی بات ہے۔ اس وقت جاؤ۔ مجھے ذرا تنہائی میں رو لینے دو۔" تب پورنا کو وہاں سے اُٹھ جانے کے سوا اور کچھ نہ سوجھا۔ وہ آہستہ سے اُٹھ کر دبے پاؤں اپنے کمرہ میں چلی گئی۔ سومترا تنہائی میں روئی یا نہ روئی مگر پورنا اپنی بدنصیبی پر گھنٹوں روتی رہی۔ ابھی تک سومترا کو خوش کرنے کی کوشش میں وہ اپنی حالت پر غور نہ کرسکی تھی۔ اب آنکھوں سے آنسوؤں کی بڑی بڑی بوندیں گراتی ہوئی وہ ان ساری

باتوں پر دل ہی دل میں غور کرنے لگی۔ کملا پرشاد کیا واقعی ایک ساڑی اس کے لیے لائے تھے؟ ایک روز کے علاوہ تو پھر کبھی کملا پرشاد سے بولی تک نہ تھی، اس روز بھی وہ خود کچھ نہ بولی تھی۔ بلکہ کملا پرشاد کی باتیں سن رہی تھی۔ ہاں اگر اس سے غلطی ہوئی تو یہی کہ وہ یہاں آنے پر راضی ہوگئی، لیکن کرتی کیا؟ اور سہارا ہی کیا تھا؟ کوئی آگے پیچھے نظر بھی تو نہ آتا تھا۔ آخر جب انہی لوگوں کا دیا کھاتی تھی تو یہاں آنے میں ہرج کیا تھا۔ جب سے وہ یہا آئی اس نے کبھی کملا سے بات چیت نہ کی۔ پھر کملا نے اس کے لیے ریشمی ساڑی کیوں لی؟ وہ تو ایک کنجوس ہیں، یہ فیاضی ان میں کہاں سے آگئی، سومترا نے بھی تو ساڑیاں نہ مانگی تھیں۔ اگر اس کے لیے ساڑی لائے تھے تو میرے لیے لانے کی کیا ضرورت تھی۔ میں ان کی نند نہیں۔ دیورانی نہیں، جٹھانی نہیں بلکہ صرف اس کا آسرا رکھنے والی ہوں۔

یہ سوچتے سوچتے دفعتاً پورنا کو ایک ایسی بات سوجھ گئی جس کے ممکن ہونے کا وہ کبھی خیال بھی نہ کرسکتی تھی۔ وہ ایسا کانپ اُٹھی گویا کوئی خوفناک جانور سامنے آگیا ہو۔ اس کا سارا دل سارا احساس، سارا ضمیر گویا ایک تیرہ و تار خلا میں منتقل ہوگیا، جیسے کوئی بڑا محل اس کے اوپر گر پڑا ہو۔ کملا پرشاد اسی کے لیے تو ساڑی نہیں لائے تھے اور سومترا کو کسی طرح شک نہ ہو اس لیے ویسی ہی ایک اور ساڑی اس کے لیے بھی لیتے آئے ہوں گے؟ اگر یہ بات تھی تو بڑا غضب ہوگیا۔ ایسی حالت میں وہ کیا ایک لمحہ بھی اس مکان میں رہ سکتی تھی۔ وہ مزدوری کرے گی۔ آٹا پیسے گی، کپڑے سیئے گی، بھیک مانگے گی، مگر یہاں نہ رہے گی۔ یہی شبہ اتنے دنوں تک سومترا کو اس کی سہیلی بنائے ہوئے تھا؟ اگر ایسا تھا تو سومترا نے اس سے صاف کیوں نہ کہہ دیا اور کیا پہلے ہی دن سے اس کو بلا کسی سبب ہی کے یہ شبہ ہوگیا؟ کیا سومترا نے میرے یہاں آنے کا مطلب ہی بُرا سمجھا؟ کیا اس کے خیال سے میں یہاں محبت کا کھیل ہی کھیلنے کے لیے آئی اور لائی گئی؟ اس کے آگے پورنا اور کچھ نہ سوچ سکی۔ ایک لمبی ٹھنڈی اور گہری سانس کھینچ کر وہ فرش پر لیٹ گئی، گویا ملک الموت کو آنے کی دعوت دے رہی ہو۔ ہائے بھگوان رنڈاپا کیا کلنک کا دوسرا نام ہے؟

مگر اس گھر کو چھوڑ دینے کا قصد کر کے بھی پورنا چھوڑ نہ سکی، کہاں جائے گی؟ جا ہی کہاں سکتی ہے؟ اتنی جلد چلا جانا کیا اس الزام کو اور بھی مضبوط نہ کر دے گا؟ بیوہ پر الزام لگا دینا کتنا آسان ہے۔ عوام کو اس کے بارے میں بُرے سے بُرا خیال کرتے دیر نہیں لگتی،

گویا کجروی ہی بیوگی کی قدرتی معاش ہے۔ گویا بیوہ ہو جانا دل کی ساری خواہشات اور ساری کمزوریوں کا امنڈ پڑنا ہے۔ پورنا صرف کروٹ بدل کر رہ گئی۔

کھانے کے لیے جاتے وقت سومترا پورنا کو ساتھ لے لیا کرتی تھی۔ آج بھی اس نے آکر کمرہ کے دروازہ سے آواز دی۔ پورنا نے نہایت عاجزی سے کہا۔ ''بہن! آج تو مجھے بھوک نہیں ہے'' سومترا نے پھر اصرار نہیں کیا۔

بارہ بجے کے قبل تو کملا پرشاد کبھی اندر سونے نہ آتے تھے مگر آج ایک بج گیا، دو بجے، پھر بھی ان کی آہٹ نہ ملی۔ یہاں تک کہ تین بجنے کے بعد اس کے کانوں میں دروازے بند کرنے کی آواز آئی۔ سومترا نے اندر سے کواڑ بند کر لیے تھے۔ شاید اب اسے امید نہ رہی مگر پورنا ابھی تک ان کا انتظار کر رہی تھی، حتیٰ کہ باقی رات بھی انتظار ہی میں گزر گئی کملا پرشاد نہیں آئے۔

اب مسئلہ پیچیدہ ہو گیا۔ کل گھر میں اس کا چرچا ہو گا۔ جتنے منہ اتنی ہی باتیں ہوں گی اور ہر منہ سے اس کی شکل و صورت کچھ بڑی ہو کر نکلے گی۔ ان بھید بھری کانا پھوسیوں اور اشاروں کا خیال کر کے تو اس کا دل گویا بیٹھ گیا۔ اس نے دل ہی دل میں ایشور سے پرارتھنا کی ''بھگوان تم ہی اب میرا سہارا ہو۔ میری لاج اب تمھارے ہی ہاتھ ہے۔''

پورنا تمام دن کملا سے دو چار باتیں کرنے کا موقع کھوجتی رہی، مگر وہ مکان میں آئے ہی نہیں اور مردانہ نشست گاہ میں وہ خود شرم سے نہ جا سکی۔ آج خواہش نہ ہوتے ہوئے بھی اسے کھانا پڑا۔ فاقہ کر کے لوگوں کو من مانی رائے زنی کرنے کا موقع وہ کیوں دیتی؟

اگرچہ سومترا نے ان دنوں اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھا بھی نہیں مگر آج شام کے وقت پورنا اس کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ سومترا نے کہا ''آؤ بہن، بیٹھو میں نے تو آج اپنے دادا جی کو لکھ دیا ہے کہ آکر مجھے لے جائیں۔ یہاں رہتے رہتے جی اوب گیا ہے۔''

پورنا نے مسکرا کر کہا۔ ''میں بھی چلوں گی یہاں تنہا کیسے رہوں گی؟''

سومترا۔ ''نہیں دل لگی نہیں کرتی بہن، یہاں آئے بہت دن ہو گئے۔ اب جی نہیں لگتا۔ کل حضرت رات بھر غائب رہے، شاید سمجھے ہوں گے کہ منانے آتی ہو گی، میری بلا

جاتی۔ میں نے اندر سے دروازہ بند کرلیا۔ پورنا نے بات بنائی "بے چارے آکر لوٹ گئے ہوں گے۔"

سومترا۔ میں تھوڑی ہی گئی تھی۔ وہ ادھر آئے ہی نہیں، سمجھا ہوگا لونڈی منا کر لے جائے گی مگر یہاں کس کی اٹکی تھی۔

پورنا۔ منا لانے میں کوئی بڑا نقصان تو نہ ہوتا۔

سومترا۔ کچھ نہیں، فائدہ ہی فائدہ تھا۔ ان کے آتے چاروں پدارتھ ہاتھ باندھے سامنے آجاتے یہی نا؟

پورنا۔ تم ہنسی اڑاتی ہو۔ سوامی کسی کارن روٹھ جائے تو کیا اسے منانا استری کا دھرم نہیں ہے؟

سومترا۔ میں تو خود ہی کہتی ہوں بہنی۔ عورت مرد کے پیروں کی جوتی کے سوا اور ہے ہی کیا؟ مرد چاہے جیسا ہو، چور ہو، ٹھگ ہو، بدکار ہو، شرابی ہو، عورت کا فرض ہے کہ اس کے پیروں کی دُھول دھوکر پیے۔ میں نے کون سا قصور کیا تھا جو انھیں منانے جاتی وہ بھی تو سنوں؟

پورنا۔ تم ہی اپنے دل میں سوچو؟

سومترا۔ خوب سوچ لیا ہے۔ آپ پیسے کی چیز تو کبھی بھول کر بھی نہ لائے۔ دس پانچ روپے تو کئی بار مانگنے پر ملتے ہیں۔ دو ریشمی ساڑیاں لانے کی کیسے ہمت پڑ گئی۔ اس میں کیا بھید ہے، اتنا تو تم بھی سمجھ سکتی ہو؟ آپ ٹھیک ہوجائیں گے۔ پوچھو اگر ایسے ہی بڑے چھیلا ہو تو بازار میں کیوں نہیں منہ کالا کرتے؟ یا گھر ہی میں کمپا لگانے کے شکاری ہو، مجھے پہلے ہی سے شبہ تھا اور اب تو انھوں نے اپنے دل کی بات ظاہر کردی۔ پورنا نے ذرا بھنویں چڑھا کر کہا "بہن تم کیسی باتیں کرتی ہو؟ ایک تو برہمنی دوسرے بدھوا، پھر رشتہ میں بہن، مجھے کیا بری نگاہوں سے دیکھیں گے۔ پھر ان کی ایسی عادت بھی نہیں رہی۔"

سومترا پان بناتی ہوئی بولی۔"عادت کی نہ کہو پورنا عادت کسی کے ماتھے پر نہیں لکھی ہوتی جنھیں تم بڑا نیک چلن سمجھتی ہو۔ وہ چھپے رستم ہوتے ہیں، ان کا تیر میدان میں نہیں چلتا ہے۔ مگر ہاں ان میں ایک بات اچھی ہے۔ اگر آج بیمار

پڑجاؤں تو سارا غصہ غائب ہوجائے۔ دوڑے چلے آئیں پھر دتکارو بھی تو نہ ہٹیں۔"

پورنا۔ تو آج کیوں نہیں بیمار پڑجاتیں؟

سومترا۔ ذرا دو چار دن جلا تو لوں۔ اکیلے لالہ کو نیند نہیں آتی۔ کروٹیں بدل کر سویرا کرتے ہوں گے، اسی سے تو مجھے جانے نہیں دیتے۔

پورنا۔ بڑی بے درد ہو بہن۔ آج چلی جانا، تمھیں میری قسم۔

مگر سومترا اتنی آسانی سے ماننے والی نہ تھی۔ آج کی رات بھی یوں ہی گزر گئی۔ پورنا تمام رات آہٹ لیتی رہی، کملا پرشاد نہ آئے۔ اسی طرح کئی روز گزر گئے۔ سومترا کو اب کملا پرشاد کا تذکرہ کرتے کرتے دن کٹتا تھا۔ ان کی ساری برائیاں اسے بھولتی جاتی تھیں۔ سارے گِلے اور شِکوے دماغ سے باہر ہوئے جاتے تھے۔ وہ ان کی محبت بھری باتیں یاد کرکے روتی تھی مگر ابھی تک بیجا خودداری کا خیال دور نہ ہوا تھا۔ بھوک سے بے قرار ہونے پر بھی کیا کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا سہل ہے؟ عورت کا دل اپنی ہار نہ مان سکتا تھا۔

دس بارہ دن گزر گئے تھے۔ ایک روز آدھی رات کے بعد پورنا کو سومترا کے کمرے کا دروازہ کھلنے کی آہٹ ملی۔ اس نے سمجھا کہ شاید کملا پرشاد آئے ہیں۔ اپنے دروازے پر کھڑی ہوکر جھانکنے لگی۔ سومترا اپنے کمرے سے دبے پاؤں نکل اِدھراُدھر متفکرانہ نگاہوں سے تاکتی مردانہ کمرے کی طرف چلی جا رہی تھی۔ پورنا سمجھ گئی کہ آج شوہر کو منا لانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ وہ کمرے سے باہر نکلی۔ صحن کو بھی پار کیا۔ دالان سے بھی باہر نکل گئی۔ شوہر کے کمرے کے دروازے پر بھی جا پہنچی۔ وہاں پر ایک لمحہ تک کھڑی سوچتی رہی کہ کیسے پکاروں، دفعتاً کملا پرشاد کے کھانسنے کی آواز بن کر وہ بھاگی۔ بے تحاشہ بھاگی اور اپنے کمرے میں آکر رکی۔ اس کے عشق کے ہاتھوں ستایا ہوا دل غرور کا کھلونا بنا ہوا تھا۔ عورت کا غرور ناقابلِ فتح ہے۔ لاثانی ہے غیر محدود ہے۔

پورنا ابھی تک دروازے پر کھڑی تھی۔ اسے اس وقت اپنے سہاگ کے دنوں کا ایک واقعہ یاد آرہا تھا۔ جب وہ کئی دنوں تک روٹھنے کے بعد اپنے شوہر کو منانے گئی تھی اور دروازہ ہی پر سے لوٹ آئی تھی۔ کیا سومترا بھی دروازہ ہی پر سے لوٹ نہ آئے گی؟ وہ ابھی یہی سوچ رہی تھی کہ سومترا اندر آتی ہوئی دکھائی دی۔ اسے جو خیال آیا تھا وہی ہوا۔ پورنا کے جی میں آیا کہ جاکر سومترا سے پوچھے، کیا ہوا؟ تم ان سے کچھ بولیں یا باہر ہی سے

لوٹ آئیں؟ مگر ایسی حالت میں سومترا سے کچھ پوچھنا مناسب نہ معلوم ہوا۔

سومترا نے کمرے میں جاتے ہی چراغ بجھا دیا، کمرہ بند کرلیا اور سو رہی۔

مگر پورنا ابھی تک اپنے کمرہ کے دروازہ پر کھڑی رہی۔

سومترا کے لیے جدائی کی تکلیف کتنی نا قابلِ برداشت ہو رہی ہے، یہ سوچ کر اس کا نازک دل مسوس اُٹھا۔ کیا اس موقع پر اس کی کچھ ذمہ داری نہ تھی؟ کیا اسی طرح الگ رہ کر تماشا دیکھنا ہی اس کا فرض تھا؟ اس سارے روٹھنے کا خاص سبب تو وہی تھی۔ تب وہ کیا اطمینان سے ہر دو عشاق کو ہجر کی آگ میں جلتا دیکھ سکتی تھی؟ ہرگز نہیں۔ اس کے پہلے بھی کئی بار اس کے جی میں آیا تھا کہ کملا پرشاد کو سمجھا بجھا کر راضی کرے لیکن کتنی ہی بدگمانیاں اس کا راستہ روک کر کھڑی ہوگئی تھیں۔ آج اس نے ان بدگمانیوں کا قلع قمع کردیا۔ کملا پرشاد کو منانے چلی، اس کے دل میں کسی طرح کا شک نہ تھا۔ کملا کو وہ شروع سے اپنا بڑا بھائی سمجھتی آرہی تھی، انھیں بھیا کہہ کر پکارتی بھی تھی۔ پھر اسے ان کے کمرے میں جانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ کمرے کے دروازے پر کھڑی ہوکر انھیں آہستہ سے پکارے گی اور کہے گی کہ بھابی کو بخار ہو آیا ہے۔ پس آپ ذرا اندر جائیے۔ پس یہ خبر پاتے ہی کملا اندر دوڑے ہوئے چلے جائیں گے۔ اس میں اسے ذرا بھی شبہ نہ تھا۔ تین سال کی متاہلانہ زندگی کا تجربہ ہونے پر بھی وہ مردوں کے رویہ سے ناواقف تھی۔ اپنے ماما کے چھوٹے سے گاؤں میں اس کا بچپن گزرا تھا۔ وہاں سارا گاؤں اسے بہن یا بیٹی کہتا تھا۔ اس بری خواہشوں سے مبرا دنیا میں وہ آزادی سے کھیتوں، کھلیانوں میں گھوما کرتی تھی۔ شادی بھی اس شخص سے ہوئی جو جوان ہوکر بھی لڑکا تھا جو اتنا حیادار تھا کہ اگر محلّہ کی کوئی عورت گھر میں آجاتی تو اندر قدم نہ رکھتا تھا۔ وہ اپنے کمرے سے نکلی اور مردانہ کمرے کے دروازہ پر جاکر اس نے آہستہ سے کواڑ پر تھپکی دی۔ اندیشہ تو اسے یہ تھا کہ کملا پرشاد کی نیند بمشکل ٹوٹے گی۔ لیکن وہاں نیند کہاں؟ آہٹ پاکر کملا نے دروازہ کھول دیا اور پورنا کو دیکھ کر حیرت سے بولا۔ ''پورنا آؤ بیٹھو۔''

پورنا نے سومترا کی علالت کی خبر نہ دی کیونکہ جھوٹ بولنے کی اس کو عادت نہ تھی۔ ایک لمحہ تک حیص و بیص میں کھڑی رہی۔ اسے کوئی بات نہ سوجھی تھی۔ آخر بولی۔ ''کیا آپ سومترا سے روٹھے ہیں، وہ بے چاری منانے آئی تھیں۔ اس پر آپ نہ گئے۔'' کملا

نے متعجب ہو کر کہا "منانے آئی تھیں سومترا؟ جھوٹی بات ہے۔ مجھے کوئی منانے نہیں آیا تھا۔ منانے ہی کیوں لگیں؟ جس سے محبت ہوتی ہے اسے منایا جاتا ہے۔ میں تو مر بھی جاؤں تو کسی کو رنج نہ ہو۔ ماں باپ روئیں گے۔ سومترا مجھے کیوں منانے لگیں؟ کیا تم سے کہتی تھیں؟"

پورنا کو بھی تعجب ہوا۔ سومترا کہاں آئی تھی اور کیوں لوٹ گئی، بولی "میں نے ابھی انھیں یہاں آتے اور ادھر سے جاتے دیکھا ہے، میں نے سمجھا شاید آپ کے پاس آئی ہوں۔ اس طرح کب تک روٹھے رہیے گا۔ بے چاری رات دن روتی رہتی ہیں۔"

کملا نے گویا یہ بات نہیں سنی۔ قریب آکر بولے "یہاں کب تک کھڑی رہو گی؟ اندر آؤ تم سے کچھ کہنا ہے" یہ کہتے ہوئے اس نے پورنا کی کلائی پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔ اور دروازہ کی چٹخنی لگا دی۔ پورنا کا دھڑکنے لگا۔ اس جوش سے بھری ہوئی سخت اور ظالمانہ گرفت نے گویا اسے سانپ بن کر ڈس لیا۔ سارے اعضاء سُست پڑ گئے۔ تھر تھر کانپتی ہوئی دروازہ سے لپٹ کر کھڑی ہو گئی۔

کملا اس کی گھبراہٹ دیکھ کر پلنگ پر جا بیٹھا اور تسلی دیتے ہوئے بولا "ڈرو مت پورنا، آرام سے بیٹھو۔ میں بھی آدمی ہوں۔ کوئی کاٹنے والا جانور نہیں ہوں۔ آؤ مجھ سے کیوں، اتنی بھاگی بھاگی پھرتی ہو؟ مجھ سے دو باتیں بھی کرنا تمھیں نہیں گوارا ہوتا، تم نے اس دن ساڑی لوٹا دی۔ جانتی ہو کہ مجھے کتنا رنج ہوا؟"

تو اور کیا کرتی۔ سومترا اپنے دل میں کیا سوچتی۔

کملا نے یہ بات نہ سنی۔ اس کی بے چین نگاہ پورنا کے زرد چہرہ پر جمی ہوئی تھی۔ اس کے دل میں نفس پرستی کی تیز آگ مشتعل ہو گئی۔ اس کا سارا وجود، اس کے سارے حواس، اس کی ساری رغبت، ایک عجیب مہلک جذبے سے متحرک ہو اُٹھے، درندوں کی آنکھوں میں شکار کے وقت جو چمک آجاتی ہے کچھ ویسی ہی چمک کملا کی آنکھوں میں پیدا ہو گئی وہ پلنگ سے اُٹھا اور دونوں ہاتھوں کو کھولے ہوئے پورنا کی طرف بڑھا۔ اب تک پورنا خوف سے کانپ رہی تھی۔ کملا کو اپنی طرف آتا دیکھ کر اس نے گردن اُٹھا کر جلتی ہوئی آنکھوں سے اس کی جانب دیکھا اس کی نگاہ میں خوفناک ہیبت اور خطرہ کی نمود تھی۔ گویا وہ کہہ رہی تھی کہ خبردار اگر ایک جو بھر بھی اس طرف بڑھے تو ہم دونوں میں سے ایک کا

خاتمہ ہوجائے گا۔ اس وقت پورنا کو اپنے دل میں ایک لامحدود طاقت کا احساس ہو رہا تھا جو ساری دنیا کی فوجوں کو اپنے پیروں تلے کچل سکتی تھی۔اس کی آنکھوں میں شعلہ باری، اس کی وہ بندھی ہوئی مٹھیاں‌اور تنی ہوئی گردن دیکھ کر کملا رک گیا۔ اس کے ہوش ذرا ٹھکانے آگئے اور اس کی ہمت ایک قدم بھی آگے بڑھنے کی نہ پڑی۔ کھڑا کھڑا بولا "یہ صورت نہ اختیار کرو پورنا۔ میں جانتا ہوں کہ محبت جیسی چیز جبر یا دغا سے نہیں مل سکتی، نہ میں اس ارادے سے تمھارے پاس آرہا تھا۔ میں تو صرف تمھاری نگاہِ کرم کا امیدوار ہوں جس دن سے یہ تمھاری موہنی مورت دیکھی ہے اسی دن سے تمھاری پوجا کر رہا ہوں۔ پتھر کی مورتوں کی پوجا پھول پتی سے ہوتی ہے۔ مگر تمھاری پوجا آنسوؤں سے کرتا ہوں۔ میں جھوٹ نہیں کہتا پورنا؟ اگر اس وقت تمھارا اشارہ پاجاؤں تو اپنی جان کو بھی تمھارے قدموں پر نچھاور کردوں۔ یہی میری سب سے بڑی خواہش ہے۔ میں بہت چاہتا ہوں کہ تمھیں بھول جاؤں مگر دل کسی طرح نہیں مانتا۔ یقیناً اگلے جنم میں میرا تم سے کوئی زبردست تعلق رہا ہوگا، شاید اس جنم میں بھی میری یہی خواہش بلا پوری ہوئے باقی رہی ہوگی۔ تمھارے قدموں پہ گرگر کر ایک بار رو لینے کی خواہش ہی کے سبب میں تم کو یہاں لایا ہوں۔ بس یہ سمجھ لو کہ میری زندگی کا تمھارے ہی رحم پر دارومدار ہے۔ اگر تمھاری آنکھیں میری جانب سے یوں ہی برگشتہ رہیں تو دیکھ لینا کہ یا تو ایک روز کملا پرشاد کی نعش اسی کمرے میں تڑپتی پاؤگی یا گنگا کے کنارے پر۔ میرا یہی مقصد ہے۔

پورنا کا غصہ کم ہوا۔ کانپتے ہوئے لہجے میں بولی۔"بابو جی آپ مجھ سے کیسی باتیں کر رہے ہیں، آپ کو شرم نہیں آتی؟"

کملا پلنگ پر بیٹھتا ہوا بولا۔ "نہیں پورنا مجھے تو اس میں کوئی شرم کی بات نہیں دکھائی دیتی۔ اپنی من چاہی دیوی کو پوجنے میں کون سی شرم کی بات ہے؟ محبت ایشور کی پیدا کی ہوئی رغبت، ایشور کا پیغام ہے۔ محبت کی دنیا میں انسانوں کے بنائے ہوئے معاشرتی قاعدوں کی کوئی وقعت نہیں۔ بیاہ سماج کے مضبوط رکھنے کی صرف ایک تدبیر ہے۔ ذات پات صرف جداگانہ کام کرنے والے لوگوں کا ایک گروہ ہے۔ زمانہ کی گردش نے تمھیں ایک ایسی حالت میں مبتلا کر دیا ہے جس میں محبت کے سکھوں کا خیال کرنا ہی گناہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر سوچو کہ سماج کی یہ کتنی بڑی ناانصافی ہے، کیا تمھیں اس لیے بنایا ہے کہ دو تین

برس محبت کا سکھ اُٹھانے کے بعد زندگی بھر بیوگی کی سخت تکلیف برداشت کرتی رہو؟ کبھی نہیں! ایشور اتنا بے انصاف، اتنا بدطینت نہیں ہوسکتا۔ بسنت کمار جی میرے بڑے دوست تھے۔ آج بھی ان کی یاد آتی ہے تو آنکھوں میں آنسو بھر جاتے ہیں۔ اس وقت بھی ان کو اپنے سامنے کھڑا دیکھتا ہوں۔ تم سے ان کو بڑی محبت تھی۔ تمھارے سر میں ذرا بھی درد ہوتا تو بیچارے بے قرار ہوجاتے تھے۔ وہ تمھیں سکھ سے منڈھ دینا چاہتے تھے کہ تمھیں تیز ہوا کا جھونکا بھی نہ لگے۔ انھوں نے اپنی زندگی تمھارے ہی لیے وقف کر رکھی تھی۔ رؤو مت پورنا۔ تمھیں ذرا بھی اداس دیکھ کر ان کا دل پاش پاش ہوجاتا تھا۔ تمھیں روتا دیکھ کر ان کی روح کو کتنی تکلیف ہوگی۔ پھر یہ آج کوئی نئی بات نہیں۔ ادھر مہینوں سے تمھیں رونے کے سوا کوئی کام نہیں۔ اس روح کو تمھاری یہ فضول تپیا دیکھ کر کتنا رنج ہوگا۔ اس کا اندازہ تم کرسکتی ہو؟ ایشور تمھیں دُکھ کے اس اتھاہ ساگر میں ڈوبنے دینا نہیں چاہتے۔ وہ تمھیں اُبارنا چاہتے ہیں۔ تمھیں زندگی کے سُکھ میں محو کردینا چاہتے ہیں۔ اگر ان کی تحریک نہ ہوتی تو مجھ جیسے کمزور آدمی کے دل میں محبت کیوں پیدا ہوتی۔ جس نے کسی عورت کی طرف نگاہ اُٹھا کر نہیں دیکھا وہ آج تم سے محبت کی بھیک کیوں مانگتا ہوتا؟ مجھے تو اس میں ایشور کا ہاتھ صاف نظر آرہا ہے۔“

پورنا اب تک دروازے سے چپٹی کھڑی تھی۔ اب دروازے سے ہٹ کر وہ فرش پر بیٹھ گئی۔ کملا پرشاد پر اس سے پہلے جو شبہ ہوا تھا وہ اب مٹتا جاتا تھا۔ وہ محو ہوکر ان کی باتیں سن رہی تھی۔ کملا پرشاد اسے فرش پر بیٹھا ہوا دیکھ کر اُٹھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کرسی پر بیٹھانے کی کوشش کرتا ہوا بولا۔”نہیں نہیں پورنا! یہ نہیں ہوسکتا پھر میں بھی زمین ہی پر بیٹھوں گا۔ آخر اس کرسی پر بیٹھنے میں تمھیں کیا عذر ہے؟“

پورنا نے اپنا ہاتھ نہیں چھڑایا۔ کملا سے اس کو جھجک بھی نہیں ہوئی، یہ کہتی ہوئی کہ ”بابو جی آپ بڑی ضد کرتے ہیں۔ کوئی مجھے اس طرح یہاں بیٹھا دیکھ لے تو کیا ہو؟“ وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

کملا کا چہرہ شگفتہ ہوگیا، بولا۔”اگر کوئی کچھ کہے تو اس کی بے وقوفی ہے۔ سومترا کو یہاں بیٹھا دیکھ کر کوئی کچھ نہ کہے گا۔ تمھیں دیکھ کر اس کے ہاتھ خود بخود سینہ پر پہنچ جاویں گے! یہ انسانوں کے رچے ہوئے سوانگ ہیں اور میں انھیں کچھ نہیں سمجھتا۔ جہاں

دیکھو ڈھکوسلا۔ جہاں دیکھو خرافات، ہماری زندگی مکر وفریب کی زندگی ہوگئی ہے۔ میں ان مکروفریب کا خاتمہ کردوں گا۔ پورنا، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میں نے آج تک کسی عورت کی طرف نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا۔ میری نظر میں کوئی جچتی ہی نہ تھی۔ مگر تمھیں دیکھتے ہی میرے دل میں ایک عجیب قسم کی ہلچل ہونے لگی۔ میں اسی وقت سمجھ گیا کہ یہ ایشور کی تحریک ہے۔اس کی مرضی نہ ہوتی تو تم اس گھر میں آتی ہی کیوں، یہاں آنے میں بھی ایشور کی تحریک ہے۔ اس میں ذرا بھی شک نہ کرنا۔ ایک سے ایک خوبصورت عورتیں میں نے دیکھیں مگر اس چاند میں دل کو کھینچ لینے والی جو طاقت ہے وہ کسی میں نہ ملی۔''

یہ کہہ کر کملا پرشاد نے پورنا کے رخسار کو انگلی سے مس کیا، پورنا کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اس نے جھجک کر منہ ہٹا لیا مگر کرسی سے اُٹھی نہیں۔ یہاں سے اب بھاگنا نہیں چاہتی تھی۔ ان باتوں کو سن کر اس کے دل میں ایسی خوشگوار جنبش پیدا ہورہی تھی، جیسے مانڈو کے نیچے جاتے وقت کسی نوجوان کے دل میں ہوتی ہے۔

کملا کو دفعتاً ساڑیوں کی یاد آگئی۔ دونوں ابھی تک اس نے صندوق میں رکھ چھوڑی تھیں۔ اس نے ایک ساڑی نکال کر پورنا کے آگے رکھ دی اور کہا۔ ''دیکھو یہ وہی ساڑی ہے پورنا، اس روز تم نے اس کو لینا نامنظور کر دیا تھا، آج میری خاطر سے لے لو۔ ایک لمحہ کے لیے اسے پہن لو، تمھاری یہ سفید ساڑی دیکھ کر میرے دل میں چوٹ سی لگتی ہے۔ میں ایماناً کہتا ہوں کہ یہ میں تمھارے ہی واسطے لایا تھا۔ سومترا کے دل میں کوئی شبہہ نہ ہو اس لیے ایک اور لانی پڑی، نہیں اٹھاکر رکھو مت، صرف ایک ہی لمحہ کے لیے پہن لو۔ ذرا میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس رنگ کی ساڑی تمھارے بدن پر کتنی کھلتی ہے۔ نہ مانوگی تو میں جبراً پہنا دوں گا۔'' پورنا نے ساڑی کو ہاتھ میں لے کر اس کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔ ''کبھی پہن لوں گی، اتنی جلدی کیا ہے پھر یہاں کیسے پہنوں گی؟''

کملا۔ میں ہٹا جاتا ہوں۔

کمرے کے ایک جانب ایک چھوٹی کوٹھری تھی، اسی میں کملا پرشاد کبھی کبھی بیٹھ کر پڑھتا تھا۔ اس کے دروازے پر چھینٹ کا ایک پردہ پڑا ہوا تھا۔ کملا پرشاد پردہ اُٹھاکر اس کوٹھری میں چلا گیا۔ مگر تنہا رہ جانے پر بھی پورنا ساڑی نہ پہن سکی! جی

پہننے کو ضرور چاہتا تھا۔ مگر لحاظ اس بات کا تھا کہ کملا پرشاد اپنے دل میں اس کا نہ جانے کیا مطلب سمجھ بیٹھے۔

کملا پرشاد نے پردہ کی آڑ سے کہا۔ ''پہن چکیں، اب باہر نکلوں۔''

پورنا نے مسکراکر کہا۔''ہاں پہن چکی نکلو۔''

کملا نے پردہ اُٹھا کر جھانکا۔ پورنا ہنس پڑی۔ کملا نے پھر پردہ بند کردیا اور اس کی آڑ سے بولا۔ ''اب کے اگر تم نے نہ پہنا پورنا تو میں آکر جبراً پہناؤں گا۔''

پورنا نے ساڑی پہنی تو نہیں، ہاں اس کا آنچل کھول کر سر پر رکھ لیا۔ سامنے ہی آئینہ تھا۔ اس نے اس پر نگاہ ڈالی۔ اپنے حسن پر وہ آپ ہی فریفتہ ہوگئی۔ ایک لمحہ کے لیے اس کے دل میں پشیمانی کا خیال آگیا۔ اس کے اندر ہی کہیں سے آواز آئی۔ ''پورنا ہوش میں آ کدھر جارہی ہے؟ وہ راستہ تیرے لیے بند ہے، تو اس پر قدم نہیں رکھ سکتی؟'' وہ ساڑی کو الگ کر دینا چاہتی تھی کہ دفعتاً کملا پرشاد پردہ سے نکل آیا اور بولا۔ ''آخر تم نے نہ پہنا نا؟ میری اتنی ذرا سی بات بھی تم نے نہ مانی؟''

پورنا۔ پہنے تو ہوں، اب کیسے پہنوں؟ کون بھلی معلوم ہوتی ہے؟ میرے بدن پر پڑکر ساڑی کی مٹی پلید ہوگئی۔

کملا نے فریفتہ نگاہوں سے دیکھ کرکہا۔ ''ذرا آئینہ میں تو دیکھ لو۔'' پورنا نے دبی ہوئی نگاہ آئینہ پر ڈال کر کہا۔ ''دیکھ لیا۔ ذرا بھی بھلی نہیں لگتی۔''

کملا۔ چراغ کی لو تو مات ہوگئی، واہ رے بھگوان! تم ایسی چمکتی ہوئی صورت بنا سکتے ہو، تمھیں دھنیہ (آفریں) ہے۔

پورنا۔ میں اُتار پھینک دوں گی۔

کملا۔ بھگوان، اب میرا بیڑا کیسے پار لگے گا؟

پورنا۔ مجھے ڈبوکر! یہ کہتے کہتے پورنا کا چہرہ ماند پڑ گیا۔

پورنا نے ساڑی اُتار کر الگنی پر رکھ دی۔

کملا نے پوچھا۔ ''یہاں کیوں رکھتی ہو؟''

پورنا بولی۔ ''اور کہاں لے جاؤں؟ آپ کی اتنی خاطرداری کردی! ایشور نہ

جانے اس کی کیا سزا دیں گے؟"

کملا: ایشور سزا نہیں دیں گے، پورنا! یہ انھی کا حکم ہے! تم اس کی چنتا نہ کرو۔ کھڑی کیوں ہو؟ ابھی تو بہت رات ہے، کیا ابھی سے بھاگ جانے کا ارادہ ہے؟

پورنا نے دروازے کے قریب جاکر کہا۔ "اب جانے دو بابو جی۔ کیوں میری زندگی بھرشٹ (ناپاک) بنانا چاہتے ہو؟ تم مرد ہو تمھارے لیے سب معاف ہے، میں عورت ہوں، میں کہاں جاؤں گی؟ دور تک سوچو، اگر گھر میں ذرا بھی خبر ہوئی تو جانتے ہو میری کیا درگت ہوگی؟ ڈوب مرنے کے سوا میرے لیے کوئی اور چارہ نہ رہ جائے گا۔ اس کو سوچیے آپ میرے لیے جلا وطن ہونا پسند کریں گے؟ اور پھر بدنام اور رسوا ہوکر جیے تو کیا جیے۔ نہیں بابو جی! مجھ پر رحم کیجیے۔ میں تو آج مر بھی جاؤں تو کسی کا کوئی نقصان نہ ہوگا، بلکہ زمین کا بوجھ ہی کچھ ہلکا ہوجاوے گا، لیکن آپ کی زندگی بیش قیمت ہے۔ اسے آپ میرے لیے کیوں مصیبت میں ڈالیے گا۔ جیوں ہی کوئی موقع آئے گا آپ تو پر جھاڑ کر الگ ہوجاویں گے لیکن میری کیا گت ہوگی، اس کی آپ کو اس وقت ذرا بھی فکر نہ ہوگی۔"

کملا نے زور دے کر کہا۔ "یہ کبھی نہیں ہوسکتا پورنا، ضرورت پڑے تو تمھارے لیے جان تک دے دوں۔ جب چاہے امتحان کر کے دیکھ لو۔"

پورنا۔ یہ سب خالی باتیں ہی باتیں ہیں۔ ابھی محلّہ میں دو ایک ایسے بھی قصے دیکھ چکی ہوں۔ آپ کو نہ جانے کیوں میری اس صورت پر موہ ہوگیا ہے۔ اسے اپنی بدنصیبی کے سوا اور کیا کہوں؟ جب تک آپ کی مرضی ہوگی اپنا دل بہلایے گا، پھر بات بھی نہ پوچھیے گا۔ میں کیا سمجھ نہیں رہی ہوں۔ ایشور کو آپ درمیان میں گھسیٹ لاتے ہیں، اس کا مطلب بھی سمجھ رہی ہوں۔ ایشور کسی بُرے راستہ کی طرف نہیں لے جاتے۔ اسے چاہے انس کہیے چاہے ترک، مگر ہے بُرا ہی راستہ! میں اس دھوکے میں نہیں آنے کی! آج جو کچھ ہوگیا سو ہوگیا۔ اب بھول کر بھی میری طرف آنکھ نہ اُٹھایے گا۔ ورنہ میں یہاں نہ رہوں گی۔ اگر کچھ نہ ہوسکے گا تو ڈوب مروں گی، ایندھن نہ پاکر آگ خود ہی بجھ جاتی ہے، اس میں ایندھن نہ ڈالیے۔"

کملا نے آزردہ ہوکر کہا۔ "پورنا میں تو مرجاؤں گا، سچ کہتا ہوں میں زہر کھا

کر سو رہوں گا اور یہ ہتیا کا پاپ تمھارے اوپر ہوگا۔"

یہ آخری فقرہ پورنا نے سنا تھا یا نہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے۔ اس نے دروازہ کھولا اور صحن کی طرف چلی۔ کملا دروازے پر کھڑا تاکتا رہا، پورنا کو روکنے کی جرأت اسے نہ ہوئی۔ چڑیا ایک بار دانے پر آکر پھر نہ جانے کیا آہٹ پاکر اڑ گئی تھی، اتنی ہی دیر میں پورنا کے دلی جذبات میں کتنا تغیر ہوا، وہ کھڑا ہوا یہی سوچتا رہا۔ وہ غصہ پھر وہ خوشی اور رغبت اور آخر میں یہ ترک و فنا کا راز اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔

کیا وہ چڑیا پھر دانے پر گرے گی؟ یہی سوال کملا کے دماغ میں بار بار اُٹھنے لگا۔

(۱۰)

ایک معیار پرست ہندو لڑکی کی طرح پریما شوہر کے گھر آکر شوہر ہی کی ہوگئی تھی، اب امرت رائے اس کے لیے صرف ایک خواب کی طرح تھے جو اس نے کبھی دیکھا تھا، وہ گھر کے کاموں میں بڑی ہوشیار تھی۔ سارا دن گھر کا کوئی نہ کوئی کام کرتی رہتی۔ دان ناتھ کو آرائش کا سامان خریدنے کا شوق تھا۔ وہ اپنے گھر کو صاف ستھرا سجا ہوا بھی دیکھنا چاہتے تھے لیکن اس کے لیے جس باقاعدگی اور محنت کی ضرورت ہے، وہ ان میں نہ تھی۔ کوئی چیز قرینے سے رکھنا انھیں آتا ہی نہ تھا۔ عینک غسل خانے کی طاق پر رکھ دی تو اس کی یاد اس وقت آئی جب کالج میں اس کی ضرورت پڑتی۔ کھانے، پینے، سونے، جاگنے کی کوئی پابندی نہ تھی۔ کبھی کوئی عمدہ کتاب مل گئی تو تمام رات جاگتے رہے۔ کبھی سرِشام سے سو رہے تو کھانے پینے کا ہوش بھی نہ رہا۔ آمدنی خرچ کا بھی کوئی انتظام نہ تھا۔ جب تک ہاتھ میں روپے رہتے بے دریغ خرچ کیے جاتے، بے ضرورت چیزیں آیا کرتیں، روپے خرچ ہونے پر لکڑی تیل میں کفایت کرنی پڑتی تھی۔ تب وہ اپنی ضعیفہ ماں پر جھنجھلاتے مگر ماں کا اس میں کوئی قصور نہ تھا۔ ان کا بس چلتا تو اب تک دان ناتھ چار پیسے کے آدمی ہوگئے ہوتے۔ وہ پیسے کا کام دھیلے میں ٹالنا چاہتی تھیں، کوئی کہار، کوئی خادم ان کے یہاں ٹکنے نہ پاتے تھے۔ انھیں اپنے ہاتھوں کام کرنے میں شاید لطف آتا تھا وہ غریب ماں باپ کی بیٹی تھیں۔ دان ناتھ کے والد بھی معمولی آدمی تھے اور پھر وہ زندہ بھی رہے بہت کم، ماں نے اگر اتنی کفایت سے کام نہ لیا ہوتا تو دان ناتھ کسی دفتر کے چپراسی ہوتے۔ ایسی عورتوں کے لیے بخل قدرتی تھا۔ وہ دان ناتھ کو اب بھی وہی بچہ سمجھتی تھیں جو کبھی ان کی گود

میں کھیلا کرتا تھا۔ ان کی زندگی کا وہ سب سے مسرت بخش وقت ہوتا تھا جب دان ناتھ کے ساتھ سامنے تھال رکھ کر وہ کھلانے بیٹھتی تھیں، کسی مہراج، رسوئیا، کہار یا مہری کو وہ اس مسرت میں خلل انداز نہ ہونے دیتی تھیں۔ پھر وہ جئیں گی کیسے؟ جب تک دان ناتھ کو اپنے سامنے بٹھلا کر نہ کھلا لیں انھیں اطمینان نہ ہوتا تھا۔ دان ناتھ بھی ماں پر جان دیتے تھے وہ چاہتے تھے کہ عمدہ سے عمدہ کھائیں پہنیں اور آرام سے رہیں۔ مگر ان کے پاس بیٹھ کر بچوں کی توتلی زبان میں باتیں کرنے کی انھیں فرصت نہ تھی اور نہ خواہش۔ دوستوں کے ساتھ غپ کرنے میں انھیں زیادہ لطف آتا تھا۔ ضعیفہ نے دل کی بات کہی نہیں مگر اس کی دلی خواہش تھی کہ دان ناتھ اپنی پوری تنخواہ لاکر اس کے ہاتھ میں رکھ دیتے، پھر وہ اپنے طرز پر اسے خرچ کرتی۔ تین سو روپے کم نہیں ہوتے، اتنے روپیوں کی گڈیوں کو ہاتھوں سے چھونے کا لطف اسے کبھی حاصل نہ ہوا تھا۔ دان ناتھ میں یا تو اتنی سمجھ نہ تھی یا وہ لاپرواہ تھے۔ پریما نے دو ہی چار مہینے میں گھر کو بہت باقاعدہ طور پر مکمل کر دیا۔ اب ہر ایک کام کا وقت اور قاعدہ تھا۔ ہر ایک چیز کا خاص مقام تھا، آمدنی اور خرچ کا حساب تھا۔ دان ناتھ کو اب دس بجے سونا اور پانچ بجے اُٹھنا پڑتا تھا۔ نوکر چاکر خوش تھے۔ سب سے زیادہ خوش تھی پریما کی ساس۔ دان ناتھ کو جیب خرچ کے لیے پچیّس روپے دے کر پریما باقی روپے ساس کے ہاتھ میں رکھ دیتی تھی اور جس چیز کی ضرورت ہوتی انھی سے کہتی، اس طرح ضعیفہ کو خود گھر کی مالکہ خیال کرتی تھی، اگرچہ شروع ماہ سے وہ کہنے لگی تھی کہ اب روپے نہیں رہے، خرچ ہوگئے، کیا میں روپے ہو جاؤں مگر پریما کے پاس تو پائی پائی کا حساب رہتا تھا وہ منت سماجت کرکے اپنا کام نکال لیا کرتی تھی۔

یہ سب کچھ تھا مگر دان ناتھ کے دل میں اب بھی یہی اندیشہ موجود تھا کہ پریما کو امرت رائے سے محبت ہے۔ پریما خواہ دان ناتھ کے لیے جان تک نکال کر رکھ دے مگر اس اندیشے کو ان کے دل سے نہ نکال سکتی تھی۔ اگر پریما کی محبت کا حال انھیں پیشتر سے معلوم نہ ہوتا تو شاید وہ خود کو دنیا میں سب سے زیادہ خوش نصیب خیال کرتے اس سے وہ کیا چاہتے تھے، اس میں انھیں کون سی کمی نظر آتی تھی، یہ وہ خود نہ جانتے تھے، مگر ایک موہوم سا خیال موجود رہتا تھا کہ تب کچھ اور ہی بات ہوتی۔ وہ ہر روز اسی ادھیڑبن میں پڑے رہتے تھے کہ امرت رائے کی طرف سے ان کا خیال پھیردوں۔ تنخواہ کے علاوہ

اخباروں میں مضامین لکھ کر امتحانوں کے پرچے دیکھ کر ایک خاصی رقم ان کے ہاتھ لگ جاتی تھی۔ انھی سے وہ پریما کے لیے طرح طرح کے تحفے لایا کرتے تھے۔ اگر ان کے بس کی بات ہوتی تو وہ آسمان کے تارے توڑ لاتے اور انھیں اس کے گلے کا ہار بناتے! اپنے رفیق پروفیسروں سے اس کی تعریف کرتے ہوئے ان کی زبان نہ تھکتی تھی۔ انھوں نے کبھی شاعری نہیں کی تھی۔ شاعروں کو تک بند کہا کرتے تھے۔ مگر اب ان کی نثر بھی شاعرانہ ہوتی تھی۔ پریما شاعری کی زندہ مورت تھی اس کے ایک طرز، ایک انداز کو دیکھ کر قوت متخیلہ خود بخود متحرک ہوجاتی تھی۔ اس کے سامنے بیٹھ کر انھیں دنیا و مافیہا فراموش ہوجاتے تھے، ساری فضا بہشت کا نمونہ بن جاتی تھی۔ ایسی نزاکت، ایسی جلا، ایسی کشش، ایسی حلاوت کیا مادی ہوسکتی تھی۔ جب وہ لمبی پلکوں سے ڈھکی ہوئی شرمیلی، رسیلی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھتی تو دان ناتھ کا دل امنگ سے بھر جاتا تھا۔ سچی محبت وصل میں بھی ہجر کی خوشگوار تکلیف کو محسوس کرتی ہے۔ دان ناتھ کو پریما اپنے سے دور معلوم ہوتی تھی۔

اس پر بھی دان ناتھ کے دل میں وہ اندیشہ برابر موجود تھا۔ وہ ایک بار اس کے دل میں داخل ہوکر دیکھ بھال کرنی چاہتے تھے، ایک بار اس کے دلی جذبات کا عمق معلوم کرنا چاہتے تھے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی جانتے تھے کہ وہ یہ نہ سمجھے کہ اس کی جانچ ہو رہی ہے۔ کہیں اس نے بھانپ لیا تو غضب ہوجائے گا۔ اس کا نازک دل اس جانچ کا بوجھ برداشت بھی کرسکے گا یا نہیں۔

نہ جانے کیوں اب دان ناتھ کو امرت رائے سے نفرت ہوگئی تھی۔ شاید یہ سمجھتے تھے کہ ان کے دل خوش کن نغمے میں بھی ایک کرخت راگ ہے، یہ نہ ہوتا تو ان کی زندگی پر ملائک کو بھی رشک ہوتا۔ وہ اب بھی امرت رائے کے مکان پر جاتے تھے۔ وہاں گھنٹوں بیٹھے رہتے تھے، مگر دوستوں کی اب وہ یکسانیت نہ تھی، اب وہ ایک جان دو قالب کے مصداق نہ تھے۔ امرت رائے بھی یہ بات سمجھتے تھے۔ انھیں یہ جاننے کی بڑی خواہش ہوتی تھی کہ پریما خوش ہے یا نہیں، وہ ایک مرتبہ اس سے مل کر اس کا دل اپنی طرف سے صاف کر دینا چاہتے تھے مگر موقع ایسا نازک تھا کہ اس مسئلہ پر زبان کھولتے ہوئے انھیں تامل ہی نہیں بلکہ خوف ہوتا تھا۔ دان ناتھ اتنے چھوٹے دل کا آدمی ہے، یہ انھوں

نے نہ سمجھا تھا۔

آخر انھوں نے ایک روز کہہ ڈالا۔ ''آج کل آئینے میں اپنی صورت دیکھتے ہو؟''

دان ناتھ نے سوال کا مطلب نہ سمجھ کر کہا۔''ہاں دیکھتا کیوں نہیں! کم از کم چار مرتبہ تو حسب معمول دیکھتا ہوں۔''

امرت رائے۔ کوئی فرق ہے؟

دان ناتھ۔ دبلا ہوتا جاتا ہوں؟

امرت رائے۔ جھوٹ نہ بولو یار، مجھے تو یاد نہیں آتا کہ تم اتنے موٹے کبھی تھے۔ سچ کہتا ہوں کہ میں تمھیں مبارک باد دینے جارہا تھا مگر ڈرتا تھا کہ تم سمجھو گے کہ یہ نظر لگا رہا ہے۔

دان ناتھ۔ مجھ سے تو پریما یہی کہتی ہے کہ تم دُبلے ہوتے جا رہے ہو اور میں بھی سمجھتا ہوں کہ وہ ٹھیک کہتی ہے۔ پہلے تنہا اور آزاد تھا۔ اب خانہ داری کی فکر سر پر سوار رہتی ہے۔ دُبلا نہ ہوں گا تو کیا موٹا ہوں گا؟

امرت رائے اپنی ہنسی ضبط نہ کرسکے۔ دان ناتھ کو اتنا کم فہم انھوں نے کبھی نہ سمجھا تھا۔ دان ناتھ نے سمجھا کہ یہ میرا مضحکہ اُڑانا چاہتے ہیں۔ موٹا ہوں یا دُبلا، ان سے مطلب؟ یہ کون ہوتے ہیں پوچھنے والے؟ اب شاید یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ پریما کی محبت آمیز خدمت نے مجھے موٹا بنا دیا ہے۔ یہی سہی۔ تو آپ کو کیوں رشک آتا ہے۔ کیا اب بھی آپ کا اس سے کوئی رشتہ ہے؟ کثیف برتن سے صاف پانی بھی گندہ ہوجاتا ہے۔ نفرت سے بھرا ہوا دل پاک مذاق بھی نہیں برداشت کرسکتا۔ یہ وہی دان ناتھ ہیں جو دوسروں کو چٹکیوں میں اُڑایا کرتے ہیں۔ اچھے اچھوں کا قافیہ تنگ کر دیتے ہیں۔ آج ساری عقل چرنے چلی گئی تھی۔وہ سمجھ رہے تھے کہ یہ حضرت مجھے دھوکا دے کر پریما کا پتا لینا چاہتے ہیں۔ مجھی سے اُڑنے چلے ہیں۔ بچہ، ابھی کچھ روز اور پڑھو، تب میرے منہ لگنا۔ بولے ''تم ہنسے کیوں؟ کیا میں نے ہنسی کو کوئی بات کہی ہے؟

امرت رائے۔ نہیں بھئی، تم پر نہیں ہنسا، ہنسا اس بات پر کہ تم نے اپنی عقل اور آنکھ سے

کام لینا چھوڑ دیا ہے۔

دان ناتھ۔ میں نے نہیں چھوڑا۔ تم نے البتہ چھوڑ دیا ہے۔

امرت رائے۔ خیر مجھی کو دھوکا ہوا ہوگا۔ کبھی کبھی آنکھوں کو دھوکا ہوجایا کرتا ہے! مگر تم یونہی دُبلے ہوتے چلے گئے تو بڑی مصیبت کا سامنا ہوگا۔ کسی ڈاکٹر کو دکھایئے۔ اگر پہاڑ پر چلنا چاہو تو میں بھی ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔

دان ناتھ۔ پہاڑ پر جانے میں روپے خرچ ہوتے ہیں۔ یہاں کوڑی کفن کو بھی نہیں ہے۔

امرت رائے۔ روپے میں دے دوں گا، تم چلنے کا ٹھیک کرلو، دو مہینے اور ہیں اپریل میں چل دیں۔

دان ناتھ۔ تمھارے پاس بھی تو روپے نہیں ہیں، اینٹ پتھر میں اُڑا دیے۔

امرت رائے۔ پہاڑوں پر صوبہ بھر کے راجے رؤسا آتے ہیں ان سے وصول کریں گے۔

دان ناتھ۔ خوب! ان روپیوں سے آپ پہاڑوں کی ہوا کھائیں گے۔ اپنے گھر کی جمع لٹاکر اب دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھروگے؟

امرت رائے۔ تمھیں آم کھانے سے مطلب ہے یا پیڑ گننے سے؟ میں چوری کرکے لاؤں گا تم سے کوئی مطلب نہیں۔

دان ناتھ۔ جی تو مجھے معاف کیجیے۔ آپ ہی پہاڑوں کی سیر کریں۔ تم نے فضول اتنے روپے برباد کیے، سو پچاس یتیموں کی تم نے مدد کر ہی دی تو کون بڑا ثواب ہوجاتا ہے؟ ہاں تمھاری لیڈری کی تمنا پوری ہوجائے گی۔

یہ کہتے ہوئے وہ اُٹھ کھڑے ہوئے، امرت رائے اس بارے میں دان ناتھ کے خیالات سے واقف تھے۔ دان ناتھ کو "اُپکار" لفظ سے نفرت تھی۔ سیوا کو بھی وہ اتنا ہی قابلِ نفرت سمجھتے تھے۔ انھیں سیوا اور اپکار کے پردے میں صرف انانیت اور نام و نمود کی خواہش چھپی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ امرت رائے نے کچھ جواب نہ دیا۔ دان ناتھ کوئی جواب سننے کو تیار نہ تھے، انھیں گھر جانے کی عجلت تھی، پس انھوں نے اُٹھ کر ہاتھ بڑھا دیا، دان ناتھ نے ہاتھ ملایا اور رخصت ہوئے۔

ماگھ کا مہینہ تھا اور اندھیرا پاکھ، اس پر کچھ ابر بھی محیط تھا۔ سڑک پر لالٹین جل رہی تھیں۔ دان ناتھ کو اس وقت کانپتے ہوئے سائیکل پر چلنا ناگوار معلوم ہورہا تھا، موٹر

اور تانگے سڑک پر دوڑ رہے تھے۔ کیا انھیں اپنی زندگی میں سواری رکھنا نصیب ہی نہ ہوگا۔ انھیں ایسا معلوم ہوا کہ ان کی ہمیشہ یہی حالت رہی، جب پڑھتے تھے تب بھی تو آخر کھانا کھاتے ہی تھے، کپڑے پہنتے ہی تھے، اب کھانے پہننے کے سوا وہ اور کیا کرلیتے ہیں؟کون سی جائداد خرید لی؟ کون سا عیش و عشرت کا سامان جمع کرلیا ہے؟ اور اس پر آپ فرماتے ہیں کہ تم موٹے ہوگئے ہو، باپ کی کمائی ہے۔ مزے سے اڑا دیتے ہیں، ورنہ آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوجاتا، اُپکار اور سیوا سب دھری رہ جاتی ہے۔ گھر پہنچے تو پریما نے پوچھا۔ ''آج بڑی دیر لگائی، کہاں چلے گئے؟ دیر کرکے آنا ہو تو کھانا کھا جایا کرو۔''

دان ناتھ نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تو بہت دیر نہیں ہوئی ابھی نو نہیں بجے۔ ذرا امرت رائے کے یہاں چلا گیا تھا۔ عجیب آدمی ہیں جو بات سوجھتی ہے بے تکی، اپنے پاس جتنے روپے تھے وہ اینٹ پتھر میں اڑا دیے۔ جب چندے کی فکر سوار ہے۔ اب اور لیڈروں کی طرح ان کی زندگی بھی چندے ہی پر بسر ہوگی۔''

پریما نے اس کا کچھ جواب نہ دیا، ہاں میں ہاں ملانا نہ چاہتی تھی۔ مخالفت کرنے کی جرأت نہ تھی۔ بولی۔ ''اچھا چل کر کھانا تو کھالو۔ مہراجن کب سے بھن بھنا رہی ہیں کہ یہاں بڑی دیر ہوجاتی ہے۔ کوئی اس کے مکان کا قفل توڑ دے تو کہیں کی نہ رہے۔''

دان ناتھ کو اس وقت کھانا کھانے کی اتنی عجلت نہ تھی، جتنی پریما کے جواب سننے کی خواہش۔ آج بہت دنوں کے بعد انھیں اس کے امتحان لینے کا نادر موقع ملا تھا اور کوٹ کے بٹن کھولنے کا بہانہ کرتے ہوئے بولے۔ مجھے تو اگر چندوں پر بسر کرنا پڑے تو ڈوب مروں۔

''رئیسوں سے کالج کے لیے دو ایک مرتبہ چندہ مانگنے کا مجھے تجربہ ہے۔ گھنٹوں ان کی خوشامد کیجیے، دھرما وتار جو کہتے ہیں سچ ہے۔ بس یہ کرنا پڑتا ہے۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ کتوں کی طرح دھتکارے جاتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ جب تک کسی کے پاس کافی روپے نہ ہو کوئی کام شروع ہی کیوں کرے مگر یہاں تو نام کی ہوس مارے ڈالتی ہے بس میرا بھی نام ہوجائے، میں بھی خون لگا کر شہیدوں میں داخل ہوجاؤں، جہاں جاؤں میرا بھی جلوس نکلے۔ پھولوں کی برکھا ہو، کالجوں کے لڑکے گاڑی کھینچیں۔ حیادار آدمی تو اسے کبھی پسند نہ کرے گا کہ دوسروں کے دان پر مزے اُڑائے۔ آپ کو کنہیا بننے کی دُھن ہے۔

دس بیس نوجوان بیواؤں کو ادھرادھر سے جمع کر کے راس لیلا رچائیں گے۔ چار دیواری کے اندر کون دیکھتا ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔"

دان ناتھ دل میں امرت رائے کو اتنا کمینہ نہ سمجھتے تھے، ہرگز نہیں، انھوں نے صرف پریما کو چھیڑنے کے لیے یہ سوانگ رچا تھا۔ پریما بڑے شش و پنج میں پڑگئی۔ امرت رائے کی یہ ہجو اسے ناگوار تھی۔ ان کے متعلق اب بھی اس کے دل میں عقیدت تھی۔ دان ناتھ کے خیالات اتنے پوچ ہیں، اس کا اسے گمان بھی نہ تھا۔ بڑی بڑی حقارت بھری آنکھوں سے دیکھ کر بولی۔ "میں سمجھتی ہوں کہ امرت رائے کے ساتھ سخت نا انصافی کر رہے ہو، ان کا دل صاف ہے۔ اس میں مجھے ذرا بھی شبہہ نہیں، وہ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں اس سے سماج کا بھلا ہوگا، یا نہیں یہ تو دوسری بات ہے مگر ان کے بارے میں ایسے الفاظ زبان سے ادا کر کے تم اپنے دل کو ہلکاپن دکھا رہے ہیں۔"

دان ناتھ سناٹے میں آگئے۔ ان کے دل نے کہا۔ نکلی نہ وہی بات یہ تو میں پہلے ہی کہتا تھا۔ اگر پریما کا امرت رائے سے کوئی واسطہ نہ ہوتا۔ اگر پریما کے بجائے کوئی دوسری عورت ہوتی تو کیا وہ اتنے تیز الفاظ میں ان کی مخالفت کرتی؟ کبھی نہیں، اس کی آنکھوں سے تو چنگاریاں نکلنے لگیں۔ نتھنے پھڑکنے لگے۔ یہ میری کبھی نہ ہوگی۔ کبھی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میری باتیں اس کے دل میں چبھ گئیں۔ نرم الفاظ میں تو مجھ سے اختلاف کر سکتی تھی۔ خیر دیکھو اور کیا گل کھلتا ہے۔ بولے "مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم امرت رائے کو دیوتا سمجھ رہی ہو حالانکہ دیوتا بھی پھسلتے دیکھے گئے ہیں۔"

پریما نے عاجزی سے کہا "میں انھیں دیوتا نہیں سمجھتی مگر جانور بھی نہیں سمجھتی اگر انھیں بُری خواہش ہی نے ستایا تھا تو کیا وہ اپنا بیاہ نہیں کر سکتے تھے۔"

دان ناتھ۔ تو پھر لیڈر کیسے بنتے؟ ہم جیسوں کی صف میں نہ آجاتے۔ اپنے تیاگ کا سکہ عوام کے دلوں پر کیسے بٹھاتے؟

پریما۔ اچھا بس کرو، مجھ پر دَیا کرو، ایسی باتیں اوروں سے کیا کرو۔ میں نہیں سن سکتی۔ میں مانتی ہوں کہ انسان بھول چوک کا پتلا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ آگے چل کر امرت رائے بھی معیار سے گر جائیں۔ بُرے راستہ پر چلنے لگیں مگر یہ کہنا کہ وہ اسی نیت سے سارا کام کر رہے ہیں، کم از کم تمھارے مُنہ سے اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

رہی چندہ کی بات جو اپنا سب کچھ دے ڈالتا ہے اسے چندہ وصول کرنے میں دقت نہیں ہوتی۔ لوگ خوشی سے اس کو چندہ دیتے ہیں۔ چندے انھیں کو نہیں ملتے ہیں، جن کے بارے میں لوگوں کو شبہ ہوتا ہے۔ اتنے میں بوڑھی ماں آکر کھڑی ہوگئی۔

دان ناتھ نے پوچھا۔ "کیا ہے ماں جی؟"

ماں۔ تم دونوں میں جھگڑا کیوں ہورہا ہے؟

دان ناتھ نے ہنس کر کہا "یہی مجھ سے لڑ رہی ہیں۔ اماں میں تو بولتا بھی نہیں۔"

پریما۔ سچ کہیے گا اماں جی، کون زور سے بول رہا تھا۔ یہ کہ میں؟

ماں۔ بہو زور سے تو تم ہی بول رہی ہو۔ یہ غریب تو بیٹھا ہوا ہے۔

پریما۔ ٹھیک کہتی ہیں، آپ۔ اپنے لڑکے کو کون بُرا کہتا ہے، میری ماں ہوتیں تو میری ڈگری ہوتی۔

دان ناتھ۔ اماں جی میں یہی تو وصف ہے کہ وہ سچ بولتی ہیں۔ تمھیں شرمانا چاہیے۔

ماں۔ تجھے بھوک لگی ہے کہ نہیں، چل کر کھانا کھالے تو پھر جھگڑنا، مجھ سے تو اب نہیں رہا جاتا۔ یہ روگ بڑھاپے میں اور لگا۔

دان ناتھ۔ تم نے کھانا کیوں نہ کھا لیا؟ میں تو دن میں دس مرتبہ کھاتا ہوں، میرا انتظار کیوں کرتی ہو؟ آج بابو امرت رائے نے بھی یہ کہہ ڈالا "تم ان دنوں بہت موٹے ہوگئے" ایک آدھ روز نہ بھی کھاؤں تو کوئی ہرج نہیں۔

ماں۔ کیا کہا امرت رائے نے کہ موٹے ہوگئے ہو؟ دل لگی کی ہوگی۔

دان ناتھ۔ نہیں اماں جی، سچ مچ کہتے تھے۔

ماں۔ کہتا تھا اپنا سر، موٹے ہوگئے ہیں! آدھا بدن بھی نہ رہا۔ آپ تو کوئل بنا پھرتا ہے نا، ویسا ہی دوسروں کو سمجھتا ہے، ایک دن بلاکر اسے کھانا وانا کیوں نہیں کھلا دیتے؟ تم نے ادھر اس کی دعوت نہیں کی، اسی سے چڑھا ہوا ہے، بھلا دیکھتی ہو بہو۔ امرت رائے کی بات۔

دان ناتھ موٹے چاہے نہ ہوگئے ہوں مگر ان میں کچھ تازگی ضرور تھی۔ چہرہ پر کچھ سرخی تھی، بدن بھی کچھ چکنا ہوگیا تھا۔ مگر یہ کہنے کی بات تھی، ماؤں کو تو

اپنے لڑکے ہمیشہ دُبلے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ مگر دان ناتھ بھی اس بارہ میں کچھ شکّی آدمی تھے۔ انھیں ہمیشہ کسی نہ کسی مرض کی شکایت رہا کرتی تھی کبھی کھانا ہضم نہیں ہوا، کھٹی ڈکاریں آرہی ہیں۔ کبھی سر میں چکر آرہا ہے کبھی پیروں کے تلووں میں جلن ہو رہی ہے۔ اس طرف یہ شکایتیں بڑھ گئی تھیں۔ کہیں باہر جاتے تو انھیں کوئی شکایت نہ ہوتی کیونکہ وہاں کوئی سننے والا نہ تھا۔ پہلے تنہا ماں کو سناتے تھے۔ اب ایک اور سننے والا مل گیا تھا۔ اس حالت میں اگر انھیں کوئی موٹا کہے تو یہ اس کی سراسر زیادتی تھی۔ پریما کو بھی ان کی خاطر کرنی پڑتی تھی، اس وقت دان ناتھ کو خوش کرنے کا اسے اچھا موقع مل گیا، بولی۔ ''ان کی آنکھوں میں سنیچر ہے، دیدی بے چاری ذرا موٹی تھیں، روز انھیں طعنے دیا کرتے، گھی مت کھاؤ، دودھ مت پیو، غرض پرہیز کراکرا کے انھیں مار ہی ڈالا۔ میں وہاں ہوتی تو لالہ کی خبر لیتی۔''

ماں۔ اچھا بدن ہے اس کا۔

دان ناتھ۔ اچھا نہیں، پتھر ہے! بلغم بھرا ہوا ہے، مہینہ بھر ورزش کرنا چھوڑ دیں تو اُٹھنا بیٹھنا مشکل ہو جائے۔

پریما۔ موٹا آدمی تو مجھے نہیں اچھا لگتا۔ بدن سڈول اور بھرا ہوا ہو۔ موٹا کس کام کا؟

دان ناتھ۔ میرے ساتھ کھیلتے تھے تو رُلا رُلا مارتا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد دان ناتھ بڑی دیر تک پریما کی باتوں پر غور کرتے رہے۔ پریما نے پیچھے سے زخم پر مرہم رکھنے والی باتیں کرکے انھیں کچھ ٹھنڈا کر دیا تھا۔ انھیں اب معلوم ہوا کہ پریما نے جو کچھ کہا اس کے سوا وہ اور کچھ کہہ ہی نہیں سکتی تھی۔ انھوں نے کملا پرشاد کے منہ سے جو باتیں سنی تھیں وہی کہہ ڈالی تھیں۔ خود ان باتوں کو تولا نہ پرکھا۔ کملا پرشاد کی باتوں کا انھیں یقین کیوں ہوگیا، یہ ان کی کمزوری تھی۔ حسد کانوں کا کچا ہے۔ رقیب کے بارے میں وہ سب کچھ سننے کو تیار رہتا ہے۔ اب دان ناتھ کو سوجھی کہ بہت ممکن ہے کملا پرشاد نے وہ باتیں خود ہی اختراع کی ہوں۔ یہی بات ہے! امرت رائے اتنے کمینے، ایسے کمزور بھی نہ تھے، اب پریما کی بہادرانہ مخالفت نے اس نشہ کو اور بھی تیز کردیا جو ان پر پہلے ہی سوار تھا۔ پریما جونہی کھانا کھا کر لوٹی اس سے معافی مانگنے لگے۔ ''تم مجھ سے ناراض

ہو گئیں کیا؟" پریما نے مسکرا کر کہا "بھلا تم نے میرا کیا بگاڑا تھا؟ ہاں میں نے بے ہودہ باتیں بک ڈالی تھیں۔ میں تم سے معافی مانگنے آئی ہوں۔"

مگر دان ناتھ جہاں مذاق پسند آدمی تھے وہاں کچھ ضدی بھی تھے۔ جس شخص کے پیچھے بیوی ہی کے ہاتھوں ان کی اتنی بڑی ذلت ہوئی اسے وہ سستا نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ ساری دنیا امرت رائے کی تعریف کرے انھیں کوئی پروا نہ تھی۔ وہ بھی وہی راگ الاپ سکتے تھے۔ وہ بھی تالیاں بجا سکتے تھے۔ مگر ان کی بیوی امرت رائے سے اتنی عقیدت رکھے اور صرف دل میں نہ رکھ کر اس کا ڈھنڈھورا پیٹتی پھرے، اس بات کی ذرا بھی پروا نہ کرے کہ اس کے شوہر پر کیا اثر پڑے گا۔ اسے وہ برداشت نہ کر سکتے تھے۔ امرت رائے اگر بول سکتے تھے تو دان ناتھ بھی بولنے کی مشق کریں گے اور امرت رائے کا غرور توڑ دیں گے، اس کے ساتھ ہی پریما کا بھی۔ وہ پریما کو دکھا دیں گے کہ جن اوصاف کے سبب تو امرت رائے کو قابلِ عقیدت سمجھتی ہے وہ اوصاف مجھ میں بھی ہیں اور ان سے زیادہ۔

اس طرح ایسے دوستوں میں باہمی منافرت کی ابتدا ہوئی جو بچپن کے ساتھی تھے۔ وہ دو آدمی جن کی دوستی کی مثال دی جاتی تھی، زمانہ کی طرفہ رفتار سے دو مخالفین کی صورت میں منتقل ہوئے۔ ایک ہفتہ تک دان ناتھ کالج نہ گئے۔ انھیں نہ کھانے کی سدھ تھی نہ نہانے کی۔ سارا دن کمرے کا دروازہ بند کیے ہندو دھرم کی حفاظت کے متعلق ایک دل ہلا دینے والی تقریر کی تیاری میں مصروف رہے۔ تنہائی میں سامنے آئینہ رکھ کر کئی بار پورا لکچر دے ڈالا۔ لکچر دیتے ہوئے اپنی زبان کی روانی پر انھیں خود حیرت ہوتی تھی۔ ساتویں روز شہر میں نوٹس تقسیم ہوگئے۔ "سناتن دھرم پر چوٹ" اس پر مہاشے دان ناتھ کا ٹاؤن ہال میں لکچر ہوگا۔ لالہ بدری پرشاد جلسہ کے صدر ہوں گے۔

پریما نے پوچھا۔ "کیا آج تمھارا لکچر ہے؟ تم تو پہلے کبھی نہیں بولے۔"

دان ناتھ نے ہنس کر کہا "ہاں آج امتحان ہے، امید تو ہے کہ لکچر بُرا نہ ہوگا۔"

پریما۔ مجھے تو تم نے سنایا ہی نہیں۔ میں بھی جاؤں گی۔ دیکھوں گی۔ دیکھوں تم کیا بولتے ہو۔

دان ناتھ۔ نہیں، تم وہاں رہوگی تو میں شاید نہ بول سکوں گا۔ تمھیں دیکھ دیکھ کر مجھے شرم آئے گی۔ میں نے ایسی کتنی باتیں لکھی ہیں جن پر میں کبھی عمل نہیں کرسکتا۔ لکچر سن کر لوگ سمجھیں گے کہ دھرم کا ایسا محافظ آج تک پیدا ہی نہیں ہوا۔ تمھارے سامنے اپنے دھرم کا سوانگ رچنے سے مجھے شرم معلوم ہوگی۔ دو ایک بار بولنے کے بعد جب میں غپ ہانکنے اور دیوتا بننے میں مشاق ہوجاؤں گا تو میں خود ہی تمھیں لے کر چلا کروں گا۔

پریما۔ لالہ جی نے تمھیں آخر اپنی طرف گھسیٹ ہی لیا۔

دان ناتھ۔ انھیں تو آج دوپہر تک خبر نہ تھی۔ مجھے خود بُرا لگتا ہے کہ اصلاح کے نام ہندو سماج میں وہ سب برائیاں سمیٹ لی جائیں جس سے مغرب والے اب خود عاجز آگئے ہیں۔ اچھوت ادھار کا چاروں طرف شور مچا ہوا ہے۔ کنوؤں پر آنے سے مت روکو، مندروں میں جانے سے مت روکو، مدرسے میں جانے سے مت روکو، اچھوت ادھار کے قبل اچھوتوں کو صفائی اور عمدہ چال چلن سکھانے کی کتنی ضرورت ہے۔ اس کی طرف کسی کا دھیان نہیں۔ بس انھیں جلدی سے ملا لو، ورنہ یہ عیسائی یا مسلمان ہوجائیں گے۔ ایسی بھرشٹ اور نیچ ذاتوں کو ملاکر مسلمان یا عیسائی ہی کیا بھنا لیں گے؟ لاکھوں چمار عیسائی ہوگئے ہیں۔ صوبہ مدراس میں تو گاؤں کے گاؤں عیسائی ہوگئے مگر ان کے طور و طریق اب بھی وہیں ہیں۔ بھوت پوجنے کا ان میں اب بھی وہی رواج ہے۔ بجز اس کے کہ اب وہ شراب زیادہ پینے لگے ہیں۔ چائے کے غلام ہوگئے ہیں اور انگریزوں کے اتارے کوٹ پتلون پہنتے ہیں۔ان میں اور کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ عیسائی قوم ان سے اور بدنام ہوئی ہے، نیک نام نہیں۔ اسی طرح انھیں ملاکر مسلمان بھی کوئی بڑی فتح حاصل نہ کرسکیں گے۔ بھنگیوں کے ساتھ نماز پڑھ لینے سے یا ان کے ہاتھ کا پانی پی لینے سے کوئی قوم طاقتور ہوسکتی تو آج مسلمانوں کی ساری دنیا پر حکومت ہوتی، مگر آج جدھر دیکھیے ادھر ہندوؤں ہی کی طرح وہ بھی اپنی قسمت کو رو رہے ہیں۔ لے دے کر خود مختار اسلامی حکومت میں ایک ٹرکی رہ گیا ہے وہ بھی اس لیے کہ یورپین سلطنتوں میں باہمی تقسیم کے متعلق ابھی نا اتفاقی ہے۔ میں کم از کم اتنا فراخ دل ضرور ہوں جتنا امرت رائے

ہیں لیکن جو چمار مردہ جانور کھاتا ہے، رات دن چمڑے کے دھونے بنانے میں لگا رہتا ہے، اس کا برتن کنوئیں میں کبھی نہ جانے دوں گا۔ امرت رائے کی میں نے خوب چٹکی لی ہے۔"

پریما نے دبی زبان سے کہا۔ اب تک وہ تمھیں اپنا مددگار سمجھتے تھے۔ یہ نوٹس پڑھ کر متعجب ہوگئے ہوں گے۔ دان ناتھ نے ناک سکوڑ کر کہا "میں ان کا مددگار کبھی نہ تھا، سدھار کے جھگڑوں میں کبھی نہیں پڑا۔ میں پہلے بھی کہتا تھا اور اب بھی کہتا ہوں کہ دنیا کو اپنے ڈھنگ پر چلنے دو۔ وہ اپنی ضرورتوں کو خود جانتی ہے وقت آئے گا تو سب آپ ہی ہو رہے گا۔ اب چلتا ہوں کسی دیوتا کی منت مان دو کہ یہ کامیاب ہوئے تو سوا سیر لڈو چڑھاؤں گی۔"

پریما نے مسکراکر کہا۔ "اچھا۔"

دان ناتھ۔ نہیں! ابھی میرے سامنے تمھیں گاتے بجاتے مندر تک جانا پڑے گا۔

لکچر ہوا اور ایسے معرکہ کا ہوا کہ سارے شہر میں دھوم ہوگئی۔ پہلے دس منٹ تک تو دان ناتھ ہچکتے رہے۔ مگر رفتہ رفتہ ان کی زبان میں طاقت اور روانی آتی گئی۔ وہ اپنے ہی لفظوں کے نغمے میں محو ہوگئے۔ پورے دو گھنٹے سے ساری مجلس بت بنی بیٹھی رہی جب لکچر ختم ہوا تو لوگوں کو ایسا معلوم ہورہا تھا کہ گویا ان کی آنکھیں کھل گئیں! یہ حضرت تو چھپے رستم نکلے۔ کتنی علمیت ہے، کتنی قابلیت ہے، ساری مذہبی کتابوں کو متھ کر رکھ دیا ہے۔ جب دان پلیٹ فارم سے اُترے تو لوگوں نے دان ناتھ کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور اپنی عقیدت کے پھول برسانے لگے۔ دان ناتھ کو ایسی بڑی خوشی اپنی زندگی میں کبھی نہ حاصل ہوئی تھی۔

رات کے آٹھ بج گئے تھے۔ دان ناتھ پریما کے ساتھ بیٹھے ہوئے دون کی ہانک رہے تھے۔ "سچ کہتا ہوں کہ کوئی دس ہزار آدمیوں کا مجمع تھا مگر کیا مجال کہ کسی آدمی کے کھانسنے کی آواز بھی آئی ہو۔سب بُت بنے بیٹھے تھے۔ تم کہو گی یہ غپ اڑا رہا ہے مگر میں نے لوگوں کو کبھی اس قدر محو نہیں دیکھا۔"

دفعتاً ایک موٹر دروازہ پر آیا اور اس میں سے کون اُترا؟ امرت رائے۔ ان کی جانی ہوئی آواز دان ناتھ کے کانوں میں آئی۔ "سوامی جی ذرا باہر تو آیئے یا اندر ہی

جمے رہیے گا؟ آیئے۔ ذرا آپ کی پیٹھ ٹھونکوں۔ سر سہلاؤں، کچھ انعام دوں۔"

دان ناتھ نے چونک کر کہا۔ "امرت رائے ہیں! آج کہاں سے ٹپک پڑے؟ ذرا پان بھیجوا دینا۔"

بیاہ کے بعد آج امرت رائے پہلی مرتبہ دان ناتھ کے گھر پر آئے تھے۔ پریما تو ایسا گھبرائی گئی گویا دروازے پر بارات آگئی ہو۔ اس کے منہ سے آواز بھی نہ نکلتی تھی۔ خوف ہوتا تھا کہ کہیں امرت رائے اس کی آواز نہ سن لیں، اشارے سے مہری کو بلایا اور پان دان منگا کر پان بنانے لگی۔

ادھر دان ناتھ باہر نکلے تو امرت رائے کے سامنے آنکھیں نہ اُٹھتی تھیں۔ مسکرا تو رہے تھے مگر صرف اپنی جھینپ مٹانے کے لیے، امرت رائے نے گلے لگتے ہوئے کہا۔ "آج تو یار، تم نے کمال کر دکھایا۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی ایسا لکچر نہ سنا ہوگا۔"

دان ناتھ پچھتائے کہ یہ بات پریما نے نہ سنی۔ شرماتے ہوئے بولے۔"اجی دل لگی تھی، میں نے کہا ذرا یہ تماشا بھی کر دیکھوں۔"

امرت۔ دل لگی تھی بھئی جادو تھا۔ تم نے آگ لگا دی۔ اب بھلا ہم جیسوں کی کون سنے گا؟ مگر سچ بتانا یار۔ یہ نعمت کس طرح تمھارے ہاتھ آگئی، میں تو دانت پیس رہا تھا۔ موقع ہوتا تو وہیں تمھاری مرمّت کرتا۔

دان۔ تم کہاں بیٹھے تھے؟ میں نے تمھیں نہیں دیکھا۔

امرت۔ سب سے پیچھے کی صف میں منہ چھپائے کھڑا تھا۔ آؤ ذرا تمھاری پیٹھ ٹھونک دوں۔

دان۔ جی نہیں معاف کیجیے آپ تو پیٹھ سہلائیں گے اور مجھے مہینہ بھر تک مالش کرانی پڑے گی۔ سچ کہنا۔ میں آگے چل کر بول سکوں گا؟

امرت۔ اب تو تم میرے ہاتھوں پٹو گے۔ تم نے پہلے ہی لکچر میں اپنا سکہ جما دیا۔ آگے چل کر تو شاید تمھارا جواب ہی نہ ملے گا۔ مجھے افسوس ہے تو یہی کہ ہم اور تم اب مخالف راستوں پر چلتے ہوئے نظر آئیں گے۔ مگر یار یہاں دوسرا کوئی نہیں ہے۔ کیا تم دل سے سمجھتے ہو کہ اصلاحات سے ہندو طبقے کو نقصان پہنچے گا؟ دان ناتھ نے سنبھل کر کہا۔ "ہاں بھئی، ادھر میں نے مذہبی کتب کا جو مطالعہ کیا ہے اس سے

میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں مگر بہت ممکن ہے کہ مجھے دھوکا ہوا ہو۔"

امرت۔ تو پھر ہماری اور تمھاری خوب چھنے گی۔ مگر ایک بات کا خیال رکھنا ہمارے معاشرتی اصولوں میں خواہ کتنا ہی فرق کیوں نہ ہو، پلیٹ فارم پر خواہ ایک دوسرے کو نوچ ہی کھائیں۔ مگر ہماری دوستی ویسی ہی بے لوث رہنی چاہیے۔ ہمارے خانگی تعلقات پر ان باتوں کی آنچ بھی نہ آنے پائے۔ مجھے اپنے اوپر تو بھروسا ہے۔ مگر تمھارے اوپر مجھے بھروسا نہیں۔ معاف کرنا مجھے اندیشہ ہے کہ تم ...."

ذان ناتھ نے بات کاٹ کر کہا۔ "اپنی طرف سے بھی تمھیں پورا یقین دلاتا ہوں، کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہمارے مذہبی جذبات کا ہماری دوستی پر اثر پڑے۔"

امرت رائے نے مشتبہ انداز سے کہا۔"تم کہتے ہو مگر مجھے تو یقین نہیں آتا۔"

دان۔ ثبوت مل جائے گا تب تو مانو گے۔

امرت۔ اور تو مکان میں سب خیریت ہے نا۔ اماں جی سے میرا پرنام کہنا۔

دان۔ اجی بیٹھو، اتنی جلدی کیا ہے؟ کھانا کھا کر جانا۔

امرت۔ کئی جگہ جانا ہے، اناتھالیہ کے لیے چندہ کی اپیل کرنی ہے۔ پہلے ذرا دس پانچ آدمیوں سے مل تو لوں۔ بھلے آدمی، مخالفت ہی کرنی تھی تو یتیم خانہ بن جانے کے بعد کرتے۔ تم نے راستے میں کانٹے بکھیر دیے ہیں۔

پریما ابھی پان ہی بنا رہی تھی اور امرت رائے چل دیے۔ دان ناتھ نے آکر کہا۔ واہ! ابھی تک پان ہی نہیں بنے اور وہ چل بھی دیے۔ آج مان گئے پریما۔ وہ بھی سننے گئے تھے؟

دان۔ ہاں پیچھے کھڑے تھے۔ سامنے ہوتے تو آج ان کی درگت ہوجاتی۔ اناتھالیہ کے لیے چندہ کی اپیل کرنے والے ہیں۔ مگر دیکھ لینا، کوڑی نہ ملے گی۔ ہوا بدل گئی، اب دوسرے کسی شہر سے چاہے چندہ وصول کر لائیں مگر یہاں تو ایک پائی نہ ملے گی۔

پریما۔یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟ پُرانے پنڈت چاہے سدھاروں کی مخالفت کریں مگر تعلیم یافتہ تو نہیں کرسکتا۔

دان۔ میں شرط لگا سکتا ہوں اگر انھیں پانچ ہزار بھی مل جائیں۔

پریما۔ اچھا انھیں کوڑی نہ ملے گی۔ جھگڑا کاہے کا؟ اب روپے لاؤ۔ کل پوجا کر آؤں۔ بھابی اور پورنا دونوں کو بلاؤں گی۔ کچھ محلے کی عورتیں۔ دس بیس برہمنوں کو بھوجن کرانا بھی ضروری ہوگا۔

دان۔ یہاں دیوتاؤں کے ایسے بھگت نہیں ہیں۔ یہ پانچ آنے پیسے ہیں سوا پاؤ لڈو منگا لو، چلو چھٹی ہوئی۔

پریما۔ رام جانے، تم نیت کے بڑے کھوٹے ہو۔ بھینس سے چیونٹی والی مثل کروگے کیا؟ شام کو سوا سیر کہا تھا، اب سوا پاؤ پر آگئے۔ میں نے سوا من کی منت مانی ہے۔

دان۔ سچ؟ مار ڈالا، میرا تو دیوالہ ہی نکل جائے گا۔

کملا پرشاد نے مکان میں قدم رکھا۔ پریما نے ذرا گھونگھٹ آگے کھینچ لیا۔ اور سر جھکا کر کھڑی ہوگئی۔ کملا نے پریما کی طرف تاکا بھی نہیں۔ دان ناتھ سے بولے۔''بھائی صاحب! تم نے آج دشمنوں کی آواز بند کردی، سب کے سب گھبراے ہوئے ہیں۔ آج مزہ تو جب آئے کہ چندہ کی اپیل خالی جائے۔ ایک کوڑی بھی نہ ملے۔''

دان۔ ان لوگوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ زیادہ نہیں تو بیس پچیس ہزار تو مل ہی جائیں گے۔

کملا۔ کون، اگر پانچ سو سے زیادہ پاجائیں تو مونچھ منڈوا ڈالوں، بنارس میں منہ نہ دکھاؤں۔ ابھی ایک ہفتہ باقی ہے۔ گھر گھر جاؤں گا، والد صاحب مقابلہ کے لیے کمربستہ ہوگئے ہیں۔ دونوں پہلے ہی سے سوچ رہے تھے کہ ان کافروں کا رنگ پھیکا کرنا چاہیے۔ مگر کوئی اچھا بولنے والا نظر نہ آتا تھا۔ اب آپ کی مدد سے تو ہم سارے شہر کو ہلا سکتے ہیں۔ ابھی ایک ہزار لٹھ بند تیار ہیں۔ پورے ایک ہزار! جس دن حضرت کی اپیل ہوگی۔ چاروں طرف کے راستے بند کردیے جائیں گے۔ کوئی جانے بھی نہ پائے گا۔ بڑے بڑوں کو ہم لوگ ٹھیک کرلیں گے۔ اوروں کے لیے لٹھ بند کافی ہیں۔ زیادہ تر تعلیم یافتہ لوگ ہی تو ان کے مددگار ہیں، تو ایسے لوگ لڑائی جھگڑے کے قریب نہیں پھٹکتے۔ ہاں کل ایک لکچر تیار رکھیے گا۔ اس سے بڑھ کر ہو۔ ادھر ان کا جلسہ ہو۔ اسی وقت ادھر ہمارا جلسہ بھی ہو۔ پھر دیکھیے کیا گل کھلتا ہے۔دان ناتھ نے

کہا۔ ”آپ کو معلوم نہیں کہ حکام سب ان کی طرف ہیں۔ حاکم ضلع نے تو زمین دینے کا وعدہ کیا ہے۔“ کملا پرشاد حاکمِ ضلع کا نام سن کر ذرا سہم گئے۔ کچھ سوچ کر بولے۔”حکام ان کی پیٹھ بھلے ٹھونک دیں۔ مگر روپے دینے والے آدمی نہیں ہیں، پائیں تو اُلٹا بابو صاحب ہی کو مونڈ ڈالیں۔ ہاں کلکٹر صاحب کا معاملہ ذرا بے ڈھب ہے۔ مگر کوئی بات نہیں۔ دادا جی سے کہتا ہوں کہ آپ شہر کے دس پانچ بڑے بڑے رئیسوں کو لے کر بڑے صاحب سے ملیے اور انھیں سمجھائیے کہ اگر آپ اس معاملے میں کچھ دست اندازی کریں گے تو شہر میں بلوہ ہوجائے گا۔“ یہ کہتے ہوئے کملا نے پریما سے پوچھا۔ ”تم کس جانب ہو، پریما۔“

پریما یہ باتیں سن کر پہلے سے بھری بیٹھی تھی۔ یہ سوال چنگاری کا کام کر گیا مگر کہتی کیا، دل میں اینٹھ کر رہ گئی۔ بولی۔ ”میں ان جھگڑوں میں نہیں پڑتی۔ آپ جانیں اور وہ جانیں۔ میں دونوں طرف کا تماشا دیکھوں گی۔ کہیے، اماں جی تو خیریت سے ہیں۔ بھابی جی آج کل کیوں روٹھی ہوئی ہیں؟ میرے پاس کئی دن ہوئے ایک خط بھیجا تھا میں بہت جلد مائیکے چلی جاؤں گی۔“

کملا۔ ابھاگوں کے لیے دوزخ میں بھی جگہ نہیں ملتی۔ ایک درجن چٹھیاں تو لکھ چکی ہیں مگر مائیکے والوں میں کوئی بات بھی نہیں پوچھتا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ چاہتی کیا ہیں۔ رات دن جلا کرتی ہیں۔ شاید ایشور نے انھیں جلنے ہی کے لیے بنایا ہے۔ میں ایک دن خود ہی مائیکے پہنچائے دیتا ہوں۔ انھیں مزہ تب آئے جب روپے کی تھیلی دے دوں اور پوچھوں کچھ نہ۔ ان کا جس طرح جی چاہے خرچ کریں۔ سو یہاں اپنے باپ کا بھی اعتبار نہیں کرتے پھر وہ کیا چیز ہیں۔

کملا چلا گیا۔ دان ناتھ بھی ان کے ساتھ باہر آئے اور دونوں بڑی دور تک باتیں کرتے ہوئے چلے گئے۔

دفعتاً کملا نے رُک کر کہا۔ ”ساڑھے نو بج رہے ہیں۔ چلو سنیما دیکھ آئیں۔“

دان۔ اِس وقت! کم از کم ایک بجے تک ہوگا۔ نہیں صاحب آپ جائیں! میں جاتا ہوں۔

کملا نے دان ناتھ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ ”اجی چلو بھی وہیں ہوٹل میں بیٹھ کر کھالیں گے۔ تمھیں منیجر سے ملائیں گے۔ بڑا یارباش آدمی

ہے اسی کے مکان میں کھانا بھی کھائیں گے۔"

دان۔ نہیں بھائی صاحب، معاف کیجیے۔ بے چاری عورتیں میرے انتظار میں بیٹھی رہیں گی۔

کملا۔ اچھا اگر ایک روز بارہ بجے تک بیٹھی رہیں گی تو کون مری جاتی ہیں۔ عورتوں کو بہت سر چڑھانا اچھا نہیں ہوتا۔

دان ناتھ نے دو چار مرتبہ منع کیا مگر کملا نے نہ چھوڑا۔ دونوں منیجر کے مکان میں کھانا کھایا اور سنیما ہال میں جا بیٹھے۔ مگر دان ناتھ کو ذرا بھی لطف نہ آتا تھا۔ ان کا دل مکان پر لگا ہوا تھا۔ پریما بیٹھی اپنے دل میں کیا کہتی ہوگی؟ گھبرا رہی ہوگی۔ بُرا پھنسا۔ کملا بیچ بیچ میں کہتا جاتا تھا۔ "یہ دیکھو چیپلن آیا۔ واہ کیا کہنا ہے۔ پٹھے تیرے دم کا ظہور ہے، ارے یار کدھر دیکھ رہے ہو۔ ذرا اس عورت کو دیکھو، سچ کہتا ہوں کہ اگر یہ مجھے پانی بھرنے کو نوکر رکھ لے تو راضی ہوجاؤں! واہ ایسی ایسی پریاں بھی دنیا میں ہیں۔ ایک ہمارا ملک منحوس ہے! تم تو سو رہے ہو؟

"جی۔"

بڑی مشکل سے وقفہ پڑا۔ کملا تو پان اور سگریٹ لینے گئے، دان ناتھ نے دوسرے دروازے سے نکل کر گھر کی راہ لی۔

پریما نے کہا۔ "بڑی جلدی لوٹے، ابھی گیارہ ہی تو بجے ہیں!"

دان۔ کیا کہوں تمھارے بھائی صاحب پکڑ لے گئے۔

پریما نے تنک کر کہا۔"جھوٹ مت بولو، بھائی صاحب پکڑ لے گئے۔ انھوں نے کہا ہوگا چلو جی ذرا سنیما دیکھ آئیں۔ تم نے ایک بار تو نہیں کی ہوگی، پھر چپکے سے چلے گئے ہوگے۔ جانتے تو تھے ہی کہ لونڈی بیٹھی رہے گی۔"

دان۔ ہاں قصور تو میرا ہی ہے۔ میں نہ جاتا تو وہ مجھے گود میں نہ لے جاتے مگر مروت نہ توڑ سکا۔

پریما۔ جی، ایسے ہی بڑے مروت دار تو ہیں، آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ وہاں کی بہار دیکھنے کو جی للچا اُٹھا۔

دان۔ کہہ لو جو چاہو مگر مجھ پر زیادتی کر رہی ہو۔ میں قید سے چھوٹ کر بھاگا ہوں۔ بس اتنا ہی سمجھ لو۔ اماں جی بھی بیٹھی ہیں؟

پریما۔ انھیں تو میں نے کھلا کر سلا دیا۔ اس وقت جاگتی ہوتیں تو تم سے ڈنڈوں سے باتیں کرتیں۔ ساری شرارت بھول جاتے۔

دان۔ تم نے بھی کیوں نہ کھا لیا؟

پریما۔ سکھا رہے ہو تو وہ بھی سیکھ لوں گی۔ بھیا سے میل ہوا ہے تو میری دشا بھی بھابی کی سی ہو کر رہے گی۔

دان ناتھ اس پُر اسرار محبت سے نہال ہوگئے۔ انھوں نے پریما کو گلے لگا کر کہا۔ ''نہیں پریما۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب تمھیں ایسی شکایت کا موقع کبھی نہ دوں گا۔ چل کر کھانا کھالو۔''

پریما۔ اور تم؟

دان۔ میں تو کھا آیا۔

پریما۔ تو میں بھی کھاچکی۔

دان۔ دیکھو پریما! دق نہ کرو، میں سچ کہتا ہوں، خوب شکم سیر ہو کر کھا آیا ہوں۔

پریما نے نہ مانا۔ دان ناتھ کو کھلا کر ہی چھوڑا، تب خود کھایا۔ دان ناتھ آج بہت خوش تھے۔ جس مسرت کی، جس غیر مشتبہ مسرت کی ان کے تخیل میں جگہ تھی اس کا آج قدرے ظہور ہو رہا تھا۔ ان کا دل کہہ رہا تھا۔ ''میں ناحق اس پر شبہ کرتا ہوں۔ پریما میری ہے، ضرور میری ہے۔ امرت رائے کے خلاف آج میں نے اتنی باتیں کیں اور کہیں پھر بھی تیور پر بل نہیں پڑے۔ آج آٹھ مہینے کے بعد دان ناتھ کو زندگی کی سچی خوشی کا احساس ہوا۔

پریما نے پوچھا۔ ''کیا سوچتے ہو؟''

دان۔ سوچتا ہوں کہ مجھ سے زیادہ خوش قسمت دنیا میں کون ہوگا؟

پریما۔ میں تو ہوں۔

دان۔ تم دیوی ہو۔

پریما۔ اور تم میرے دل و جان کے مالک۔

چھ روز گزر گئے۔ کملا پرشاد اور اس کے احباب روز مرّہ آتے اور شہر کی خبریں سنا جاتے ہیں۔ کن کن روٗسا کو توڑا گیا۔ کن کن محلوں پر دھاوا ہوا۔ کس کس

کچہری، کس کس دفتر پر چڑھائی ہوئی۔ یہ رپورٹ دان ناتھ کو سنائی۔ آج یہ بھی معلوم ہوگیا کہ صاحب بہادر نے امرت کو زمین دینے سے انکار کردیا۔ اینٹ پتھر اپنے مکان میں بھر رکھے ہیں۔ بس کالجوں کے تھوڑے طلبہ رہ گئے ہیں سو ان کا کیا ہوسکتا ہے۔ دان ناتھ ان خبروں کو پریما سے چھپانا چاہتے تھے۔ مگر کملا پرشاد کو کب چین آتا تھا۔ وہ جاتے وقت مختصر رپورٹ اسے بھی سنا دیتے تھے۔

ساتویں روز کملا پرشاد اپنے اور کتنے ساتھیوں کے ساتھ آئے اور بولے "چلو ذرا باہر کا ایک چکر لگا آئیں۔"

دان ناتھ نے بے پروائی سے کہا۔ "مجھے لے کر کیا کروگے۔ آپ لوگ تو ہیں ہی۔"

کملا۔ اجی نہیں! ذرا چل کر رنگ تو دیکھو۔ ایک ہزار آدمی ایسے تیار کر رکھے ہیں جو امرت رائے کی تقریر سننے کے بہانے سے جائیں گے اور وہاں اس قدر شور مچائیں گے کہ لالہ صاحب تقریر ہی نہ کرسکیں گے۔ ٹائیں ٹائیں فش ہو کر رہ جائے گا۔ دو تین سو آدمیوں کو سکھا رکھا ہے کہ ایک ایک پیسہ چندہ دے کر چلے آئیں۔ ذرا چل کر ان سبھوں کی باتیں سنو۔

دان۔ ابھی میری اسپیچ تیار نہیں ہوئی ہے۔ ادھر گیا تو پھر ادھوری ہی رہ جائے گی۔

کملا۔ واہ واہ، وا۔ اتنے دنوں تک کیا کرتے رہے۔ بھلے آدمی! اچھا جلدی سے لکھ لکھا لو۔ یہ کہتے ہوئے کملا پرشاد اندر چلے گئے۔ پریما آج کی رپورٹ سننے کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔ بولی۔ "آیئے بھیا جی! آج تو مقابلہ کا دن ہے۔"

کملا۔ (مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے) کیسا مقابلہ؟ (چٹکی بجا کر) یوں اُڑا دوں گا۔

پریما۔ مار پیٹ تو نہ ہوگی؟

کملا۔ مار پیٹ کی ضرورت ہی نہ پڑے گی۔ ہاں وہ لوگ چھیڑیں گے تو اس کے لیے بھی تیار ہیں۔ ان کے جلسے میں ہمارے ہی آدمی زیادہ ہوں گے، اس کا بندو بست کر لیا گیا ہے۔ اسپیچ ہونے ہی نہ پائے گی۔ رئیس تو ایک بھی نہ جائے گا۔ ہاں دو چار بگڑے ہوئے جو امرت رائے کے دوست ہیں وہ ضرور پہنچ جائیں گے۔ مگر ان سے کیا ملنا ہے؟ دینے والے تو سیٹھ ساہوکار ہیں۔ انھیں ہم نے پہلے ہی گانٹھ لیا ہے۔

پریما کو بڑی تشویش ہوئی۔ جہاں اتنے حریف جمع ہوں گے وہاں جھگڑا ہونا بہت ممکن ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جہلا ان پر ٹوٹ پڑیں؟ کیا انھیں ان باتوں کی خبر نہیں ہے، سارے شہر میں جس بات کا چرچا ہو رہا ہے، کیا وہ ان کے کانوں تک نہ پہنچی ہوگی؟ ان کے بھی تو کچھ نہ کچھ مددگار ہوں گے۔ پھر وہ کیوں اس جلسہ کو ملتوی نہیں کراسکتے؟ کیوں اپنی جان کے دشمن ہوئے ہیں؟ آج ان لوگوں کو جلسہ کرنے دیں، جب یہ لوگ ذرا ٹھنڈے پڑجائیں تو دو چار ماہ بعد اپنا جلسہ کریں مگر وہ بھی تو ضدی آدمی ہیں۔ آگ میں کودنے کا تو گویا انھیں مرض ہے۔ کیا میرے سمجھانے سے وہ مان جائیں گے؟ کہیں ایسا تو نہ سمجھیں گے کہ یہ بھی اپنے شوہر کی طرف داری کر رہی ہے؟ دو تین گھنٹے تک پریما اسی تشویش میں مبتلا رہی۔ کوئی بات طے نہ کرپائی تھی۔ دو تین بار خط لکھنے بیٹھی مگر یہ سوچ کر رہ گئی کہ خط انھیں نہ ملا تو؟ ممکن ہے وہ گھر پر نہ ہوں، آدمی انھیں کہاں کہاں کھوجتا پھرے گا؟ چار بجے دان ناتھ اپنے غول کے ساتھ اپنے جلسہ میں شریک ہونے چلے۔ پریما کو اس وقت اپنی حالت پر رونا آیا۔ یہ دونوں دوست جن میں گہری محبت تھی، آج ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے ہیں اور میرے سبب! امرت رائے سے پہلے میری جان پہچان نہ ہوتی تو آج ایسی لاگ ڈانٹ کیوں ہوتی؟ وہ دلی اضطراب کی حالت میں کبھی کھڑی ہوجاتی اور کبھی بیٹھ جاتی۔ اس کی ساری رقت، ساری نزاکت، ساری محبت، اسے امرت کو جلسہ میں جانے سے روکنے کے لیے ان کے گھر جانے کی ترغیب دینے لگی۔ اس کا نسوانی لحاظ ایک لمحہ کے لیے کافور ہوگیا، ایک مرتبہ اندیشہ ہوا کہ دان ناتھ کو بہت بُرا معلوم ہوگا۔ مگر اس نے اس اندیشہ کو ٹھکرا دیا۔ خوددارانہ غرور سے چہرہ چمک اُٹھا۔ میں کسی کی لونڈی نہیں ہوں، کسی کے ہاتھ اپنے اصول کو فروخت نہیں کرڈالا۔ محبت شوہر کے لیے ہے مگر عقیدت ہمیشہ امرت رائے کے لیے رہے گی۔ دفعتاً اس نے کہار کو بلاکر کہا۔ ''ایک تانگہ لاؤ۔''

ماں نے پوچھا۔ ''کہاں جاؤ گی بیٹی؟''

پریما۔ ذرا بابو امرت رائے کے مکان تک جاؤں گی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ آج فساد ضرور ہوگا۔ انھیں منع کردوں کہ جلسہ میں نہ جائیں۔

ماں۔ بڑی اچھی بات ہے بیٹی! میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گی، میری بات نہ ٹالے گا۔ جب ننھا سا تھا، جبھی سے میرے گھر آتا جاتا تھا۔ نہ جانے ایسی کیا بات پیدا ہوگئی کہ ان دونوں میں ایسی اَن بَن ہوئی۔ بہو، میں نے دو بھائیوں میں ایسی محبت نہ دیکھی۔

پریما۔ یہ سب بھیّا کا پڑھایا ہوا سبق ہے، انھیں ابتدا ہی سے بابو امرت رائے سے چڑھ ہے۔ ان کا عجیب مزاج ہے، ان سے زیادہ قابل و ہوشیار ہونا ایسا جرم ہے جسے وہ معاف نہیں کرسکتے۔

ماں۔ دانو بے چارہ بھولا ہے، ان کی باتوں میں آگیا۔

تانگہ آگیا۔ دونوں امرت رائے کے گھر چلیں۔ یہاں معلوم ہوا کہ وہ دس منٹ پہلے ٹاؤن ہال چلے گئے۔ پریما اب بڑے سوچ بچار میں پڑی۔ ٹاؤن ہال میں ہزاروں آدمی جمع ہوں گے، اور سب کے سب چھٹے ہوئے شہدے۔ وہاں جانا تو مناسب نہیں۔ مگر شاید جلسہ ابھی شروع نہ ہوا ہو اور امرت رائے سے دو چار باتیں کرنے کا موقع مل جائے۔ زیادہ سوچنے کا موقع نہ تھا۔ تانگے والے سے بولی۔ ''ٹاؤن ہال میں چلو، خوب تیز، تمھیں ایک روپیہ انعام دوں گی۔''

تانگے کا گھوڑا دن بھر کا تھکا ہوا تھا۔ کہاں تک دوڑتا۔ کوچوان بار بار چابک مارتا تھا۔ مگر گھوڑا صرف گردن ہلا کر رہ جاتا تھا۔ ٹاؤن ہال تک پہنچتے پہنچتے بیس منٹ لگ گئے۔ دونوں جلدی سے اُتر کر ٹاؤن حال کے اندر گئیں تو دیکھا کہ امرت رائے پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں اور سینکڑوں آدمی نیچے کھڑے شور مچا رہے ہیں۔ عورتوں کے لیے ایک طرف چقیں پڑی ہوئی تھیں۔ یہ دونوں بھی چق کی آڑ میں جاکر کھڑی ہوگئیں۔ مجمع اتنا تھا اور اتنے شہدے جمع تھے کہ پریما کو پلیٹ فارم کی طرف جانے کی ہمت نہ پڑی۔

امرت رائے نے کہا۔ ''معززین، براہِ کرم ذرا خاموش ہوجائیے۔ مجھے کوئی طولانی تقریر نہیں کرنی ہے۔ میں صرف دو چار باتیں آپ سے کہہ کر بیٹھ جاؤں گا......''

کئی آدمیوں نے چلا کر کہا۔ ''دھرم کا دشمن ہے۔''

امرت۔ کون کہتا ہے کہ میں دھرم کا دشمن ہو؟

کئی آوازیں۔ "اور کیا ہو تم؟ بتاؤ کون کون سے وید پڑھے ہو؟"

اس پر چاروں طرف سے تالیاں بج گئیں اور لوگوں نے شور مچا کر آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ امرت رائے نے پھر کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ کچھ لوگ یہاں جلسے کی کارروائی میں خلل ڈالنے کا ارادہ کرکے آئے ہیں۔ جن لوگوں نے انھیں سکھا پڑھا کر بھیجا ہے انھیں بھی جانتا ہوں۔"

اس پر ایک صاحب بولے۔"آپ کسی پر حملہ کیوں کرتے ہیں؟ اس کا نتیجہ بُرا ہوگا۔"

امرت رائے کی طرف والے ایک نوجوان نے بگڑ کر کہا۔ "آپ کو اگر یہاں رہنا ہے تو خاموشی کے ساتھ لکچر سنیے ورنہ حال سے چلے جایئے۔"

کئی آدمیوں نے لکڑیاں سنبھالتے ہوئے کہا۔ ہال کسی کے باپ کا نہیں ہے اگر کچھ گردہ رکھتے ہو تو اتر آؤ نیچے۔

امرت رائے نے زور سے کہا۔"کیا آپ لوگ فساد کرنے پر تلے ہوئے ہیں؟ یاد رکھیے اگر فساد ہوا تو اس کی ذمّے داری آپ پر ہوگی۔"

کئی آدمیوں نے چلا کر کہا۔ "تو کیا آپ ہمیں پھانسی پر چڑھادیں گے۔ آپ ہی کی ساری دنیا پر حکومت ہے؟ آپ ہی جرمنی کے قیصر ہیں۔"

اس پر چاروں طرف سے تالیاں بجیں اور قہقہوں نے ہال کی دیواریں ہلا دیں۔ ایک غنڈے نے جس کی آنکھیں بھنگ کے نشے میں چڑھی ہوئی تھیں آگے بڑھ کر کہا۔ "بیاکھیان پیچھے ہوئی۔ آؤ ہمار تمھار پہلے ایک پکڑ ہوئی جائے۔"

کالج کے ایک نوجوان نے آپے سے باہر ہوکر اس غنڈے کو اتنے زور سے دھکا دیا کہ وہ کئی آدمیوں کے سنبھالنے پر بھی نہ سنبھل سکا۔ پھر کیا تھا۔ سیکڑوں آدمی چھریاں لے لے کر پلیٹ فارم کی طرف لپکے۔ کالج کے سب طلبہ اول صف میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کا خون بھی گرم ہو رہا تھا۔ انھوں نے بھی کرسیاں اٹھائیں۔ امرت رائے بھی پلیٹ فارم سے اُتر آئے اور طلبہ کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگے مگر اس وقت کون کس کی سنتا تھا؟ قریب تھا کہ طرفین میں سخت فساد ہوجائے کہ دفعتاً ایک عورت پلیٹ فارم پر آکر کھڑی

ہوگئی۔ سبھی لوگوں کی توجہ مبذول ہوگئی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں اتنی عاجزی تھی، چراغ کی طرح چمکتے ہوئے چہرہ پر اتنی التجا تھی کہ کرسیاں اوپر اُٹھی رہ گئیں۔ ڈنڈے نیچے آگئے۔ ہرایک کے دل میں سوال اُٹھا، یہ عورت کون ہے؟ یہ موہنی مورت کہاں سے پیدا ہوگئی؟ سبھی متحیر ہوکر اس کی طرف تاکنے لگے۔

عورت نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''معززین! آپ کے سامنے آپ کی بہن، آپ کی ایک لڑکی کھڑی ہوئی آپ سے بھیک مانگ رہی ہے۔ اسے مایوس نہ کیجیے گا۔''

ایک بوڑھے بھلے آدمی نے پوچھا۔''آپ کون ہیں؟''

عورت۔ میں آپ کے شہر کے رئیس لالہ بدری پرشاد کی لڑکی ہوں اور اس ناتے سے آپ کی بہن اور بیٹی ہوں۔ ایشور کے لیے بیٹھ جایئے۔ بہن کو کیا اپنے بھائیوں سے اتنی التجا کرنے کا بھی حق نہیں ہے؟ یہ جلسہ آج اس لیے کیا گیا ہے کہ آپ سے اس شہر میں ایسا مکان بنانے کے لیے مدد مانگی جائے جہاں ہماری بے کس و بے یار و مددگار بہنیں اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کرتی ہوئی آرام سے رہ سکیں۔ کون ایسا محلّہ ہے جہاں ایسی دس پانچ بہنیں نہیں دیکھتے؟ کم از کم اس کا اندازہ تو کر ہی سکتے ہیں، وہ جدھر آنکھیں اُٹھاتی ہیں ، اُدھر ہی انھیں بھوت کھڑے دکھائی دیتے ہیں جو ان کی بے کسانہ حالت کو اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ ہماری لاکھوں بہنیں اسی طرح صرف زندگی بسر کرنے کے لیے گرجاتی ہیں۔ کیا آپ کو ان پر رحم نہیں آتا؟ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اگر ان بہنوں کو روکھی سوکھی روٹیوں اور موٹے جھوٹے کپڑوں کا بھی سہارا ہو تو وہ آخر وقت تک اپنے ننگ و ناموس کی حفاظت کرتی رہیں۔ عورت بہت ہی مجبوری کی حالت میں بدچلن ہوتی ہے۔ اپنی عزت سے زیادہ اسے دنیا کی کسی چیز پر فخر نہیں ہوتا، نہ وہ کسی چیز کو اتنی قیمتی سمجھتی ہے۔ آپ سبھی صاحبوں کی لڑکیاں اور بہنیں ہوں گی، کیا ان کے متعلق آپ کا کوئی فرض نہیں ہے؟ آپ لوگوں میں ایسا ایک بھی مرد ہے جو اتنا سنگ دل ہو، میں یہ نہیں مان سکتی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اناتھوں کی حفاظت کرنا مذہب کے خلاف ہے؟ جو یہ کہتا ہے وہ مذہب کو بدنام کرتا ہے۔ رحم مذہب کی بنیاد ہے۔ میرے بھائی بابو امرت رائے نے ایسا مکان بنانے کا تہیہ کرلیا ہے۔ وہ

اپنی ساری پونجی ان کے لیے وقف کر چکے ہیں۔ اب وہ اس کام میں آپ کی مدد مانگ رہے ہیں۔ جس آدمی کے پاس کل لاکھوں کی جائداد تھی آج بھکاری بن کر آپ سے بھیک مانگ رہا ہے۔ آپ میں سمائی ہو تو اسے بھیک دیجیے، نہ سمائی ہو تو کہہ دیجیے کہ بھائی دوسرا دروازہ دیکھو، مگر اسے ٹھوکر تو نہ ماریے۔ اسے گالیاں تو نہ دیجیے۔ یہ سلوک آپ جیسے شریف آدمیوں کی شان کے خلاف ہے۔

ایک صاحب بولے۔ "کملا بابو کو کیوں نہیں سمجھاتیں؟"

دوسرے صاحب بولے۔ "اور بابو دان ناتھ بھی تو ہیں۔"

پریما ایک لمحہ کے لیے گھبرا گئی۔ اس اعتراض کا کیا جواب دے؟

اعتراض تو بالکل واجبی تھا۔ جو اپنے گھر کے آدمیوں کو نہیں سمجھا سکتا وہ دوسروں کو سمجھانے کے لیے کس منہ سے کھڑا ہوسکتا ہے؟ کچھ سوچ کر بولی۔ "ہاں ضرور ہیں لیکن مجھے آدھ گھنٹے پہلے کچھ نہ معلوم تھا کہ ان لوگوں کے اخلاق نصائح کا یہ نتیجہ ہوسکتا ہے جو سامنے دکھائی دے رہا ہے۔ باپ ہو، شوہر ہو، بھائی ہو۔ اگر اس نے اس جلسے میں خلل ڈالنے کی کوشش کی ہے تو میں اس کے کام کو قابلِ نفریں خیال کرتی ہوں۔ لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ کوئی سمجھ دار آدمی اتنی پوچ بات کر سکتا ہے۔"

ایک موٹے تازے پگڑی والے آدمی نے کہا۔ "اور جو ہم کملا بابو سے پچھتائے وہئی؟ ہم کا ہسیاں کالیوے کا رہا جون آئیں؟ وہی لوگ بھجن رہا تب آئیں۔"

غنڈے کا دل کتنا سادہ، کتنا انصاف پسند تھا۔ اسے اب معلوم ہو رہا تھا کہ امرت رائے اَدھرم کی اشاعت نہیں بلکہ دھرم کی اشاعت کر رہے ہیں۔ خود اس کی ایک بیوہ بہن ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ ایسے مفید کام کی مخالفت کرتے ہوئے اسے اب خود شرم آرہی تھی، وہ اس الزام کو اپنے سر پر نہ لے کر محرکوں کے سر پر ڈال رہا تھا۔

پریما نے اسی طرح کوئی آدھ گھنٹے تک اپنی شیریں زبانی، اپنی بے خوف راست بازی، اپنی ذہانت سے لوگوں کو عالمِ محویت میں رکھا۔ اس کا ایک دم پلیٹ فارم پر آجانا جادو کا کام کر گیا۔ عورت کی بے عزتی کرنا اتنا آسان نہیں تھا، جتنا امرت رائے کی۔ مرد کی بے عزتی ایک معمولی بات ہے۔ عورت کی بے عزتی کرنا آگ میں کودنا ہے، پھر عورت بھی کون؟ شہر کے بڑے رئیس کی لڑکی! لوگوں کے خیالات میں انقلاب سا ہوگیا۔ جو لوگ

خلل ڈالنے آئے تھے وہ بھی شیر ہوگئے۔ جب پریما نے چندے کی اپیل کرتے ہوئے اپنا آنچل پھیلایا تو وہ نظارہ دکھائی دیا جسے دیکھ کر دیوتا بھی خوش ہوجاتے۔ سب بڑی رقمیں ان غنڈوں نے دیں جو یہاں لاٹھی چلانے آئے تھے۔ غنڈے اگر کسی کی جان لے سکتے ہیں تو کسی کے لیے جان بھی دے سکتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر بابو لوگوں کو بھی جوش آیا جو صرف تماشا دیکھنے آئے تھے۔ وہ بھی کچھ نہ کچھ دے گئے۔ عوام غور سے نہیں جوش سے کام کرتے ہیں۔ مجمع ہی میں اچھے کاموں کی بربادی ہوتی ہے اور بُرے کاموں کی بھی، کتنے ہی لوگ تو گھر سے روپے لائے۔ سونے کی انگوٹھیاں تعویذوں اور کنٹھوں کا ڈھیر لگ گیا۔ دس بیس غنڈے تو پریما کے پیر چھوکر گھر گئے۔ وہ اتنے خوش تھے گویا تیرتھ کرکے لوٹے ہوں۔

جلسہ برخاست ہوا تو امرت رائے نے پریما سے کہا۔"یہ تم نے کیا غضب کر ڈالا، پریما؟ دان ناتھ تمھیں مار ہی ڈالیں گے۔"

پریما نے ہنس کر کہا۔ "جب ان گنواروں کو منا لیا تو انھیں بھی منا لوں گی۔"

امرت۔ "ہاں پریما۔ سب کچھ کرسکتی ہو۔ میں تو آج دنگ رہ گیا، اپنی غلطی پر پچھتاتا ہوں۔"

پریما نے سختی سے کہا۔"اپنے ہی ہاتھوں تو؟"

(۱۱)

پورنا علی الصباح اور دنوں سے آدھ گھنٹہ پیشتر اُٹھی۔ اس نے دبے پاؤں سومترا کے کمرہ میں قدم رکھا۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ سومترا سوتی ہے یا جاگتی۔ شاید وہ اس کی صورت دیکھ کر معلوم کرنا چاہتی تھی کہ اس کو رات کے واقعہ کی خبر ہے یا نہیں۔ سومترا پلنگ پر پڑی ہوئی کچھ سوچ رہی تھی، پورنا کو دیکھ کر وہ مسکرا پڑی۔ مسکرانے کی کیا بات تھی، یہ تو وہی جانے۔ مگر پورنا کا کلیجہ دھک سے ہوگیا۔ "بھگوان کہیں اس نے دیکھ تو نہیں لیا؟"

سومترا نے اُٹھ کر الجھے بالوں کو سنبھالتے ہوئے کہا۔"آج اتنے سویرے کیسے جاگ پڑیں بہن؟"

سوال بالکل معمولی تھا مگر پورنا کو ایسا معلوم ہوا کہ اس خاص مضمون کی تمہید ہے۔ آج سویرے جاگ پڑنا ایسا الزام تھا جسے تسلیم کرنے میں بڑی آفت کا

اندیشہ تھا۔ ”بولی کیا بہت سویرا ہے، روز ہی کا وقت تو ہے۔“

سومترا۔ ”نہیں بہن آج سویرا ہے۔ تمھیں رات کو نیند نہیں آئی کیا؟ آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔“

پورنا کا دل دھڑکنے لگا۔ یہ دوسرا اور پہلے سے بھی بڑا الزام تھا اسے وہ کیسے تسلیم کرسکتی تھی۔ بولی ”نہیں بہن، تمھیں دھوکا ہو رہا ہے، رات خوب سوئی، ایک ہی نیند میں سویرا ہوگیا۔ زیادہ سوجانے سے بھی آنکھیں سرخ ہوجاتی ہیں۔“

سومترا نے ہنس کر کہا۔ ”ہوجاتی ہوں گی مجھے معلوم نہیں تھا۔“

پورنا نے زور دے کر کہا۔ ”واہ اتنی سی بات تمھیں معلوم نہیں، البتہ تم کو ضرور نیند نہیں آئی۔ کیا ساری رات جاگتی رہیں؟“

سومترا۔ میری بلا جاگے۔ جسے ہزار بار غرض ہوگی، آئے گا۔ یہاں ایسی کیا پڑی ہے۔ وہ راضی ہی رہتے تھے تو مجھے کون بہشت مل جاتی تھی، تب تو اور جلاتے تھے، یہاں تو تقدیر میں رونے کے سوا اور کچھ لکھا ہی نہیں۔

پورنا۔ تم تو فضول ہی روٹھی بیٹھی ہو بہن، ایک بار چلی کیوں نہیں جاتیں؟ سومترا کے دل میں آیا کہ رات کا سارا ماجرا کہہ سنائے۔ مگر لحاظ نے زبان بند کردی۔ بولی ”یہ تو نہ ہوگا بہن، خواہ ساری عمر اسی طرح گزر جائے۔ میرا کوئی قصور ہو تو میں جاکر مناؤں، بے انصافی وہ کریں اور منانے میں جاؤں یہ نہیں ہوسکتا۔“

یہ کہتے کہتے اس کو رات کی ذلت یاد آگئی۔ وہ گھنٹوں دروازہ پر کھڑی رہی تھی، وہ جاگتے تھے، پھر بھی دروازہ نہ کھولا۔ تیوریاں چڑھا کر بولی۔ ”پھر کیوں منانے جاؤں؟ میں کسی کو کچھ نہیں جانتی، خواہ ایک خرچ کیا، خواہ سو، میرے باپ نے دیے اور اب بھی دیے جاتے ہیں۔ ان کے مکان میں پڑی ہوں، اتنا گناہ البتہ کیا ہے۔ آخر مرد اپنی عورت پر کیوں اتنا رعب جماتا ہے؟ بہن کچھ تمھاری سمجھ میں آیا؟“

پورنا نے رازدارانہ تبسم کے ساتھ کہا۔ ”کیا یہ آج کی نئی بات ہے؟ مرد نے ہمیشہ عورت کی حفاظت کی ہے۔ پھر رعب کیوں نہ جمائے؟“

سومترا۔ حفاظت کی ہے تو اپنی غرض سے، کچھ اس لیے نہیں کہ عورتوں کے متعلق مردوں کے خیالات بہت وسیع ہیں۔ اپنی جائداد کے لیے اولاد کی ضرورت نہ ہوتی تو کوئی

مرد عورت کی بات بھی نہ پوچھتا، جو عورتیں بانجھ رہ جاتی ہیں ان کی کتنی درگت ہوتی ہے۔ یہ بات روز ہی دیکھتی ہوں۔ ہاں ایسے لوگوں کی بات چھوڑو جو رنڈیوں پر جان دیتے ہیں۔

پورنا۔ میں تو ایسی کئی عورتوں کو جانتی ہوں جو مردوں ہی پر رعب جماتی ہیں۔ یہ کیوں؟

سومترا۔ وہ کوئی نکمّے مرد ہوں گے۔

پورنا۔ نہیں بہن۔ نکمّے نہیں بلکہ سو کماؤں میں کماؤ! ایک نہیں دس پانچ تو اپنے محلے ہی میں گنا دوں اور باہر کیوں جاؤں، میرے ہی ماموں تھے جو مامی صاحبہ کے بلا حکم دروازے پر سے نہ ٹلتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ کچہری کا سمن آیا تو اندر جاکر پوچھنے لگے کہ "ارے سنتی ہو! کچہری سے سمن آیا ہے، جاؤں یا نہ جاؤں؟"

سومترا۔ اگر تمھاری مامی منع کردیتیں تو نہ جاتے؟

پورنا۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ نہ جاتے، چپراسی جبراً پکڑ لے جاتا۔

سومترا۔ تو تمھاری مامی امیر گھرانے کی لڑکی ہوں گی؟

کیسا امیر گھرانا؟ مول لائی گئی تھیں! ماموں صاحب کی پہلی بیوی مر گئی تھیں تو انھیں مول لے آئے تھے۔

سومترا۔ کیا کہتی ہو بہن! کہیں عورتیں بکتی ہیں؟

پورنا۔ عورتیں اور مرد دونوں ہی بکتے ہیں۔ لڑکی کا باپ کچھ لے کر لڑکی بیاہے اور لڑکے کا باپ کچھ لے کر بیاہے، یہ بیچنا نہیں تو اور کیا ہے؟ مگر لڑکے والوں کے لیے لینا کوئی بات نہیں ہے۔ ہاں لڑکی کا باپ اگر کچھ لے کر لڑکی دے تو بُرائی کی بات ہے۔ اس کا رواج نہیں ہے۔

سومترا۔ مزا تو تبھی آئے جب لڑکی والے بھی لڑکیوں کا جہیز لینے لگیں، بلا پورا جہیز لیے ہوئے شادی نہ کریں، تب مردوں کے ہوش ٹھکانے آجاویں۔ میرا تو اگر بابو جی بیاہ نہ کرتے تو مجھے کبھی اس کا خیال بھی نہ آتا۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ لڑکی والوں کو ہی لڑکی بیاہنے کی اتنی غرض کیوں ہوتی ہے؟

پورنا۔ تم بہن، بچوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ لڑکیوں کی شادی میں سال دو سال کی دیر ہوجاتی ہے تو چاروں طرف ہنسی ہونے لگتی ہے۔ لڑکوں کی شادی کبھی نہ ہو تو بھی

کوئی نہیں ہنستا۔ دنیاوی رواج بھی کوئی چیز ہے۔

سومترا۔ انگریزوں میں بہت سی عورتیں کنواری رہ جاتی ہیں تو کیا ہوتا ہے، وہ کیا سب بدچلن ہوتی ہیں؟

پورنا۔ کسی کے دل کا حال کوئی کیا جانتا ہے۔ بہن عورت کمزور ہوتی ہے۔ ایک محافظ کے بغیر اس کی زندگی آرام و سکون کے ساتھ نہیں بسر ہوسکتی ہے۔

سومترا۔ تو پھر یہ مس کنواری رہ جاتی ہیں؟

پورنا۔ اس لیے کہ وہ زندگی کو عیش میں گزارنا چاہتی ہیں یا اولاد کی پرورش کی تکلیف نہیں اُٹھانا چاہتیں یا کسی سے فریب کرنا نہیں چاہتیں۔

سومترا۔ اچھا تمھارے ماموں صاحب عورت سے کیوں دبتے تھے؟ کیا بڑے دُبلے پتلے مریض سے آدمی تھے اور تمھاری مامی بھاری بھرکم عورت تھیں؟

پورنا۔ اے نہیں بہن، مامی تو ایسی دبلی پتلی تھیں کہ پھونک دو تو اُڑجائیں۔ اور ماموں تو پورے بھیم تھے۔ پختہ سوا سیر تو ان کی خوراک تھی، مگر مامی کی آنکھوں کے اشارے پر چلتے تھے۔ کیا مجال کہ اپنی مرضی سے ایک کوڑی خرچ کریں۔ دن بھر کے بعد بھی ججمانی سے لوٹتے تو کھانا گھر ہی آکر کھاتے۔

سومترا۔ تو وہ بے وقوف ہوں گے۔

پورنا۔ تو بس، اسی طرح مرد بھی ان عورتوں پر رعب جما لیتے ہیں، جو بے وقوف ہوتی ہیں۔ ہوشیار عورت پر مرد رعب نہیں جما سکتا اور نہ ایسے مرد پر عورت ہی رعب جما سکتی ہے۔ دونوں میں سے جس کی عقل تیز ہوگی اسی کی زیادہ چلے گی۔

سومترا۔ میں تو جاہلوں کو بھی عورتوں کو ڈانتے ہوئے دیکھتی ہوں۔

پورنا۔ یہ تو دنیا کا رواج ہی ہے بہن، مرد عورت سے طاقت میں عقل میں اکثر بڑھ کر ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی حکومت ہے۔ جہاں مرد کے بجائے عورت میں یہ باتیں زیادہ ہیں، وہاں عورتوں ہی کی چلتی ہے، مرد کما کر کھلاتا ہے تو کیا رعب جمانے سے بھی جائے۔

سومترا۔ بس بس، تم نے لاکھ روپے کی بات کہہ دی۔ یہی میں بھی سمجھی ہوں۔ بے چاری عورت کما نہیں سکتی اس لیے اس کی یہ درگت ہے۔ مگر میں کہتی ہوں کہ اگر مرد

اپنے کنبہ بھر کو کھلاسکتا ہے تو کیا عورت اپنی کمائی سے اپنے پیٹ بھی نہیں بھر سکتی۔
پورنا۔ لیکن سوال تو حفاظت کا ہے، عورت کی حفاظت کون کرے گا؟

سومترا۔ حفاظت؟ کیا اسے کوئی کھاجائے گا یا لوٹ لے جائے گا؟

پورنا۔ بدمعاشوں کے سبب ان کا رہنا مشکل ہوجائے گا۔

سومترا۔ جب ایسی کئی عورتیں مل کر رہیں گی تو کوئی ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔ ہر عورت اپنے پاس تیز چُھرا رکھے۔ اگر کوئی مرد اسے چھیڑے تو اپنی جان پر کھیل جائے۔ چُھرا بھونک دے۔ ایسے دس بیس واقعے ہوجائیں گے تو مردوں کی نانی مر جائے گی۔ پھر کوئی عورتوں کی طرف آنکھ بھی نہ اُٹھا سکے گا۔

پورنا نے متانت سے کہا۔"وقت آئے گا تو وہ بھی ہوجائے گا۔ بہن ابھی تو عورتوں کی حفاظت مرد ہی کرتا ہے۔"

سومترا۔ ہمیں نے مردوں کی خوشامد کرکے انھیں سر پر چڑھا رکھا ہے۔

پورنا۔ یہ تمام باتیں اسی وقت تک ہیں جب تک سوامی روٹھے ہوئے ہیں۔ ابھی آکر گلے لگا لیں تو پیر چومنے لگو گی۔

سومترا۔ کون؟ میں نے ہمیشہ ڈانٹ پلائی ہے۔ جبھی تو مجھ سے لالہ کی کور دبتی ہے وہ کوڑی کوڑی کو دانتوں سے پکڑتے ہیں اور مجھ سے جو کچھ خرچ کرتے بنتا ہے، کرتی ہوں، ان سے مانگنے نہیں جاتی اس پر اور بھی جلتے ہیں۔ آج ہی گنگا نہانے جاؤں گی۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ گھر کی بگھی نہ ملے گی۔ وہ میرے لیے خالی نہیں رہتی، کرائے کی بگھی پر جاؤں گی۔ چار روپے سے کم خرچ نہ ہوں گے۔ دیکھنا کیسا جامے سے باہر ہوتے ہیں۔

اتنے میں کہار نے آکر کہا "بہو جی بابو جی نے ریشمی اچکن مانگی ہے" سومترا نے تنک کر کہا "جا کہہ دے۔ جہاں رکھی ہو، ڈھونڈ لے جائیں۔ یہاں کوئی ان کی لونڈی نہیں ہے۔ باہر بیٹھے نوابوں کی طرح حکم چلاتے ہیں۔"

کہار نے دست بستہ عرض کی "سرکار نکال کر دے دیں ناہیں ہمار کندی ہوئے لاگی۔ چمڑی ادھیڑ لیہیں۔"

سومترا۔ تیری قسمت میں لات کھانا لکھا ہے، جاکر لات کھا! تو تو مرد ہے کیا تجھے بھی اور

کہیں کام نہیں ملتا؟

کہار چلا گیا تو پورنا نے کہا "بہن کیوں جھگڑا بڑھاتی ہو؟ لاؤ مجھے کنجی دے دو تو میں نکال کر دے دوں، ان کا غصہ جانتی ہو۔"

سومترا۔ یہاں کسی کی دھونس سہنے والی نہیں، سو دفعہ غرض ہو کر اپنی اچکن لے جائیں، مجھے کوئی تنخواہ نہیں دیتے۔

کہار نے لوٹ کر کہا "سرکار کہت ہیں کہ اچکن لوہے والی صندوک ماں دھری ہے۔"

سومترا۔ تو نے کہا نہیں کہ جاکر نکال لاؤ، کیا اتنا کہتے زبان گری جاتی ہے۔

کہار۔ ای تو ہم ناہیں کہا سرکار، آپ دو جنے چھن بھرماں اکے ہوئی ہیں بیچ ما ہمار کشمس ہوئی جائی۔

سومترا۔ اچھا تو یہاں سے بھاگ جا۔ ورنہ پہلے میں ہی پٹوں گی۔

کہار منہ لگا تھا۔ بولا "سرکار جتنا مارے کا ہوئے مار لیں، مدا بابو جی سے نہ پٹاویں۔ ایس گھونسا مارت ہیں کہ کوس بھر سے دھاکا سنات ہے۔" سومترا کو ہنسی آگئی۔ ہنستی ہوئی بولی "تو بھی اسی طرح اپنی عورت کو مارتا ہے یہ اسی کا ڈنڈا ہے۔"

کہار۔ ارے سرکار جو ای ہوت تو کا پوچھے کا رہا۔ مہریا ایس گن کی پوری ملی ہے کہ بات پیچھو کرت ہے۔ بہاری پہلے چلاوت ہے جو سرکار، سن بھرپاوے کہ کو تو دوسری مہریا سے ہنست رہا تو ٹھاڑھے لیل جائے، سرکار تھرتھر کانپت ہے بہو جی، بابو جی سے تون اتنا ناہیں ڈرائت ہے۔

سومترا۔ تو تو جنم کا لت خوار ہے بھاگ جا کہدے کہ اپنی اچکن لے جائیں کیا پیر میں منہدی لگی ہے۔

کہار۔ جائت ہے سرکار۔ آج بھلے کا منہ ناہیں دیکھا جان پڑت ہے۔" کہار چلا گیا تو پورنا نے کہا "سکھی، تم تو چھیڑ چھیڑ لڑتی ہو۔ میں تو یہاں سے بھاگی جاتی ہوں۔

سومترا نے اس کا آنچل پکڑ لیا "بھاگتی کہاں ہو؟ ذرا تماشا دیکھو، کیا شیر ہیں جو پھاڑ کھائیں گے۔"

پورنا۔ غصہ میں آدمی اندھا ہوجاتا ہے بہن، کہیں کوئی بُری بات کہہ بیٹھیں تو؟

سومترا۔ بُری کہیں گے تو بُری سنیں گے۔

پورنا۔ اور جو ہاتھ چلا دیا؟

سومترا۔ ہاتھ کیا چلا دیں گے، کوئی کھیل ہے؟ پھر صورت نہ دیکھوں گی۔ کملا پرشاد کے کھڑاؤں کی آواز سنائی دی۔ پورنا کا دل دھڑکنے لگا اور سومترا بھی ایک لمحہ کے لیے ٹپٹا گئی، مگر وہ جلدی ہی سنبھل بیٹھی اور اس طرح تیار ہوگئی جیسے کوئی ہوشیار کھلاڑی اپنے مدِمقابل کا وار بچاتا ہے۔ کملا نے کمرے میں قدم رکھتے ہی تیز لہجہ میں کہا ''بیٹھی غپ لڑاتی ہو، ذرا اچکن مانگ بھیجی تھی تو اُٹھتے نہ بنا۔ باپ سے کہا ہوتا کہ کسی کروڑپتی سیٹھ کے گھر بیاہتے، یہاں کا حال تو جانتے تھے۔''

سومترا نے تڑپ کر کہا ''باپ دادا کا نام نہ لینا۔ کہے دیتی ہوں، وہ پلنگ پر کنجی پڑی ہے اور سامنے صندوق رکھا ہے۔ اچکن لو اور باہر جاؤ۔ یہاں تمھاری کوئی لونڈی نہیں ہے، جب اپنی کمائی کھلانا تب ڈانٹ لینا۔ باپ یہ جانتے تھے کہ یہ سب ٹھاٹ باٹ باہر ہی باہر ہے۔''

کملا۔ تم بڑی سمجھدار تھیں، تمھیں نے پتا لگا لیا ہوتا۔

سومترا۔ جھگڑا کرنا چاہتے ہو یا اچکن لے کر باہر جانا چاہتے ہو۔

کملا۔ نہیں جھگڑا کرنا چاہتا ہوں۔

سومترا۔ اچھی بات ہے، جیسا کہوگے ویسا سنوگے۔

کملا۔ میری اچکن نکالتی ہو یا نہیں۔

اگر بھلے مانسی سے کہتے ہو تو ہاں، اور رعب سے کہتے ہو تو نہیں۔

کملا۔ میں تو رعب ہی سے کہتا ہوں۔

سومترا۔ تو نکال لو۔

کملا۔ تمھیں نکالنا پڑے گا۔

سومترا۔ میں نہیں نکالتی۔

کملا۔ بُرا ہوگا سومترا! بُرا ہوگا کہے دیتا ہوں۔

سومترا۔ جو کچھ جی میں آئے کر لینا۔ یہاں بال برابر پروا نہیں ہے۔

کملا۔ تم اپنے گھر چلی جاؤ۔

سومترا۔ میرا گھر یہی ہے۔ یہاں سے اور کہیں نہیں جاسکتی۔

کملا۔ لکھپتی باپ کا گھر تو ہے۔

سومترا۔ باپ کا گھر جب تھا تب تھا، اب تو یہی گھر ہے۔ میں عدالت سے لڑ کر پانچ سو کا مہینہ لے لوں گی، لالہ اس پھیر میں نہ رہنا۔ پیر کی جوتی نہیں ہوں کہ نئی تھی تو پہنا اور پُرانی ہوگئی تو اُتار پھینک دیا۔

ایسا ترکی بہ ترکی جواب آج تک کملا نے کبھی نہ پایا تھا۔ اس کے ترکش میں جو تیز سے تیز تیر تھے وہ سب اس نے سر کردیے۔ مکان سے نکل جانے تک کی دھمکی دی، مگر سومترا پر ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ وہ سومترا کو مار نہیں سکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہی کرسکتا ہے کہ اس کی صورت نہ دیکھے۔ اور اس امر کی سومترا کو کوئی پروا نہیں معلوم ہوتی۔ اب پورنا سے بولا۔ ''دیکھتی ہو پورنا ان کی باتیں؟ جتنا ہی طرح دیتا ہوں اتنا ہی یہ شیر ہوئی جاتی ہیں۔''

پورنا۔ آپ سمجھدار ہوکر جب کچھ نہیں سمجھتے تو انھیں کیا کہوں؟

سومترا نے پیچ و تاب کھا کر کہا ''بہن! منہ دیکھے کی سند نہیں، کاہے سے یہ بڑے سمجھدار بن گئے اور میں بے سمجھ بن گئی؟ اسی مونچھ سے جو آدمی مجھ جیسی سیدھی سادی عورت کو آج تک مٹھی میں نہ کرسکا وہ سمجھدار نہیں بلکہ بیل ہے۔ آخر میں کیوں ان کی دھونس سہوں؟ دس باتیں پیار کی کرے اس کی ایک دھونس بھی سہ لی جاتی ہے، جس کی تلوار ہمیشہ میان سے باہر رہتی ہو اس کی کوئی کہاں تک سہے گا؟

کملا۔ کہے دیتا ہوں سومترا رو رو کر دن کاٹوگی۔

سومترا۔ میری بلا روئے۔ ہاں تم روؤگے۔

کملا۔ میں سو شادیاں کرسکتا ہوں۔

سومترا تلملا اٹھی۔ (اس ضرب کا وہ اتنا ہی سخت جواب نہ دے سکتی تھی، وہ یہ نہ کہہ سکتی تھی کہ میں بھی ہزار شادیاں کرسکتی ہوں) حقارت آمیز لہجہ میں بولی۔ ''جو مرد ایک کو نہ رکھ سکا وہ سو کو کیا رکھے گا۔ ہاں چکلہ بسائے تو دوسری بات ہے۔''

کملا شکست کھا گیا۔ جس کی ناک پر مکھی نہ بیٹھنے پاتی اسے ایک کمزور عورت نے شکست دے دی۔ کوئی لفظ اس کے منہ سے نہ نکلا۔ لال لال آنکھوں سے سومترا کی طرف دیکھ اُلٹے پاؤں واپس چلا گیا۔

دو تین منٹ تک دونوں عورتیں خاموش رہیں۔ دونوں ہی اپنے ڈھنگ پر اس جھگڑے پر غور کر رہی تھیں۔ سومترا فتح کے غرور سے پھولی ہوئی تھی۔ اس کا ضمیر اس کی ذرا بھی تحقیر نہ کر رہا تھا، اس نے وہی کیا جو اسے کرنا چاہیے تھا مگر پورنا کی رائے میں ساری خطا سومترا کی ہی تھی، ذرا اُٹھ کر اچکن نکال دیتی تو اس بکواس کی نوبت نہ آتی، عورت کا مرد کے منہ لگنا بھلا نہیں معلوم ہوتا۔ نہ جانے اس کی زبان سے اس طرح کے سخت الفاظ کیسے نکلے، پتھر کا کلیجہ ہے، بے چارے کملا بابو تو جیسے ٹھک سے رہ گئے۔ ایسی عورت کی اگر مرد بات بھی نہ پوچھے تو اس میں شکایت کیا؟

دفعتاً سومترا بولی۔ ”بہت تاؤ کھا کر گئے ہیں، میرا کیا کرلیں گے؟ اب سیدھے ہو جائیں گے، دیکھ لینا ایسے مردوں کی یہی دوا ہے، تمھارا بڑا لحاظ کیا ورنہ ایسی ایسی سناتی کہ کان کے کیڑے مرجاتے۔“

پورنا۔ سنانے میں تو تم نے کوئی بات اُٹھا نہ رکھی بہن! دوسرا مرد ہوتا تو نہ جانے کیا کرتا۔

سومترا۔ جو کہے گا وہ سنے گا ہی، ہزار بار سنے گا، دبے گا وہ جو کسی کا دیا کھاتا ہو۔ میں تو اپنے باپ سے کبھی نہیں دبی، پھر ان کی ہستی کیا ہے؟ سو سو شادیوں کی بات کہتے ہوئے بھی جسے شرم نہ آئے وہ بھی کوئی آدمی ہے۔

پورنا۔ ”بہن، اور دنوں کی تو میں نہیں کہتی مگر آج تمھاری ہی ہٹ دھرمی تھی۔

سومترا۔ اچھا جلے پر نمک نہ چھڑکو سکھی، جس کے اوپر پڑتی ہے وہی جانتا ہے۔

پورنا۔ میں نے تو کوئی ایسی بات نہیں کہی بہن۔ مجھ پر ناحق بگڑتی ہو۔

سومترا۔ سارا الزام میرے سر منڈھ رہی ہو، اور کیا لاٹھیوں سے مارو گی؟ عورت کمزور ہوتی ہے۔ اسے نصیحت دینے والے بہت ہوتے ہیں مگر مردوں کو کوئی نہیں سمجھاتا۔ اتنی دیر بیٹھی سنتی رہیں ایک بار بھی منہ سے نہ نکلا کہ بابو کیسی باتیں کر رہے ہو؟ تم خوش ہو رہی ہو گی کہ اچھا ہو رہا ہے جو اس کی درگت بنائی جارہی ہے۔“ پورنا کو یہ

آخری جملہ تیر کی طرح لگا۔ وہ متحیر ہوکر سومترا کا منہ تاکنے لگی۔ اگرچہ وہ ہمیشہ سومترا کی چاپلوسی کیا کرتی تھی پھر بھی وہ جانتی تھی کہ جس دن کملا بابو ساڑیاں لائے تھے اسی دن سے سومترا اس کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھنے لگی ہے مگر اس موقع پر پورنا نے کملا کی نذر واپس کرکے اپنی سمجھ میں شبہ کو مٹانے کی کامیاب کوشش کی تھی۔ پھر آج سومترا بلاوجہ کیوں اس پر بے رحمانہ حملے کر رہی ہے؟ اسے پھر شک ہوا کہ کہیں سومترا نے رات کی بات جان تو نہیں لی۔ وہ خوف زدہ ہوکر دبی زبان سے بولی۔ ”بہن! تمھارے دل میں جو بات ہو، صاف صاف کہہ دو۔ مجھ بیکس کو جلا کر کیا پاؤگی۔ اگر میرا یہاں رہنا تمھیں ناگوار ہو تو میں آج ہی منہ میں کالکھ لگا کر یہاں سے چلی جاؤں گی۔ دنیا میں لاکھوں ودھوائیں پڑی ہیں۔ کیا سبھی کی حفاظت کرنے والے بیٹھے ہیں؟ کسی طرح ان کے دن بھی کٹتے ہی ہیں۔ میرے دن بھی اسی طرح کٹ جائیں گے۔ اور پھر بھی کوئی سہارا نہیں ہے تو گنگا جی تو کہیں نہیں گئی ہیں۔“

سومترا نے پھر بھی پورنا کے زخمی دل پر مرہم رکھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اور بھی ناک سکوڑ کر بولی۔ ”مجھے تمھارا رہنا کیوں ناگوار ہوگا۔ بہن کیا میری چھاتی پر بیٹھی ہو، نہ میرا گھر نہ میرا در، نہ میں لینے میں، نہ میں دینے میں، میں کیوں بُرا ماننے لگی۔ میں ہی کیوں نہ کہیں ڈوب مروں کہ سارا گھر شانتی پاجائے۔ بس کی گانٹھ تو میں ہوں۔ سارے گھر کا تو میرے ہی مارے ناک میں دم ہے۔ میں ہی سب کی آنکھوں میں کھٹکتی ہوں۔“

پورنا نے یہ باتیں گویا سنی ہی نہیں۔ بیویاں شوہروں سے روٹھ کر ایسی تیاگ کی باتیں عموماً کیا ہی کرتی ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ خود کو سناکر بولی۔ ”میں جانتی تھی اپنے جھونپڑے سے پیر باہر نکالنا میرے لیے بُرا ہوگا۔ میں نے جان بوجھ کر اپنے پیروں میں کلہاڑی ماری، میں کملا بابو کی باتوں میں آگئی۔ اتنی جگ ہنسائی اور قسمت میں لکھی تھی۔“

سومترا نے تیز لہجہ میں کہا۔ ”تو ان بابو صاحب نے تو تمھیں کچھ نہیں کہا۔“ اس نے اپنا جملہ ختم تو کر دیا مگر چہرے سے یہ بات معلوم ہوتی تھی کہ وہ ابھی اور کہنا چاہتی ہے گر کسی وجہ سے نہیں کہہ رہی ہے۔

پورنا نے دروازے کی طرف جاتے ہوئے روکھی آواز میں کہا۔ "میرے لیے جیسے کملا بابو ویسی تم۔"

سومترا۔ تو جاتی کہاں ہو؟ ذرا بیٹھو تو۔

پورنا۔ نہیں بہن! بیٹھنے کا پھل پاگئی، اب جانے دو۔ پورنا اپنے کمرے میں آکر رونے لگی۔ ادھر سومترا نے ہارمونیم پر گانا شروع کیا۔

اودھو سوارتھ کا سنسار

یہ گانا تھا یا پورنا پر فتح پانے کا نغمہ۔ پورنا کو تو یہ فتح کا نغمہ ہی معلوم ہوا۔ ایک ایک راگ اس کے دل پر تیر بن کر چوٹ کر رہا تھا۔ کیا اب اس مکان میں اس کا گزر بسر ہوسکتا ہے؟ نا ممکن! نہ جانے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب وہ اس گھر میں آئی تھی۔ اپنے اس جھونپڑے میں رہ کر سلائی کرکے یا چکی پیس کر کیا وہ زندگی نہ بسر کرسکتی تھی، بے چاری بلّو اس کو آخر تک سمجھاتی رہی مگر قسمت میں دھکّے کھانے لکھے تھے۔ اس کی بات کیسے مانتی؟

اب پورنا کا دل ایک مرتبہ کملا پرشاد سے باتیں کرنے کے لیے بے قرار ہو رہا تھا۔ وہ ان سے صاف کہہ دینا چاہتی تھی کہ وہ اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔ ان کے سوا اور کس سے کہے؟ بدری پرشاد ہنس کر ٹال دیں گے۔ اماں سمجھیں گی یہ میری بہو کی برابری کر رہی ہے، ابھی سے چلے جانے میں خیریت ہے، کہیں کوئی دوسرا فسانہ اُٹھ کھڑا ہوا تو میں کہیں منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہوں گی۔ سومترا جو چاہے الزام لگائے، دنیا اسی کی بات مانے گی۔

پورنا رات ہی سے، تنہائی میں رات کے وقت کملا کے پاس جانے پر پچھتا رہی تھی، اب بھلے آدمی کو بھی اس وقت ہنسی کرنے کو سوجھ گئی مگر وہ ساڑی میرے بدن پر خوب کھل رہی تھی! مجھے وہاں جانا ہی نہ چاہیے تھا مگر ایک مرتبہ اور ان سے ملنا ہوگا۔ میں دروازے پر کھڑی رہوں گی۔ مجھے کمرے میں جانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ کھڑے کھڑے کہہ دوں گی کہ "بابو جی اب مجھے جانے دیجیے اور کہیں جگہ نہیں ہے تو بابو امرت رائے کا بدھوا آشرم تو ہے، دس پانچ بدھوائیں وہاں رہتی بھی تو ہیں۔ میں بھی وہیں چلی جاؤں تو کیا ہرج ہے؟" وہ سمجھائیں گے تو بہت، سومترا کو ڈانٹنے پر بھی آمادہ ہوجائیں گے مگر اس

ڈانٹ ڈپٹ سے جھمیلا اور بھی بڑھے گا، طرح طرح کے شکوک لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوں گے۔ ابھی کم از کم لوگوں کو مجھ پر رحم تو آتا ہے، پھر تو کوئی بات پوچھنے کا بھی روادار نہ ہوگا۔ بدھوا پر بدچلنی کا الزام لگتے کتنی دیر لگتی ہے؟

پورنا دن بھر اُداس بیٹھی رہی۔ اس کا دل کسی کام میں نہ لگتا تھا، خواہش نہ ہوتے ہوئے بھی کھانا کھانے گئی۔ اندیشہ ہوا کہ کہیں سومترا آکر جلی کٹی نہ سنانے لگے۔ خدا خدا کرکے کسی طرح دن کٹا، رات آئی۔ سومترا نے سرِشام ہی سے دروازہ بند کرلیا۔ کھانا ہوجانے کے بعد پورا سوتا پڑ گیا۔ تو پورنا نے دبے پاؤں کملا کے دروازے پر جاکر آہستہ سے پکارا۔ کملا ابھی سنیما سے لوٹا تھا اس نے فوراً ہی کواڑ کھول دیے اور بولا۔ ''آؤ۔ آؤ پورنا۔ تمھیں دیکھنے کے لیے دل بے چین ہو رہا تھا۔

پورنا نے دروازے پر کھڑے ہوکر کہا۔ ''میرے وہاں آنے کا کوئی کام نہیں ہے، میں آپ سے رخصت ہونے آئی ہوں۔ اس گھر میں اب میرا نباہ نہیں ہوسکتا، آخر میں بھی انسان ہوں۔ کہاں تک سب کا مُنہ تاکوں اور کس کس کی خوشامد کروں؟''

کملا نے دروازے پر آکر کہا۔ ''اندر تو آؤ۔ تم تو اس طرح کھڑی ہو گویا چپت مار کر بھاگ جاؤگی۔ ذرا صبر سے کام لیتے ہوئے بیٹھو تو سنوں کہ کیا بات ہے۔ اس گھر میں کون ہے جو تمھیں آدھی بات کہنے کی جرأت کرسکتا ہے؟ اپنا اور اس کا خون ایک کر دوں گا، مگر اندر تو آؤ۔''

پورنا۔ نہیں میرے اندر آنے کی ضرورت نہیں۔ یونہی مجھے طعنے مل رہے ہیں۔ اندر جاکر تو نہ جانے کیا کلنک لگ جائے گا۔

کملا پرشاد نے تیوریاں چڑھا کر کہا۔ ''کس نے طعنہ دیا ہے؟ سومترا نے؟''

پورنا۔ کسی نے دیا ہو آپ کا پوچھنا اور میرا بتلانا دونوں فضول ہیں۔ طعنے والی بات ہوگی تو سبھی طعنے دیں گے، آپ کسی کا مُنہ نہیں بند کرسکتے اکیلے کے لیے تو مٹی کا ٹھیکرا بھی تیز چاقو بن جاتا ہے۔ بس سب سے اچھا یہی ہے کہ میں یہاں سے چلی جاؤں۔ آپ صاحبوں نے میری پرورش اتنے دنوں تک کی، اس کے لیے میرا ایک ایک رواں آپ سب کا جس گائے گا۔

کملا۔ کہاں جانا چاہتی ہو؟

پورنا۔ کہیں نہ کہیں ٹھکانا مل ہی جائے گا اور کچھ نہ ہوگا تو گنگا جی تو ہیں ہی۔
کملا۔ تو پہلے مجھے تھوڑا سا سنکھیا دیتی جاؤ۔

پورنا نے حسرت آمیز لہجہ میں کہا۔ ''کیسی بات منہ سے نکالتے ہو بابو جی، میری جان بھی آپ لوگوں کے کام آئے تو مجھے دینے میں خوشی ہی ہوگی، لیکن بات بڑھتی جاتی ہے اور آگے چل کر نہ جانے اور کتنی بڑھے، اس لیے میرا یہاں سے ٹل جانا ہی بہتر ہے۔''

کملا پرشاد نے پورنا کا ہاتھ پکڑ کر اسے جبراً اندر کھینچ لیا اور دروازہ بند کرتا ہوا بولا۔ ''ہاں اب کہو کیا کہتی ہو، سومترا نے بھی تمھیں کچھ کہا ہے؟''

پورنا دروازے سے لپٹی ہوئی بولی۔ ''پہلے دروازہ کھول دو تو میں بتلاؤں۔ کیوں ناحق مجھ بیکس کی زندگی برباد کر رہے ہو؟''

کملا۔ کھول دوں گا۔ ایسی جلدی کیا ہے؟ پانی میں بھیگ تو نہیں رہی ہو یا میں ہوا ہوں؟ اگر سومترا نے تمھیں کچھ کہا تو میں ایشور کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اسے کل ہی گھر سے نکال کر باہر کر دوں گا اور پھر کبھی اس کا مُنہ نہ دیکھوں گا۔ دیکھو پورنا اگر دروازہ کھولا تو پچھتاؤ گی۔ سینہ میں چھری مار لوں گا۔ چھ ماہ ہوئے جب میں نے تمھیں پہلے پہل دیکھا اس وقت سے میرے دل کی جو حالت ہو رہی ہے وہ تم نہیں جان سکتیں۔ اتنے دنوں تک کسی طرح صبر کیا۔ مگر اب صبر نہیں ہوتا۔ خیر جب تب درشن ہو جاتے تھے جس سے دل کی تسکین ہوتی تھی، اب تم یہاں سے جانے کی بات کہتی ہو۔ تمھارا یہاں سے جانا میرے جسم سے جان کا چلا جانا ہے۔ میں تمھیں روک نہیں سکتا۔ تمھیں روکنے کا مجھے کوئی اختیار نہیں ہے، دنیا بیاہ کے سوانگ کو تو سولھوں آنہ اختیار دے دیتی ہے مگر محبت کو جو ایشور کا سروپ ہے، ذرا بھی اختیار نہیں دیتی۔ جاؤ مگر کل ہی سنوگی کہ کملا جہان سے کوچ کر گیا۔

پورنا کا بے یار دل اس اظہارِ عشق سے سخت کش مکش میں پڑ گیا۔ اس کا ہاتھ کواڑ کی چٹخنی پر تھا، وہ خود بخود چٹخنی کے پاس سے ہٹ گیا، وہ خود ایک قدم آگے بڑھ آئی۔ اس کی حالت اس آدمی کی سی ہو گئی جس نے بے جانے کسی لڑکے کا پیر کچل دیا ہو اور جو اس کو درد سے تڑپتا دیکھ کر جلد ہی دوڑ کر اسے گود میں اُٹھا

لے۔ کملا پرشاد جس دن ساڑی لائے تھے، اسی دن سے پورنا کو کچھ شک ہو گیا تھا۔ مگر اس نے اسے مردوں کی تفریح سمجھ لی تھی۔ پس اس وقت وہ ایسی عشقیہ باتیں سن کر خوف زدہ ہو گئی۔ گھبرائی ہوئی آواز سے بولی۔ ''ایسی باتیں نہ کہو بابو جی، میری دنیا و عاقبت نہ بگاڑو۔ پھر میں سچ مچ مرنے تھوڑے ہی جا رہی ہوں، کہیں نہ کہیں تو رہوں گی ہی۔ کبھی کبھی آتی رہوں گی مگر اس وقت مجھے جانے دو۔ میری بدنامی سے کیا تمھیں رنج نہ ہوگا۔''

کملا۔ پورنا نیک نامی اور بدنامی سب ڈھکوسلا ہے۔ محبت ایشور کی تحریک ہے، اسے قبول کرنا گناہ نہیں بلکہ اس کی توہین کرنا گناہ ہے۔ مجھے ایشور نے دولت دی ہے۔ ایک سے ایک خوبصورت عورتوں کو روزانہ دیکھتا ہوں۔ دولت کے زور سے جسے چاہوں، اپنی خواہشوں کا شکار بنا سکتا ہوں مگر قسم لے لو جو آج تک کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھا ہو۔ میرے احباب مجھے بوڑھے بابا کہا کرتے ہیں۔ سومترا کو آئے تین برس ہو گئے مگر اس کو میں نے محبت آمیز نگاہوں سے کبھی نہیں دیکھا۔ لیکن تمھیں دیکھتے ہی مجھے ایسا معلوم ہوا گویا میری آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا۔ ایسا معلوم ہوا گویا میرے دل کے مندر میں عرصہ سے براجمان ہو۔ مگر میں لا علمی کے سبب اس کرب کے راز کو نہ سمجھ سکتا تھا۔ بس جیسے کوئی بھولی ہوئی یاد آجائے۔ اب کتنا ہی چاہتا ہوں کہ تمھیں بھول جاؤں مگر دل پر میرا کوئی بس نہیں چلتا۔ یہی سمجھ لو کہ میری زیست تمھارے التفات پر منحصر ہے۔

یہ کہتے ہوئے کملا کا گلا بھر آیا۔ اس نے رومال نکال کر آنکھیں پونچھیں، گویا ان میں آنسو بھر رہے تھے۔

پورنا بُت کی طرح بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ اس کا سارا ادراک سارا احساس سارا دل گویا امنڈتی ہوئی لہروں میں بہے جا رہے تھے اور کوئی اس کی فریاد نہ سنتا تھا۔ انسان، وحش و طیور، ساحل کے درخت اور آبادی کے مقامات سب بھاگے جا رہے تھے، اس سے دور کوسوں دور، وہ کھڑی نہ رہ سکی۔ زمین پر بیٹھ کر اس نے ایک آہ سرد بھری اور زار و قطار رونے لگی۔

کملا نے پاس جاکر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور گلا صاف کرکے بولا۔ ''پورنا تم جس

مصیبت میں ہو، میں اسے جانتا ہوں۔ مگر سوچو کہ ایک زندگی کی قیمت کیا ایک یاد داشت سابقہ کے برابر بھی نہیں۔ میں تمھاری شوہر پرستی کے معیار کو سمجھتا ہوں۔ اپنے شوہر سے تمھیں کتنی محبت تھی یہ دیکھ چکا ہوں، انھیں تم سے کس قدر محبت تھی، یہ بھی میں دیکھ چکا ہوں۔ اکثر پارک میں ہری ہری گھاس پر لیٹے ہوئے وہ گھنٹوں تعریف کیا کرتے تھے، میں سن سن کر ان کے بھاگ کو سراہتا تھا اور خواہش ہوتی تھی کہ تمھیں ایک بار پاجاتا تو تمھارے قدموں پر سر رکھ کر روتا۔ سومترا سے روز بروز نفرت ہوتی جاتی تھی۔ یہ انھیں کا بویا ہوا بیج ہے جو آج پھولنے اور پھلنے کے لیے بے چین ہے۔"

پورنا نے سسکتے ہوئے کہا۔ "بابو جی! تمھارے پیروں پڑتی ہوں، مجھے جانے دو میرا جی نہ جانے کیوں گھبرا رہا ہے۔"

کملا نے سر ٹھونک کر کہا۔ "ہائے پھر وہی بات! اچھی بات ہے جاؤ اب ایک بار بھی بیٹھنے کو نہ کہوں گا۔"

پورنا جیوں کی تیوں بیٹھی رہی، اسے کسی خوفناک انجام کا اندیشہ ہورہا تھا۔

کملا نے کہا۔ "اب جاتی کیوں نہیں ہو۔ میں نے تمھیں باندھ تو نہیں لیا ہے۔"

پورنا نے کملا کی طرف افسردہ نگاہوں سے دیکھا اور سر جھکا کر کہا۔ "تم وعدہ کرتے ہو کہ اپنی جان کی حفاظت کرتے رہوگے۔"

کملا نے بے پروائی سے کہا۔ "تمھیں میری جان کی سلامتی سے واسطہ؟ جس طرح تم پر میرا کچھ زور نہیں ہے اسی طرح مجھ پر تمھارا کوئی زور نہیں ہے یا تمھیں بھول ہی جاؤں گا یا اپنی زندگی ہی کا خاتمہ کروں گا۔ مگر اس سے تمھارا کیا بنتا بگڑتا ہے؟ جی میں آئے تو ذرا سا رنج کر لینا ورنہ وہ بھی نہ کرنا۔ میں تم سے گِلہ کرنے نہ آؤں گا۔"

پورنا نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تو اس طرح تو میں نہ جاؤں گی۔"

کملا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے جینے نہ دوگی، نہ مرنے دوگی یعنی تمھاری مرضی ہے کہ ہمیشہ تڑپتا ہی رہوں۔ یہ حالت مجھ سے نہ برداشت ہوسکے گی۔ تم جاکر آرام سے

لیٹو اور میری فکر چھوڑ دو۔ مگر نہیں، یہ میری غلطی ہے جو سمجھ رہا ہوں کہ تم میری زندگی کے خیال سے مجھ سے یہ وعدہ کرا رہی ہو۔ یہ صرف بھکاری کو میٹھے الفاظ میں جواب دینے کا ایک طریقہ ہے۔ ہاں وعدہ کرتا ہوں کہ اپنی جان کی حفاظت کرتا رہوں گا اسی طرح جیسے تم میری جان کی حفاظت کرتی ہو۔

پورنا۔ یہ وعدہ میں نہیں جانتی، سچا وعدہ کرو۔

کملا۔ تو جانِ من، یہ گانٹھ میں باندھ لو کہ کملا پرشاد جدائی کی تکلیف سہنے کے لیے زندہ نہیں رہ سکتا۔

پورنا نے رقت کے لہجہ میں کہا۔ ''بابو جی! تم نے مجھے بڑی مصیبت میں مبتلا کر دیا۔ تم مجھے مایا جال میں پھنسا کر میری پوری تباہی و بربادی پر تلے ہوئے ہو۔ میرے دل سے فرض کا احساس مٹا جاتا ہے۔ تم نے مجھ پر جادو سا ڈال دیا ہے......''

کملا نے جوش میں آکر کہا۔''اچھا اب چپ رہو پورنا! ایسی باتوں سے مجھے دلی صدمہ ہو رہا ہے۔ تم سمجھ رہی ہو کہ میں اپنی نفسانی خواہش کو پورا کرنے کے لیے تمھیں مایا جال میں پھنسا رہا ہوں مگر یہ تم میرے ساتھ زیادتی کر رہی ہو۔ تمھیں کیسے یقین دلاؤں کہ یہ مایا جال نہیں بلکہ خالص دلی نذر ہے؟ اگر اس کا انجام دیکھنا چاہتی ہو تو یہ لو۔''

یہ کہہ کر کملا پرشاد نے کھونٹی پر لٹکتی تلوار لی اور اسے میان سے کھینچ کر بولا۔''لاش کو سامنے تڑپتی دیکھ کر یقین کر لینا کہ محبت تھی یا ہوس۔''

اگر پورنا صرف ایک لمحہ صبر سے بیٹھی رہ سکتی تو اسے ضرور ثبوت مل جاتا مگر عورت کا نازک دل سہم گیا۔ یہ بات جان کر کملا پرشاد نے یہ تماشا کیا تھا۔ پورنا نے تلوار اس کے ہاتھ سے چھین لی اور بولی۔ ''میں تم سے کوئی ثبوت نہیں مانگ رہی ہوں۔''

کملا۔ پھر تم نے مایا جال کیسے کہا؟

پورنا۔ خطا ہوئی معاف کیجیے۔

کملا۔ ابھی تمھیں کوئی شبہ ہو تو میں اسے مٹانے کو تیار ہوں۔ اس سے بہتر موت اور میرے لیے کیا ہو سکتی ہے کہ اپنی محبت کی سچائی کا ثبوت دیتے ہوئے تمھارے

سامنے اپنی جان قربان کردوں۔

پورنا نے تلوار کو نیام میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”تم اسی تلوار سے میری زندگی کا خاتمہ کرسکتے تو کتنا اچھا ہوتا مجھے یقین ہے کہ میں ذرا بھی نہ جھجکتی۔ سر جھکائے کھڑی رہتی۔“

یہ جملہ مکار کملا کے دل میں اُتر گیا۔ ایک لمحہ کے لیے اس کو اپنے کمینے پن پر افسوس ہوا۔ بھرّائی ہوئی آواز سے بولا۔”اگر برہما نے بھی میرے ہاتھوں تمھاری موت لکھی ہوتی، اگر اس قتل کے صلے میں مجھ کو تینوں لوک کی سلطنت، بہشت کی ساری حوریں اور دیوتاؤں کی ساری برکتیں ملتی ہوتی تو بھی تمھارے پاک جسم سے خون کا ایک قطرہ بھی نہ بہا سکتا۔ اگر میری روح آلودہ ہوجاتی تو بھی میرا ہاتھ تلوار نہ پکڑسکتا۔ تم نے اس وقت بڑی سخت بات کہہ ڈالی پورنا! ذرا میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر دیکھو، کیسی دھڑکن ہو رہی ہے۔ ہَول دِل سا ہو رہا ہے۔ دیکھو اس طرف پان دان رکھا ہے۔ ایک پان بنا کر کھلا دو۔ اسی کو یاد کرکے دل کو تسکین دوں گا۔“ پورنا نے پان کے دو بیڑے بنا کر کملا کو دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ کملا نے پان لے کر کہا۔ ”کھانے کے بعد کچھ دچھنا ملنی چاہیے۔“

پورنا نے مذاق سے کہا۔ ”پریما ہوتیں تو ان سے کچھ دچھنا دلا دیتی جب آئیں گی تب دلا دوں گی۔“

کملا پان چباتا ہوا بولا۔”میری دچھنا یہی ہے کہ یہ میرے ہاتھ سے کھالو۔“

پورنا۔ نہ میں ایسی دچھنا نہیں لیتی، تمھاری کون چلائے۔ بیڑوں پر کوئی جادو کر دیا ہو۔ مرد اس فن کے بھی تو ماہر ہوتے ہیں، میں پختہ ارادہ کرکے آئی تھی کہ دروازہ پر کھڑے کھڑے تم سے یہاں سے جانے کی بات کرکے چلی جاؤں گی مگر تم نے کچھ ایسا منتر پھونکا کہ میں سب کچھ بھول گئی۔

کملا نے بیڑا، اس کے منہ کے قریب لے جا کر کہا۔ ”میں اپنے ہی ہاتھ سے کھلاؤں گا۔“

پورنا۔ میرے ہاتھ میں دے دو۔

کملا۔ جی نہیں۔ استاد نے مجھے سبق نہیں پڑھایا ہے۔

پورنا۔ کوئی شرارت تو نہ کرو گے؟

پورنا نے منہ کھول دیا اور کملا نے اسے پان کھلا دیا۔ پورنا کا دل دھڑک رہا تھا کہ مبادا کملا کوئی زیادتی نہ کر بیٹھے۔ مگر کملا اتنا بے شعور نہ تھا کہ قریب آتے ہوئے شکار کو دور ہی سے چونکا دیتا۔ اس نے پان کھلا اور پلنگ پر بیٹھ کر کہا۔ ''اب یہاں سے کہیں جانے کا نام نہ لینا، سارا زمانہ چھوٹ جائے مگر تم مجھ سے نہیں چھوٹ سکتیں۔ زندگی بھر کے لیے یہی گھر تمھارا گھر ہے اور میں تمھارا خادم ہوں۔ جس دن تم نے یہاں سے جانے کا نام لیا اسی دن میں نے کسی طرف کا راستہ لیا۔''

پورنا نے ایک لمحہ تک غور کرنے کے بعد کمزور آواز میں کہا۔ ''اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ بابوجی، میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ چوری چھپے کا دھندا کب تک چلے گا؟ آخر ایک دن تمھارا دل مجھ سے ضرور پھر جائے گا۔ تم سمجھنے لگوگے کہ یہ کہاں کا روگ میں نے پالا۔ اس وقت میری کیا گت ہوگی؟ سوچو۔''

کملا نے استقلال سے کہا۔ ''ایسے شکوک کو دل میں نہ آنے دو پیاری، ہر بیاہی عورتیں کیا مردوں کو زنجیروں سے باندھ رکھتی ہیں؟ وہاں بھی تو مرد بات ہی کو نباہتا ہے، جو بات کو پورا کرنا نہیں چاہتا تو کیا بیاہ اسے کسی طرح مجبور کرسکتا ہے؟ سومترا میری بیاہتا ہوکر ہی کیا زیادہ سکھی ہوسکتی ہے۔ یہ تو دل مل جانے کی بات ہے۔ جب بیاہ کے موقع پر بغیر جانے بوجھے کہی جانے والی بات کی اتنی اہمیت ہے تو کیا محبت بھرے دل سے نکلنے والی بات کی کوئی اہمیت ہی نہیں، ذرا سوچو زندگی میں سکھ ہی تو چاہتا ہے یا اور کچھ؟ پھر جس آدمی کے ساتھ اس کی زندگی آرام سے گزر رہی ہے اسے وہ کیسے چھوڑ سکتا ہے، اس کے ساتھ بے دردی یا مکاری کیسے کرسکتا ہے؟''

پورنا نے نرم اعتراض کے لہجہ میں کہا۔ ''بیاہ کی بات اور ہوتی ہے بابوجی میں ایسی نادان نہیں ہوں۔''

کملا نے مسکرا کر کہا۔ ''نہیں تم بھلا نادان ہوسکتی ہو، رام رام تو وید شاستر سبھی پڑھے بیٹھی ہو۔ اچھا بتلاؤ، بیاہ کتنے قسم کے ہوتے ہیں؟''

پورنا۔ بیاہ کتنے قسم کے ہوتے ہیں، اس کا مطلب؟

کملا۔ بڑی عقلمند ہو تو اس کا مطلب سمجھو۔
پورنا۔ کیا بیاہ بھی کئی قسم کے ہوتے ہیں؟ ہم نے تو ایک ہی قسم کا بیاہ سب جگہ دیکھا ہے۔

کملا پرشاد نے بیاہ کے سات اقسام بتلائے۔ کس وقت کون چلن رائج تھا۔ اس کے بعد کون سا چلن رائج ہوا اور موجودہ وقت میں کون کون سے چلن رائج ہیں۔ یہ ساری داستان بہت سی بے سر پیر کی باتوں کے ساتھ مشتاق پورنا سے کہہ سنائیں۔ سمرتیوں کا عالم بھی اتنے غیر مشتبہ انداز سے اس موضوع پر باتیں نہ کر سکتا۔

پورنا نے پوچھا۔ ''تو گندھرب بیاہ ابھی تک ہوتا ہے؟''
کملا۔ ہاں یورپ میں اس کا زیادہ رواج ہے۔ مسلمانوں میں بھی ہے۔ اس ملک میں بھی پہلے تھا مگر اب ایک قانون کے مطابق پھر اس کا رواج ہو رہا ہے۔
پورنا۔ اس بیاہ میں کیا ہوتا ہے؟
کملا۔ کچھ نہیں، عورت اور مرد ایک دوسرے سے قول و قرار کرتے ہیں، بس بیاہ ہو جاتا ہے، ماں باپ، بھائی، پنڈت، پروہت کسی کا کام نہیں، ہاں لڑکا اور لڑکی دونوں ہی کا بالغ ہونا ضروری ہے۔

پورنا نے بے اعتباری کے لہجے میں کہا بیاہ کیا لڑکوں کا کھیل ہے۔ کملا پرشاد نے معترضانہ انداز سے کہا ''میری سمجھ میں تو جسے تم بیاہ سمجھ رہی ہو وہی لڑکوں کا کھیل ہے۔ ڈھول مجیرا بجا کر آتش بازیاں چھوٹیں اور دو نادان بچے جو بیاہ کا بھید بھی نہیں جانتے ایک دوسرے کے گلے سے عمر بھر کے لیے باندھ دیے گئے سچ پوچھو تو یہی بچوں کا کھیل ہے۔''

پورنا نے پھر شک کا اظہار کیا دنیا تو ایسے بیاہ کو نہیں مانتی، کملا پرشاد نے جوش سے کہا ''دنیا اندھی ہے۔ اس کے سارے کاروبار اُلٹے ہیں۔ ایسی دنیا کی پروا نہیں کرتا۔ آدمی کو ایشور نے اس لیے نہیں بنایا ہے کہ وہ رو رو کر اپنی زندگی کے دن گزارے۔ صرف اس لیے کہ دنیا ایسا چاہتی ہے۔ معمولی کاموں میں جب ہم سے کوئی غلطی ہو جاتی ہے تو ہم اسے فوراً درست کرتے ہیں۔ تب زندگی کو ہم کیوں

ایک غلطی کے لیے برباد کریں؟ اگر آج کسی ناگہانی صدمے سے یہ مکان گر پڑے تو ہم کل ہی اسے پھر بنانا شروع کردیں گے۔ مگر جب کسی کمزور عورت کی زندگی پر کوئی ناگہانی آفت پڑجاتی ہے تو اس سے امید کی جاتی ہے کہ وہ ہمیشہ اس کے نام کو روتی رہے۔ یہ کتنی بڑی نا انصافی ہے؟ مردوں نے یہ قاعدہ صرف اپنی نفسانی خواہشات پورا کرنے کے لیے بنایا ہے۔ بس اس کا اور کوئی مطلب نہیں ہے، جس نے اس امر کا فتویٰ دیا چاہے وہ دیوتا ہو چاہے رشی، چاہے مہاتما، میں اسے انسانی طبقے کا سب سے بڑا دشمن سمجھتا ہوں۔ عورتوں کے لیے شوہر پرستی کی پخ لگا دی۔ دوبارہ بیاہ ہوتا تو اتنی اناتھ عورتیں ان کے پنجہ میں کیسے آتیں؟ بس یہی سارا راز ہے۔ انصاف تو ہم تب سمجھتے جب مردوں کو بھی ویسی ہی ممانعت ہوتی۔"

پورنا بولی۔"سمرتیاں مردوں ہی کی بنائی تو ہوں گی؟"

کملا۔ اور کیا سب دغابازوں کی کارروائی ہے۔

پورنا۔ اچھا تو تم بابو امرت رائے کو کیوں بدنام کرے ہو؟

کملا۔ صرف اس لیے کہ ان کے طور و طریقے اچھے نہیں۔ وہ بیاہ کی قید میں نہ پڑ کر چھٹے ساانڈ بنے رہنا چاہتے ہیں۔ ان کا بدھوا آشرم ان کی نفس پرستی کا مقام ہوگا۔ اس لیے ہم ان کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اگر وہ بیوہ سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو ملک میں بیواؤں کا بھلا ہوگا مگر وہ شادی نہ کریں گے۔ بعض لوگوں کو ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلنے میں مزہ آتا ہے، مگر ایشور نے چاہا تو ان کا آشرم تیار نہ ہو سکے گا۔ سارے شہر میں انھیں کوڑی بھر کی بھی مدد نہ ملے گی۔ (گھڑی کی طرف دیکھ کر) ارے دو بج رہے ہیں۔ اب دیر نہ کرنی چاہیے۔ آؤ اس چراغ کے سامنے ایشور کو گواہ کرکے ہم دونوں قسم کھائیں کہ عمر بھر ہم متاہلانہ عہد کا ایفا کریں گے۔

پورنا کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا، وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور بولی! "ابھی نہیں بابو جی! سال بھر نہیں۔ تب تک سوچ لو۔ میں بھی سوچ لوں۔ جلدی کیا ہے؟"

یہ کہتی ہوئی وہ دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکل گئی اور کملا پرشاد کھڑے تاکتے رہ گئے۔ چڑیا دانہ چگتے چگتے قریب آگئی تھی۔ مگر جیوں ہی شکاری نے ہاتھ بڑھایا وہ پُھر سے اُڑ گئی! مگر کیا وہ ہمیشہ شکاری کی ترغیبوں سے بچتی رہے گی؟

پورنا کتنا ہی چاہتی تھی کہ کملا پرشاد کی طرف سے اپنا دل پھیر لے مگر یہ شک اس کے دل میں سما گیا تھا کہ مبادا انھوں نے خودکشی کرلی تو کیا ہوگا؟ رات کو وہ کملا پرشاد سے بے رخی کرکے چلی تو آئی تھی مگر بقیہ رات اس نے اسی اندیشے میں گزار دی۔ اس کا منحرف دل عقیدتِ شوہری، ضبطِ عہد کے خلاف طرح طرح کی دلیلیں کرنے لگا۔ کیا وہ مرجاتی تو اس کا شوہر دوسرا بیاہ نہ کرتا؟ ابھی ان کی عمر ہی کیا تھی؟ پچّیس برس کی عمر میں کیا وہ مجرد رہ کر زندگی بسر کرنے کا عہد کرتے؟ ہرگز نہیں۔ اب اسے یاد ہی نہ آتا تھا کہ پنڈت بسنت کمار نے اس کے ساتھ کبھی اتنی گہری محبت کا اظہار کیا تھا۔ انھیں اتنی فرصت ہی کہاں تھی؟ سارے دن تو دفتر میں بیٹھے رہتے تھے۔ پھر انھوں نے اسے آرام ہی کیا پہنچایا؟ ان کے ساتھ بھی رو رو کر ہی زندگی بسر ہوتی تھی، کیا رو رو کر جان دینے کے لیے اس کا جنم ہوا ہے؟ سورگ اور نرک سب ڈھکوسلا ہے۔ اب اس سے زیادہ تکلیف وہ نرک کیا ہوگا؟ جب نرک ہی میں رہنا ہے تو نرک ہی سہی۔ کم از کم زندگی کے کچھ دن آرام سے گزریں گے، جینے کا کچھ سکھ تو ملے گا۔ جس سے محبت ہو وہی اپنا سب کچھ ہے۔ بیاہ وغیرہ سب کچھ دکھاوا ہے۔ چار حروف سنسکرت کے پڑھ دینے سے کیا ہوتا ہے؟ مطلب تو صرف یہی ہے نہ کہ کسی طرح عورت کی پرورش ہو۔ اونہہ اس فکر میں کوئی کیوں مرے؟ بیاہ کیا عورت کو مرد سے باندھ دیتا ہے؟ وہ بھی ملنے ہی کا سودا ہے۔ عورت اور مرد کا دل نہ ملا تو بیاہ کیا ملا دے گا بیاہ ہونے پر بھی تو مرد کی جب خواہش ہوتی ہے تو عورت کو چھوڑ دیتا ہے۔ بیاہ کے بغیر بھی تو عورت مرد زندگی بھر محبت سے رہتے ہیں۔

اسی قسم کے بڑے سوچ بچار میں پڑے رہ کر پورنا نے سویرا کردیا۔

علی الصباح وہ بالوں میں کنگھی کر رہی تھی کہ سومترا آکر کھڑی ہوگئی۔ پورنا نے ملائمت سے کہا۔ ”بیٹھو بہن! آج تو بڑے سویرے نیند کھل گئی!“ سومترا نے سخت لہجہ میں کہا۔ ”نیند آئی ہی کیسے تھی؟“

پورنا۔ نہ جانے کس طبیعت کے آدمی ہیں؟

سومترا۔ کیا تم نے بھی ابھی تک ان کی تھاہ نہیں پائی؟ تم تو ان باتوں میں بڑی ہوشیار ہو؟“

پورنا نے مشتبہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”میں نے یہ علم نہیں پڑھا ہے۔“

سومترا۔ پہلے میں بھی ایسا ہی سمجھتی تھی، مگر اب معلوم ہوا کہ مجھے دھوکا ہوا تھا۔

پورنا نے مصنوعی غصے سے کہا۔ ”تم تو بہن آج لڑنے آئی ہو۔“

سومترا۔ ہاں آج لڑنے ہی آئی ہوں۔ ہم تم دونوں اب اس مکان میں نہیں رہ سکتے۔

پورنا نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ ایسا معلوم ہوا گویا زمین نے اپنے سارے بوجھ سے اُسے دبا دیا ہو۔

سومترا نے پھر کہا۔ ”تم نے جب پہلے پہل اس گھر میں قدم رکھا تھا نا جبھی میں کھٹکی تھی، مجھے اسی وقت یہ اندیشہ ہوا تھا کہ تمھارا یہ حسن و شباب اور اس پر یہ سادہ مزاجی میرے لیے مضرت رساں ہوگا۔ اس لیے میں نے تمھیں اپنے ساتھ رکھنا شروع کیا لیکن شدنی کو کون ٹال سکتا ہے؟ میں جانتی ہوں کہ تمھارا دل صاف ہے، اگر تمھیں کوئی نہ چھیڑتا تو تم تمام عمر اپنے عہد پر قائم رہتیں۔ مگر پانی میں رہ کر اس کے تھپیڑوں سے بچا رہنا تمھاری طاقت کے باہر تھا۔ بے لنگر کی کشتی لہروں میں ساکت نہیں رہ سکتی۔ پڑی ہوئی دولت کو اُٹھا لینے میں کسے تامل ہوتا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیا ہے پورنا! تم دھوکا نہیں دے سکتیں۔ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں وہ تمھارے ہی بھلے کی کہہ رہی ہوں۔ اب بھی اگر بچ سکتی ہو تو اس بدکار شخص کا سایہ بھی اپنے اوپر نہ پڑنے دو۔ یہ نہ سمجھو کہ میں اپنے لیے اپنے پہلو کا کانٹا نکالنے کے لیے تم سے یہ باتیں کہہ رہی ہوں۔ میں جیسی تب تھی ویسی ہی اب ہوں۔ میرے لیے تو جیسے ”کتا گھر رہے ویسے رہے بدلیں۔“ والی مثل ہے۔ البتہ مجھے تمھاری فکر ہے۔ یہ شیطان تمھیں کہیں کا نہ رکھے گا۔ میں تمھیں ایک صلاح دیتی ہوں۔ کہو تو کہوں، کہو تو نہ کہوں۔“

پورنا نے مُنہ سے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف ایک مرتبہ دُکھ بھری آنکھوں سے دیکھ کر سر جھکا لیا۔

سومترا بولی۔ ”اس سے تم صاف صاف کہہ دو کہ وہ تم سے شادی کر لے۔“

پورنا نے آنکھیں پھیلا کر دیکھا۔

سومترا۔ شادی میں صرف ایک بار جگ ہنسائی ہے، پھر کوئی کچھ نہ کہہ سکے گا۔ اس طرح چھپ چھپ کر ملنا تو آتما اور پرلوک دونوں کو تباہ کر دے گا۔ اس کی محبت کا امتحان بھی ہوجائے گا۔ اگر وہ شادی کرنے پر رضامند ہوجائے تو سمجھ لینا کہ اس کو تم سے سچی محبت ہے ورنہ سمجھ لینا کہ اس نے نفس پرستی کی دھن میں تمھاری آبرو ریزی کا تہیہ کر لیا ہے۔ اگر وہ انکار کرے تو اس سے پھر نہ بولنا اور نہ اس کی صورت دیکھنا۔ میں کہو تو لکھ دوں کہ وہ شادی کرنے پر کبھی رضامند نہ ہوگا۔ وہ تمھیں خوب سبز باغ دکھائے گا، طرح طرح کے حیلے کرے گا مگر خبردار، اس کی باتوں میں نہ آنا۔ پکا جعل ساز ہے۔ رہی میں، سو میں نے تو ٹھان لیا ہے کہ لالہ کے منہ میں کالکھ لگا دوں گی، بلا سے میری آبرو جائے، بلا سے میری بربادی ہوجائے مگر انھیں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رکھوں گی۔

پورنا نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ ”میں ہی کیوں نہ منہ میں کالکھ لگا کر کہیں ڈوب مروں بہن؟“

سومترا۔ تمھارے ڈوب مرنے سے میرا کیا فائدہ ہوگا؟ نہ وہ اپنی عادت چھوڑ سکتے ہیں اور نہ میں اپنی عادت چھوڑ سکتی ہوں۔ نہ وہ پیسوں کو دانت سے پکڑنا چھوڑیں گے اور نہ میں پیسوں کو ہیچ سمجھنا چھوڑوں گی۔ انھیں چھچھورے پن سے رغبت ہے، اپنے مُنہ میاں مٹھو بننے کا خبط ہے، مجھے ان باتوں سے نفرت ہے۔ اب تک میں نے ان کو اتنا چھچھورا نہ سمجھا تھا۔ سمجھتی تھی کہ وہ محبت کرسکتے ہیں، خود ان سے محبت کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ مگر رات میں نے جو کچھ دیکھا اس نے ان کی رہی سہی عزت بھی مٹا دی اور ساری برائیاں سہہ سکتی ہوں مگر بدچلنی کا سہنا میری طاقت سے باہر ہے۔ میں ایشور کی قسم کھاکر کہتی ہوں پورنا! تمھارے متعلق مجھے کوئی شکایت نہیں۔ تمھاری طرف سے میرا دل بالکل صاف ہے، بلکہ مجھے تمھارے اوپر رحم آتا ہے۔ میں نے اگر غصے میں کوئی سخت بات کہہ دی ہو تو معاف کرنا۔ جلتے ہوئے دل سے دھوئیں کے سوا اور کیا نکل سکتا ہے؟

پورنا کا سارا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔ گویا زمین نیچے دھنسی جاتی تھی، اس کا دل کبھی اتنا کمزور نہ ہوا تھا۔ وہ کوئی اعتراض نہ کرسکی۔ اس کی زندگی اس وقت

سومترا کی مٹھی میں تھی۔ سومترا کے بجائے وہ ہوتی تو کیا وہ اتنی فراخ دل ہو سکتی تھی؟ ہرگز نہیں۔ وہ اس کو زہر کھلا دیتی۔ اس کے حلق پر چھری پھیر دیتی، اس رحم نے بدنصیب پورنا کو اتنا متاثر کیا کہ وہ روتی ہوئی اس کے قدموں پر گر پڑی اور سسکیاں بھرتی ہوئی بولی۔ ”بہن! مجھ پر رحم کرو!“

سومترا نے اُسے اُٹھا کر سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”میں نے کہہ دیا بہن کہ میرا دل تمھاری طرف سے صاف ہے۔ بس اب تو ایسی تدبیر کرنی چاہیے کہ اس مکار سے پیچھا چھوٹے۔ اسے تمھاری طرف دیکھنے کی بھی جرأت نہ ہو۔ اسے تم اب کی کتے کی طرح دتکار دو۔“

پورنا نے عاجزانہ لہجہ میں کہا۔ ”بہن میں کیا کرتی؟ میرے بجائے تم ہوتیں تو شاید تم بھی وہی کرتیں جو میں نے کیا تھا۔ انھوں نے اپنی جان دے ڈالنے کی دھمکی دی ہے۔“

سومترا نے ہنس کر کہا۔ ”تو کیا تم سمجھتی ہو کہ یہ سن کر میں بھی اس کے آگے سر جھکا دیتی؟ ہزار بار نہیں، میں صاف کہتی کہ ضرور جان دے دو، کل دیتے ہو آج دے دو۔ تم سے نہ بنے تو لاؤ میں تمھیں موت کے گھاٹ اُتار دوں۔ ان بدمعاش مکاروں کا یہ بھی ایک لٹکا ہے۔ اسی طرح محبت جتا کر یہ عورتوں پر اپنا رنگ جماتے ہیں، ایسے بے حیا مرا نہیں کرتے، مرتے وہ ہیں جن میں سچائی کی طاقت ہوتی ہے۔ ایسے نفس کے بندے مر جائیں تو دنیا بہشت بن جائے۔ یہ بدکار بازاری عورتوں کے پاس نہیں جاتے۔ وہاں ان کی نانی مرتی ہے۔ پہلے تو رنڈی پوری پوجا لیے بغیر سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتی، دوسرے وہاں شہر کے شہدوں کا جمگھٹا رہتا ہے، کہیں کسی سے مڈبھیڑ ہوجائے تو ان کی ہڈی پسلی چور کردے۔ یہ ایسے ہی شکار کی تلاش میں رہتے ہیں۔ جہاں نہ پیسے کا خرچ ہے، نہ پٹنے کا خوف، ہڑ لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آوے۔ چکنی چپڑی باتیں کیں۔ محبت کا سوانگ بھرا اور بس ایک بے یار دل کے مالک بن بیٹھے۔“

پورنا نے کچھ تیزی سے کہا۔ ”میری عقل پر نہ جانے کیوں پردہ پڑگیا ہے۔“

سومترا نے تسکین دیتے ہوئے کہا۔ ”تمھارے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بہن، ایسا پردہ پڑنا کوئی انوکھی بات نہیں، میں خود نہیں کہہ سکتی کہ محبت کی میٹھی میٹھی باتوں میں پڑکر کیا کر بیٹھتی۔ یہ معاملہ بڑا نازک ہے بہن، دولت سے چاہے آدمی کا جی بھر جائے مگر

محبت سے نہیں بھرتا۔ ایسے کان بہت کم ہیں جو محبت کے الفاظ سن کر پھول نہ اُٹھیں۔"

دفعتاً کملا پرشاد ہاتھ میں ایک خط لیے ہوئے آیا۔ مگر دروازے کے اندر قدم رکھتے ہی سومترا کو دیکھا تو جھجکتے ہوئے بولا۔"پورنا، پریما نے تمھیں بلایا ہے۔ میں نے گاڑی تیار کرنے کو کہہ دیا ہے، چلو تمھیں پہنچا دوں۔"

پورنا نے سومترا کی طرف دیکھا۔ گویا اس سے پوچھ رہی تھی کہ تمھاری کیا رائے ہے۔ مگر سومترا دیوار کی طرف تاک رہی تھی۔ گویا اسے پورنا سے کوئی سروکار ہی نہ تھا۔

پورنا نے ہچکتے ہوئے کہا "آپ جائیں میں کسی وقت چلی جاؤں گی۔"

کملا۔ نہیں شاید کوئی ضروری کام ہے، اس نے ابھی بلایا ہے۔

پورنا نے سومترا کی طرف دیکھا، مگر سومترا ہنوز دیوار کی طرف تاک رہی تھی۔ پورنا سے نہ ہاں کہتے بنتا تھا نہ نہیں، پریما سے وہ ادھر مہینوں سے نہ مل سکی تھی۔ اس سے ملنے کے لیے دل بے قرار ہو رہا تھا، نہ جانے کیوں بلایا ہے، اتنی جلدی بلایا ہے تو یقیناً کوئی ضروری کام ہوگا۔ رات بھر کی بات ہے، ان کے ساتھ جانے میں ہرج ہی کیا ہے؟ وہاں دو چار روز رہنے سے دل بہل جائے گا۔ ان حضرت سے تو پنڈ چھوٹ جائے گا۔ یہ سوچ کر اس نے کہا۔"آپ کیوں تکلیف کیجیے گا۔ میں تنہا چلی جاؤں گی۔"

کملا نے جھنجھلا کر جواب دیا۔"اچھی بات ہے۔ جب مرضی ہو چلی جانا میں تو اسی وقت جا رہا ہوں۔ دان ناتھ بابو سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ میں نے تمھارے آرام کے خیال سے کہا تھا کہ اسی گاڑی پر تمھیں بھی لیتا چلتا۔"

پورنا اب کوئی اعتراض نہ کر سکی۔ بولی "تو کب جایئے گا؟"

کملا نے دروازے کے باہر قدم رکھتے ہوئے کہا "میں تیار ہوں۔"

پورنا بھی جھٹ پٹ تیار ہوگئی۔ کملا چلا گیا تو اس نے سومترا سے کہا "ان کے ساتھ جانے میں کوئی ہرج تو نہیں ہے؟"

سومترا نے تسلی دیتے ہوئے کہا "ساتھ جانے میں کیا ہرج ہے مگر دیکھو مجھے بھول نہ جانا، جلد ہی آنا۔"

سومترا نے یہ بات صرف دنیاداری کے خیال سے کہی تھی ورنہ دل میں وہ پورنا کے

جانے پر مطمئن تھی۔ پورنا کا دل کملا پرشاد کی طرف سے منحرف کر دینے کے بعد اس کے لیے اس سے بہتر اور کون سی بات ہوسکتی تھی کہ ان دونوں میں کچھ دنوں کے لیے علاحدگی ہوجائے؟ پورنا یہاں آنا نہ چاہے گی اور پریما خود اس سے جانے کو کیوں کہنے لگی۔ اس کے یہاں رہنا گوارہ کرلے تو اس کی مُنہ مانگی مراد مل جائے۔ سومترا کو پورنا کے چلے جانے میں اپنی بھلائی نظر آئی۔

لیکن جب پورنا تانگے پر بیٹھی اور دیکھا کہ گھوڑے کی باگ کسی کوچوان کے ہاتھ میں نہیں بلکہ کملا پرشاد کے ہاتھ میں ہے تو اس کا دل ایک نہ معلوم اندیشہ سے دہل گیا۔ ایک بار جی میں آیا کہ تانگے سے اُتر پڑے مگر اس کے لیے کوئی بہانہ نہ سوجھا۔ وہ اسی دبدھا میں پڑی ہوئی تھی کہ کملا پرشاد نے گھوڑے کو چابک لگائی اور تانگہ چل پڑا۔

کچھ دور تک تو تانگہ جانے ہوئے راستہ پر چلا۔ وہی مندر تھے، وہی دکانیں تھیں، پورنا کا شک رفع ہونے لگا۔ لیکن ایک موڑ پر تانگے کو گھومتا دیکھ کر پورنا کو ایسا معلوم ہوا کہ سیدھا راستہ چھوٹا جا رہا ہے۔ اس نے کملا سے پوچھا "ادھر سے کہاں چل رہے ہو؟"

کملا نے استقلال سے کہا "ادھر پھیر تھا۔ اس راستے سے جلد پہنچیں گے۔"

پورنا خاموش ہوگئی۔ کئی منٹ تک ایک گلی میں تانگہ چلنے کے بعد تانگہ چوڑی سڑک پر پہنچا۔ ایک لمحے کے بعد اس نے ریلوے لائن پار کی۔ اب آبادی بہت کم ہوگئی تھی۔ صرف دور دور پر انگریزوں کے بنگلے بنے ہوئے تھے۔

پورنا نے گھبرا کر پوچھا "تم مجھے کہاں لیے جاتے ہو؟"

کملا۔ پورنا! اپنے باغیچے تک چل رہا ہوں۔ کچھ دیر وہاں سیر کرکے پریما کے مکان پر چلیں گے۔

پورنا۔ تم نے مجھ سے باغیچے کا ذکر بھی نہ کیا تھا ورنہ میں کبھی نہ آتی۔

کملا۔ ارے تو دس منٹ کے لیے یہیں رک جاؤ گی تو ایسا کیا غضب ہوجائے گا؟

پورنا۔ تانگہ لوٹا دو۔ ورنہ میں کود پڑوں گی۔

کملا۔ کود پڑو گی تو ہاتھ پیر ٹوٹ جائیں گے۔ میرا کیا بگڑے گا؟

پورنا نے خوف زدہ نگاہوں سے کملا کو دیکھا۔ وہ اسے اس سنسان مقام میں کیوں لے آیا ہے؟ کیا اس نے دل میں کچھ اور ٹھانی ہے؟ یہ اتنا کمینہ اتنا بدمعاش

نہیں ہوسکتا اور بنگلے پر دس پانچ منٹ ٹھہر جانے میں ہی کیا بگڑ جائے گا۔ آخر وہاں بھی نوکر چاکر ہوں گے۔

ذرا دیر میں باغیچہ بھی آپہنچا۔ کملا نے تانگے سے اُتر کر پھاٹک کھولا۔ اسے دیکھتے ہی دو مالی دوڑے ہوئے آئے۔ ایک نے گھوڑے کی راس پکڑی، دوسرے نے کملا کا ہینڈ بیگ اُٹھا لیا۔ کملا نے پورنا کو آہستہ سے تانگے پر سے اُتارا اور اس کو اندر کے سجے ہوئے بنگلے میں لے جاکر کہا "یہ جگہ تو ایسی بُری نہیں ہے کہ یہاں گھنٹے دو گھنٹے ٹھہرا نہ جاسکے۔"

پورنا نے چالاکی سے اپنی حفاظت کرنے کا ارادہ کرلیا۔ بولی "پریما میری راہ دیکھ رہی ہوں گی، اس لیے میں جلدی کر رہی تھی۔"

کملا۔ "اجی باتیں نہ بناؤ، میں سمجھتا ہوں، تم ایسا بدکار سمجھتی ہو، اس کا مجھے گمان بھی نہ تھا۔ وہ دیوی جس کے اشارے پر بس اپنی جان قربان کرنے کو تیار ہوں، مجھے اتنا ذلیل اور بدکار سمجھتی ہے۔ یہ میرے لیے ڈوب مرنے کی بات ہے۔

پورنا نے نادم ہوکر کہا "تم یہ کیسے سمجھ گئے کہ میں تمھیں ذلیل و خوار سمجھی ہوں۔"

کملا۔ آخر گاڑی سے کود پڑنے پر کیوں آمادہ تھیں؟ کیوں بار بار تانگہ لوٹا دینے کی بات کہہ رہی تھیں؟ چادر اُتار ڈالو، ذرا آرام سے بیٹھو، یہ بھی اپنا ہی گھر ہے، کوئی سرائے نہیں۔ ہاں اب بتاؤ کہ تم مجھ سے کیوں اتنا ڈرتی ہو؟ کیا میں قاتل ہوں، ڈاکو ہوں، عیاش ہوں، بدمعاش ہوں، میں نے تمھارے ساتھ ایسا کون سا برتاؤ کیا ہے جس سے تم نے میرے بارے میں ایسی رائے قائم کرلی؟ میں نے تمھاری مرضی کے خلاف اپنے مُنہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا پھر بھی تم مجھے اتنا کمینہ سمجھتی ہو! تمھاری اس بدگمانی کا صرف ایک ہی سبب ہوسکتا ہے۔ سومترا نے تمھارے کان بھرے ہیں۔ آج میں نے دیکھا کہ تمھارے پاس بیٹھی جھوٹی سچی اُڑا رہی تھی۔ تم اس کی باتوں میں آگئیں۔ میں جانتا ہوں کہ اس نے میرے بارے میں خوب زہر اُگلا ہوگا۔ مجھے دغاباز، کمینہ، بدچلن، سب کچھ کہا ہوگا۔ یہ سب صرف اس لیے تھا کہ تمھارا دل مجھ سے برگشتہ ہوجائے۔ میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں، اس

کی مٹھی میں نہ رہوں تو بدکار و زناکار ہوں۔ اس کے لیے یہ نا قابلِ برداشت ہے کہ میں کسی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھ لوں۔ نہیں وہ مجھے اپنا کتا بنا کر رکھنا چاہتی ہے کہ روز مرہ اس کے پیچھے دم ہلاہلا کر دوڑتا پھروں، اس کی آواز سنتے ہی جاکر اس کے پیر چاٹنے لگوں، تب وہ مجھے اپنی میز پر بٹھائے گی۔ گود میں لے کر پیار کرے گی، چومے گی، تھپکی دے گی، سہلائے گی، لیکن کہیں اس کے اشارے پر دوڑا ہوا نہ گیا تو پھر ڈنڈا، ہنٹر، ٹھوکر کے لیے مجھے تیار رہنا چاہیے۔ اگر میں کتا بن کر رہ سکتا تو آج مجھ سا خوش قسمت آدمی دنیا میں کوئی نہ ہوتا؟ مگر بدقسمتی کی بات ہے کہ مجھ میں وہ اوصاف نہیں ہیں، میں مرد ہوں اور مرد ہی رہنا چاہتا ہوں۔

پورنا کے دل سے سومترا کا جادو اُترنے لگا۔ تلون کمزوریوں کا خاصا ہے۔ ان پر نہ باتوں کا اثر ہوتے دیر لگتی ہے اور نہ اس کے مٹتے۔

پورنا بولی۔"وہ ساری خطا تمھاری ہی بتلاتی ہیں۔"

کملا۔ ہاں ہاں، وہ بتلائیں گی ہی اور کیا فرماتی تھیں؟

پورنا۔ سیکڑوں باتیں، کہاں تک کہوں؟ یاد بھی تو نہیں۔

کملا۔ جبھی تم میرے ساتھ آتے گھبراتی تھیں۔ تمھیں یہ باغ پسند ہے؟

پورنا۔ جگہ تو بُری نہیں۔

کملا۔ جی چاہتا ہے کہ ایک مہینہ تمھیں یہیں رکھوں۔

پورنا۔ سومترا بھی یہاں رہنے پر راضی ہو تب نا۔

کملا۔ اسے تو میں بھول کر نہ لاؤں۔

پورنا۔ تو میں تنہا یہاں کیسے رہوں گی؟

کملا۔ تمھارے یہاں رہنے کی کسی کو خبر ہی نہ ہوگی۔ تمھارے برندابن چلے جانے کی بات پھیلا دی جائے گی۔ مگر رہوگی تم اس باغیچے میں۔ میں صرف ایک بار مکان جایا کروں گا۔ یہاں کے آدمیوں کو تاکید کردی جائے گی کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ اس مسرت کے خیال ہی سے میرا دل ناچ اُٹھتا ہے وہی زندگی میری دنیاوی مسرت کی بہشت ہوگی۔ کوئی بات ایشور کی مرضی کے بغیر نہیں۔

پورنا! ایک پتی بھی اس کے حکم کے بغیر نہیں ہل سکتی۔ سومترا مجھ سے

ناراض ہے تو ایشور کی مرضی ہے، تم مجھ پر مہربان ہو تو یہ بھی ایشور کی مرضی ہے۔ کیا ہمارا تمھارا میل ایشور کی مرضی کے بغیر ہو سکتا ہے۔ کبھی نہیں، یہ کھیل وہ کیوں کھیل رہا ہے۔ اسے ہم اور تم نہیں سمجھ سکتے۔ پورنا! بڑے بڑے رشی منی بھی نہیں سمجھ سکتے۔ مگر ہو رہا ہے سب اسی کی مرضی سے۔ دھرم اور ادھرم یہ سب ڈھکوسلا ہے۔ اگر ابھی تک تمھارے دل میں کوئی دھرم کا خیال ہو تو اسے اب نکال ڈالو، آج سے تم میری دل و جان کی مالکہ ہو اور میں تمھارا غلام۔

یہ کہتے ہوئے کملا نے پورنا کا ہاتھ پکڑ کر اپنی گردن میں ڈال لیا اور دونوں ہم آغوش ہوگئے۔ پورنا ذرا بھی نہ جھجکی۔ اس نے خود کو علاحدہ کرنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی مگر اس کے چہرے پر خوشی کی کوئی علامت نہ تھی نہ لبوں پر تبسم تھا، نہ رخساروں پر گلاب کا رنگ نہ آنکھوں میں محبت کی سرخی، اس کا کنول سا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ نیچے جھکی ہوئی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز، سارا بدن سُست سا معلوم ہوتا تھا۔

کملا نے پوچھا۔ ''اُداس کیوں ہو پیاری؟ یہ تو خوشی کا وقت ہے؟''

پورنا نے دُکھ بھری آواز میں کہا۔ ''اُداس تو نہیں ہوں؟''

پورنا کیوں اُداس تھی۔ وہ اس کو کملا سے نہ کہہ سکی۔ اسے اس وقت بسنت کمار کی یاد نہ تھی۔ دھرم کا خیال نہ تھا۔ بلکہ کملا کی ہم آغوشی پر مست ہوتے ہوئے اس وقت یہ اندیشہ ہو رہا تھا کہ اس محبت کا انجام کیا ویسا ہی خوفناک ہوگا؟ قسمت کا بے دردانہ کھیل پھر اس کے مسرت بھرے خواب کو دور تو نہ کردے گا؟ وہ منظر اس کی آنکھوں میں پھر گیا۔ جب اول مرتبہ اس کے شوہر نے اسے گلے لگایا تھا۔ اس وقت اس کا دل کتنا بے خوف، کتنا امنگوں سے معمور تھا۔ مگر اس وقت کے بجائے اندیشے تھے آفتیں تھیں۔

وہ اسی نیم ہوشی کی حالت میں تھی کہ کملا نے آہستہ سے اسے کوچ پر لٹا دیا اور دروازہ بند کرنے جا ہی رہا تھا کہ پورنا نے اس کے چہرہ کی طرف دیکھا اور چونک پڑی۔ کملا کی دونوں آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ یہ باطنی مسرت کی تاباں اور خوشگوار روشنی نہ تھی۔ یہ کسی درندے کی خونی تشنگی کا عکس تھی۔ ان میں عاشق

کی نور افزا خواہش نہیں بلکہ شکاری کا خونخوار قصد تھا۔ ان میں ساون کی کالی گھٹاؤں کا خوش کن سماں نہیں بلکہ بادلوں کا خوفناک ظہور تھا، ان میں شرد رت کے صاف آب رواں کا ملائم نغمہ نہیں بلکہ برکھا رت کی قیامت خیز طغیانی کا خوفناک شور تھا۔ پورنا سہم گئی۔ وہ جھپٹ کر کوچ سے اُٹھی۔ اس نے کملا کے ہاتھ کو جھٹکے کے ساتھ کھینچ لیا اور دروازہ کھول کر برآمدے میں نکل گئی۔

کملانے شرارت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ''کیوں، کیوں پورنا کہاں جاتی ہو؟''

پورنا نے بے خوف ہوکر کہا۔ ''میں گھر جاؤں گی، تانگہ کہاں ہے؟''

کملا۔ گھر جانے کی ابھی کیا ہے؟ تم ڈر کیوں گئیں؟

پورنا۔ تانگہ لاؤ میں جاؤں گی۔

کملا۔ اتنی جلدی تو تم نہ جاسکو گی پورنا! آخر یکایک یہ تمھیں ہو کیا گیا؟

پورنا۔ کچھ ہوا نہیں، میں یہاں ایک لمحہ بھر بھی نہیں ٹھہرنا چاہتی۔

کملا۔ اور اگر میں جانے نہ دوں؟

پورنا۔ تم مجھے روک نہیں سکتے۔

کملا۔ مان لو میں روک ہی لوں؟

پورنا۔ تو میں شور مچاؤں گی۔

کملا نے ہنس کر کہا۔ ''تمھارا شور سننے والا یہاں ہے ہی کون؟ تم اب میرے قابو میں ہو، اب یہاں سے بچ کر نہیں جاسکتیں۔ دونوں مالی میرے نوکر ہیں۔ وہ کبھی نہ آویں گے، تیسرا آدمی یہاں میل بھر تک نہیں ہے۔''

پورنا نے کملا کی طرف شعلہ بار نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ''کملا بابو! میں دست بستہ کہتی ہوں کہ مجھے یہاں سے جانے دو ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ سوچو کہ ابھی ایک منٹ پہلے تم مجھ سے کیسی باتیں کر رہے تھے۔ کیا تم اتنے بے حیا ہو کہ مجھ پر جبر کرنے کے لیے بھی تیار ہو؟ لیکن تم دھوکے میں ہو، اپنا دھرم چھوڑنے سے پہلے یا تو اپنی جان دے دوں گی یا تمھاری جان لے لوں گی۔''

کملا نے تمسخرانہ انداز سے کہا۔ ''تب تم واقعی بہادر عورت ہو مگر افسوس یہی کہ یہ اسٹیج نہیں، یہاں تمھاری بہادری پر تالیاں بجانے والا کوئی نہیں ہے۔''

یہ کہتے ہوئے کملا نے ایک قدم آگے رکھا اور چاہا کہ پورنا کا ہاتھ پکڑ لے۔ پورنا پیچھے ہٹ گئی۔ کملا اور آگے بڑھا۔ دفعتاً پورنا نے دونوں ہاتھوں سے ایک کرسی اُٹھا لی اور اسے کملا کے چہرے پر جھونک دیا۔ کرسی کا ایک پایہ پورے زور کے ساتھ کملا کے مُنہ پر پڑا جس سے ناک میں گہری چوٹ آئی اور ایک دانت بھی ٹوٹ گیا۔ کملا اس جھونکے سے نہ سنبھل سکا۔ چاروں شانے چت زمین پر گر پڑا۔ ناک سے خون جاری ہوگیا۔ اسے غش آگیا۔ اس کو اسی حالت میں چھوڑ کر پورنا لپک کر باغیچے کے باہر نکل گئی۔ سڑک پر اب سناٹا تھا۔ پورنا کو اب اپنی جان بچانے کی فکر تھی۔ کہیں اس کو کوئی پکڑ نہ لے۔ قیدی بن کر ہتھکڑیاں پہنے ہوئے ہزاروں آدمیوں کے سامنے اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ چھوٹی سی پُلیا دکھائی دی۔ وہ لپک کر سڑک کے نیچے اتری اور اس پُلیا میں گھس گئی۔

اس وقت اس کی حالت نہایت رقت انگیز تھی۔ سینہ دھڑک رہا تھا۔ جان ناخونوں میں سمائی ہوئی تھی۔ ذرا بھی کھٹکا ہوتا تو وہ چونک پڑتی۔ سڑک پر چلنے والوں کا سایہ نالہ میں پڑتا دیکھ کر اس کی آنکھوں میں اندھیرا سا چھا جاتا۔ کہیں اسے پکڑنے کوئی نہ آتا ہو۔ اگر کوئی آگیا تو وہ کیا کرے گی۔ اس نے ایک اینٹ اپنے پاس رکھ لی تھی۔ اس اینٹ کو وہ اپنے سر پر مارے گی۔ پولیس والوں کے پنجے میں پھنسنے کی بہ نسبت سر پھوڑ کر مر جانا کہیں بہتر تھا۔ سڑک پر آنے جانے والوں کی ہلچل سنائی پڑ رہی تھی۔ ان کی باتیں بھی کانوں میں پڑجاتی تھیں۔ ایک مالی بدری پرشاد کو خبر دینے کے لیے دوڑ گیا تھا۔ ایک گھنٹہ کے بعد سڑک پر سے ایک بگھی نکلی۔ معلوم ہوا کہ بدری پرشاد آگئے۔ آپس میں کیا باتیں ہو رہی ہوں گی؟ شاید تھانہ میں اس کی رپٹ کی گئی ہو۔ پھر باغیچے سے ایک تانگہ نکلتا ہوا دکھائی دیا۔ شاید ڈاکٹر ہوگا۔ چوٹ تو ایسی نہیں آئی مگر بڑے آدمیوں کے لیے ذرا سی بات بھی بہت ہوجاتی ہے۔

اس وقت پورنا کو اپنی اس حرکت پر پشیمانی ہوئی۔ اس نے اگر ذرا صبر سے کام لیا ہوتا تو کملا پرشاد کبھی ایسی شرارت نہ کرتا، چالاکی سے کام نکل سکتا تھا۔ مگر شدنی کون ٹال سکتا ہے؟ لیکن یہ بھی اچھا ہی ہوا، بچہ کی عادت چھوٹ جائے گی۔ اب بھول کر بھی ایسی شرارت نہ کریں گے۔ لالہ نے سمجھا ہوگا کہ عورت ذات کر ہی کیا سکتی ہے، دھمکی میں آجائے گی۔ یہ نہیں جانتے تھے کہ سبھی عورتیں ایک سی نہیں ہوتیں۔

سومترا یہ سن کر خوش ہوگی، بچہ کو خوب طعنہ دے گی۔ ایسا آڑے ہاتوں لے گی کہ وہ بھی یاد کریں گے۔ لالہ بدری پرشاد بھی خوب خبر لیں گے۔ ہاں اماں جی کو بُرا لگے گا۔ ان کی نگاہوں میں تو ان کا بیٹا دیوتا ہے۔ بالکل دودھ کا دھلا ہوا ہے۔

پلیا کے نیچے جانوروں کی ہڈیاں پڑی ہوئی تھیں۔ پڑوس کے کتے اپنے اپنے حریفوں کی چھیڑ چھاڑ سے بچنے کے لیے ادھرادھر سے ہڈیاں لالا کر تنہائی میں لذت اندوز ہوتے تھے۔ ہڈیوں سے بدبو آرہی تھی۔ ادھر ادھر سے پھٹے پُرانے چھتڑے، آم کی گٹھلیاں، کاغذ کے ردّی کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ اب تک پورنا نے اس نفرت انگیز منظر کی طرف توجہ نہ کی تھی۔ اب دیکھ کر اس کو نفرت ہونے لگی۔ وہاں لمحہ بھر بھی رہنا شاق گزرنے لگا مگر جائے کہاں ناک دبائے اکڑوں بیٹھی ہوئی چلنے والوں کی آمد و رفت پر کان لگائے ہوئے تھی۔

دوپہر ہوتے ہوتے باغیچہ کا پھاٹک بند ہوگیا۔ بگھی، موٹر، تانگے کسی کی آواز بھی نہ سنائی دی، اس سکوت میں پورنا اپنے مستقبل کے بحر تفکر میں غوطہ زن ہو رہی تھی۔

اب اس کے لیے کہاں ٹھکانا تھا؟ ایک طرف جیل کی سخت تکالیف تھیں، دوسری طرف روٹیوں کے لالے، اشکوں کی روانی اور دردجاں گزا ایسے آدمی کے لیے موت کے سوا اور کیا ٹھکانا ہے؟

شام ہوگئی اور تاریکی چھا گئی تو پورنا وہاں سے باہر نکلی اور سڑک پر کھڑی ہوکر سوچنے لگی۔ کہاں جاؤں؟ زندگی میں اب ذلت، شرم، رنج و تکلیف کے سوا اور کیا ہے؟ اپنے شوہر کے بعد ہی اس نے کیوں نہ اپنی جان دے دی کیوں نہ اس کی نعش کے ساتھ ستی ہوگئی؟ اس جینے سے تو جل کر مر جانا کہیں اچھا تھا۔ کیوں اس وقت اس کی عقل پر پردہ پڑگیا تھا۔ وہ کیا جانتی تھی کہ شریف لوگ بھی ایسے بدمعاش ہوتے ہیں، اپنے دوست بھی حلق پر چُھری پھیرنے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں۔

دفعتاً ایک بوڑھے آدمی کو دیکھ کر وہ ایک درخت کی آڑ میں کھڑی ہوگئی۔ جب بوڑھا قریب آگیا اور پورنا کو یقین ہوگیا کہ اس کے سامنے نکلنے میں کوئی خطرہ نہیں ہے تو اس نے آہستہ سے پوچھا کہ ”بابا گنگا جی کا راستہ کدھر ہے؟“

بوڑھے نے حیرت سے کہا ”گنگا جی یہاں کہاں ہیں، یہ تو مُڈواڈیہہ ہے۔“

پورنا۔ گنگا جی یہاں سے کتنی دور ہے؟
بوڑھا۔ دو کوس۔

اس حالت میں دو کوس جانا پورنا کو ناممکن العمل سا معلوم ہوا۔ اس نے سوچا کہ کیا ڈوب مرنے کے لیے گنگا ہی ہیں، یہاں اور کوئی تالاب یا ندی نہ ہوگی؟ وہ وہیں کھڑی رہی کوئی تصفیہ نہ کر سکی۔

بوڑھے نے پوچھا۔ ''تمھارا گھر کہاں ہے بیٹی؟ کہاں جاؤگی؟''

پورنا سہم گئی۔ اب تک اس نے کوئی قصہ نہ گڑھا تھا، کیا بتلاتی؟

بوڑھے نے پھر پوچھا۔ ''گنگا جی ہی جانا ہے یا اور کہیں؟''

پورنا نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''وہیں ایک محلّہ میں جاؤں گی۔''

بوڑھے نے ٹھٹھک کر پورنا کو سر سے پیر تک دیکھا اور کہا۔ ''وہاں کس محلّہ میں جاؤگی؟ سیکڑوں محلے ہیں۔''

پورنا نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے پاس جواب ہی کیا تھا؟

بوڑھے نے ذرا جھنجلا کر پوچھا۔ ''یہاں کس گاؤں میں تمھارا گھر ہے؟''

پورنا کوئی جواب نہ دے سکی، وہ پچھتا رہی تھی کہ میں نے اس بوڑھے کو ناحق چھیڑا۔

بوڑھے نے اب کے سخت لہجے میں پوچھا۔''تو اپنا پتا کیوں نہیں بتاتی؟ کیا گھر سے بھاگ آئی ہے۔''

پورنا تھر تھر کانپ رہی تھی، وہ ایک لفظ بھی مُنہ سے نہ نکال سکی!

بوڑھے کو یقین ہوگیا کہ یہ عورت گھر سے روٹھ کر آئی ہے، اس کو رحم آگیا بولا ''بیٹی گھر سے روٹھ کر بھاگنا اچھی بات نہیں۔ زمانہ خراب ہے کہیں بدمعاشوں کے پنجے میں پھنس جاؤ تو عمر بھر کے لیے آبرو میں بٹّہ لگ جائے۔ گھر لوٹ جاؤ بیٹا۔ بڑے بوڑھے دو باتیں کہیں تو غم کھانا چاہیے، وہ تمھارے ہی بھلے کے لیے کہتے ہیں۔ چلو میں تم کو گھر پہنچا دوں۔''

پورنا کے لیے اب جواب دینا لازم ہوگیا۔ بولی۔ ''بابا مجھے گھر والوں نے نکال دیا ہے۔''

بوڑھا۔ کیوں نکال دیا۔ کسی سے لڑائی ہوئی تھی؟

پورنا۔ نہیں بابا، میں بدھوا ہوں۔ گھر والے مجھے رکھنا نہیں چاہتے۔

بوڑھا۔ ساس سسر ہیں؟

پورنا۔ نہیں بابا، کوئی نہیں ہے۔ ایک رشتہ دار کے یہاں پڑی تھی۔ سو آج اس نے بھی نکال دیا ہے۔

بوڑھا ایک منٹ کچھ سوچ کر بولا۔ "تو تم گنگا جی کی طرف کیا کرنے جا رہی تھیں! وہاں کوئی تمھارا اپنا ہے؟"

پورنا۔ نہیں مہاراج، سوچتی تھی کہ رات بھر وہیں گھاٹ پر پڑی رہوں گی اور سویرے کسی جگہ کھانا پکانے کی نوکری کرلوں گی۔

بوڑھا سمجھ گیا۔ بیکس عورت رات کے وقت گنگا کا راستہ اور کس لیے پوچھ سکتی ہے؟ اب وہاں بھی اس کا کوئی نہیں ہے، پھر تو گنگا کے کنارے پر جانے کا اور مطلب ہی کیا ہوسکتا ہے؟ بولا۔"بدھوا آشرم میں کیوں نہیں جاتیں؟"

پورنا۔ بدھوا آشرم کیا ہے بابا؟

بوڑھا۔ وہاں اناتھ عورتوں کو پالا جاتا ہے۔ کیسی ہی عورت ہو، وہ بڑی خوشی سے اس کو اپنے یہاں رکھ لیتے ہیں۔

"امرت رائے بابو کو دنیا جتنا چاہے بدنام کرے مگر کام انھوں نے بڑے دھرم کا کیا ہے۔ اس وقت پچاس عورتوں سے کم نہ ہوں گی۔ سب ہنسی خوشی سے رہتی ہیں، کوئی مرد اندر نہیں جانے پاتا۔ امرت بابو آپ بھی اندر، نہیں جاتے، ہمت کا دھنی آدمی ہے۔ سچا تیاگی اسی کو دیکھا۔"

پورنا کا دل بیٹھ گیا۔ جس مصیبت سے بچنے کے لیے اس نے مرجانے کی ٹھان لی تھی وہ پھر سامنے آتی ہوئی نظر آئی، امرت رائے اسے دیکھتے ہی پہچان جائیں گے، ان کے سامنے وہ کھڑی ہی کیسے ہوسکے گی۔ شاید اس کے پیر کانپنے لگیں گے اور وہ گر پڑے گی۔ وہ اسے قاتلہ سمجھیں گے جس سے وہ ایک دن سالی کے ناتے سے مذاق کرتے تھے۔ وہ آج ان کے سامنے آوارہ بن کر جائے گی۔

بوڑھے نے پوچھا۔"دیر کیوں کرتی ہو بیٹی؟ چلو میں تمھیں وہاں پہنچا دوں

یقین کرو۔ وہاں تم بڑے آرام سے رہو گی۔"

پورنا نے کہا۔ میں وہاں نہ جاؤں گی بابا۔"

بوڑھا۔ وہاں جانے میں کیا برائی ہے؟

پورنا۔ یونہی۔ میرا جی نہیں چاہتا۔

بوڑھے نے جھنجلا کر کہا۔ "تو یہ کیوں نہیں کہتیں کہ تمھارے سر پر دوسرا بھوت سوار ہے۔"

یہ کہہ کر بوڑھا آگے بڑھا۔ "جس نے خود بدچلنی کے راستے پر چلنے کا ارادہ کرلیا اسے کون روک سکتا ہے؟"

پورنا بوڑھے کو جاتا دیکھ کر اس کے دل کی بات سمجھ گئی۔ کیا اب بھی وہ بدھوا آشرم میں جانے سے انکار کرسکتی تھی؟ بولی۔

"بابا تم بھی اب مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟"

بوڑھا۔ کہتا ہوں کہ چلو۔ بدھوا آشرم میں پہنچا دوں۔

پورنا۔ وہاں مجھے بابو امرت رائے کے سامنے تو نہ جانا پڑے گا؟

بوڑھا۔ یہ سب نہیں جانتا۔ مگر ان کے سامنے جانے میں ہرج ہی کیا ہے؟ وہ بُرے آدمی نہیں ہیں۔

پورنا۔ اچھے بُرے کی بات نہیں ہے بابا۔ مجھے ان کے سامنے جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔

بوڑھا۔ اچھی بات ہے مت جانا۔ نام اور پتا تو لکھانا ہی پڑے گا۔

پورنا۔ نہیں بابا، میں نام اور پتا بھی نہ لکھاؤں گی۔ اسی سے تو میں کہتی تھی کہ اس آشرم میں نہ جاؤں گی۔

بوڑھے نے کچھ سوچ کر کہا۔ "اچھا چلو میں امرت بابو کو سمجھا دوں گا۔ جو بات تم نہ بتانا چاہو گی، اس کے لیے وہ تمھیں مجبور نہ کریں گے۔ میں انھیں اکیلے میں سمجھا دوں گا۔"

ذرا فاصلے پر ایک تانگہ مل گیا۔ بوڑھے نے اسے طے کرلیا۔ دونوں اس پر بیٹھ کر روانہ ہوگئے۔

پورنا اس وقت خو کو گنگاجی کی لہروں میں ڈبونے کے لیے جاتی توشاید اتنی مغموم اور خوف زدہ نہ ہوتی۔

(۱۴)

بابو دان ناتھ کے مزاج میں میانہ روی نہ تھی، وہ جس سے دوستی کرتے تھے اس کے غلام بن جاتے تھے۔ اسی طرح جس کی مخالفت کرتے تھے اسے خاک میں ملا دینا چاہتے تھے۔ کئی مہینے تک وہ کملا پرشاد کے دوست بنے رہے۔ بس جو کچھ تھے کملا پرشاد تھے۔ انھیں کے ساتھ گھومنا، انھیں کے ساتھ اُٹھنا، بیٹھنا، امرت رائے کی صورت سے بھی نفرت تھی، انھیں کے کاموں کی تنقید میں دن گزرتا تھا۔ اس کے خلاف لکچر دیئے جاتے تھے۔ اور جس روز پریما نے ٹاؤن ہال میں جاکر ان سازشوں کو خاک میں ملا دیا تھا۔ اس روز سے وہ امرت رائے کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ پریما سے پہلے ہی دل صاف نہ تھا۔ اب تو ان کے غصّے کی حد نہ رہی۔ پریما سے کچھ نہ کہا۔ اس بات کا ذکر تک نہ کیا۔ پریما جواب دینے کو تیار بیٹھی تھی مگر اس سے بات چیت کرنا بھی ترک کردیا۔ بھائی پر جان دیتے تھے اور بہن کی صورت سے بیزار۔ انھوں نے جس مسرت آمیز زندگی کا تصور کیا تھا وہ لا علاج مرض کی طرح انھیں گلائے ڈالتی تھی۔ ان کی حالت اس شخص کی سی تھی جو ایک گھوڑے کے رنگ و روپ اور چال کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہوجائے مگر ہاتھ آجانے پر اس پر سوار نہ ہوسکے۔ اس کی کنوتیاں اس کے تیور، اس کا ہنہنانا، اس کا پاؤں سے زمین کھودنا، یہ ساری باتیں انھوں نے پیشتر نہ دیکھی تھی۔ اب اس کے پٹھے پر ہاتھ رکھتے خوف معلوم ہوتا ہے جس شکل کے تصور پر دان ناتھ ایک روز دل میں خوش ہوجاتے تھے، اب اسے سامنے دیکھ کر ان کا دل ذرا بھی خوش نہ ہوتا تھا۔ پریما دل و جان سے ان کی خدمت کرتی تھی۔ ان کا مُنہ چوما کرتی تھی، انھیں خوش کرنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ مگر دان ناتھ کو اس کی حرکات و سکنات میں تصنع کی بُو آتی تھی، وہ اپنی غلطی پر دل ہی دل میں پچھتاتے تھے اور ان کے دل کی یہ آگ نفرت کی شکل اختیار کرکے امرت رائے پر جھوٹا الزام لگانے اور ان کی مخالفت کرنے میں ٹھنڈی ہوتی تھی لیکن جلد ہی دل کی جلن کو اس طرح ٹھنڈک پہنچانے کا ذریعہ بھی ان کے لیے ختم ہوگیا۔

شام کا وقت تھا۔ دان ناتھ بیٹھے کملا پرشاد کا انتظار کر رہے تھے۔ آج وہ اب تک کیوں نہیں آئے؟ آنے کا وعدہ کرکے تھے۔ پھر آئے کیوں نہیں؟ یہ سوچ کرانھوں نے کپڑے پہنے اور کملا پرشاد کے مکان جانے کی تیاری کی۔ اسی وقت ایک دوست نے آکر رات کے

واقعہ کی خبر سنائی۔ دان ناتھ کو یقین نہ ہوا۔ بولے۔"آپ نے یہ غپ سنی کہاں؟"

"سارے شہر میں چرچا ہو رہا ہے، آپ کہتے ہیں کہ غپ سنی کہاں؟"

"کسی نے یونہی افواہ اُڑادی ہوگی، کم از کم میں کملا پرشاد کو ایسا آدمی نہیں سمجھتا۔"

"اس کا ثبوت یہی ہے کہ کملا پرشاد کے چہرہ پر سخت چوٹ آئی ہے۔ اور ایک دانت بھی ٹوٹ گیا۔"

دان ناتھ نے مسکرا کر کہا۔ "جس کے چہرہ اور سینہ پر چوٹ آئے۔ اور ایک دانت بھی ٹوٹ جائے وہ یقیناً زناکار ہے۔"

دان ناتھ کو اس وقت تک یقین نہ آیا۔ جب تک کہ انھوں نے کملا پرشاد کے مکان پر جاکر تحقیقات نہ کرلی۔ کملا پرشاد منہ پر پٹی باندھے آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا گولی لگ گئی ہے۔ دان ناتھ کی آواز سنی تو اس نے آنکھیں کھولیں اور ناک سکوڑ کر کراہتے ہوئے کہا۔ "آیئے بھائی صاحب بیٹھیے! کیا آپ کو اب خبر ہوئی یا آنے کی فرصت ہی نہ ملی؟ بُرے وقت میں کون کس کا ہوتا ہے؟"

دان ناتھ نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بات نہیں ہے بھائی صاحب! مجھے تو ابھی معلوم ہوا۔ سنتے ہی دوڑا آرہا ہوں۔ یہ بات کیا ہے؟"

کملا نے کراہ کر کہا۔ "قسمت کی بات ہے بھائی صاحب اور کیا کہوں؟ اس عورت سے ایسی امید نہ تھی۔ جب دانہ کو محتاج تھی تب اس کو اپنے مکان لایا۔ اس کو برابر اپنی بہن سمجھتا رہا۔ جو اور لوگ کھاتے تھے وہی وہ بھی کھاتی تھی، جو اور لوگ پہنتے تھے وہی وہ بھی پہنتی تھی۔ مگر وہ بھی دشمنوں سے ملی ہوئی تھی۔ کئی روز سے کہہ رہی تھی کہ ذرا مجھے اپنے باغیچے کی سیر کرا دو۔ آج جو وہاں لے کر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کی دو مسٹنڈے بنگلے کے برآمدے میں کھڑے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی دونوں مجھ پر ٹوٹ پڑے، میں تنہا کیا کرتا؟ وہ ڈائن بھی ان دونوں کے ساتھ ہی مل گئی اور مجھ پر ڈنڈے برسانے لگی۔ ایسی مار پڑی ہے بھائی صاحب کہ بس کچھ نہ پوچھیے۔ وہاں نہ کوئی آدمی نہ آدم زاد۔ کسے پکارتا؟ میں بے ہوش ہوکر گر پڑا تو تینوں وہاں سے رفوچکر ہوگئے۔"

دان ناتھ نے ایک لمحہ تک غور کرنے کے بعد کہا۔ "بابو امرت رائے کا مزاج تو ایسا نہیں ہے، ہاں یہ ممکن ہے کہ شہدوں کی شرارت ہو۔"

کملا۔ بھائی صاحب آدمی کے دل میں کیا ہے اسے برہما جی بھی نہیں جان سکتے، ہماری آپ کی ہستی ہی کیا ہے؟ سادھوؤں کے بھیس میں اکثر بدمعاش ....

دفعتاً لالہ بدری پرشاد نے کمرہ میں قدم رکھتے ہوئے کہا۔ ''جیسے خود ہو، شرم نہیں آتی۔ بولنے کو مرتے ہو۔ تمھیں تو مُنہ میں کالک لگا کر کہیں ڈوب مرنا چاہیے تھا مگر تم جیسے پاپیوں میں ایسی خودداری کہاں؟ تم نے سچ کہا کہ اکثر سادھوؤں کے بھیس میں بدمعاش چھپے ہوتے ہیں۔ جن کی گود میں کھیل کر تم پلے انھیں بھی تم نے الّو بنا دیا۔ مجھ جیسے جہاں دیدہ شخص کو بھی تم نے چکمہ دیا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم اتنے بدکار ہو، میں نے تم کو زہر دے دیا ہوتا، مجھے تمھاری نیک چلنی کا فخر تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ تم میں اور خواہ کتنی ہی برائیاں ہوں مگر تمھارا چال چلن صاف ہے، مگر آج مجھے معلوم ہوا کہ تم جیسا کمینہ اور ذلیل شخص دنیا کے پردے پر نہ ہوگا۔ جس بے یار و مددگار بیوہ کو میں نے اپنے گھر میں پناہ دی، جسے میں اپنی بیٹی سمجھتا تھا اور جسے تم بھی بہن کہتے تھے اسی کے متعلق تمھاری یہ بدنیتی، تمھیں چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیے، اس نے تمھیں مار ہی کیوں نہ ڈالا مجھے یہی افسوس ہے۔ تم جیسے بزدل کے لیے یہی سزا مناسب تھی۔''

دان ناتھ نے دبی زبان سے پوچھا۔''بھائی صاحب کا خیال ہے کہ امرت رائے ......''

بدری پرشاد نے دانت پیس کر کہا۔''بالکل جھوٹ، سراسر جھوٹ، سولھوں آنے جھوٹ۔ ہمارا امرت رائے سے معاشرتی مسئلوں پر اختلاف ہے، لیکن ان کا چال چلن جتنا عمدہ ہے اتنا دنیا میں کم لوگوں کا ہوگا۔ تم ان کے بچپن کے دوست ہو، تمھیں بتلاؤ کہ میں جھوٹ کہتا ہوں یا سچ؟''

دان ناتھ نے دیکھا کہ اب صاف گوئی کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ خواہ کملا پرشاد ناراض ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ سر نیچا کر کے ایک ناپسندیدہ سچ کہنے، ایک نہایت ضروری فرض کو انجام دینے کے طریقے پر کہا۔ ''آپ بالکل سچ کہتے ہیں۔ ان میں یہی تو ایک طاقت ہے جو ان کے بڑے بڑے دشمن کو بھی علانیہ ان کے مقابلے میں نہیں آنے دیتی۔''

بدری پرشاد نے کملا کی طرف ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ ''مارو اس کے مُنہ پر تھپڑ، اب بھی شرم آئی کہ نہیں؟ ابھی ہوا ہی کیا ہے؟ ابھی تو صرف ایک دانت ٹوٹا ہے اور سر میں ذرا

چوٹ آئی ہے۔ مگر اصلی مار تو اب پڑے گی۔ جب سارے شہر میں لوگ تھوکیں گے اور بچہ جی کا گھر سے نکلنا مشکل ہوجائے گا۔ پاپی مجھے بھی اپنے ساتھ لے ڈوبا، آباؤ و اجداد کی گاڑھی کمائی آن کی آن میں تلف کردی۔ مجھے تو اب یہ تشویش ہے کہ میں کون سا مُنہ لے کر باہر نکلوں گا۔ سپوت نے کہیں مُنہ دکھانے کی جگہ نہ رکھی۔"

یہ کہتے ہوئے لالہ بدری پرشاد باہر چلے گئے۔ دان ناتھ بھی انھیں کے ساتھ باہر چلے گئے۔ کملا پرشاد آنکھیں بند کیے چپ چاپ سنتا رہا۔ اسے بھی خاندانی عزت اپنے والد کی عزیز تھی۔ بے حیائی کا جامہ اس نے ابھی تک نہ پہنا تھا۔ محبت کے میدان میں ابھی اس کا پہلا ہی کھیل اور اس پہلے ہی کھیل میں اس کے پیر میں ایسا تیز کانٹا چبھا کہ شاید پھر وہ وہاں قدم رکھنے کی جرأت بھی نہ کرسکے۔ مگر دان ناتھ کے مواجہہ میں وہ ایسی ڈانٹ پھٹکار نہ سننا چاہتا تھا۔ لالہ بدری پرشاد نے اس کی صرف لعنت ملامت ہی نہیں بلکہ اسے جھوٹا اور دغاباز بنایا، اپنی حفاظت کے لیے اس نے جو داستان وضع کی تھی اس کا راز فاش کردیا۔ کیا دنیا میں کوئی باپ ایسا بے درد ہوسکتا ہے؟ اس روز سے کملا پرشاد نے پھر اپنے والد سے بات نہ کی۔

دان ناتھ یہاں سے چلے تو ان کے دل میں ایسا آرہا تھا کہ اسی وقت گھر بار چھوڑ کر کہیں نکل جائیں۔ کملا پرشاد اپنے ساتھ انھیں بھی لے ڈوبا تھا۔ عوام کی نگاہوں میں کملا پرشاد اور وہ واحد تھے۔ یہ ناممکن تھا کہ ان میں سے کوئی ایک کام کرے اور اس کی نیک نامی یا بدنامی دوسرے کو نہ ملے۔ عوام کے سامنے اب کس مُنہ سے کھڑے ہوں گے؟ کیا یہ ان کی رفاہ عام والی زندگی کا خاتمہ تھا۔ کیا وہ خود کو اس الزام سے مبرا رکھ سکتے تھے؟

مگر کملا پرشاد اتنا گیا گزرا شخص ہے، اتنا فریبی، اتنا بدکار، اتنا کمینہ! پھر اور کس پر اعتماد کیا جائے؟ ایسا مذہبی شخص بھی بھی اتنا پست ہوسکتا ہے تو پھر دوسروں سے کیا امید؟ جو شخص مروت اور سخاوت کا مجسمہ تھا وہ ایسا نفس پرست کیوں کر ہوگیا؟ کیا دنیا میں کوئی سچا اور بے ریا شخص نہیں ہے؟

گھر پہنچ کر وہ جیوں ہی اندر داخل ہوئے، پریما نے پوچھا۔"تم نے بھی بھیّا کے بارے میں کوئی بات سنی؟ ابھی مہری نہ جانے کہاں سے اوٹ پٹانگ باتیں سن آئی ہے، مجھے تو یقین نہیں آتا۔"

دان ناتھ نے آنکھیں بچا کر کہا۔ ”یقین نہ آنے کا سبب؟“

”تم نے بھی کچھ سنا ہے؟“

”ہاں سنا ہے تمھارے مکان ہی سے چلا آرہا ہوں۔“

”تو سچ مچ بھیّا جی پورنا کو باغ میں لے گئے تھے؟“

”بالکل سچ!“

پورنا نے بھیّا کو مار گرا دیا۔ یہ بھی سچ ہے؟“

”جی ہاں یہ سچ ہے۔“

”تم سے کس نے کہا؟“

”تمھارے والد صاحب نے۔“

”والد صاحب کو نہ پوچھو، وہ تو بھیّا پر ادھار ہی کھائے رہتے ہیں۔“

”تو کیا سمجھ لوں انھوں نے کملا پر جھوٹا الزام لگایا۔“

”نہیں، یہ میں نہیں کہتی، مگر بھیّا میں ایسی عادت کبھی نہ تھی۔“

”تم کسی کے دل کا حال کیا جانو؟ پہلے میں بھی انھیں دھرم اور سچائی کا پتلا سمجھتا تھا مگر آج معلوم ہوا کہ وہ بدچلن ہی نہیں بلکہ پرلے سرے کے جھوٹے بھی ہیں۔ پورنا نے بہت اچھا کیا، مار ڈالتی تو اور بھی اچھا کرتی، نہ معلوم اس نے کیوں چھوڑ دیا۔ تمھارا بھائی سمجھ کر اسے رحم آگیا ہوگا۔“

پریما نے ایک لمحہ سوچ کر مشتبہ لہجے میں کہا۔ ”مجھے اب بھی یقین نہیں آتا، پورنا برابر میرے گھر آتی تھی۔ وہ اس کی طرف کبھی آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے، اس میں ضرور کوئی نہ کوئی راز ہے۔ بھیّا جی کو بہت چوٹ تو نہیں آئی؟“

دان ناتھ نے طنز سے کہا۔ ”جاکر مرہم پٹی ذرا کر آؤنا!“

پریما نے حقارت سے دیکھ کر کہا۔ ”ایشور جانے تم بڑے بے درد ہو، کسی کو تکلیف میں دیکھ کر بھی تمھیں رحم نہیں آتا۔“

”ایسے پاپیوں پر رحم کی مٹی خراب کرنا ہے، اگر میں باغیچے میں اس وقت ہوتا یا کسی طرح میرے کانوں میں پورنا کے چلّانے کی آواز پہنچ جاتی تو چاہے پھانسی پاتا مگر کملا پرشاد کو زندہ نہ چھوڑتا۔ اور پھانسی کیوں ہوتی؟ کیا قانون اندھا ہے، ایسی حالت میں سبھی ایسا

کرتے۔ بدمعاش! اسے ایک بیکس بیوہ پر دست درازی کرتے شرم نہ آئی، اور وہ بھی جو اس کی پناہ میں تھی۔ میں ایسے آدمی کا خون کر ڈالنا گناہ نہیں سمجھتا۔"

پریما کو یہ سخت کلامی بُری معلوم ہوئی۔ شاید یہ بات سچ ثابت ہونے پر اس کے دل میں بھی ایسے ہی خیالات پیدا ہوتے، مگر اس وقت اسے معلوم ہوا کہ صرف اسے جلانے کے لیے، صرف اس کو ذلیل کرنے کے لیے یہ حملہ کیا گیا ہے اگر اس بات کو سچ بھی مان لیا جائے تو بھی ایسی جلی کٹی سنانے سے فائدہ؟ کیا یہ باتیں دل ہی دل میں نہ رکھی جاسکتی تھیں؟

اس کے دل میں زبردست خواہش ہوئی کہ جاکر کملا پرشاد کو دیکھ آئے مگر اس خوف سے کہ تب تو یہ اور بگڑ اُٹھیں گے، اس نے اپنی اس خواہش کا اظہار نہ کیا۔ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔ ایک لمحہ کے بعد دان ناتھ نے کہا۔ "جی چاہتا ہو تو جاکر دیکھ آو۔ چوٹ تو ایسی گہری نہیں مگر مکر تو ایسا کیے ہوئے ہیں، گویا گولی ہی لگ گئی ہے۔"

پریما نے بے پروائی سے کہا۔"تم دیکھ آئے، میں جاکر کیا کروں گی؟"

دان۔ "نہیں بھئی۔ میں کسی کو روکتا نہیں، ایسا نہ ہو کہ پیچھے کہنے لگو کہ تم نے جانے نہ دیا، میں بالکل نہیں روکتا۔"

پریما۔ "میں نے تو کبھی تم سے کسی بات کی شکایت نہیں کی۔ کیوں ناحق الزام لگاتے ہو؟ میری جانے کی بالکل خواہش نہیں ہے۔"

دان۔ "ہاں خواہش نہ ہوگی، میں نے کہہ دیا نا، منع کرتا تو ضرور خواہش ہوتی۔ میرے کہہ دینے سے چوٹ لگ گئی۔"

پریما سمجھ گئی کہ اسی چندے والے جلسے کی طرف اشارہ ہے۔ اب اور کچھ بات چیت کرنے کا موقع نہ تھا۔ دان نے اس قصور کو ہنوز معاف نہ کیا تھا، وہ وہاں سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

دان ناتھ کے دل کا بخار نہ نکلنے پایا تھا، وہ مہینوں سے موقع کی تلاش میں تھے کہ ایک مرتبہ پریما سے خوب کھلی باتیں کریں۔ مگر اس کا موقع انھیں نہ ملتا تھا۔ آج بھی یہ موقع ان کے ہاتھ سے نکل گیا، وہ کھسیائے ہوئے باہر جانا چاہتے تھے کہ دفعتاً ان کی والدہ نے آکر کہا۔"آج سسرال کی طرف تو نہیں گئے تھے؟ کچھ گڑبڑ سن رہی ہوں۔"

دان ناتھ والدہ کے سامنے سسرال کی کوئی بُرائی نہ کرتے تھے۔ عورتوں کے ناخوش کرنے کی اس سے سہل اور کوئی تدبیر نہیں ہے۔ پھر انھوں نے پریما سے جو سخت کلامی کی اس کا کچھ رنج بھی تھا۔ اب انھیں معلوم ہورہا تھا کہ وہی باتیں ہمدردانہ لہجہ میں کہی جاسکتی تھیں۔ دل اظہار افسوس کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ بولے۔''سب غپ ہے اماجی!''

غپ کیسی۔ بازار میں سنتی چلی آتی ہوں، گنگا کنارے یہی بات ہو رہی تھی، وہ برہمنی بدھوا آشرم میں پہنچ گئی۔

دان ناتھ نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔ بدھوا آشرم! وہاں کیسے پہنچی؟

''اب میں یہ کیا جانوں، مگر وہاں پہنچ گئی۔ اس میں شبہ نہیں کئی آدمی وہاں سے پتا لگا لائے۔ میں کملا کو دیکھتے ہی بھانپ گئی تھی کہ یہ شخص نگاہ کا سچا نہیں ہے مگر تم کسی کی سنتے تھے؟''

''اماں! کسی کے دل کا حال کوئی کیا جانتا ہے؟''

''جن کی آنکھیں ہیں وہ جان ہی جاتے ہیں؟ تم جیسے آدمی دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ اب شہر میں جدھر جاؤگے۔ ادھر انگلیاں اُٹھیں گی۔ لوگ تمھیں بھی خطاوار قرار دیں گے۔ وہ عورت وہاں جاکر نہ جانے کیا باتیں بتائے گی یہ میں کبھی نہ مانوں گی کہ پہلے سے کچھ سانٹھ گانٹھ نہ تھی۔ اگر پہلے سے کچھ بات چیت نہ تھی تو وہ کملا کے ساتھ تنہا باغیچے میں گئی کیوں تھی؟ مگر اب وہ سارا الزام کملا پرشاد پر عاید کر کے خود صاف نکل جائے گی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ کہیں تمھیں بھی نہ گھسیٹے ذرا میری ایک بار اس سے ملاقات ہوجاتی تو میں پوچھتی۔''

دان ناتھ کے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے۔ ان کے پیٹ میں کوئی بات ہضم نہ ہوسکتی تھی۔ پریما کے کمرے کے دروازے پر جاکر بولے۔''کچھ سنا؟ پورنا بدھوا آشرم میں پہنچ گئی۔''

پریما نے ان کی طرف دیکھا، اس کی آنکھیں سرخ تھیں، وہ باتیں جو دل کو ملتے رہنے پر اس کے مُنہ سے نہ نکلنے پاتی تھیں، فرض اور رشک جنھیں اندر ہی اندر دباتے تھے، وہ آنسو بن کر نکل جاتی تھیں۔ چندے والے جلسے میں کیا اتنا بڑا پاپ کیا تھا کہ معاف ہی نہ کیا جاسکے؟ وہ جہاں جاتے ہیں جو کرتے ہیں، کیا اس سے پوچھ کر کرتے ہیں؟ بلاشک وہ

علم و عقل، سن میں اس سے زیادہ ہیں اس لیے وہ زیادہ آزاد ہیں۔ انھیں اس پر نگرانی کرنے کا حق ہے۔ وہ اگر اُس کو کوئی نامناسب بات کرتے دیکھیں تو روک سکتے ہیں۔ لیکن اس جلسے میں جاتا تو کوئی نامناسب بات نہ تھی۔ کیا کوئی بات اس لیے نامناسب ہوجاتی ہے کہ امرت رائے کا اس میں ہاتھ ہے؟ ان میں اتنی ہمدردی بھی نہیں، یہ سب جانتے ہوئے بھی اَن جانے بنتے ہیں۔

دان ناتھ اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر محبت سے پگھل گئے۔ اپنی سخت کلامی پر نادم ہوئے۔ محبت کی رفتار روانی آب کی طرح ہے جو ذرا دیر کے لیے رُک جائے مگر اپنی چال تبدیل نہیں کرسکتی۔ یہ بات وہ کیوں بھول گئے؟ ایک اٹل سچائی کی مخالفت کرنے کا کفارہ اب بجز ان کے اور کون کرے گا؟ میٹھی آواز سے بولے۔"پورنا بدھوا آشرم میں پہنچ گئی۔"

پریما کچھ فیصلہ نہ کرسکی کہ اس خبر پر خوش ہو یا رنجیدہ۔ دان ناتھ نے یہ بات کس نیت سے اس سے کہی؟ ان کا کیا مطلب تھا؟ وہ کچھ نہ جان سکی۔ دان ناتھ اس کی یہ بات تاڑ گئے۔ بولے۔"اب اس کے بارے میں کوئی تشویش نہیں رہی۔ امرت رائے اس کا بیڑا پار لگا دیں گے۔"

پریما کو یہ جملہ پہیلا ہی سا معلوم ہوا۔ یہ امرت رائے کی تعریف ہے یا ہجو؟ امرت رائے اس کا بیڑا کیسے پار لگا دیں گے! عموماً تو اس جملہ کا یہی مطلب ہے کہ اب پورنا کو ایک ٹھکانا مل گیا۔ لیکن کیا یہ طنز نہیں ہوسکتا؟

دان ناتھ نے کچھ شرمندہ ہوکر کہا۔"اب مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امرت رائے پر میرا شبہ بالکل بے جا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرکے کملا پرشاد کی ہر بات کو کلام الٰہی سمجھ لیا تھا۔ میں نے امرت رائے کے ساتھ کتنی بڑی بے انصافی کی ہے اس کا اندازہ اب میں کسی قدر کرسکتا ہوں۔ میں کملا پرشاد کی آنکھوں سے دیکھتا تھا۔ اس مکار نے مجھے بڑا مغالطہ دیا۔ نہ جانے میری عقل پر کیوں ایسا پردہ پڑگیا کہ اپنے لاثانی دوست پر ایسا شک کرنے لگا؟"

پریما کے چہرہ پر محبت کا جیسا رنگ اس وقت نظر آیا ویسا اور پہلے دان ناتھ نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ یہ کچھ ویسا ہی فخر آگیں سرور تھا جیسا ماں کو دو برگشتہ دل بھائیوں کی کدورت رفع ہوجانے سے ہوتا ہے۔ بولی۔"امرت رائے کی بھی تو غلطی تھی کہ انھوں نے تم سے

ملنا جلنا ترک کردیا۔ کبھی کبھی باہم ملاقات ہوتی رہتی تو ایسی بدگمانی پیدا کیوں ہوتی۔ کھیت میں ہل نہ چلنے ہی سے تو گھاس اُگ آتی ہے۔"

"نہیں ان کی غلطی نہیں۔ یہ سراسر میرا قصور تھا۔ میں جلد ہی اس کی تلافی کروں گا۔ میں ایک جلسے میں ساری باتیں طشت ازبام کروں گا۔ ان دغا بازوں کی غلطی کی قلعی کھول دوں گا۔"

"قلعی تو کافی طور پر کھل گئی۔ اب اسے کھولنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"ضروزت ہے، کم از کم اپنی آبرو بچانے کے لیے۔ اس کی بڑی ضرورت ہے۔ میں عوام پر ظاہر کردوں گا کہ ان عیاروں سے میرا میل جول کس ڈھنگ کا تھا۔ اس موقع پر خاموش ہوجانا میرے لیے مضر ہوگا۔ اف مجھے کتنا بڑا دھوکا ہوا۔ اب مجھے معلوم ہوگیا کہ مجھ میں آدمیوں کے پرکھنے کی سکت نہیں ہے لیکن اب لوگوں کو معلوم ہوجائے گا کہ میں جتنا جانی دوست ہوسکتا ہوں، اتنا ہی جانی دشمن بھی ہوسکتا ہوں۔"

"جس وقت کملا پرشاد نے اس بیکس بیوہ پر بد نگاہ کی، اگر میں وہاں موجود ہوتا تو ضرور گولی مار دیتا۔ ذرا اس بدمعاش کو دیکھو کہ بے چاری کو اس باغیچے میں لے گیا جہاں دن کو بھی آدھی رات کا سناٹا رہتا ہے۔ بہت ہی اچھا ہوا اور اس سے بھی اچھا ہوتا اگر اس نے پاجی کو جان سے مار ڈالا ہوتا۔ مجھے اب اس سے عقیدت ہوگئی ہے، جی چاہتا ہے کہ جاکر اس کے درشن کروں۔ مگر ابھی نہ جاؤں گا۔ سب سے پہلے اِن بگلا بھگت جی کی خبر لینی ہے۔"

پریما نے شوہر کو عقیدت مندانہ نگاہوں سے دیکھا۔ ان کا دل اس قدر پاک ہے، یہ آج تک وہ نہ سمجھی تھی۔ اب تک اس نے ان کا جو پہلو دیکھا تھا وہ ایک احسان فراموش، حاسد، کوتاہ اندیش، بدذات شخص تھا۔ اگر یہ بات دیکھ کر بھی وہ دان ناتھ کی عزت کرتی تھی تو اس کی وجہ وہ محبت تھی جو دان ناتھ کو اس کے ساتھ تھی۔ آج اس نے ان کی صاف باطنی کا منور جلوہ دیکھا۔ کتنا سچا پچھتاوا، کتنا پاک غصہ، آج ایک عورت کی کتنی توقیر!

اس نے کمرے کے دروازے پر آکر کہا۔"میں تو سمجھتی ہوں کہ اس وقت تمھارا چپ رہ جانا ہی بہتر ہے۔ کچھ دنوں تک لوگ تمھیں بدنام کریں گے مگر آخر میں وہ تمھاری عزت کریں گے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر تم نے بھیّا جی کی مخالفت کی تو والد

صاحب کو بہت رنج ہوگا۔"

دان ناتھ نے گویا زہر کا گھونٹ پی کر کہا۔"اچھی بات ہے۔ جیسی تمھاری مرضی! مگر یاد رکھو کہ میں کہیں باہر مُنہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا۔"

پریما نے احسان مندانہ نگاہوں سے دیکھا۔ گلا بھر آیا۔ مُنہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔ شوہر کے اس ترک نے سرمست بنا دیا۔ اس کے ایک اشارے پر توہین و ہجو برداشت کرنے کے لیے تیار ہوکر دان ناتھ نے آج اس کے دل پر اختیار پا لیا وہ مُنہ سے کچھ نہ بولی۔ مگر اس کا ایک ایک رویاں شوہر کو آشیرباد دے رہا تھا۔ صرف ترک و فنا ہی وہ طاقت ہے جو دل پر فتح حاصل کرسکتی ہے؟

شہر میں گھرگھر، گلی کوچہ، جہاں دیکھیے یہی تذکرہ تھا۔ اسی سلسلہ میں بابو دان ناتھ کا نام بھی لوگوں کی زبان پر آجاتا تھا جو شخص کملا پرشاد کی ناک کا بال اور آٹھوں پہر کا ساتھی ہو اس کے چال چلن کی جانچ سخت اصولوں کے مطابق نہ کی جاسکتی تھی۔ ایسے لوگ عموماً بدچلن ہوتے ہیں، یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ کچھ دنوں اور پہلے اگر کملا پرشاد کے بارے میں ایسا ذکر ہوتا تو کوئی اس پردھیان بھی نہ دیتا۔ ایسے صدہا واقعات روز ہی ہوتے رہتے ہیں، کوئی پروا بھی نہیں کرتا۔ لیڈروں کے اطوار و اخلاق سبھی پر رائے زنی ہونے لگتی ہے۔ کملا پرشاد ابھی تک لیڈروں کے اس درجہ میں نہ آیا تھا، اس کا جو کچھ وقار اور اثر تھا وہ دان جیسے عالم، ذکی اور نیک شعار شخص کے میل جول کے سبب تھا۔ وہ پودا نہ تھا جو زمین سے نشو و نما پاتا ہے بلکہ بیل کی طرح درختوں پر پھیلنے والا شخص تھا۔ اس میں جو کچھ نور تھا وہ محض عکس تھا۔ بس اس کے اعمال کی ذمےّ داری بہت حد تک اس کے دوستوں پر ہی ڈالی جاسکتی ہے اور دان ناتھ پر اس کا سب سے زیادہ قریبی رشتہ دارانہ دوست ہونے کے سبب اس ذمے داری کا سب سے زیادہ بار تھا۔ اجی یہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹّے بٹّے ہیں۔ یہ بات زبان پر آئے یا نہ آئے مگر سب کے دل میں ضرور تھی۔

دو چار روز بعد زاویۂ نظر میں ایک عجیب تبدیلی ہوئی۔ کچھ اس طرح کی رائے زنی ہونے لگی۔

کملا بابو کا قصور نہیں۔ سیدھے سادے آدمی ہیں۔ ڈور تو دوسروں ہی کے ہاتھوں میں تھی جو ٹٹی کے آڑ سے شکار کھیلتے ہیں۔ اس غریب کو الّو بناکر خود مزے اڑاتے تھے،

پھنستے تو احمق ہی ہیں، کھلاڑی تو پہلے کود پھاند کر نکل جاتے ہیں۔ سارا کالکھ دانو کے چہرہ پر لگ گیا۔

دان ناتھ کو واقعی مکان سے نکلنا مشکل ہوگیا۔ وہی لوگ جو اس کے سامنے ادب سے سر جھکاتے تھے۔ اب انھیں آتا دیکھ کر کترا جاتے تھے، جو ان کو پلیٹ فارم پر جاتا دیکھ کر مسرت کے نعروں سے ساری فضا کو معمور کر دیتے تھے۔ اب ان کا مضحکہ اُڑاتے تھے، ان پر طعنوں کی بوچھار کرتے تھے۔ کالج کے طلبہ میں بھی تنقید ہونے لگی تھی۔ انھیں دیکھ کر آپس میں نگاہیں ملائی جاتی تھیں، درجے میں ان سے مضحکہ خیز سوالات کیے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک روز برآمدے میں کئی لڑکوں کے سامنے چلتے چلتے دفعتاً انھوں نے مڑکر پیچھے کی طرف دیکھا تو ایک لڑکے کو ہاتھ کی چونچ بنائے ہوئے پایا۔ لڑکے نے فوراً ہاتھ نیچا کر لیا۔ اور کچھ شرمندہ بھی ہوگیا۔ مگر دان ناتھ کو ایسا صدمہ ہوا کہ ان کا اپنے کمرے تک پہنچنا دشوار ہوگیا۔ کمرے میں جاکر وہ نیم غشی کی حالت میں کرسی پر گر پڑے۔ اب وہ ایک لمحہ بھی وہاں نہ رہ سکتے تھے۔ اسی وقت رخصت کے لیے درخواست لکھی اور گھر چلے گئے۔

پریما نے ان کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر پوچھا۔ ”مزاج کیسا ہے؟ آج جلدی کیسے چھٹی ہوگئی؟“

دان ناتھ نے بے پروائی سے کہا۔ ”چھٹی نہیں ہوئی، سر میں کچھ درد تھا۔ بس چلا آیا۔“

ایک لمحہ کے بعد پھر بولے۔ ”میں نے آج سے رخصت لے لی ہے چند روز آرام کروں گا۔“

پریما نے ہاتھ مُنہ دھونے کے لیے پانی لاکر رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں تو کب سے چلّا رہی ہوں کہ کچھ دنوں کی رخصت لے کر پہاڑوں کی سیر کرو۔ دن بدن گھلے جاتے ہو۔ آب و ہوا کی تبدیلی سے ضرور نفع ہوگا۔“

دان۔ تم تو چلتی ہی نہیں مجھے تنہا جانے کو کہتی ہو۔

پریما۔ میرا جانا مشکل ہے۔ خرچ کتنا بڑھ جائے گا پھر تو میں بھلی چنگی ہوں جس کے لیے اپنا مکان ہی پہاڑ ہو رہا ہو وہ پہاڑ پر کیا کرنے جائے۔

دان۔ تو مجھے ہی کیا ہوا ہے؟ اچھا خاصا گینڈا بنا ہوا ہوں، اتنا موٹا تو میں کبھی نہ تھا۔

پریما۔ ذرا آئینے میں صورت تو دیکھو۔

دان۔ صورت تو کم از کم سو مرتبہ روزانہ دیکھتا ہوں، مجھے تو کوئی فرق نہیں نظر آتا۔
پریما۔ نہیں دل لگی نہیں، تم ادھر بہت دبلے ہوگئے ہو، تمھیں خود ہی کمزوری محسوس ہوتی ہوگی، ورنہ تم بھلا رخصت لیتے۔ چھٹیوں میں تو تم سے کالج کے بغیر نہ رہا جاتا۔ پھر تم رخصت کب لینے والے تھے۔ تین مہینے تم کوئی کام نہ کرو۔ نہ پڑھو، نہ لکھو، بس خوب گھومو اور آرام کرو۔ ان تین مہینوں کے لیے مجھے اپنا ڈاکٹر بنالو۔ میں تمھیں جس طرح رکھوں اسی طرح رہو۔
دان۔ نا بھیّا، تم مجھے کھلا کھلاکر کوتل بنا دوگی۔

پریما سے آج تک دان ناتھ نے ایک مرتبہ بھی اپنی بدنامی کا ذکر نہ کیا تھا جب ایک دفعہ طے کرلیا کہ اپنی عزت و نیک نامی کو اس کی مرضی پر قربان کردیں گے تو پھر اس سے اپنی دلی خواہش کا ذکر کیا کرتے؟ اندر ہی اندر گھٹتے رہے تھے۔ دنیاوی شہرت جس کے عموماً سبھی لوگ خواہش مند ہوتے ہیں، دان کی زندگی کا بھی تو سہارا تھی۔ بدنام ہوکر جینے سے مرجانا ان کے لیے کہیں بہتر تھا۔ عزت و وقار کا جو محل انھوں نے برسوں میں کھڑا کیا تھا وہ پرائی آگ سے جل کر خاک سیاہ ہوگیا تھا۔ اس محل کی تعمیر وہ دو چار الفاظ کے ذریعہ پھر کرسکتے تھے۔ صرف ایک تقریر کسی جادوگر کے منتر کی طرح اس تودۂ خاک کو نئی تعمیر کی شکل میں منتقل کرسکتی تھی، مگر ان کی زبان بند تھی۔ لوگوں سے ملنا جلنا بند ہوگیا تھا۔ اب انھوں نے باہر نکلنا بھی چھوڑ دیا۔ دن بھر پڑے پڑے کچھ پڑھا یا سوچا کرتے، دل کی فکر و تشویش انھیں اندر ہی اندر گھلائے ڈالتی تھی۔ پریما کے بہت اصرار پر باہر نکلتے بھی تھے تو اس وقت جب اندھیرا ہوجاتا تھا۔ کسی پہچان والے کی شکل دیکھتے ہی ان کی جان نکل سی جاتی تھی۔

ایک روز سومترا آئی بہت خوش تھی۔ پریما نے پوچھا۔"اب تو بھیّا سے لڑائی نہیں ہوتی؟ سومترا ہنس کر بولی۔"اب ٹھیک ہوگئے۔ بدنامی ہوئی تو کیا مگر ٹھیک راستہ پر آگئے۔ اب سیر تماشا بند ہے مکان سے نکلتے ہی نہیں۔ لالہ جی سے تو بول بند ہی ہے اماں جی بھی بہت کم بولتی ہیں۔ بس اپنے کمرے میں پڑے رہتے ہیں۔ اب تو جو کچھ ہوں میں ہوں۔ میں ہی ان کے دل و جان کی مالکہ اور ان کی زندگی کے لیے امرت ہوں۔ روز نئے نئے لقب بنائے جاتے ہیں۔ نئے نئے نام دیے جاتے ہیں۔ میرا تو جی اب اکتا جاتا ہے۔ پہلے یہ

خواہش رہتی تھی کہ یہ میرے پاس بیٹھے رہیں، اب یہ خواہش رہتی ہے کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے آنکھوں سے اوجھل ہوجائیں۔ جب محبت جتانے لگتے ہیں تو جھنجھلا اُٹھتی ہوں، مگر پھر بھی پیشتر سے کہیں بہتر حالت میں ہوں۔ کم ازکم یہ اندیشہ تو نہیں ہے کہ میری چیز کسی اور کو مل رہی ہے۔ آئندہ کے لیے بھی یہ اندیشہ نہ رہے گا۔ دیہات جانے کا حکم جاری ہوگیا ہے۔

پریما نے پوچھا۔"کون کون جائے گا؟"

سومترا۔ بس ہمیں دونوں۔ دراصل لالہ جی انھیں یہاں سے ہٹا دینا چاہتے ہیں۔ مگر یہ تو اچھا نہیں لگتا کہ وہ دیہات میں تنہا جاکر رہیں۔ میں نے بھی ان کے ساتھ جانے کا ارادہ کرلیا ہے۔ دو چار روز میں چلے جائیں گے۔ وہ تم سے ملنا چاہتے ہیں مگر شرم کی وجہ سے نہ وہ یہاں آتے ہیں اور نہ تمھیں بلاتے ہیں۔ کہ ان کے سامنے کیسے تاک سکوں گا؟

پریما۔ اسی شرم کے خیال سے تو میں بھی نہیں گئی۔ بھیّا پچھتاتے تو ہوں گے؟

سومترا۔ پچھتاتے ہی نہیں، روتے ہیں، جیسے کوئی لڑکی ماں کے گھر سے رخصت ہوتے وقت روتی ہے، ہمیشہ کے لیے سبق مل گیا۔ میں تو پورنا کے پاؤں دھودھو کر پیوں۔ واقعی بڑی ہمت کی عورت! ایک مرتبہ اس سے مل کیوں نہیں آتیں۔ یکایک دان ناتھ ہاتھ میں ایک خط لیے دوڑے ہوئے آئے اور کچھ کہنا چاہتے تھے کہ سومترا کو دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔ پھر شرماتے ہوئے بولے۔"سومترا دیوی کب آئیں؟ مجھے تو خبر ہی نہیں ہوئی۔"

سومترا نے مسکراکر کہا۔"آپ نے آنا جانا ترک کردیا مگر ہم تو ایسا نہیں کرسکتے۔"

دان ناتھ کچھ جواب دینے ہی کو تھے کہ پریما نے ان کی شکل سے ان کے دل کی بات تاڑ کر کہا۔"جانا آنا بھلا کہاں چھوٹ سکتا ہے بہن؟ ان کا جی ہی اچھا نہیں رہا۔"

سومترا۔ ہاں دیکھ تو رہی ہوں۔ آدھے بھی نہیں رہے۔

دان ناتھ نے پریما کو خط دکھلا کر کہا۔"یہ دیکھو امرت رائے کا ایک مضمون ہے۔"

دان۔ پڑھ لو۔ پریما نے لپک کر خط لے لی مگر کچھ سنبھل کر بولی کس بات پر ہے وہ تو مضمون نہیں لکھتے۔"

پریما۔ پڑھ لوں گی مگر ہے کیا؟ وہ ودھوا آشرم کے بارے میں کچھ لکھا ہوگا۔

دان۔ مجھے گالیاں دی ہیں۔

پریما کو گویا بچھو نے ڈنک ماردیا۔ بے اعتباری کے طریقہ پر بولی۔"تمھیں گالیاں دی ہیں؟ تمھیں ! میں انھیں اس سے بہت زیادہ سمجھتی ہوں۔

دان۔ میں نے گالیاں دی ہیں تو وہ کیوں چپ رہتے؟

پریما۔ تم نے گالیاں نہیں دیں۔ رایوں میں اختلاف ہونا گالی نہیں ہے۔

دان۔ کسی کو گالی دینے ہی میں لطف آئے تو؟

پریما۔ تو میں ایک ایک کی سو سو سناؤں گی۔ میں انھیں اتنا کمینہ نہیں سمجھتی تھی۔ اب معلوم ہوا کہ وہ بھی ہماری ہی طرح کمزوریوں میں بھرے ہوئے انسان ہیں۔

دان۔ ایسی چن چن کر گالیاں ایجاد کی ہیں کہ میں تو دنگ رہ گیا۔

پریما۔ اب اس بات کا ذکر ہی نہ کرو۔ مجھے رنج ہوتا ہے۔

دان ناتھ نے مسکرا کر کہا۔"ذرا پڑھ تو لو۔ پھر بتلاؤ کہ اس پر کیا کارروائی کی جائے۔ جاکر پٹک دوں یا کھوپڑی سہلاؤں؟"

پریما۔ تمھیں مذاق سوجھا ہے اور مجھے غصّہ آرہا ہے۔ جی چاہتا ہے اس وقت جاکر کہہ دوں کہ تم اب میری نظر سے گر گئے اور لوگ چاہے تم سے خوش ہوں، اس چال سے چاہے تمھیں چندے اور مل جائیں مگر میری نگاہوں میں تم نے اپنی عزت کھودی۔

دان۔ تو چلو میں اور تم دونوں ساتھ چلیں۔ تم زبان کا تیر چلانا میں اپنے ہاتھوں کی صفائی دکھاؤں گا۔

سومترا۔ پہلے مضمون تو پڑھ لو۔ گالیاں دی ہوتیں تو لالہ یوں باتیں نہ کرتے۔ امرت رائے ایسا آدمی ہی نہیں ہے۔

پریما نے سہمی ہوئی آنکھوں سے مضمون کا عنوان دیکھا۔ پہلا جملہ پڑھا تو چڑھے ہوئے تیور ڈھل گئے۔ دوسرا جملہ پڑھتے ہی وہ خط پر زیادہ جھک گئی۔ تیسرے جملہ پر اس کا غصّہ بھرا چہرہ بحال ہونے لگا۔ چوتھے جملہ پر اس کے ہونٹوں پر تبسم

نمایاں ہوا اور پیراگراف کے ختم ہوتے ہوتے اس کا سارا بدن کھل اُٹھا۔ پھر ایسا معلوم ہوا گویا وہ ہوائی جہاز پر اُڑی جارہی تھی۔ سارے حواس میں تازگی آگئی تھی۔ مضمون کے تینوں پیراگرافوں کو ختم کرکے اس نے اس طرح سانس لی گویا وہ کسی مشکل امتحان سے نکل آئی۔

دان ناتھ نے پوچھا۔"پڑھ لیا؟ مار کھانے کا کام کیا ہے؟ چلتی ہو تو چلو، میں جا رہا ہوں۔"

پریما نے خط کو تہہ کرتے ہوئے کہا۔"تم جاؤ میں نہ جاؤں گی۔"

دان۔ آج مجھے معلوم ہوا کہ دنیا میں میرا کوئی سچّا دوست ہے تو یہی ہے۔ میں نے اس کے ساتھ ناانصافی کی، آج معافی مانگوں گا۔ سچّے دل سے معافی مانگوں گا۔

پریما۔ اگر آج نہ جاؤ تو بہتر ہے۔ وہ سمجھیں گے کہ خوشامد کرنے آئے ہیں۔

دان۔ نہیں پیاری اب دل نہیں مانتا، ان کے گلے سے لپٹ کر رونے کو جی چاہتا ہے۔

یہ کہتے ہوئے دان ناتھ باہر چلے گئے۔ سومترا بھی بوڑھی اماں کے پاس جا بیٹھی، پریما کی تعریف کے بغیر اسے چین کہاں؟ پریما نے اسی مضمون کو دوبارہ پڑھا۔ پھر جاکر پلنگ پر لیٹ رہی، اس مضمون کا ایک ایک لفظ اس کے پردۂ نظر پر نقش تھا۔ دل میں ایسے ایسے خیالات آرہے تھے جن کو وہ نہ آنے دینا چاہتی تھی۔

پھر اس کے خیالات نے ایک عجیب صورت اختیار کی۔ امرت رائے نے یہ مضمون کیوں لکھا؟ انھوں نے اگر دان ناتھ کو فی الحقیقت گالیاں دی ہوتیں تو خواہ ایک لمحہ کے لیے اس کو ان پر غصہ آتا۔ مگر غالبًا اس کا دل زیادہ مضطرب نہ ہوتا۔ دفعتًا اس نے خط کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کرڈالا اور ان ٹکڑوں کو دریچے کے باہر پھینک دیا۔ جو پَر چڑیا کو جال کے نیچے بکھرے ہوئے دانے کی طرف لے جائیں ان کا اُکھڑ جانا ہی اچھا!

(۱۴)

دان ناتھ جب امرت رائے کے بنگلے کے قریب پہنچے تو دفعتًا ان کے پیر رُک گئے۔ احاطے کے اندر جاتے ہوئے انھیں شرم معلوم ہوئی۔ امرت رائے اپنے دل میں کیا کہیں گے؟ انھیں یہی خیال ہوگا کہ جب چاروں طرف ٹھوکریں کھا چکے اور کسی نے ساتھ نہ دیا

تو یہاں دوڑے آئے ہیں۔ وہ اسی سوچ میں پھاٹک پر کھڑے ہوئے تھے کہ امرت رائے کا بوڑھا نوکر اندر سے آتا دکھائی دیا۔ دان ناتھ کے لیے اب وہاں کھڑا رہنا ناممکن تھا۔ پھاٹک میں داخل ہوئے۔ بوڑھا انھیں دیکھتے ہی جھک کر سلام کرتا ہوا بولا۔

''آؤ بھیا بہت دنن ما سدر لیہو، بابو روز تمھارا چرچا کرکے پچھتات رہے، تم کا دیکھ کے پھولے نہ سمہیں، مجے ماں تو رہیو؟ جائے کے بابو سے کہدی۔'' یہ کہتا ہوا وہ الٹے پاؤں بنگلے کی طرف چلا۔ دان ناتھ جی جھینپتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے چلے۔ ابھی وہ برآمدے میں بھی نہیں پہنچ پائے تھے کہ امرت رائے اندر سے نکل آئے اور دوڑ کر خوب گلے ملے۔

دان ناتھ نے کہا۔''تم مجھ سے بہت ناراض ہوگئے ہو؟''

امرت رائے نے دوسری طرف تاکتے ہوئے کہا۔''یہ نہ پوچھو دانو، کبھی تمھارے اوپر غصّہ آیا ہے، کبھی رحم کبھی افسوس ہوا ہے۔ کبھی تعجب۔ کبھی اپنے اوپر غصّہ آیا ہے۔ کبھی رحم۔ کبھی افسوس ہوا ہے۔ انسان کا دل کتنا پیچیدہ ہے۔ اس کا سبق مل گیا۔ تمھیں اس وقت یہاں دیکھ کر بھی مجھے اتنی خوشی نہیں جتنی ہونی چاہیے تھی۔ ممکن ہے کہ یہ بھی تمھارا عارضی جذبہ ہو، ہاں تمھارے اخلاق پر مجھے کبھی شبہ نہیں ہوا۔ روزمرہ طرح طرح کی باتیں سنتا تھا مگر ایک لمحہ کے لیے بھی میرا دل ڈانوا ڈول نہیں ہوا۔ یہ تم نے کیا حماقت کی کہ کالج سے رخصت لے لی۔ رخصت منسوخ کرالو اور کل سے کالج جانا شروع کردو۔''

دان ناتھ نے اس بات کا کوئی جواب نہ دے کر کہا۔''تم مجھے اتنا بتاؤ کہ تم نے مجھے معاف کردیا ہے یا نہیں۔ میں نے تمھارے ساتھ بڑے کمینہ پن کا برتاؤ کیا ہے۔''

امرت رائے نے مسکرا کر کہا۔''پونجی پاکر کمینہ بن جانا بالکل قدرتی امر ہے۔ بھئی تم نے کوئی انوکھی بات نہیں کی۔ جب تھوڑی دولت پاکر لوگ خود کو بھول جاتے ہیں تو تم پریما جیسی مجسم لکشمی کو پاکر کیوں نہ آپے سے باہر ہوجاتے۔''

دان ناتھ نے سنجیدگی سے کہا۔''یہی تو میں نے سب سے بڑی غلطی کی۔ میں پریما کے قابل نہ تھا۔''

امرت۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں پریما نے تمھیں شکایت کا کوئی موقع نہ دیا ہوگا۔

دان۔ کبھی نہیں، لیکن نہ جانے کیوں شادی ہوتے ہی شکی ہوگیا۔ مجھے بات بات پر شک ہوتا تھا کہ پریما دل میں مجھ سے نفرت کرتی ہے۔ سچ پوچھو تو میں نے اسے جلانے اور رُلانے کے لیے ہی تمھاری ہجو شروع کی۔ میرا دل تمھاری طرف سے ہمیشہ صاف رہا۔

امرت۔ مگر تمھاری یہ چال اُلٹی پڑی، کیوں؟ کسی ہوشیار آدمی سے صلاح کیوں نہ لی؟ تم میرے یہاں متواتر ایک ہفتہ دس گیارہ بجے تک بیٹھتے اور میری تعریفوں کے پل باندھ دیتے تو پریما کو میرے نام سے چڑھ ہوجاتی۔ مجھے یقین ہے۔

دان۔ میں نے تم پر چندے کے روپے ہضم کرنے کا الزام لگایا۔ حالانکہ میں قسم کھانے کو تیار تھا کہ یہ سراسر جھوٹ ہے۔

امرت۔ میں جانتا تھا۔

دان۔ مجھے تمھارے اوپر یہاں تک حملہ کرنے میں تامل نہ ہوا کہ ....

امرت۔ اچھا چپ رہو بھئی، جو کچھ کیا۔ اتنا میں تب بھی جانتا تھا کہ اگر کوئی مجھ پر وار کرتا تو تم پہلے سینہ کھول کر کھڑے ہوجاتے۔ تمھیں آشرم کی سیر کرا لاؤں۔

دان۔ چلوں گا، مگر میں چاہتا ہوں کہ پہلے تم میرے دونوں کان پکڑ کر خوب زور سے کھینچو اور پھر دو تمانچے زور زور سے لگاؤ۔

امرت۔ اس وقت نہیں مگر پہلے کئی بار جب تم نے شرارت کی تو ایسا غصہ آیا کہ گولی مار دوں، لیکن پھر یہی خیال آجاتا تھا کہ اتنی برائیوں پر بھی تم اوروں سے بہتر ہو۔ آؤ چلو، تمھیں آشرم کی سیر کراؤں۔ تنقیدی نظر سے دیکھنا۔ جو بات تمھیں کھٹکے، جہاں اصلاح کی ضرورت ہو فوراً مطلع کرنا۔

دان۔ پورنا بھی تو یہیں آگئی ہے، اس نے اس بارے میں کچھ اور باتیں کیں؟

امرت۔ اجی! اس کی نہ پوچھو۔ عجیب عورت ہے۔ اتنے روز آئے ہوگئے مگر ابھی تک رونا دھونا بند نہیں ہوا، اپنے کمرے سے نکلتی ہی نہیں۔ میں خود کئی مرتبہ گیا۔ کہا جو کام بہترین معلوم ہو اسی کو اپنے ذمے لو۔ مگر اس کے مُنہ سے تو ہاں، نہیں، کچھ نکلتی ہی نہیں۔ عورتوں سے بھی نہیں بولتی۔ کھانا دوسرے تیسرے وقت بہت کہنے سننے سے کھا لیا۔ بس مُنہ ڈھانکے پڑی رہتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ دیگر عورتیں

اس کی عزت کریں میں اس کو کوئی اختیار دے دوں۔ کسی طرح اس پر روشن ہوجائے کہ ایک شہدے کی شرارت نے اس کا بال بھی بیکا نہیں کیا، اس کی عزت جتنی پہلے تھی اتنی ہی اب بھی ہے۔ مگر وہ کچھ ہونے نہیں دیتی۔ تمھارا تو اس سے تعارف ہے نا!

دان۔ بس ایک مرتبہ پریما کے ساتھ بیٹھا دیکھا ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔

امرت۔ پریما ہی اسے ٹھیک کرے گی۔ جب دونوں گلے مل لیں گی تو پورنا اس سے اپنا سارا ماجرا بیان کردے گی۔ تب اس کے دل کو قرار آئے گا۔ اس کی شادی کرنے کی خواہش ہو تو ایک سے ایک بڑھ کر دولت و ثروت والے لوگ مل سکتے ہیں۔ دو چار آدمی تو مجھی سے کہہ چکے ہیں۔ مگر میں پورنا سے کہتے ہوئے خوف کھاتا ہوں کہ مبادا بُرا مان جائے۔ پریما اس کو ٹھیک کر لے گی۔ میں نے اگر مجرد رہنے کا تہیہ نہ کرلیا ہوتا اور وہ ذات پات کے قیود توڑنے پر تیار ہوجاتی تو میں بھی امیدواروں میں ہوتا۔

دان۔ اس کے خوبصورت ہونے میں تو کوئی شک ہی نہیں۔

امرت۔ مجھے تو اچھے اچھے گھروں میں بھی ایسی حسین عورتیں نہیں دکھائی دیتیں۔

دان۔ یار تم ریجھے ہوئے ہو پھر کیوں نہیں بیاہ کرلیتے؟ مجرد رہنے کا خیال ترک کردو۔ بڑھاپے میں عاقبت کی فکر کرلینا۔ میں نے بھی تو یہی نقشہ تیار کرلیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ شادی کو لوگ کیوں رفاہ عام کی زندگی کے لیے خلل آگیں سمجھتے ہیں۔ اگر عیسیٰ، شنکر اور دیانند بے بیاہے ہوئے تھے تو رام، کرشن، شیو اور وشنو خانہ داری کی ہزاروں بندشوں میں مبتلا تھے۔

امرت رائے نے ہنس کر کہا۔ ”لکچر پورا کرونا، ابھی کچھ دن ہوئے کہ آپ برہچریہ کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ اسی کو انسانی زندگی کا ارتقائے کامل سمجھتے تھے اور آج بیاہ کے وکیل بنے ہوئے ہیں۔ قسمت اچھی پاگئے نا۔“

دان ناتھ تیوریاں چڑھاکر کہا۔ ”میں نے کبھی غیر متاہلانہ زندگی کو معیارانہ نہیں خیال کیا۔ وہ معیار نہ ہو ہی کیسے سکتی ہے۔ غیر قدرتی امر کبھی معیار نہیں بن سکتا۔“

امرت۔ اچھا بھئی میں ہی غلطی پر ہوں۔ چلتے ہو کہیں؟ ہاں آج تمھیں شام تک یہاں رہنا پڑے گا۔ کھانا تیار ہو رہا ہے، کھاپی کر ذرا لیٹیں گے۔ خوب غپ شپ کریں گے۔ پھر شام کو دریا میں بجرے کی سواری کا لطف اُٹھائیں گے۔ وہاں سے لوٹ کر پھر کھانا کھائیں گے۔ اور تب تمھیں فراغت مل جائے گی۔ ایشور نے چاہا تو آج پریما دیوی مجھے کوسنے لگیں گی۔

دونوں دوست آشرم کی سیر کو چلے۔ امرت رائے نے دریا کے کنارے کسی سنگم کے نزدیک پچاس ایکڑ زمین لے لی تھی۔ وہیں وہ رہتے بھی تھے۔ اپنا چھاؤنی والا بنگلہ فروخت کر ڈالا تھا۔ آشرم کے دروازے کے دونوں بازوؤں پر دو بڑے بڑے کمرے تھے، ایک میں آشرم کا دفتر تھا اور دوسرا آشرم کی چیزوں کی نمائش کا کمرہ۔ دفتر میں ایک ادھیڑ عورت بیٹھی ہوئی لکھ رہی تھی۔ رجسٹر وغیرہ قرینے سے الماریوں میں چنے ہوئے رکھے تھے۔ وہاں اس وقت اسّی[80] عورتیں اور بیس[20] لڑکے۔ ان کی حاضری درج تھی۔ نمائش کے کمرہ میں سوت، اون، ریشم، سلمہ، ستارے مونج وغیرہ کے خوشنما بیل بوٹے دار اشیاء شیشے کے دروازوں میں رکھی ہوئی تھیں، سلے ہوئے کپڑے بھی الگنیوں پر لٹک رہے تھے۔ مٹی اور لکڑی کے کھلونے، موزے بنیائین عورتوں ہی کی بنائی ہوئی تصویریں علاحدہ علاحدہ سجی ہوئی تھیں۔ ایک الماری میں آشرم کی بنی ہوئی مٹھائیاں چنی ہوئی تھیں۔ آشرم میں اُگے ہوئے پودے گملوں میں لگے ہوئے تھے۔ کئی تماشائی اس وقت بھی ان چیزوں کو دیکھ رہے تھے۔ کچھ بکری بھی ہو رہی تھی۔ دو عورتیں گاہکوں کو چیزیں دکھا رہی تھیں۔ یہاں کی روزانہ بکری تقریباً سو روپیہ تھی۔ معلوم ہوا کہ شام کے وقت گاہک زیادہ آتے ہیں۔

اب دونوں آدمی اندر داخل ہوئے۔ ایک وسیع مربع صحن تھا جس کے چاروں طرف برآمدہ تھا۔ برآمدے ہی میں کمرے کے دروازے تھے۔ دوسری منزل بھی اسی نمونہ کی تھی۔ زیریں حصّہ میں دفتر تھا۔ بالائی حصّہ میں عورتیں رہتی تھی، کہیں موزے گلوبند وغیرہ بُنے جا رہے تھے، کہیں مربّے اور اچار بن رہے تھے۔ ہر شعبہ ایک قابل خاتون کے زیر اہتمام تھا۔ حسبِ ضرورت دو تین یا چار پانچ عورتیں اس کی مدد کرتی تھیں۔ اس طرح انھیں تعلیم بھی دی جا رہی تھی۔ صحن میں پھول پتّے لگے ہوئے تھے، کئی عورتیں زمین کھود رہی تھیں، کئی آبیاری کر رہی تھیں، چاروں طرف چہل پہل تھی، کہیں سستی، کم حوصلگی شکر رنجی کا نام نہ تھا۔

دان نے پوچھا۔ ''اتنی ہوشیار عورتیں تمھیں کہاں سے مل گئیں؟''

''کچھ دیگر صوبہ جات سے بلائی گئی ہیں، کچھ تیار کی گئی ہیں اور کچھ ایسی ہیں جو روزمرہ باقاعدہ طور پر آکر تعلیم دیتی ہیں اور چار بجے واپس جاتی ہیں۔ جج صاحب مسٹر جوشی کی بیوی مصوری میں ماہر ہیں۔ وہ آٹھ عورتوں کے ایک درجہ کو دو گھنٹے روزانہ پڑھانے کے لیے آیا کرتی ہیں۔ مسز سکینہ سلائی کے کام میں ہوشیار ہیں وہ عموماً تمام دن یہیں رہتی ہیں۔ تین عورتیں پاٹھ شالہ میں کام کرتی ہیں۔ پہلے مجھے شک ہوتا تھا کہ شریف گھرانے کی عورتیں اپنا وقت یہاں کیوں دینے لگیں لیکن اب اس امر کا تجربہ ہو رہا ہے کہ ان میں خدمت گزاری کا حوصلہ مردوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہے۔ پردہ کا تو یہاں قطعی ذکر نہیں ہے، چلو باغیچے کی طرف چلیں۔ اس کا انتظام پورنا کو سپرد کیا گیا ہے۔ میں نے سمجھا کہ یہاں اس کو تفریحِ طبع کے لیے کافی سامان ملے گا اور کھلی ہوا میں کچھ دیر کام کرنے سے اس کی صحت بھی ٹھیک ہوجائے گی۔''

باغیچہ بہت بڑا نہ تھا۔ آم، امرود، لیچی وغیرہ کی قلمیں لگائی جارہی تھیں۔ ہاں پھولوں کے پودے تیار ہوگئے تھے۔ درمیان میں ایک حوض تھا اور تین چھوٹی لڑکیاں حوض سے پانی نکال کر کیاریوں کو سینچ رہی تھیں۔ حوض جانے کے لیے چاروں طرف چار روشیں بنی ہوئی تھیں اور ہر ایک روش بیلوں سے منڈھے ہوئے بانس کے چھوٹے چھوٹے پھاٹک تھے، اس کے سائے میں سنگی بنچیں رکھی ہوئی تھیں۔ پورنا انھیں بنچوں میں سے ایک پر سر جھکائے بیٹھی پھولوں کا ایک گلدستہ تیار کر رہی تھی۔ کس کے لیے؟ دونوں دوستوں کی آہٹ پاکر پورنا اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے گلدستے کو بینچ پر رکھ دیا۔

امرت رائے نے پوچھا۔ ''کیسی طبیعت ہے پورنا؟ یہ دیکھو دان ناتھ تم سے ملنے آئے ہیں، بڑے خواہش مند ہیں۔''

پورنا نے سر جھکائے ہی ہوئے دریافت کیا۔ ''پریما بہن تو بہ خیریت ہیں۔ ان سے کہہ دیجیے گا کہ کیا مجھے بھول گئیں یا مُنہ دیکھے ہی کی محبت تھی۔ خبر بھی نہ لی کہ مر گئی یا زندہ ہوں۔''

دان۔ وہ تو کئی بار تم سے ملنے کو کہتی تھی۔ مگر پس وپیش کے سبب نہ آسکیں۔

''تم نے گلدستہ بہت عمدہ بنایا ہے۔''

تینوں لڑکیاں ڈالی چھوڑ چھوڑ کر آ کھڑی ہوئی تھیں۔ یہاں جو تعریف تقسیم ہو رہی تھی اس سے وہ کیوں محروم رہتیں؟ ایک بول اُٹھی، دیوی جی نے پیپل کے پیڑ کے نیچے ایک مندر بنایا ہے چلیے آپ کو دکھائیں۔"

پورنا۔ یہ جھوٹ بولتی ہے مندر کہاں ہے۔

لڑکی۔ بنایا تو ہے، چلیے دکھا دوں، وہیں روز گلدستے بنا بنا کر ٹھاکر جی پر چڑھاتی ہیں۔ روز گنگا جل بھی لاکر ٹھاکر جی پر چڑھاتی ہیں۔ امرت رائے نے لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔"کہاں مندر بنا ہے چلو دیکھیں۔"

تینوں لڑکیاں آگے آگے چلیں، ان کے پیچھے دونوں دوست تھے اور سب کے پیچھے پورنا آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔

دان ناتھ نے انگریزی میں کہا۔ "بھگتی انسانوں کا سہارا ہے۔"

امرت رائے بولے۔"اب مجھے یہاں ایک مندر تعمیر کرانے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔"

باغ کے دوسرے کونے پر ایک پُرانا درخت تھا۔ اسی کے نیچے تھوڑی زمین صاف کرکے پورنا نے ایک گھروندا سا بنا لیا تھا۔ وہ پھولوں سے خوب آراستہ تھا۔ اسی گھروندے میں کیلے کے پتے سے بنے ہوئے ایک سنگھاسن پر کرشن کی ایک مورت رکھی ہوئی تھی۔ مورت وہی تھی جو بازار میں ایک ایک پیسے کی ملتی ہے۔ مگر اوروں کے لیے خواہ وہ مٹی کی مورت ہو، پورنا کے لیے وہ ازلی حیات کا منبع، لازوال محبت کا مجسمہ، لا انتہا عقیدت کا خزانہ تھی۔ سنگھاسن کے سامنے چینی کے برتن میں ایک خوبصورت گلدستہ رکھا ہوا تھا۔ اس بیکس کی دلی عقیدت کا ایک نور سا وہاں پھیلا ہوا تھا جس نے دونوں دہریوں کا سر بھی ایک لمحہ کے لیے خم کردیا۔

امرت رائے ذرا دیر کسی خیال میں غرق رہے۔ دفعتاً وہ آبدیدہ ہوگئے۔ بھرے ہوئے گلے سے بولے۔"پورنا تمھاری بدولت آج ہم لوگوں کو بھی بھگتی کی ایک جھلک مل گئی۔ اب ہم روزانہ کرشن بھگوان کی زیارت کے لیے آیا کریں گے۔ ان کی پوجا کا کون سا وقت ہے؟"

پورنا کا چہرہ اس وقت ناقابلِ بیان نور سے منور تھا اور اس کی آنکھیں عمیق و پُرسکون رقت سے معمور تھیں۔ بولی۔ "میری پوجا کا کوئی وقت نہیں ہے بابو جی۔ جب دل

میں درد پیدا ہوتا ہے تو یہاں چلی آتی ہوں اور بھگوان کے چرنوں میں بیٹھ کر رو لیتی ہوں۔ کچھ نہیں کہہ سکتی بابو جی کہ اس طرح رو لینے سے میری کس قدر تشفی ہوجاتی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بھگوان کرشن خود ہی میرے آنسو پوچھتے ہیں۔ مجھے اپنے چاروں طرف ایک پاکیزہ خوشبو اور روشنی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ ان کا ہنستا ہوا اور کھلا ہوا چہرہ دیکھتے ہی میرے دل میں امید و مسرت کی لہریں سی اُٹھنے لگتی ہیں۔ پریما بہن کبھی آئیں گی بابو جی؟ ان سے کہہ دیجیے گا کہ انھیں دیکھنے کے لیے میں بہت بے چین ہو رہی ہوں۔"

دان ناتھ نے تسکین دی کہ پریما کل ضرور آئے گی۔ دونوں دوست وہاں سے چلے تو دفعتاً تین کا گھنٹہ بجتا ہوا سنائی دیا۔ دان ناتھ نے چونک کر کہا۔ "ارے تین بج گئے، اتنی جلدی ہی۔"

امرت۔ اور تم نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا، مجھے بھی یاد نہ رہا۔

دان۔ چلو اچھا ہوا تمھارا ایک وقت کا کھانا بچ گیا۔

امرت۔ اجی میں نے تمھاری دعوت کی بڑی تیاریاں کی تھیں، اتنا خرچ کیا گیا اور رسوئیے نے خبر تک نہ دی۔

دان۔ میاں صاحب! آپ کے پچاس روپیہ سے کم تو کبھی نہ بگڑے ہوں گے۔ اسے میں بغیر کھانا کھائے ہی ماننے کو تیار ہوں، ہے رسوئیا بھی چالاک خوب تعلیم دی ہے۔

امرت۔ چالاک نہیں، پتھر! دس بجے کھلاتا تو دو چپاتیاں کھاکر اُٹھ جاتے اور مجھے دعوت کرنے کا سستا جُس مل جاتا۔ اب تو خوب بھوک لگی ہوئی ہے۔ تھالی پر پل پڑوگے۔

ادھر تو یہ شکایت کہ دیر کی، گھر جاکر امرت رائے نے رسوئیے کو خوب ڈانٹا۔ "تم نے کیوں اطلاع نہیں کی کہ کھانا تیار ہے؟"

رسوئیے نے کہا۔ سرکار بابو جی صاحب کے ساتھ آشرم میں تھے، مجھے ڈر لگتا تھا کہ آپ خفا نہ ہوجائیں۔

بات ٹھیک تھی۔ امرت رائے کئی دفعہ اپنے باورچی کو منع کرچکے تھے کہ جب میں کسی کے ساتھ رہا کروں تو سر پر مت سوار ہو جایا کرو۔ باورچی کا کوئی قصور نہ تھا بے چارے بہت شرمائے۔ کھانا آیا ہر دو احباب نے کھانا شروع کیا۔ کھانا

بلا گوشت کا تھا لیکن بہت خوش ذائقہ۔

دان ناتھ نے چٹکی لی۔ یہ کھانا تم جیسے برہمچاریوں کے لیے نہیں ہے، تمھارے لیے تو ایک کٹورا دودھ اور دو چپاتی کافی ہیں۔

امرت۔ کیوں بھئی۔

دان۔ تمھیں ذائقہ سے کیا واسطہ؟

امرت۔ جی نہیں میں ان برہمچاریوں میں نہیں ہوں۔ مقوی اور لذیذ غذا کو میں دل و دماغ کی صحت کے لیے ضروری سمجھتا ہوں۔ کمزور جسم میں تندرست قوتِ ارادی نہیں رہ سکتی۔ تعریف تو یہ ہے کہ تم جاندار گھوڑے کو حسبِ خواہش دوڑا سکتے ہو، مریل گھوڑے پر سوار ہوکر اگر تم گرنے سے بچ ہی گئے تو بڑا کام کیا؟ کھانا کھانے کے بعد دونوں دوستوں میں آشرم کے متعلق بڑی دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ آخر شام ہوئی اور دونوں گنگا جی کی سیر کو چلے۔

شام کو ہوا آہستہ چل رہی تھی اور بجرا ہلکی لہروں پر تھرکتا ہوا چلا جاتا تھا۔ امرت رائے ڈنڈا لیے بجرے کو کھے رہے تھے اور دان ناتھ تختے پر پیر پھیلائے ہوئے تھے۔ گنگا دیوی بھی طلائی زیور پہنے بیٹھے راگوں میں گا رہی تھی۔ آشرم کی شاندار عمارت آفتاب کی آخری برکت میں نہائی ہوئی کھڑی تھی۔ دان ناتھ کچھ دیر لہروں سے کھیلنے کے بعد بولے۔ "آخر تم نے کیا تصفیہ کیا۔"

امرت رائے نے پوچھا۔ "کس بارے میں؟"

"یہی اپنی شادی کے بارے میں۔"

امرت۔ میری شادی کی فکر میں تم کیوں پڑے ہو؟

دان۔ اجی تم نے عہد کیا تھا، یاد ہے۔ آخر اسے پورا کروگے۔

امرت۔ میں اپنا عہد پورا کرچکا۔

دان۔ جھوٹے ہو۔

امرت۔ نہیں سچ۔

دان۔ بالکل جھوٹ۔ تم نے اپنی شادی کب کی؟

امرت۔ کرچکا۔ سچ کہتا ہوں۔

دان نے مذاق سے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔"کیا کسی کو چپکے سے گھر میں ڈال لیا ہے؟"

امرت۔ جی نہیں، خوب نقارہ بجا کر کیا اور بیوی بھی ایسی جس پر سارا ملک فریفتہ ہے۔

دان۔ اچھا تو کوئی اپسرا ہے؟

امرت۔ جی ہاں، اپسراؤں سے بھی زیادہ حسین۔

دان۔ اب میرے ہاتھوں پٹو گے۔ صاف بتاؤ کہ کب تک شادی کرنے کا ارادہ ہے؟

امرت۔ تو تم مانتے ہی نہیں تو میں کیا کروں؟ میری شادی ہوگئی ہے۔

دان۔ کہاں ہوئی؟

امرت۔ یہیں بنارس میں۔

دان۔ اور بیوی کیا آسمان میں ہے یا تمھارے دل میں؟

امرت۔ جی نہیں میرے تمھارے اور دنیا کے سامنے۔

دان۔ میں نے تو نہیں دیکھا۔

امرت۔ ابھی دیکھے چلے آتے ہو اور اب بھی دیکھ رہے ہو؟

دان ناتھ نے سوچ کر کہا۔ "کون ہے، پورنا تو نہیں؟"

امرت۔ پورنا کو تو میں اپنی بہن سمجھتا ہوں۔

دان۔ تو پھر کون ہے؟ تم نے مجھے کیوں نہ دکھلایا؟

امرت۔ گھنٹوں تک دکھاتا رہا۔ اب اور کیسے دکھاتا۔ اب بھی دکھا رہا ہوں۔ آشرم کی طرف اشارہ کرکے "دیکھو! ایسی حسینہ تم نے اور کہیں دیکھی ہے۔"

اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ایسی ایسی اور کئی جانیں اس پر قربان کرسکتا ہوں" دان ناتھ نے مطلب سمجھ کر کہا۔ "اچھا اب سمجھا۔"

امرت۔ اس کے ساتھ میری زندگی بڑے مزے سے کٹ جائے گی۔ یہ ازدواج واحد کے عہد کرنے کا وقت ہے، متعدد ازدواج کے دن گئے۔

دان ناتھ نے متانت سے کہا۔"اگر میں جانتا کہ تم عہد کو اس طرح پورا کروگے تو میں پریما سے ہرگز شادی نہ کرتا۔ پھر دیکھتا تم کیسے بچ کر نکل جاتے۔"

امرت رائے کے ہاتھ رُک گئے۔ انھیں ڈنڈا چلانے کا ہوش نہ رہا،

بولے۔ ”یہ تمھیں اسی وقت سمجھ لینا چاہیے تھا جب میں نے پریما کی پرستش چھوڑ دی۔ پریما سمجھ گئی تھی، چاہے پوچھ لینا۔“

زمین پر تاریکی پھیل رہی تھی اور بجرا لہروں پر تھرکتا ہوا چلا جاتا تھا اسی بجرے کی طرح امرت رائے کا دل متحرک ہو رہا تھا۔ مگر دان ناتھ ساکت بیٹھے ہوئے تھے۔ گویا کوئی تیر لگ گیا ہو۔ دفعتاً انھوں نے کہا۔ ”بھیا تم نے مجھے بڑا دھوکا دیا۔“

پریم چند کے ادبی کارناموں پر تحقیقی کام کرنے والوں میں
مدن گوپال کی اہمیت مسلم ہے پریم چند کے خطوط کے حوالے سے
بھی انھیں اولیت حاصل ہے۔ ان کی پہلی کتاب انگریزی میں بہ
عنوان "پریم چند" 1944 میں لاہور سے شائع ہوئی۔ اسی کتاب کی
وجہ سے غیر ممالک میں بھی پریم چند کے بارے میں دلچسپی پیدا
ہوئی۔ "ٹائمز لٹریری سپلمینٹ لندن" نے لکھا ہے کہ مدن گوپال وہ
شخصیت ہے جس نے مغربی دنیا کو پریم چند سے روشناس کرایا۔
اردو، ہندی ادیبوں کو غیر اردو ہندی حلقے سے متعارف کرانے میں
مدن گوپال نے تقریباً نصف صدی صرف کی ہے۔

مدن گوپال کی پیدائش اگست 1919 میں (ہانسی) ہریانہ میں ہوئی۔
1938 میں سینٹ اسٹیفن کالج سے گریجویشن کیا۔ انھوں نے تمام
زندگی علم و ادب کی خدمت میں گزاری۔ انگریزی، اردو اور ہندی
میں تقریباً 60 کتابوں کے مصنف ہیں۔ پریم چند پر اکسپرٹ کی
حیثیت سے مشہور ہیں۔ ویسے پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا کے
ماہر ہیں۔ مختلف اخبارات، سول ملیٹری گزٹ لاہور، اسٹیٹس مین
اور جن ستہ میں بھی کام کیا۔ بعدازاں حکومتِ ہند کے پبلکیشن
ڈویژن کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے 1977 میں ریٹائر ہوئے اس
کے علاوہ دینک ٹریبون چندی گڈھ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے
1982 میں سبکدوش ہوئے۔